

شہزادہ جہاں عرف جہاںی استاد کی ہر کام خیر سرگودشت

تناوالت

ظاہر جاوید لکھنؤ

شہزادہ

۷۲۳۷۴۱۱



عرض مصنف

”تاوان“ کی پہلی قسط غالباً مئی 1993ء کے سرگزشت میں شائع ہوئی تھی۔

قریباً چھ سال ہوئے ہیں ماہ بہ ماہ ”تاوان“ کا سفر جاری ہے۔ یہ کوئی دیو مالائی یا ماورائی کہانی نہیں۔ اس کی جڑیں اسی ماحول اور معاشرے میں ہیں جہاں میں آپ رہتے ہیں۔ یہ ہمارے ہی گلی کوچوں اور ہمارے ہی شہروں قصبوں کی روئیداد ہے۔ اس روئیداد میں آپ کو بہت سے جانے پہچانے چہرے اور مناظر سانس لیتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ اس کہانی کی خوں رنگ شاموں، جیسی کوئی شام آپ نے بھی دیکھی ہوگی۔ اس کہانی کی اسرار بھری راتوں جیسی کوئی رات آپ پر بھی گذری ہوگی۔ ایسی اُجلی مہمیں اور ایسی فسوں خیز دوپہرس آپ کے علم میں بھی آئی ہوں گی۔

یہ آبلہ پاشا جہاں کی کہانی ہے۔ وہ لڑکپن میں یتیم ہوا اور اس کی ننھی سی بہن اس کی کل کائنات ٹھہری۔ چند سال بعد جب امارات سے آئے ہوئے ایک امیر زادے نے شاہ جہاں کی بہن کو ہوس کی نظر سے دیکھا تو شاہ جہاں کو یوں لگا کہ اس کی کائنات جان لیوا زلزلوں کی زد میں آگئی ہے..... یہی وہ لمحہ تھا جب شاہ جہاں..... جہانی استاد بنا..... اس کے ہاتھ میں ایک لہو پینے والا خنجر آگیا۔ اس خنجر کے ساتھ جب وہ جرائم کی دنیا میں داخل ہوا تو ہر طرف اس کے نام کا ڈنکا بج اٹھا۔ اکڑی ہوئی گردنیں اس کے سامنے جھکتی چلی گئیں اور بڑے بڑے روشن نام اس سورج کے سامنے تاریک ہو گئے۔ شاہ جہاں کو ناقابلِ تسخیر اور ناقابلِ مزاحمت کہا گیا لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ صحرائی بگولوں کی طرح آزاد پھرنے والا یہ شخص لڑکپن سے ہی ایک نازک لڑکی کی ریشمی زلفوں میں یوں جکڑا ہوا ہے کہ جنبش

دیباچہ

کراچی کے ماہنامہ جرائد نے جب عروج پایا تو آپ جنتی کے انداز میں بیان کردہ طویل داستانوں نے بہت مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ یہ طویل آپ بیتیاں ہر پرچے کی لازمی ضرورت قرار پائیں اور ان کے بغیر پڑچوں کی سرکولیشن میں اضافہ یا استحکام ایک کار دشوار ٹھہرا مگر ایسی کسی کہانی کو عرصہ دراز تک اس ڈھنگ سے لکھنا کہ وہ اپنے قارئین کو اپنی دلچسپی کے سحر میں گرفتار بھی رکھے، کوئی معمولی کام نہ تھا۔ اتنی لمبی سانسوں کے رستم قلم کہاں ہوتے ہیں! تاریخ ادبیات پر نظر ڈالیں تو ”علم ہو شہر“ کے بعد اردو میں ضخامت کے اعتبار سے پھر نظر ”علی پور کا املی“ پر ہی آ کر ٹھہرتی ہے۔ باقی کہانیاں تو ان کے مقابلے میں افسانچے ہی نظر آتی ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر ڈائجسٹوں کو اپنی ابتدا ہی میں ایسے ”اوپنر“ مل گئے تھے جو ایک لمبی اور شاندار اننگ کھیلنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے آغاز ہی میں ایسے دل کش اور منفرد شاش کھیلے کہ دیکھنے والے بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ تحریر کے میدان میں قلم کا سرچڑھ کر بولنے والا جادو جگانے والے اولین مصنف محترم انوار مجتبیٰ صدیقی اور حضرت اقلیم علیم تھے۔

ممکن ہے کسی صاحب نظر کو میری اس ذاتی رائے سے اختلاف ہو اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ میری نظر سے ابتدائی زمانے کی کوئی معرکہ آرا سلسلہ وار کہانی نہ گزری ہو۔ بہر حال میرے علم کے مطابق تو ستر کے عشرے کی ابتدا میں مذکورہ بالا مصنفین ہی کی سلسلہ وار کہانیاں دھوم مچا رہی تھیں۔ انوار صاحب کی سونا گھاٹ کا پجاری، غلام روہیں، انکا اور اقبال کے یاد نہ ہوں گی اور اقلیم صاحب کی مفروہ کی انفرادیت اور روایت شکنی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ تیسرا نام اس دور کے حوالے سے جناب ایم۔ اے راحت کا ہے جنہوں نے سامون، ہمالیہ، پارس، سوکھے گلاب، آسیب، دہشت کدہ اور کالا جادو جیسی شہرہ آفاق اور رجحان ساز کہانیاں لکھ کر ملک گیر شہرت حاصل کی ہے۔ بعد میں طویل کہانی نویسی کے فن میں اپنا لوہا منوانے والوں میں برادر ام ایچ اقبال، ”قبلہ“ شکیل عادل زادہ، محی الدین نواب، (جن کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ ”دیوتا“ لکھ کر داستان گوئی کے منبر کی امامت پر فائز ہو چکے ہیں۔) مرحوم جبار توقیر صاحب، ”علامہ“ احمد اقبال اور عزیز محمد احمد مودی کے اسمائے گرامی ممتاز و مشہور ہوئے۔ ان تمام حضرات نے اس سرزمین بے آب و گیاہ کو اپنی طبع رواں سے خوب خوب سیراب کیا۔ نت نئے موضوعات کے ایسے ایسے بیج بوئے جن سے پھوٹنے والے پودے آج قد آور درخت نظر آتے ہیں۔ الفاظ و بیان کے وہ گل کھلائے جن کی خوشبو سے دماغ ابھی تک معطر ہیں۔

یہاں ایک وضاحت بہت ضروری ہو گئی ہے ورنہ امکان ہے کہ یہ سطور پڑھنے والے مجھے کو تاہ نظری کا طعنہ دے بیٹھیں۔ مندرجہ بالا تمام گفتگو میں نے ستر کی دہائی کے حوالے سے کی ہے، اس سے پہلے بھی طویل کہانیاں لکھی گئی تھیں جن کے لکھنے والوں میں ایم ایلاس مرحوم کا نام

تک نہیں کر سکتا۔ وہ لڑکی اس کے پاس تھی لیکن بہت دور بھی تھی ایک عجیب فاصلہ حائل تھا ان کے درمیان۔ شاہجہاں یہ فاصلہ پائنا چاہتا تھا لیکن بے رحم وقت اس سے ایک ایک پل کا تاوان مانگ رہا تھا۔

اس سلسلہ وار کہانی کی اشاعت کے موقع پر میں محترم معراج رسول صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کہانی کو ایک دوسرے ادارے سے مجھ سے کی شکل میں شائع کرنے کی اجازت دی۔ اس کے علاوہ محترم بھائی سید انور فراز صاحب کا بھی بے حد مشکور ہوں۔ اس کہانی میں اکثر ان کا مشورہ شامل حال رہا ہے اور وقتاً فوقتاً مفید ڈسکشن ہوتی رہی ہے۔

دل چاہ رہا ہے کہ اس موقع پر بھائی ساجد امین اور خالد محمود کا ذکر بھی کروں۔ ان دونوں نے ”کاروبار“ کے حوالے سے اکثر میری ذمے داریاں بھی نبھائی ہیں۔ ان کے اس ایثار کی وجہ سے میں لکھنے لکھانے اور آپ تک پہنچنے کے قابل ہوتا ہوں۔

غفار بھائی نے حسب سابق ان مجموعہ جات کو بھی عام ڈگر سے ہٹ کر شاندار انداز میں پیش کیا ہے۔

میں اس امید کے ساتھ یہ پیش لفظ ختم کرتا ہوں کہ اگلا صفحہ اُلٹتے ہی آپ تلخ و شیریں حقائق کی ایک ایسی دنیا میں داخل ہوں گے جو فسوں خیز افسانوں سے بڑھ کر دلچسپ اور تحریر خیز ہے۔

طاہر جاوید مغل



اس شخص کی داستان جس حالات کی تصویر نے مجھ کو دیا وہ یہاں ہوتا ہے
اس کا نام شاہ جہاں رکھا گیا، مگر وہ نیلے آئے جہاں آستانہ کے نام سے پہچانے
آگے ہوئی گھر میں اس کے دو بوجھ ہمارے ہیں، جہاں کی دنیا کے لیے ایک
لوشن تمام اس کے ساتھ بچہ تھے، قانون کے محافظوں کے ساتھ وہ جیل کے لیے
لاہور جیل گیا ایک نازک سی لڑکی کے لیے اس نے خود کو قانون کے حوالے کر دیا
ابھی کچھ اور دیکھا، شاہ جہاں جیل کی صعوبت میں اس کا مقدر رہا لیکن گردش حالات کو
حالات کی ایک منظر کوٹ اسے بچے اور ان کے مزید تاوان کی حالت کا نہیں
باجل ناخواستہ اس صفت قدم بڑھانے پر مجبور تھا۔
زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر سفر کرتی ہوئی ایک پریویج سگزشت

مشقت کے بعد ساڑھے چار بجے ہی قیدیوں کو بیرکوں
میں بند کر دیا جاتا تھا اس لئے رات ان کے لئے کچھ زیادہ ہی
طویل ہو جاتی تھی اور بھری راتیں تو ویسے بھی لاتنا ہی ہوتی
ہیں۔ ایسی "بھری راتوں" میں جب سائون چاندنی یا بھاری
پونہ کاری ہو جاتی ہے تو ان کا درد بھی بیکراں ہو جاتا ہے۔
انسان کے اندر آپوں آپ ہی غم کا کوئی سوتا پھوٹ نکلتا ہے
اور وہ جذبات کے اظہار کے لئے بے چین ہو جاتا ہے۔
نجانے کیوں مجھے توقع تھی کہ میرا بیرک کا ساتھی نور محمد
ابھی کچھ دیر میں تنگے فرش پر لیٹا لیٹا اپنا پایاں ہاتھ کان پر رکھے
گا اور آنکھیں بند کر کے کوئی درد بھری آن لگائے گا۔ نفیسات
کسی ہے کہ ایک جائداد مخصوص ماحول میں، مخصوص رد عمل
ظاہر کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور بار بار کے تجربے سے ہم اس
رد عمل کی پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔ میری بھی پیشین گوئی تھی
کہ نور محمد ابھی اپنی درد بھری آواز سے اس جاں مسلسل
سکوت پر ایک کاری ضرب لگائے گا اور کوئی غمخیز اور
بیرک بیرک چیلی ہوئی خاموش دشت کچھ دیر کے لئے ہی
سہی لیکن دو ہم بد ہم ہو جائے گی۔
مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میری بائیں جانب
تاریکی میں کوئی پانچ فٹ کے فاصلے سے نور محمد کی دل سوز آواز

رات بڑی سوتھی، بے خبر اور ہڈیوں میں اترتی
ہوئی۔
دور کہیں مشرق سے بلند ہونے والا پندرہویں رات کا
چاند دھیرے دھیرے تاریک آسمان پر بلند ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی
گول، سنہری، گیس بھرا غبارہ کسی بچے کے ہاتھ سے چھوٹ کر
اوپر ہی اوپر اٹھتا جا رہا ہو۔ ایک جیل کے کمنہ سال دو دو باہم
چاندنی میں نما تے جا رہے تھے۔ جگہ جگہ آہنی سلاخیں چمک
رہی تھیں اور بیرکوں کے گدے فرش پر روشن گلیمرس سی
رنگ رہی تھیں۔ وہی چاندنی جو باغوں میں، مکھانوں میں
میدانوں میں اور پھاڑوں پر حسن بے کرب رہی تھی اس
جیل میں اتری تو پوری جان سے سک اٹھی تھی۔
میں نے نیل کا پتھر انا جو دس سے بھرا ہوا فاسٹری
کیل انجی طرح شانوں پر گپٹ کر دیوار سے ٹک لگائی اور
بے خیالی میں سلاخوں سے باہر دیکھنے لگا۔ ابھی رات کا آغاز
ہی ہوا تھا لیکن یوں لگتا تھا سورج غروب ہوئے مدہیں بیت
گئی ہیں۔ مدہیں بیت تھی ہیں کہ میں اسی طرح کو غمخیز میں بیٹھا
سلاخوں سے باہر جھانک رہا ہوں اور چاندنی میں بادوں کی
بسا بچھا کر کسی نئی چال سے رات کو ہرانے کی کوشش کر رہا
ہوں۔

قابل ذکر ہے۔ لیکن اس دور کا بعد کے زمانے سے موازنہ کرنا میرے نزدیک درست نہیں ہے۔
قصہ مختصر یہ کہ ظاہر جاوید مغل کو اگر اس میدان میں ایسا وہ مذکورہ قد آور ستونوں کے
درمیان مضبوط بنیاد کا ایک نیا صوفشاں مینار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ۱۹۹۲ء میں جب اس جوان قلم
شسوار ادب نے "تاوان" کے نام سے ہاتھ بننا شروع کئے تو مجھے یقین تھا کہ مستقبل کی ایک ناقابل
فراموش سرگزشت شروع ہو چکی ہے۔ اس داستان کی پہلی قسط ہی میں مصنف کے ذریعہ بیان اور
کثرت مشاہدہ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاوان کے مرکزی کردار اور ان کے
حوالے سے ہمارے سامنے آنے والے موضوعات ڈائجسٹوں کے قارئین کے لیے اجنبی نہیں۔
محبت، نفرت، سیاست، منافقت اور انتقام انسانی زندگی اور معاشرے کا ازل سے حصہ ہیں اور شاید ابد
تک رہیں۔ لہذا دنیا میں جنم لینے والی ہر کہانی کے اجزائے ترکیبی میں ان کا شامل ہونا ناگزیر ہے۔
دیکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ مصنف نے ان سے کہانی کے کرداروں اور ماحول کو کیسا بنایا، سنوارا
ہے اور اس طرح وہ جو پیغام اپنے پڑھنے والوں تک ان ذرائع سے پہنچانا چاہتا ہے اسے پہنچانے میں
کس حد تک کامیاب رہا ہے۔ اس تناظر میں مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ ظاہر
نے بحیثیت مصنف اپنی یہ ذمہ داری بڑی خوش اسلوبی اور کمال کے ساتھ پوری کی ہے اور کر رہے
ہیں۔ وہ اپنے قاری کو ہنسنا بھی جانتے ہیں اور رلنا بھی۔ ان کے قلم کی جنش پڑھنے والے کے دل
کی دھڑکنوں میں کی بیشی کا سبب ہوتی ہے۔ تاوان کا مطالعہ کرنے والے میرے اس دعوے کی
صد اقت کا خود تجربہ کریں گے۔

تادم تحریر تاوان کی ستر اقساط لکھی جا چکی ہیں۔ ہر قسط تقریباً تیس سے پینتیس صفحات پر
محیط ہوتی ہے اس طرح یہ اب تک ہزاروں صفحات پر پھیل چکی ہے اور ابھی سلسلہ جاری ہے۔
اس طوالت کے باوجود پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی اور شوق بے پایاں کا عنصر قائم و دائم رکھنا، کسی
مصنف کی خلاق اور تحریری کمال کا کھلا ثبوت ہے۔ ورنہ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ چند اقساط لکھ کر ہی
مصنف کا دم پھولنا شروع ہو جاتا ہے اور کہانی کی ٹانگیں لڑکھانے لگتی ہیں۔ خدا ظاہر کو نظریہ سے
بچائے کہ ان کی کہانی نہایت سبک رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے اور وہ خود بھی ابھی تک تازہ
دم ہیں۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر
(اقبال)

سید انور فراز

فضا میں ابھری اور گوشتی چلی گئی۔ یہ وہی ہرولز رگیت تھا جس کی فرمائش اکثر قیدی نور محمد سے کیا کرتے تھے۔ کدی آمل رانجن دے۔ میں لگ لگ کر تیرہ ماٹوں اتھے سبھ میرے ویری دے۔ کنوں دل و حال سناواں۔ دے رانجن دے۔

گیت کے بول اور اس پر نور محمد کی آواز جب سنا بندھ جایا کرتا تھا۔ جہاں تک نور محمد کی آواز جاتی تھی دادو حسین کے ڈوگرے پر سا کرتے تھے۔ نور محمد کا گیت ہر قیدی کے سامنے جیسے بھولی ہری یادوں کے انبار لگا دیتا تھا اور جب تک گیت کو پہنچا تھا قیدی نگاہیں ان انباروں میں کچھ تلاش کرتی رہتی تھیں۔ خوش گلو نور محمد بیل کی ان سنگلاخ ہیرکوں میں سوز گداز کا واحد حوالہ تھا۔ وہ یہاں کا ممدی حسن تھا۔ احمد زشدی تھا، مسعود رانا، سلیم رضا، عیسیٰ خیلوی، نور جہاں، لالا، نسیم بیگم سب کچھ وہی تھا۔ وہ ایک شخص نہیں تھا، نور ایک عہد تھا، آواز کی دنیا کا۔ اس رات بھی جب اس کی آواز کوئی تو ہر قیدی کی طرح میں بھی سوچوں کے دنیا میں بہتا نہجانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کدی آمل رانجن دے۔ میں لگ لگ کر تیرہ ماٹوں

میری نگاہوں کے سامنے ایک سولہ سالہ نومند لڑکے کی شبیہ ابھری جو اپنی پانچ سالہ گلیاسی بن کو سینے سے لگائے بارش میں بھٹکتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے قدموں میں تیزی تھی۔ وہ اپنی غصناک چوکی کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ دور، جہاں اس کی بہن کے پھول سے گال بے رحم پھڑوں سے محفوظ رہیں۔ جہاں اس کے ریشمی بال بے دردی سے کھینچے نہ جائیں۔ جہاں اسے پیٹ بھر کر کھانا ملے اور وہ نیند بھر کر سو سکے۔ وہ چلا جا رہا تھا۔ اور بس چلا جا رہا تھا۔

پھر جوستان کے ایک قصبے میں ایک جھوٹے سے گھر کا منظر اس کی نگاہ کے سامنے آیا۔ یہاں وہ اپنی مٹی بن کے ساتھ رہتا تھا۔ وہی اس کی ماں تھی، وہی باپ، وہی بھائی اور وہی سرپرست۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اسے سلا تا تھا۔ اسے کپڑے پہنا تا تھا۔ گود میں بٹھا کر اس کی کتھکی کرتا تھا اور اپنے ساتھ لپٹا کر سلا تا تھا۔ یہ لڑکا کون تھا؟ میں ہی تھا۔ وہ میری، بن کھنڈ تھی جسے میں بار سے شتہا لگا کرتا تھا۔

پھر میرے قصور نے شتہا کو نوخیز لڑکے کے روپ میں دیکھا۔ وہ میرک کی طالبہ تھی۔ سفید براق لباس میں کئی اور ہی دنیا کی قلوب دکھائی دیتی تھی۔ وہ جوانی کی دلہن تھی مگر اب بھی میری گود میں بیٹھتی تھی۔ مجھ سے چٹ کر لیتی تھی اور میرے پیٹ پر ٹانگ چڑھا کر گلیاسی سناتی تھی۔ کون کتا

ہے وہ بڑی ہو چکی تھی، وہ تو چھوٹی سی بچی تھی، معصوم اور سادہ۔ جس کے دل کی صاف سختی پر صرف اپنے بچپن کا نام لکھا تھا۔ دنیا اس کے لئے اس نام سے شروع ہو کر اس نام پر ختم ہو جاتی تھی۔ وہ کہاں جوان ہوئی تھی؟ وہ معصوم تھی اور اس کے خواب بھی معصوم تھے۔ وہ اس شہزادے کے خواب نہیں دیکھتی تھی جو اڑنے والے گھوڑے پر سوار آتا ہے اور شہرے مستقبل کی باتیں کرتا ہے۔ وہ تو انہی تکیوں، پھولوں اور گھوٹوں کے سینے دیکھتی تھی۔ گلیاسیوں کی کتابیں پڑھتی اور بچوں کے گیت سنتی تھی۔ ہر شب تارے اسے لکھوں کے ساتھ آگے بڑھتی دیکھتے تھے اور ہر برج صحرائی غم نیرت اس کے گلوے جو متی تھی۔ اس لئے وہ اس شہزادے کو دیکھ کر حیران ہو گئی تھی جس نے ایک روز اسے درختوں کی اوٹ سے گھورا تھا۔ یہ شہزادہ اڑنے والے گھوڑے پر نہیں چپ پر سوار تھا۔ وہ کسی شہرے دیس سے نہیں "مارات" سے آیا تھا اور پکڑ کے شکار پر نکلا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہر کاووں کی ایک پوری فوج تھی۔ میری مٹی بن نے اس کرفت چہ شہزادہ کو دیکھا تھا تو بھاگ کر گھر آگئی تھی۔ اس کا سینہ دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔ ایک اکی میرے قصور نے جست بھری اور دڑبے کی حویلی کا منظر میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ علاقے کا پولیس انچارج بھی وہاں موجود تھا۔ وہ ایک طوفانی شب تھی۔ دڑبے کی سرکوشی میرے کانوں میں گونجی۔

"شاہ جہاں! اب بھی وقت ہے۔ ماں جاؤ۔ تمہاری بہن شہزادی کھائے گی۔ گودوں اربوں میں کھیلے گی۔ میں تمہیں اپنی طرف سے ضمانت دیتا ہوں کہ تمہاری بہن وہاں سکی رہے گی۔"

میں نے کہا تھا۔ "سائیں، تیری اپنی دو بیٹیاں بھی تو جوان ہیں۔ وہ کچھ کم خوبصورت نہیں۔ تو انہیں اس امیر زادے کے حرم میں داخل کیوں نہیں کر دیتا؟"

دڑبے نے خنخوار نظروں سے مجھے گھورا تھا اور سانپ کی طرح ہنکارا تھا۔ "لگتا ہے تو بہن بھی بیابا ہے گا اور ذلت کا بار بھی گلے میں پہنے گا۔"

دراے میں ایک بے چراغ کنیا کے اندر ایک موت واقع ہوئی تھی اور ایک نیا انسان وجود میں آیا تھا۔ مرنے والے کا نام شاہ جہاں بی بی ایل ایل بی تھا اور وجود میں آنے والے کا نام جہانی استاد۔

اگلے تین برس میں "جہانی" بن کر میں نے جو کچھ کیا اسے عقید کرنے کے لئے دفتر دار رہا۔ میری بہن ایک محفوظ نگاہ میں تھی اور میں اس کی طرف سے قطعی بے فکر تھا۔ اب میں تھا اور میرے دشمن تھے۔ میں نے دیوانہ وار ان سے ٹکری اور ہر روز گاہ میں ان کے سامنے ڈٹ گیا۔ یہ ایک خونی بازی تھی جس میں شب و روز میری جان داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھوں کم از کم پندرہ قتل ہوئے اور بیٹوں ایسے جرائم میرے کھاتے میں لکھے گئے جن میں سے ہر ایک کے بدلے مجھے عمر قید ہو سکتی تھی، لیکن جب میں نے خود کو قانون کے حوالے کیا تو ان سب جرائم کے بدلے مجھے صرف بارہ سال قید کی سزا ہوئی۔ اس رعایت کا ایک سبب تو میرے جرائم کا پس منظر تھا لیکن ایک سبب اور بھی تھا۔ اس کی وضاحت میں آگے چل کر کروں گا۔ ہاں۔ اتنا یادوں کہ میرے "بھتیجا بھینکے" ایک وجہ میری بہن تھی۔ یہ ایک طویل روداد ہے، مختصر یہ کہ وہ ایک روز جان جو ہم میں ڈال کر مجھ تک پہنچی تھی۔ بلک بلک کر روئی تھی، پوری جان سے میرے ساتھ لپٹ گئی تھی اور میں اس کے اشکوں میں بہہ کر پولیس اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔ اس ناقابل شکست عہد کے ساتھ کراب میری جان جائے تو جائے میں جرم کے راستے پر قدم نہیں رکھوں گا۔ اپنی شہتہ کی خاطر میں نے جہانی استاد کے گھڑے کر کے اسے لاہور جیل کے احاطے میں دفن کر دیا تھا۔ اب جو شاہ جہاں کبل لپٹے اس کو ٹھری میں بیٹھا چاند کو تک رہا تھا۔ وہ ایک اور شخص تھا۔ سیدھا سادا بھلا مانس اور بالکل مختلف۔ اس میں کوئی اگر نہیں تھی۔ اس کا کوئی دبدبہ نہیں تھا۔ وہ کسی کو گریبان سے نہیں پکڑتا تھا۔ اس کی نگاہیں اس کے پاؤں کی انگوٹھوں سے اوپر نہیں اٹھتی تھیں۔ وہ نیچو دار قیدیوں کی گلیاں کھا کر بھی مڑ نہیں ہوتا تھا اور ہنر پختہ ٹھنڈے وغیرہ بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑتے تھے۔ دیر ہوئی اس کی آنکھوں میں گوندنے والی بھلاں بھج چکی تھیں اور اس نے اپنے بازوؤں کی تڑپ پھیلوں کو مصلحت کے انکشاف کا کر مظلوم کر دیا تھا۔ اب اس کے سامنے صرف ایک ہی متھہ تھا۔ جیسے تھے اپنی باقی کی آٹھ سال قید کاٹنا اور اس میں بذریعہ "تیک چٹنی" زیادہ سے زیادہ تخفیف کرائنا تاکہ وہ جلد از جلد اس مخموس چار دیواری سے نکل کر اس آزاد فضا

میں پہنچ سکے جہاں اس کی بہن رہتی تھی۔ وہ عزیز ہستی جو ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک اس کی زندگی کا محور تھی۔

ہاں میرے اندر وہ پہلے والا شاہ جہاں اب مرکب تھا۔ اپنی تمام غلامیوں سمیت مٹی اوڑھ چکا تھا۔ اب جو زندہ تھا وہ ایک تھکا ہارا مسافر تھا جسے کسی کی معصوم مسکراہٹ درکار تھی۔ اور بس۔

"کدی آمل رانجن دے" نور محمد کے عالم میں بار بار یہی بول دہرا رہا تھا۔ ہر دفعہ اس کی آواز بولوں میں ایک تیار تک بھرتی تھی۔ اس کی آواز جہاں تک جاری تھی وہیں تک کیف طاری تھا۔ قیدی ملا نہیں بجا بجا کر اور تالیاں پیٹ پیٹ کر اس کے گیت کو تھاپ دے رہے تھے۔

ایک ایک سے سب آوازیں رک گئیں اور سیردادوں کی سیڑیوں سے سناٹا گونج اٹھا۔ چاند بھی جیسے ایک اکی ڈر کر سی بڈی کی اوٹ میں چھپ گیا۔ روداد میں بھانٹے ہوئے آئے۔ ان کے ساتھ جیکر حیدر شاہنواز نمودار ہوا۔ اس نے غرا کر اس محفل نشاط کے شرکاء کو ایک مشترکہ گالی دی اور بولا۔ "خبردار، تان سین کے بچہ! خاموش بیٹھو۔ جیلر صاحب راؤنڈ پڑیں۔"

ہر ذی نفس کو سانپ سونگھ گیا۔ اس وقت جیلر صاحب کا راؤنڈ پڑنا سمجھ میں نہیں آیا۔ ہر حال یہ جیل تھی اور یہاں سب کچھ متوقع تھا بلکہ جو بات زیادہ غیر متوقع تھی وہی صین متوقع تھی۔ قدموں کی دڑن ٹھک ٹھک سناں دی اور جیلر صاحب پورے طہران کے ساتھ اندھیرے سے برآمد ہوئے شاید ہر بری چیز اندھیرے سے ہی برآمد ہوتی ہے۔ جیلر صاحب کا قدر کوئی ساڑھے چھ فٹ تھا۔ آنکھیں ہر وقت سرخ رہتی تھیں۔ بات کرتے وقت سے چتر جھڑتے تھے۔ وہ اس جیل کے تین جیلوں میں سب سے سخت گیر شمار ہوتے تھے۔ ان کا نام عادل خاں تھا۔ ان کے پیٹھے سے پہلے ہی سپاہی حضرات ہیرک کا کلو تازہ رولب روشن کر چکے تھے۔ عادل خاں نے ہیرک کے سامنے ٹھکر کر ایک نظر بغور قیدیوں کا جائزہ لیا۔ سب جاگ چکے تھے اسے شور سے تو قبر میں سویا مرہ بھی اللہ اکبر کہہ کر اٹھ جاتا۔ اب وہ سب ڈرے سے کبوتروں کی طرح اپنی اپنی جگہ کھڑے جیلر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھ سمیت ان کی تعداد دس تھی۔ دس عدد ڈرے ہوئے انسان ایک ڈرانے والے کے سامنے دست بستہ کھڑے تھے۔ عادل خاں کی نظر مجھ پر جم کر رہ گئی۔ اس نے سوائے نظروں سے جیکر حیدر کی طرف دیکھا۔ اس

لے اوب سے کہا۔ ”جی سر، میں شاہ جہان ہے۔“
جیلر نے مجھے سر تا سر گھورا۔ ”اس کی کتنی بڑی ہڈیاں ہیں۔“

خون میری رگوں میں بہنے لگا۔ مجھے کون سی بلا لگے پڑے والی تھی۔ ہم ملتے ہی پریڈار نکلیں کا بہت بڑا کھچا جھلانا دروازے کی طرف بڑھا۔ کھٹ پٹ کی کچھ آوازیں آئیں اور جھدار نے کڑک دار آواز میں باہر آنے کا حکم سنایا۔ قہقہے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے کھل آٹارا اور پانچ فٹ کے دروازے سے سرخار کا ہر کھل آیا۔ سسٹری اپنی اپنی جگہ کچھ اور بھی چوکی ہو گئے۔ جیلر اب مجھ سے کوئی پانچ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس کی نگاہیں برسے کی طرح میرے جسم کو چمید رہی تھیں۔ بے حس و حرکت وہ میری طرف دیکھتا چلا گیا۔ یہ نہ دیکھنے کا سکوت ہے۔ حد جان لیا تھا۔

یہ ایک جیلر نے عجیب سے لیے میں پوچھا۔ ”تو چاہتا کیا ہے؟“

”میں۔۔۔ میں کیا چاہوں گا جناب؟“

جیلر نے قہقہے کی جیب سے ایک سفید کانڈ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ قل ایک پکا آدھا کانڈ تھا۔ اس پر بال بین سے لکھی ہوئی ایک تحریر تھی۔ مجھے کیوں کانڈ پر نظر پڑے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میں یہ تحریر پہچانتا ہوں مگر کھٹے والا کون ہے؟ کچھ یاد نہیں آیا۔ سب سے اوپر لکھا تھا۔

”خدمت جناب عزت آئید پر شہنشاہ جیل اکرم خاں درانی صاحب۔“ بس ابھی میں اتنا ہی پڑھ پایا تھا کہ ایک زمانے کا چہرہ میرے منہ پر ڈالا۔ کان میں جیسے سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ جیلر عاقل خاں کی خوفناک آواز کانوں میں گونجی۔ ”حرامزادے! کیا تم تیار رہا کھائے ہو؟“

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا جیلر کے غضب کا سمندر اچھل گیا۔ بیکھت مجھ پر ٹھوکوں، ٹکوں اور چھڑوں کی بارش ہو گئی۔ میں جیسے اچانک ہی کسی طوفان کی زد میں آ گیا تھا۔ چند لمحوں بعد اس طوفان کا زور ٹوٹا تو میں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوا۔ کھڑا کھڑا جس پر بیٹنے کی جانب سے کھٹا تھا پھٹ چکا تھا۔ یہی حال میرے بالائی ہونٹ اور دائیں اہد کا ہوا تھا۔ چہرے سے رستے والا خون نچنے پاؤں کی پٹ پر پوند پوند گر رہا تھا۔ جیلر نے زمین پر گرا ہوا کانڈ اٹھایا اور بڑے طنز سے لیے میں پڑھنے لگا۔

”خدمت جناب عزت آئید پر شہنشاہ جیل اکرم خاں درانی صاحب، بندہ دوسری بار آپ کو چھٹی لکھ رہا ہے۔“

خوف ہے کہ کس پہلے والی چٹنی آپ کو مل نہ سکی ہو۔ عرض احوال یہ ہے کہ میں پوری رات اندازہ اری سے اور اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ اطلاع دیتا ہوں کہ آپ کی جیل میں سی کلاس قیدی نمبر ۳۳۳ شاہ جہان کی جان کو شدید خطرہ ہے۔ آپ شاہ جہان کی سبزی شیٹ دیکھ سکتے ہیں وہ ایک زمانے میں بے حد دشمنیاں پال چکا ہے۔ میری مدد کے اطلاعات کے مطابق شاہ جہان کے ایک پرانے دشمن نے اسے جیل کے اندر قتل کرانے کے لئے کچھ نہایت خطرناک خوراک جیل میں داخل کر دی ہے۔ آئندہ چند روز میں یہ لوگ کسی نہ کسی طرح شاہ جہان کو جان سے مار دیں گے۔ اگر آپ مذکورہ قیدی کی جان بچانا چاہتے ہیں تو اسے فوری طور پر جیل کے اندر باہر کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دیں۔ فقط ایک خیر خواہ۔“

جیلر عادل خاں نے میرے گناہ خیر خواہ کو بس کی ایک نئی گالی دی اور کانڈ کے پرزے کر کے میرے منہ پر مار دیے۔ ”حرامزادے! تیرا خیال ہے کہ اس طرح تیری بی کلاس کی درخواست قبول کر لی جائے گی؟“

میں نے کہا۔ ”جناب! آپ کو زبردست غلط فہمی ہو رہی ہے۔ شاید آپ کا خیال یہ ہے کہ یہ خط میں نے باہر سے لکھوایا ہے۔“

”یہ سہلانا نہیں ہے۔ اب تک اس طرح کے تین خط پر شہنشاہ صاحب کو موصول ہو چکے ہیں اور اگر چہ تھا خط آیا تا تو میں تیری ماں۔“

میں خاموشی سے سرخار کر رہ گیا۔ کچھ بولنے کا مطلب مزید تھپڑ اور خوراک کھانا تھا۔ جیلر عادل خاں کچھ دور خونی نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ ہم دونوں کے درمیان ماں کی گالی گونج رہی تھی۔ یہ صرف ایک گالی ہی نہیں تھی۔ اس میں نہایت بدترین قسم کی دھمکیاں بھی پوشیدہ تھیں۔ ان دھمکیوں کو بیل کا مکمل سمجھ سکتا تھا۔ ہم بد نصیب قیدی۔

جیلر پاؤں پچھتا ہوا واپس چلا گیا۔ مجھے دھکیل کر دوبارہ بیرک میں بند کر دیا گیا۔ میں خون پوچھتا ہوا پھر اپنے منہ سے کھل میں آن بیٹھا۔ میرے سب سے ہوئے ساتھیوں کے طویل سانس کھینچیں اور آسیب زدگان کی طرح اپنی اپنی جگہوں پر جا لیئے۔ بیرک کی کتنی بھاری گئی تھی مگر سلاخوں سے باہر زمین پر پڑے سفید کانڈ کے ٹکڑے چاندنی میں چمک رہے تھے۔ یہ کس کی تحریر تھی؟ میرے ذہن پر بار بار اس سوال کا ہتھوڑا برس رہا تھا۔ یہ درست تھا کہ کوئی چہ ماہ پہلے تک میرے منع

کرنے کے۔ وجود کھٹت درپردہ کو شش کرتی رہی تھی کہ مجھے کسی طرح جیس میں بی کلاس مل جائے لیکن مجھے ہرگز یقین نہیں تھا کہ یہ خطوط اسی سلسلے کی کڑی ہوں گے۔ کھٹت غیر قانونی طرز عمل کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر یہ ایسا کون تھا جو میری خیر خواہی پر اترا ہوا تھا؟ آدھ سوچنے کے باوجود کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو میں ذہن خالی کر کے کھٹت تخت زمین پر راز ہو گیا۔

”بھگت سالا۔“ میرے بالکل قریب سے نور محمد کی سرکشی بری۔ وہ جیسے سر پر غصہ اتار رہا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”چھوڑو یار۔ اس کا بھی کیا تصور۔ اب پر شہنشاہ صاحب نے اتنی سخت سڑی میں اسے یہ خط تمہارا جیل دوڑا دیا تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ تو غصہ آتا رہا تھا۔“

نور محمد نے کہا۔ ”سالا اتار لینا غصہ گہری میں۔ کانتا رہتا اپنی خود کو رات بھر۔“

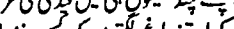
اس بات پر ہلکا سا قہقہہ پڑا۔ ساتھ والی بیرک سے دس گہری دتے قصائی کی آواز آئی۔ ”اے نور محمد! کاس مر گیا ہے۔ ذرا ایک تان لگا یعنی خیلوی والی۔ سارا مزہ بکر کر کر دیا ان دوری والوں نے۔“

وہ میری تیرکوں سے بھی اس فریاد کی کتنی قہقہے میں صبرا لند ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد نور محمد کا رہا تھا۔

پچنے ٹال چائی تارے ٹال لو ماہیا

توں پھل مونتے دا میں تیری خوشبو ماہیا

میں تیری خوشبو ماہیا



پانچ چھ روز تک کوئی نیا واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اس رات بیرک کے سامنے پیش آنے والا واقعہ بھی قریباً قریباً سب بھول چکے تھے۔ جیل میں ایسی انہنیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ قید سے پہلے چند مہینوں ہی میں قیدی کی عزت نفس کی باورزدت کے اتنے داغ لگتے ہیں کہ کسی نئے داغ کے لئے بے حس نہیں رہتی۔ پھر اس چادر پر جتنی بھی سیاسی پیچیدگیوں دریاہ نہیں ہوتی۔ میرے بیرک کے ساتھی بھی میری اس بے فرائی کو قریباً قریب فراموش کر چکے تھے لیکن میں اسے صرف ایک تلخ واقعہ سمجھ کر بھولنے کو تیار نہیں تھا۔ میری کھٹی حس پارکار کر مجھے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ مجھے کوئی ڈیڑھ ہفتہ پہلے کا ایک عجیب واقعہ یاد آ گیا تھا۔ وہ نایاب شب برات کا روز تھا۔ مگر نیل میں شب براتیں عیدیں سب برابر ہوتی ہیں۔ ہم جیل ہی کے احاطے میں ایک جگہ

مشقت کر رہے تھے۔ پر شہنشاہ صاحب کے دفتر تک جانے والی سید ریحان لائٹ کے لئے زمین کھودنی تھی۔ پچاس ساٹھ قیدی اس کام پر لگے ہوئے تھے۔ میں دفتری زیر تعمیر عمارت کے مین نیچے کام کر رہا تھا۔ یہ عمارت تین منزلہ تھی۔

اپنے مقدر کی طرح سخت زمین پر کمال چلاتے ہوئے میں کمر سیدھی کرتے کے لئے ایک پل کے لئے سیدھا ہوا۔ اسی وقت ہوا میں سرسراہٹ گونجی اور کس کھٹکٹ سے لہری پھندی ایک کراہی دھڑام سے میرے قدموں میں آن گئی۔ اس تھلا تھلا کراہی میں کم و بیش آدھ من کھٹکٹ ہوتا ہے۔ یہ کراہی میں اس جگہ گہری جہاں ایک لمحہ پہلے میرا سر تھا۔ خدا نخواستہ یہ آدھ من وزن میری گدی پر آگرا تو دوسرا سانس لینا مشکل تھا۔ میں نے بولکا کر اوپر دیکھا۔ تیسری منزل پر ایک سایہ تیزی سے او بھل ہو گیا۔ اور گرد کے قیدی بیچ ہو کر میری خیریت دریافت کرنے لگے۔ سب کے چوہوں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس وقت میں نے اور دوسروں نے اس واقعہ کو صرف ایک حادثہ جانا تھا مگر اب مجھے وہ واقعہ کسی اور رنگ میں نظر آ رہا تھا۔

میں اپنے خیالوں میں مگن بیٹھا تھا جب کرائی کالو جان محمد نے مجھے فہم کیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تین قیدی بڑے بڑے دھچکے سر پر اٹھائے جیتے باٹنے چلے آ رہے تھے۔ آج جلدی پچھنی ہوئی تھی اور جیتے وقت سے پہلے ہی آ گیا تھا۔ بمشکل ایک بجیا ہو گا۔ قیدیوں نے دھچکے زمین پر رکے اور بیٹھ لا گھری نے رعوت سے آواز لگائی۔

”چلو ہمیں چلو۔ سب لائٹ میں آؤ۔“

ہم دن بھر کے مشقت سے کھٹے ماندے پاؤں چھینے اٹھے اور چوٹا میری دیوار کے ساتھ قطار بنا کر بیٹھ گئے۔ لا گھری نے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ہالہ دے دیا دوسرے لا گھری نے ایک دھچکے میں سے ”تھلی پنک“ وال کی ایک ایک ڈوٹی ہر پالے میں اندر لٹکی شروع کی۔ اس کے پیچھے دو سرا لا گھری پہلے کھیلے جھولے میں سے ایک عدد نیکی کھیل دی نکل کر ہاتھ میں تھما رہا تھا۔ اس کے دوسرے جھولے میں ابلے ہوئے بنانا مارے چادل تھے۔ عرصہ چار سال سے میں ہمہ یار این دروغ نے جسکی کھانا کھانا چلا رہا تھا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ ابھی تک طبیعت اس کھانے پر جی نہیں تھی۔ کبھی کبھی یہ بنانا ماری کھڑکیوں بھری خوراک دیکھ کر دل اچھل جاتا تھا اور بھوک مرکز یوں میں تھمیل ہو جاتی تھی۔ اس دن تو بے بسی بھی بھلا سا بخار تھا۔

میں نے کھانے میں صرف دال لی۔ چادلوں کو روٹی پر

رکھ کر لپٹا اور لاٹھری کی نگاہ پر اچانک بھاگنے کے نینے میں اڑس لیا۔ یہاں خوراک کے ایک ایک ڈرے کی قیمت تھی۔ میں ان ڈھیر سارے ڈروں کو ضائع کیسے کر سکتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد پیرا چایوں کا دہلی چھا بھانچہ پہنچ گیا۔

”چلو بے چلو۔ اپنی اپنی ہیرک بکڑو۔“

ہم چائی بھرے کھلونوں کی طرح اپنی اپنی جگہ کھڑے ہوئے اور قطار اندر قطار ہیرکوں میں کھٹنے لگے۔ جیل کی رات شروع ہو چکی تھی۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد جو نئی اندھیرا پھیلا میں نے نور محمد کو اشارے سے پاس بلایا اور بیٹھے سے روٹی چاول نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ کھانے کی اشتیاق میری خوشبو نے نور محمد کو واپس ساگر کیا۔ وہ وہیں گھنٹوں میں سرسے کر چھڑ چھڑ کھانے لگا۔ وہ دبی منٹ میں وہ فارغ تھا۔ بکلی ہی ڈاکر لے کر وہ ممنونیت سے میری بند لیاں دبانے لگا۔

”ماسٹر! اپنی کیا ہے؟“

نورے کا خیال تھا کہ شاید میں نے روٹی چاول اپنی یعنی چوری کئے ہیں۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ بولا۔ ”ماسٹر! ایمان سے بڑا کرم تو اذ ہے تو اتنے قیدیوں میں تجھے میرا ہی خیال کیوں آیا؟“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اس لئے کہ تو اگلے بننے چھوٹ رہا ہے۔ میں نے سوچا جاتے جاتے تیری ایک دعوت ہی سہی۔“

جانے کے ذکر پر وہ اچانک ہی خیالوں میں کھو گیا۔ ”ماسٹر! یہ بندہ بھی کیا چیز ہے۔ بری سے بری جگہ بھی رہے تو دل لگا لیتا ہے۔ مجھے یاد ہے جب ایک سال پہلے میں جب ترائی کے شیعہ میں راہ چلے پڑا گیا تھا تو دھانڑیں مار مار کر دیا تھا۔ گرفتار کرنے والوں نے مجھے عقابوں کی طرح ایک لیا تھا۔ میری بیوی حاملہ تھی۔ وہ روز وہیں ترپ رہی تھی۔ میں اس کی دوا لینے لگا تھا۔ میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا تھا۔ میرا جرم صرف یہ تھا کہ میرے کپڑے پھینے پرانے تھے اور میں موقع دادرہات کے قریب موجود تھا۔ گنتا بڑا جرم تھا میرا؟ اور اس پر میں نے بے وقوفی یہ کہی کہ تھانے پہنچ کر اپنی بے گناہی کے جوش میں انکپڑے سے الجھنے کی کوشش کی۔ انکپڑے کا ”بچہ! میں تجھے بتاؤں گا“ پولیس کے سامنے اکرے والے کا حشر کیا ہوتا ہے۔“ اور اس نے اپنا کالج کر دکھایا۔ کئی مہینے تک تو مجھے کسی عدالت میں ہی نہیں پیش کیا گیا۔ مجھے یہ بھی پتا نہ چل سکا کہ میری بیوی زندہ ہے یا مر گئی۔ اپنے تین معصوم بچوں کی شکلیں میرے دماغ میں

گھومتی رہیں۔ میں نے انہیں تصور میں بے سارا سر کر دیا۔ ایک ہاتھ دیکھا۔ دوسرے تیرے سینے میرے ایک دیکھنے کی طرح جب تک رسائی حاصل کی اور اس کی زبان ان کی خیر خیریت کا پتا چلا لیکن میں نے اپنے اہل خانہ کو مصیبت کا علم نہیں ہونے دیا۔ میں ایک شریف آدمی میرے لوگوں کو معلوم پڑا تاکہ میں جب ترائی کے جرم گرفتار ہوں تو پورے خاندان کی ناک کٹ جاتی۔ میں کسی کو خبر نہیں ہونے دی۔ ہوا تک نہیں گئے دی۔ دوران مجھے عدالت کے نوادہ کی قید سنا کر جیل پہنچ دیا۔ اب میرے گھر والے بھی سمجھتے ہیں کہ میں کراچی ہوں اور وہاں بطور کار پینٹر کام کر رہا ہوں۔ میرا دوست میرے کراچی سے ایک خط میرے گھر بوسٹ کر رہا ہے۔ میں میری طرف سے لکھا جاتا ہے کہ میں کام میں بہت ہوا ہوں۔ انشاء اللہ اگلے مہینے واپس آنے کی کوشش کر گا۔ دی میرا محسن پر میرے کچھ رقم بھی گھر بھیج دیتا۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ اس جیل میں ”میں نے ایک بل گن کر کاٹا ہے۔ ایک ایک ساعت کو میں نے کھا۔ طرح طرح کر گیا ہے۔ کون سی اذیت ہے جو میں نے یہاں سہی۔ پھر مجھی اب یہاں سے جانے کا سوچتا ہوں تو دل خرا ہو جاتا ہے۔ تم سب سے بچھڑنے کا ملال ہوتا ہے۔ کیوں ہوتا ہے ماسٹر۔ بندہ اتنا جھلڑ کیوں ہے؟ جیل بھی جگہ ہے جس سے ہمارا کیا جائے۔“

میں نے کہا۔ ”نور محمد۔ بات ہے کہ تم خود بہت ا ہو۔ تم اپنی اچھائیوں کے ساتھ جس ماحول میں بھی جاؤ اسے کسی نہ کسی حد تک اچھا کر لو گے اور پھر خود ہی ماحول سے ہمارا بھی کرنے لگو گے۔“

ایک ایک میں نے ایک بکلی سی کراہی۔ بلاشبہ یہ کراہ محمد کے ہونٹوں سے برآمد ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کے سوا میرے قریب نہیں تھا۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں بند کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اسی وقت دوسری کراہ سنائی دی۔ پہلی سے شدید تھی اور اس کے ساتھ ہی میں نے نور محمد یوں لے کر متحرک دیکھا۔ ”کیا بات ہے نور محمد؟“ میں سراپائی سے پوچھا۔

”ماسٹر! میرا بیٹہ۔“

میں نے جلدی سے اس کا بیٹہ ٹھولا۔ نور محمد کے دوا ہاتھ پینے پر تھے اور وہ درد کی شدید لرزے زیر اثر ہوا۔ چارہ تھا۔ یکایک وہ چیخنے لگا۔ اچانک ہی جیسے کوئی اس آنتوں پر چھوٹا چلانے لگا تھا۔ ”ہائے مر گیا۔ ہائے میر

”ہیرک کے قیدی جن میں سے بیشتر اٹھ رہے تھے بڑا ڈاکر تھے اور ہم دونوں کی طرف آئے۔“

”وڑی کیا ہوا؟“ کالو جانی نے چلا کر پوچھا۔

نور محمد اب فرش پر سرخ شکل کی طرح ترپ رہا تھا۔ وہ اپنی دواچ میں کوہلانے کے لئے چلاتے لگے۔ دواچ میں بھانٹا دیا تھا۔ اس نے باہر سے ہیرک کی تکی دوڑن کی۔ میں نے نور محمد کو دیکھا اور کانپ گیا۔ اس کی دہلی پٹی کڑن کی رکیں ہل ہل ہوتی تھیں اور آنکھیں باہر کو ابلی پڑی تھیں۔ دواچ میں ہلکا بولا۔ ”اے نورے کہ پڑ گیا ہوا ہے کچھ کو؟“

لیکن ”نورے کا پڑ“ جواب دینے کے قابل کہاں تھا۔ سے تو جان کے لالے بڑے ہوئے تھے۔ چند اور دواچ میں ہی بھاگتے ہوئے پہنچ گئے۔ نور محمد کی حالت دیکھ کر ان سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میں نے ایک دواچ میں سے بھی لپٹے میں کہا کہ وہ جانے اور ڈاکٹر صاحب کو لائے۔ اچ میونس نے مشورہ کیا اور ایک دواچ میں ہماری ہیرک کے ہین سامنے صوبیدار کے دفتری طرف بھاگا۔ غالباً وہ ڈاکٹر تک جانے سے پہلے صوبیدار سے اجازت لیتا چاہتا تھا۔ دواچ ہین بے حد بے وقوفی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ نور محمد کی حالت دفاک تجزی سے بگڑ رہی تھی۔ وہ اب تکلیف سے بے قرار دکھ رہا تھا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اس کا رگڑ میں لے لیا اور پکارتے ہوئے حوصلہ دینے لگا۔ چاروں کھاتے ہوئے یکایک نور محمد نے خون کی تھکی اور اس کے خون کی حدت میرے ہاتھ سے گزر کر میری انوں کو چھونے لگی۔ کسی آواز نے میرے اندر سے پکار کر کہا۔ ”نور محمد مر رہا ہے۔ قیدی نمبر ۳۰۸ مر رہا ہے۔ وہ آواز رہی ہے جو اس جیل کی سنگی دیواروں میں گداؤں گداؤں کرتی تھی۔“ میں نے نور محمد کا سر فرش پر پٹا اور جیل کی سلاخوں سے چٹ کر دواچ میں کھوپکارتے لگا۔ ان سے اچھا کرنے لگا۔ وہ ڈاکٹر کو بلالیں۔ میرے ساتھ دوسرے تمام قیدی بھی رہا تھا۔ انہیں گئے۔ ہمارے شور و غل سے دواچ میں کھاتے لگا۔ دواچ میں جیل کے اسپتال کی طرف بھاگے۔ اور حور نورے تیار کر لیں۔

”نور محمد۔ نورے۔ نورے۔“

میں نے حلق کی پوری قوت سے چلاتے ہوئے کہا لیکن بدہ سننے کی حد سے گزر چکا تھا۔ جس وقت دواچ میں ہتال سے اسٹریچر لے کر بھاگتے ہوئے ہیرک کی طرف رہے تھے ”نور محمد نے آخری پگلی لی اور ہمارے ہاتھوں میں اٹھوڑا۔ آنکھیں کھلی رہ گئیں جیسے اپنے گھر کا راستہ دیکھ

ری ہوں۔ منہ دار وہ گیا جیسے وہ اپنے غیر حاضر بچوں سے غائبانہ کچھ کہتا چاہتا ہو۔ کوئی سرگوشی کرنا چاہتا ہو۔ کوئی عذر پیش کرنا چاہتا ہو کہ وہ ایک روز اچانک انہیں بتائے بغیر کہاں چلا گیا تھا۔ ہیرکوں کے کمرے سنانے میں ایک درد بھری خاموش صدا گونج گئی۔

”مکدی آہل راجھن دے۔ میں لک لک تیرے ہاتھوں۔“

میری ہیرک کے تمام قیدی دھانڑیں مار مار کر رونے لگے۔ بڑا نرم ہو جاتا ہے دل قیدیوں کا۔ ذرا ذرا سی ٹھیس سے ضبط کا شیش ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ تو ہمارا ایک ساتھ تھا۔ اور ایسے شخص پر گزارا تھا جو ان ہیرکوں کا محبوب گلوکار تھا۔

مکرائی کالو جانی نے روتے ہوئے کہا۔ ”وڑی نور محمد! تم تو سلا کر کھو جاتا تھا۔ یہ کہہ کر کون پھیر لیا۔ یہ تو خوف مرنا تھا تو پہلے روج مرنا تھا۔ وڑی کیوں اتنا اتجار کر لیا بیوی بچوں تک۔“

میرے دماغ میں تیرے آندھیاں چل رہی تھیں۔ کانوں میں وہی چیخ چڑی کی صدا گونج رہی تھی جو میں نے کوئی پون گھنٹا پہلے سنی تھی۔ کتنی رغبت سے میرا دوا ہو لکھنا کھانا تھا اور محمد نے شاید شاید یہ کھانا ہی اس کے لئے اجل کا پیغام بن گیا تھا۔ وہ روٹی اور چاول نہیں کھتے۔ وہ زہر تھا۔ وہ موت تھی۔ وہ کٹھن سے بھری ہوئی ترائی تھی جو دوسری بار میرے سر پر چھینکی گئی تھی۔ گھراس دھنہ یہ کرائی زمین پر نہیں نور محمد کے سر پر گری تھی۔ اس جب ترائی کے سر پر گری تھی جس نے کبھی جب نہیں کائی تھی اور جو ایک سال پہلے اپنے گھر سے بیوی کی دوا لینے نکلا تھا۔ ”اے میرا دل جیسے سو گھڑوں میں تقسیم ہو کر میں سے بکھر گیا۔“

کالو جانی نے میرے قریب بیٹھے ہوئے کہا۔ ”ماسٹر۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں آنسو جھللا رہے تھے۔ اس جیل میں مجھے سب سے پہلے جانی نے ہی ماسٹر کا شوق کیا تھا۔ اب بھی وہ ماسٹر کہتا تھا تو اس کا انداز سب سے جدا ہوا تھا۔ وہ اس لفظ میں اس کے اعلیٰ ترین معنی بھرتا تھا۔ یوں گنتا تھا سلطنت روم کا کوئی قدیم جیشی غلام بعد بجز واکسار اپنے آقا کو مخاطب کر رہا ہے۔ نجانے اسے کیا نظر آیا تھا۔ مجھ میں۔ بعض اوقات میں اس کے انداز پر چڑھا جاتا تھا۔ ”.....“ ”ماسٹر۔“ اس نے مجھے خاموش دیکھ کر پھر اپنے موٹے ہونٹوں کو حرکت دی۔ ”یہ سب تمہاری دوج سے ہوا ہے؟ نورے نے تمہاری طرف آنے والی موت کو گلے لگایا ہے۔“

میں نے انگلیاں نکالیں جھاکر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”ہاں

میں ہوا ہے۔ میرا ہی نوالہ اس کے گلے کا پھندا بنا ہے۔
صوبیدار شبِ خوابی کے لباس میں قندمکا ساموچ پر پہنچ چکا تھا۔ ہیرک کی سلاخوں سے باہر نیل کے گلے کا ڈھیرام ہو رہا تھا۔ سب ہراساں نظموں سے مدود نور محمد کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر قہقہہ کھل کر اسے باہر نکالا گیا اور اسٹریچر پر ڈال کر اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ اب یہ ساری کارروائی بے کار تھی۔ قیدی تو آزاد ہو چکا تھا۔ اس چھوٹی جیل سے بھی اور باہر کی بڑی جیل سے بھی مدود اور بہت اور کھلی فضاؤں میں پرواز کر چکا تھا۔ کل شام اسے ایک ستارہ میں جانا تھا اور پھر اس کی یہی تریا اور بچوں نے ساری عمر اس ستارے کو دیکھا تھا۔

اگلی صبح ساڑھے نو بجے کے قریب مجھ سمیت ہیرک کے تمام قیدیوں کو سرسٹنڈنٹ جیل کے دفتر میں پیش کیا گیا۔ ہمیں الٹی ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ جیسے راتوں رات ہم بے ضرر قیدیوں کی بجائے خود خوار قائل بن گئے ہیں۔ یہ بات اب طشت ازبام ہو چکی تھی کہ نور محمد میرا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہے۔ لہذا سرسٹنڈنٹ کے دفتر میں موجود تمام افسران کی چٹائی گاہوں کا مرکز میں ہی تھا۔ جیلر اور صوبیدار حضرات شاید مجھے کپاہی پٹا جانا چاہتے تھے۔ ہینڈ لائٹری اور اس کے دو ساتھی بڑے اٹھتیاں سے ایک طرف کھڑے تھے۔ یہاں ہم سب قیدیوں کی گالیوں، پتھریوں اور ٹھوکروں سے جو قوامیں ہوئی ہیں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ یہ تو یہاں روز کا معمول تھا۔ چیدہ چیدہ افسران نے دل کی ہراس اچھی طرح نکالنے کے بعد مجھے خصوصی توجہ کا مستحق ٹھہرایا۔ موقع پر موجود اسلم زندہ حادوا نامی ایک ڈی ایس پی نے میرے بال ٹھٹھی میں جکڑے اور پیٹ میں زوردار گھٹنا جاکر بولا "بس کے پھٹنے، مجھے یہ تیار ہونی چاہی تو لے کر کیوں گیا تھا اندر؟"

پیٹ کی ضرب کی وجہ سے میں بولنے کے قائل نہیں رہا لیکن کالو جانی کو کشش کے باوجود اور میری تمام پراہیات کے باوجود خاموش نہیں رہ سکا۔ اس نے قمر سے پچھی ہوئی آواز میں کہا۔ "ڈوڑی ایس بی صاحب! ہم ہاتھ جوڑتا ہے۔ خدا کے لئے ہمارا مغز خراب مت کرو۔ تم یہ تو پوچھتا ہے۔" ہونی چاہی کہ میں نے کر کیا تھا؟ ڈوڑی یہ نہیں پوچھتا اس ہونی چاہی کہ میں موت کس نے ملایا تھا؟ کس حرای نے ماسٹر کی جان لینے کی کوشش کیا تھا۔ کچھ انصاف یہ کہو مایاں باپ۔ تم کو بار بار چھی مٹا ہے۔ تم کو تپایا جاتا ہے کہ کوئی حرای سلا ماسٹر کو مارنا لگتا ہے۔ تم کان نہیں دھرتا۔ اور اب کان دھرتا ہے تو

میرے اس بات پر کہ ہونی چاہی اندر کون لے کر گیا تھا۔ ڈی ایس بی کا پارا ایک ایک ساتویں آسان کو چھو گیا۔ سرسٹنڈنٹ کی موجودگی میں اس نے خود پر ضبط کیا اور دو قدموں سے چلا کالو جانی کے سر پہنچ گیا۔ اس کے تیرہ نے سمجھا دیا مجھے کہ اب کالو جانی کی خیر نہیں۔ نہایت خوفناک انداز میں لیکن آہستگی سے ڈی ایس بی نے ہاتھ بڑھا کر جانی کی ٹھوڑی اور اٹھائی اور پوری شدت سے دانت چیر فرمایا۔ "لات صاحب! تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بتائے کہ وہ ہونی چاہی کھانے سے مرایا زہر لے کر مر گیا۔" زہر لے کر جس کی تین پڑیاں لگی ہیں ہیرک کے شہر اور تم ابھی بیان دو گے کہ یہ جس جیل کے اندر اور پھر کے شہر میں کیسے پہنچی اور کس نے پہنچایا؟" میں سمجھ گیا کہ جیل کے حکام اس واقعے کو دوسرا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کھانے میں زہر ثابت ہو سے ان کی اپنی ذات پر حرف آتا تھا۔ ناصی انتظامات قلعی کھلتی تھی اور یہ بھی شبہ ہوتا تھا کہ شاید کوئی الجکار اس سازش میں شریک ہے۔ لہذا ان لوگوں نے ہونی گندھے ہوئے زہر کو بڑی صفائی سے جس کی پڑیوں میں گھڑا تھا۔ اب ہم لاکھ سرسٹنٹ رچے "زہر" کا پلا رہے ہیں۔ اسپتال ان کا پاتا تھا۔ ڈاکٹر اپنے اور ایگزامینر اپنے کالو جانی سفید جھوٹ کی یہ ضرب سہ سہ سہ سہ بولا۔ "ایس بی صاحب یہ کھلت ہے۔ بالکل کھلت ہے۔ ڈوڑی نورے نے کبھی سرکٹ کو ہاتھ نہیں لگایا، کبھی اس شخص نامیں لیا۔ سارا قیدی لوگ گواہ ہے اس کا۔" اچانک جیلر عادل خاں تھک بولنے کی طرح اپنی جگہ اٹھا اور جھپٹ کر کالو جانی پر جا پڑا۔ "سائے حرای! تھے اولاد! ہم جھوٹ بولتے ہیں۔" اس نے گریبان پکڑ کر کالو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ لوٹکھڑا ہوا ایک دیوار سے ٹکرا اور اوندھے منہ ایک کرسی پر گر گیا۔ کرسی ٹوٹ گئی۔ ہاتھ کی بندھے ہوئے تھے اس کا منہ فرش سے لگا اور ہونٹوں۔ خون کا فوارہ جھوٹ نکلا۔ جیلر عادل خاں ایک کچھ جھنجھوٹ پیکل غصے تھا اس کے باوجود کالو کے سامنے بچے نظر آتا تھا۔ میں نہیں تھا کہ اگر کالو کے ہاتھ آزاد کر دیے جاتے اور عادل خاں کے مقابلے میں مکمل چھٹی دے دی جاتی تو وہ سیکنڈ کے اندر اندر اسے ناک آؤٹ کر کے زندگی کے راز سے باہر پھینک دیتا لیکن اس وقت اس کے ہاتھ قانون باندھ رکھے تھے اور وہ عادل خاں کے سامنے چڑیا کے نومو نیکی کی طرح بے بس تھا۔ عادل خاں نے بے مثال "عدل

مظاہرہ کرتے ہوئے کالو کو کرسی کے ٹوٹے ہوئے پتے سے بے دریغ پٹینا شروع کر دیا۔ جب بیشم کا مضبوط ہاتھ دوبارہ ٹوٹ گیا تو وہ اپنے وزنی بوٹ اٹھانے لگا۔ آزاد حاضرین اور قیدی حاضرین خاموش تماشا کی تھے۔ یوں لگتا تھا عادل خاں کالو سے کوئی پابند لڑ چکا رہا تھا۔ اس مار پیٹ میں اچانک کالو کے ہاتھ کا زار بند ٹوٹ گیا۔ ایک ایک اس کی بے بسی اتنا کہ فوجی تھی۔ اب ایک طرف وہ خود کو عادل خاں کی ٹھوکروں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسری جانب پیٹ پر بندھے ہاتھوں سے ہاتھ بندھ سنبھال رہا تھا۔ مارنے والے کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ شاید اسے اس بات کی فکر بھی نہیں تھی۔ دو درجن نگاہوں اور کالو کی عروانی کے درمیان ایک مکمل ازار بند کا ہاتھ لڑ رہا تھا۔ یاد! مجھے کہنے دو کہ یہ ہاتھ نامہ ایک علامت تھی۔ انسانیت اور حیوانیت کے بیچ ایک حد فاصل تھا۔ یہ ہاتھ شرم کا پتلا تھا۔ اسے مظلوم اور بے بس جیسوں کے اوپر سے بیشم ظالم اور زور آور لوگ پہنچتے رہے ہیں۔ صدیوں تک لڑتے ہوئے مظلوم ہاتھوں نے اس پتلا سے کھانا ہے اور صدیوں بیکے ہوئے جاہل ہاتھوں نے اسے تار تار کیا ہے۔ جوان باصحت عورتوں کی فراہیں باجیا مردوں کی گریہ زاری، معصوم بچوں کی چیخیں، بوڑھوں کے بالوں کی سفیدی کوئی شے اس عمل کو روک نہیں سکتی۔ ظلم اور برائی کے درمیان جہانے یہ کیسا رشتہ چلا آ رہا ہے۔ کالو کی بے بسی کے منظر نے میری آنکھوں میں نگارے سے بھر دیے۔ میرے ذہن میں دھند سی الٹی چلی آئی۔ ایک ایک سب کچھ میری برداشت سے باہر ہو گیا۔ میں ہٹا دیکر سے تھمک ہوا اور پانچوں کی طرح جیلر عادل خاں پر با پڑا۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے میں کیا کر سکتا تھا وائے اس کے کہ اپنے آگے کو بڑھتے ہوئے جسم کے زور سے عادل خاں کو گرادوں اور میں نے ایسا ہی کیا میرے سینے کی ضرب سے عادل خاں اچھلا اور کالو کے اوپر سے ہوتا ہوا ڈی ایس بی اسلم زندہ حادوا کے قدموں میں جا کر گر پڑا۔ رکت نہایت خوفناک تھی۔ اس حرکت نے سب کو کرسیوں سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اب میں پھلو کے بل فرش پر پڑا تھا اور اپنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اپنی کمرز "جاریت" سے میں جو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکتا تھا وہ میں نے لیا تھا اور اب مجھے اس جاریت کا مزا چھٹنا تھا۔ اس نت میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کش میرے ہاتھ آزاد لہ اور میں انیس اپنا دھوپ دھاسکوں جو بڑے بڑے پتے لڑ کو زمین چاٹنے پر مجبور کر چکا تھا جس کے سامنے سر

جھک جاتے تھے۔ حکم میں نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے اور فرش سے اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ابھی پند ساتوں میں مجھے دوبارہ اسی فرش پر گرنا تھا تو اپنے کا فائدہ ہمیں نے دزدیدہ نگاہوں سے عادل خاں اور اسلم زندہ حادوا کو آدم خورد و خشیوں کی طرح خود پر جھینٹ دیکھا اور ہونٹ بھیج کر انہیں بند کر دیں۔ پھر بے ہوش لٹکریوں نے میرے قلعہ جسم کی خستہ تفصیل کو سمار کرنے کے لئے دھاوا بول دیا۔ پہلے اسلم زندہ حادوا اور عادل خاں کی وحشیانہ ضربیں میرے جسم پر پڑیں۔ پھر جیل کے جانے پہچانے لائٹس پر درواریاں لالچیاں سوت کر مجھ پر ٹوٹ پڑے وہ مجھے مارنے اور دھکیلتے ہوئے دفتر سے باہر لے آئے اور مکمل کھلا کر لٹکائی شروع کر دی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے نیم دا آنکھوں سے میں نے دیکھا پند لائٹس پر درواریاں کالو کو بھی اسی طرح پیٹ رہے تھے۔ وہ برہنہ تھا۔

ہوش آیا تو میں نے خود کو اپنی ہی ہیرک میں کراہتے ہوئے پایا۔ مجھے کھڑی ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ اس سزا میں قیدی کو کھڑا رکھنا مقصود ہوتا ہے اس کے ہاتھوں کو کڑی میں ڈال کر سات آٹھ فٹ کی بلندی پر جکڑنے سے خشک کر دیا جاتا ہے۔ میری طرح کالو کو بھی ہتھکڑی لگائی تھی۔ وہ ابھی تک نیم بے ہوش تھا۔ اس کے پاؤں بار بار جسم کا بوجھ سارنے سے انکار کر دیتے تھے اور وہ ہاتھوں کے بل جھول جاتا تھا۔ اندر جیرا گرا ہو چکا تھا۔ ہیرک کے جوڑی دار جو آج نور محمد کی "رانی" کے بعد سات رہ گئے تھے کچھ تو سوچتے تھے اور کچھ ماتم زدہ خاموش بیٹھے تھے میں نے اپنے جسم کو حرکت دینا چاہی تو ہونٹوں سے بے سائزہ کراہیں نکل گئیں۔ خالوں نے لوہے کا پنڈا سمجھ کر مارا تھا۔ جسم کا کوئی حصہ درد سے خالی نہیں تھا۔

"پانی۔" میرے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔ میرے قریب سے ایک سایہ حرکت میں آیا۔ اس نے مجھے کھینچے انداز میں اسٹھ کر اتنی سلاخوں کا رخ کیا۔ سلاخوں سے باہر مٹی کا گھڑا اور سلور کا بے ڈھنگا گلاس رکھا تھا۔ اس نے گلاس بھرا اور قریب آکر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ گلاس پکڑتے ہوئے میں نے تاریکی میں آنکھیں کھلا کر اپنے ساتھی کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ہم دونوں کو ہیرک کے اندر دلی خشکی سے باندھا گیا تھا۔ یہ خشکا دھیر کوں کی درمیانی دیوار کا کام بھی دیتا تھا۔ دوسری ہیرک کے قیدی بھی تاریکی کا وہ کسو پتے تھے یا سونے والے

تھے۔ اندر آجوتی ہی قیدی پھرموں اور مکملوں سے بے نیاز ایسے نڈھال ہو کر پڑتے ہیں، کہ شور مچا کر انہیں کبھی بچاتا ہے اور کبھی نہیں۔ شاید اس کی وجہ دو واقعہ ہیں جو رات کو کئی بار آکر بے پناہ شور کے ساتھ سلاخیں جاتے ہیں۔ غالباً بتانا چاہتے ہیں کہ ہوشیار بیرک والو کہیں خوابوں میں بھی آزاد ہونے کی کوشش نہ کرنا ہم یونی پر موجود ہیں۔ ہم دونوں سے بے حد ہمدردی کے باوجود بیرک کے سارے قیدی ایک ایک کر کے سو گئے اور صرف وہ سلاخی جاتے رہ گئے جنہیں رات بھر ہمیں کانا تھا۔ یعنی پھر پو اور مکمل وغیرہ۔ نیل پر گمرانا ٹھاری ہو گیا اس ستانے میں درد کی لہر اس اور بھی شور مچانے لگیں۔ میں نے سوچا اچھا ہی ہے جان محمد کرائی عرف کالو جانی ابھی مکمل ہوش میں نہیں آیا۔ اسے بھی میری طرح کراہنے کے سوا اور کیا کرنا تھا۔ مجھے تو خدا کے ایک بندے نے پانی پلایا تھا اسے تو پانی پلانے والا بھی اب کوئی نہیں تھا۔ کل رات اور دن کے واقعات ذہن میں کسی دھندلی فلم کی طرح متحرک ہو گئے۔ میرا چاول روٹی سینے میں چھپا ہوا۔ خوش گھو نور محمد کا ترپ ترپ کر مرنے پر سنڈنٹ صاحب کے دفتر میں انہیں سے میری اور کالو کی بے طرح پٹائی۔ آٹھ پھر میں کیا کچھ نہ بیت گیا تھا۔ میری تین سال کی "ٹیک چلی" ایک دن میں عات ہوئی نظر آتی تھی۔ پھر میرا دھیان ان خطوط کی طرف چلا گیا جو بقول جیلر صاحب انہیں موصول ہو رہے تھے۔ ان کی تحریر میری جانی پہچانی تھی اور ان کے مندرجات سو فیصد درست ثابت ہوئے تھے۔ اب اس میں شبہ کی شمر بھر گئی تھی۔ میں بھی کہ مقدر کے مارے شاہ جہاں کو مکر مارنے کے لئے کوئی تاویہ ہستی کمر بستہ باندھ چکی ہے۔ یہ صورت حال غیر معمولی نہیں تھی۔ کیونکہ جیل میں آنے سے پہلے میں نے جو اندھا دھند زندگی گزار لی تھی اور جس فراخ دلی سے دشمنان اور رقابتیں مول لی تھیں اور بستی بستی اور کوپے کوپے جو بنگالہ محشر پر پایا تھا اس کی بازگشت مجھے کسی بھی وقت سنانی دے سکتی تھی۔ اور میں ذہنی طور پر اس کے لئے تیار بھی رہتا تھا لیکن یہ بات بے حد تکلیف دہ تھی کہ نیل حکام جانتے بوجھتے بھی میری حفاظت کی ذمہ داری پوری نہیں کر رہے۔ مجھ پر نگرانی کی کڑائی کرنے والے واقعات سے وہ بے خبر نہیں تھے۔ اب صرف میری وجہ سے نور محمد الٹا نک موت سے دو چار ہو گیا تھا۔ انہیں چاہئے تھا کہ وہ سختی سے واقعات کا نوٹس لیتے اور اس سلسلے میں تفتیش کرتے۔ کردہ اس گاڑی کو کسی اور لائی پر چڑھانے کی کوشش کر رہے

تھے۔ میں اپنے چاروں طرف ایک پر اسرار غصے بوس گھ رہا تھا۔ میری چمنی جس نے مجھے بہت کم درد کرایا اور یہی جس نے مجھے اپنے گرد و پیش سے خردار کر دی تھی۔ نے تیرہ کیا کہ اب اپنی جانب سے کوئی غفلت نہیں رہو رہو بلکہ کوشش کروں گا کہ حفاظت خود اختیار کر کے لئے کہ سے کوئی چھوٹا موٹا ہتھیار میرا آگے۔ ایسے حالات میں معمولی تیز دھار آگ بھی حوصلے کا باعث ہوتا ہے۔ گمری تاریکی میں دیوار سے ٹیک لگانے میں آٹھ منصوبہ بندی کرتا رہا۔ بعض اوقات آدمی جس خطرے کو بہ دور محسوس کرتا ہے وہ اچانک ہی اس کے سامنے آنے والا ہوتا ہے۔ اس کے تمام منصوبے دھرے رہ جاتے ہیں اور خود کو حالات کی آندھی پر بھٹکنے کی طرح خوب دوا پاتا ہے میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ پورا سے لگے لگے اچانک سرسراہٹ سی سنا لی دی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ دیکھ دو سکی بیرک سے کسی نے سلاخوں کے اندر ہاتھ ڈالا اور باریک سی ٹھنڈی سی شے میری گردن سے لپٹ گئی ابھی اس شے کی تاثیر پر ہی غور کر رہا تھا کہ دوسرے ہاتھ۔ پوری قوت سے میرا منہ دھانپ لیا۔ وہ ایک نہایت گھبراہٹ والی صلیب والا مضبوط ہاتھ تھا۔ میرا سر جیسے سلاخوں میں دھنک رہ گیا۔ اس وقت مجھے علم ہوا کہ میری گردن سے کس ہو۔ والی چیز کیا ہے۔ پورے بدن میں سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ تانے یا لوہے کا باریک تار تھا جسے کوئی بے پناہ قوت۔ میری گردن میں دھنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ ہتھکڑی میں لگے ہوئے تھے اور میں بیکرے بس تھا ایک ہی ساعت میں موت میری آنکھوں کے سامنے ناچنے میں نے پہلے اپنے ہونٹوں کو آزاد کرانے کی کوشش کی پھر ہتھکڑی کو دور سے جھنجھایا، پھر پاؤں میں بڑا ہوا سلور کا ٹکڑا ٹھوکر مار کر ہوا میں اڑا دیا۔ مگر بیرک کے ساتھیوں کی ڈھ میں غلغل نہیں پڑا۔ یہ سب کچھ تین یا چار سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ شدید جبین سے اندازہ ہوا کہ تاریک جلد کو کاٹ چکا ہے اور اب شہرہ رنگ کی طرف اس کا خنجر لیکن ملک سرخوش ہو گیا ہے۔

حافظ اور خدا حافظ کالو جانی۔ خدا حافظ میرے دوست اور دشمن! میں نے تاریکی جبین سے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ زخرا کا ہے یا نہیں۔ میرا قریب پر بکے کی گردن کٹی ہے تو گلے سے خرخر کی آواز نکلتی ہے میرے گلے سے تو خرخر کی آواز نہیں نکلتی تھی۔ شاید ابھی کچھ کسراتی تھی۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک بھر پور نامک کالو جانی کی ناف پر دے ماری۔ وہ غالباً بے ہوشی کی سرحد پار کر آیا تھا۔ ناف پر لات پڑتے ہی اس نے ایک پیچ ماری اور اول فول کئے لگا۔ کالو کی پیچ کا پیچ بلند تھی۔ میں نے ذہنی نظروں سے دیکھا، بیرک کے فرش پر ایک سائے نے کوٹ بدلی اور اٹھ بیٹھا۔ میں نے پھپھیروں کی پوری قوت صرف کر کے بند ہونٹوں سے غول غول کی آوازیں نکالیں۔ سایہ تیزی سے گھڑا ہو گیا۔ میرے دل میں اس کا درپہ ڈال دیا۔ یہ ایک موہوم سی امید تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اپنے ساتھی کی صورت حال جانے تک اور اس کے شور مچانے تک میرے گلے سے لپٹا ہوا تار پھوں سے گزر کر شہرہ رنگ کو قطع نہیں کرے گا۔ یہ ساتھیوں کا کھیل تھا یہ لوگوں کی بات تھی۔ میں نے زور زور سے اپنی ہتھکڑی کو حرکت دی۔ میرا بیرک کا ساتھی تیزی سے میری طرف لپکا۔ میں نے ٹیکے اندھیرے میں دیکھا اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ میرے قریب پہنچتے ہی اس نے اپنے پاس مجھے کے سینے سے کوئی آٹھ انچ لمبی نوکدار چیز نکالی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ سرے کا ٹوکڑا تھا جو اس نے سر سنڈنٹ کے زیرِ قیود دفتر سے حاصل کیا تھا اور جسے کئی روز کی محنت سے نوکدار بنایا گیا تھا۔ اس نے یہ ٹوکڑا اپنے دائیں ہاتھ میں لیا اور پوری قوت سے میرے بائیں پہلو میں ٹھونپ دیا ہاں میرے بائیں پہلو میں ٹھونپ دیا۔ کچھ سوچنے کی مصلحت نہیں تھی کہ یہ کیا ہوا ہے۔ صرف درد محسوس کرنے کی مصلحت تھی اور وہ میں کر رہا تھا۔ پہلوں کے نیچے انگارہ سا اتر گیا تھا۔ میرے قاتل نے ایک جھٹکے سے یہ سرا باہر نکالا اور دوسری مرتبہ میرے پیٹ میں ٹھونپا۔ میں جان کنی کے عالم میں ہی طرح تڑپا اور نجانے کس طرح میرے ہونٹوں پر سے اس آہنی ہاتھ کی گرفت ختم ہو گئی "بچاؤ۔ بچاؤ" میں سینے کی پوری قوت سے چلا ہا۔ یہ آواز ایک دھماکے سے شب کے سکوت کو چٹکا چور کر گئی۔ میں نے بیرک کے فرش سے کئی سر اٹھاتے ہوئے دیکھے۔ بیرک سے باہر راہداری میں بھاگتے قدموں کی صدا آئی۔ آہ۔ ایک کھرا م سناج گیا۔ مددگار ہاتھ میری طرف لپکے۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا کہ سب سے پہلے مجھے تک پہنچنے

علیم الحق حق کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی اسے بلاتے بے درمیان کے کہانی جس کا نام عالمی دہشتہ کے علامت ہے۔

انہیں بھگتے ہوئے کے داستانہ جو اپنے ہاتھوں دنیائیں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں



قیمت : ۸۰ روپے

اپنے ہا کر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمیں

برام راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں سبلی کیشنر
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور
فون: ۲۲۲۸۵۳

سٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میوہینتال لاہور
فون: ۲۲۲۸۵۳

میں آپریشن جیٹری سولت موجود تھی۔ میرا آپریشن اسی اسپتال میں کیا گیا تھا۔ مجھ کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کون ہوں اور یہاں کیوں لایا گیا ہوں۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ پچھلے پچھلے بھگت دے رات جاگیردار کا قادر زبان کا لازم خاص فلک شیر بھیجے جاگیر میں لے کر آیا تھا۔ اس کے ساتھ میں بندے اور بھی تھے انہوں نے مجھے ایک دھن سے اتار کر سیدھا اسپتال پہنچا دیا تھا۔ میں اس وقت بے ہوش تھا۔ مجھ کو ذاتی خیال تھا کہ میں جاگیردار کی کاٹنی کا زندہ ہوں جو کسی پھندے میں زخمی ہو گیا ہے۔ میں نے اس حوالے کے دوسرے باسیوں کے بارے میں جاننے کی بہت کوشش کی لیکن مجھ کو اس بات پر آمادہ نہیں تھی۔ وہ بہت محتاط اور چوکس لڑکی تھی۔ حوالے کے بارے میں اس نے صرف اتنا بتایا کہ میں اس وقت حوالے کے مسمان خانے میں ہوں۔ حوالے کی اصل عمارت یہاں سے کوئی سو گز دور ہے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے کو کھٹکتا رہا۔ کھڑکیوں کے رنگین شیشوں پر صبح اور شام باری باری آکر دستک دیتے رہے۔ میرے زخموں کا مستقل علاج ہو رہا تھا اور خوراک بھی مناسب تھی۔ میں تیزی سے سخت پانی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ”جو“ ٹھیکہ ڈاکٹر رحمان اور گیت پر کھڑے ایک دراز زہد پیردار کے علاوہ مجھے کوئی پانچواں شخص وہاں نظر نہیں آیا۔ جس گیت کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ مجھے کرنے کی کھڑکی سے نظر آتا تھا اور اس کے بارے میں مجھ کو بتایا تھا کہ یہ حوالے کے مسمان خانے کا گیت ہے۔ بعض اوقات تو مسمان خانے کے دروازے پر ایسا گھبراہٹا چھا جاتا تھا کہ شبہ ہو تا تھا میرے علاوہ کوئی موجود ہی نہیں۔ ہر روز میں سوچتا تھا کہ شاید آج قادر زبان صاحب میری مزاج چوسنے کے لئے تشریف لائیں اور یکسانیت کے اس عذاب سے نجات کی کوئی راہ نکلے مگر یہ امید بندھ آئی۔ پہلے دن کی ملاقات کے بعد وہ جیسے مجھے بھول ہی گئے تھے۔ مجھے اس کربے میں اب چودہ دن ہو گئے تھے اور ہر لمحہ ٹھنڈی بھتیجی جاری تھی۔ اگر مجھ کی صورت میں تازہ ہوا کے جھوکوں کی آمدورفت نہ ہوتی تو شاید میرا دم گھٹ جاتا۔ میرے ذہن میں سوالوں کا ایک انبار لگ چکا تھا اور بے خبری بوجھ بن کر میرا نینو دا رہی تھی۔

آغا قادر زبان کون تھے؟ میں اس تک کیسے پہنچا؟ جیل کی ایمرٹنس پر حملہ کرنے والے کون تھے؟ اس تصادم کا کیا نتیجہ نکلا؟ اس حوالے میں میری حیثیت کیا ہے؟ قانونی لحاظ سے میری پوزیشن کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے ہر سوال مجھ کو بے حد پریشان کر رہا تھا۔ جیسا ہوا تھا۔ جیل میں پیش آنے والے واقعات کا مسئلہ بھی ذہن کو الجھائے رکھتا تھا۔ گہم غلط لکھنے والا کون تھا؟ اور وہ کون لوگ تھے جو مجھے مارنا چاہتے تھے؟ کیا وہ لوگ اب بھی میری تلاش میں تھے؟ اور کہیں میں اس وقت۔۔۔ ان ہی کے زرنے میں تو نہیں؟ یہ آخری سوال سب سے بڑھ کر پریشان کن اور تکلیف دہ تھا۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس پکار پکار کر ایک اعلان کر رہی تھی۔ یہ اعلان میرے لئے کسی ذراؤں کے خواب سے کم نہیں تھا۔ کوئی میرے اندر سے کہہ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ وہ ماضی سے میں دفعتاً چکا ہوں۔ جسے میں اس کی تمام بنگامہ آرائیوں اور خوشگنائیوں سمیت ”دفن“ کر چکا ہوں۔ تمام حسرتوں، تکیوں، مسرتوں، شامیادوں، کامرائیوں اور شکستوں سمیت گاڑ چکا ہوں۔ پھر زندہ ہونے والا ہے۔ وہ تمام دزد و شب و تمام شرمندہ، تمام ہمتیاں اور تمام لوگ، تمام حادثے اور تمام معرکے پھر عدم سے وجود میں آنے والے ہیں۔ وہ سب کچھ ہونے والا ہے جو ہوتا رہا ہے۔ کوئی تاہم ہاتھ پھر میری رگ و جاں میں حالات کے تھیر پونے والا ہے۔ کوئی نامہاں ساعت پھر مجھے صدیوں کے گرداب میں جھینکنے والی ہے۔

جب ایسے خیال ذہن پر یورش کرتے تو میں کاپ احتیاج میری آنکھوں میں تین برس کا ستر معلوم جانا جب میری بہن میری زندگی کا حاصل شستا آخری بار مجھے شیش کورٹ میں ملی تھی۔ اس روز مجھے کوٹ کھیت جیل سے ایک پیشی کے سلسلے میں لایا گیا تھا۔ میں نے جیل کے ایک مقدم کو گھونٹ مار کر اس کے دو دانت توڑ دیے تھے۔ مقدم طویل قید کاٹنے کے والا قیدی ہوتا ہے۔ اسے ایک دروی دی جاتی ہے اور کچھ مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ اس مقدم نے ایک نو عمر قیدی پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ شقت کے دوران اسے بری طرح مارا تھا اور رشوت طلب کرتا تھا۔ قیدی دست قیدی کو لو اٹھیں۔ جو کچھ ملتا مقدم کو دے دیتا پھر بھی اس کی جان نہیں چھوٹی تھی۔ ایک روز میں نے اس مقدم کو قیدی سے نہایت گندی زبان استعمال کرتے سنا۔ میرے مہر کا پتہ چٹک گیا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑا تو بات بڑھ گئی۔ میرے ایک زور وار گھنے نے اس کے دو دانت توڑ دیے۔ مقدم کے ایک قید آور ساتھی نے مجھے عقب سے دبوچا جا پاؤ میں نے گھوم کر اس کی گردن پکڑ لی۔ پیرداروں نے مجھے چاروں طرف سے دبوچ لیا۔ مجھ پر مار پانی کا کس بٹا اور عدالتی کارروائی کے بعد میری قید میں ایک سال کا اضافہ کر دیا گیا یعنی ایک برس کاٹنے کے باوجود میری قید بارہ برس

ہی رہی۔ اس روز عدالت میں شستا نے سیاہ برقع کی نقاب اٹھا کے بڑی حسرت سے میرا چہرہ دیکھا تھا اور کہا تھا۔ ”آپ کو کیا معلوم ہے یہ سال کیسے گھا تھا؟“

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شستا کا غور میرے دل میں زراہ ہو گیا تھا۔ بعض فقرے ایسے ہی کاپاٹ اور بعض ساتھی ایسی ہی انقلاب آفریں ہوتی ہیں۔ میں شستا کے ان لفظوں میں بھری ہوئی مایوسی اور دل گرفتگی کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں سر ہاپا پیسے میں نما گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کیا کہ اب میں پہلے والا شاہ جہاں نہیں رہوں گا۔ میں وہ شاہ جہاں بنوں گا جس کے شستا نے خواب دیکھے ہیں۔ جس کی جاہت میں وہ ایک مدت سے کانٹوں پر لوٹ رہی تھی۔ جسے سزائے موت سے بچانے کے لئے اس نے اپنی ان موت تاحیں مصطفیٰ پر بندھ کر کاٹ دی ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا میں شستا کی توقعات پر پورا اتروں گا۔ یہ قید و بند میں نے اسی کے لئے تو قیل کی تھی ورنہ کوئی مالی کا لال تھا جو مجھے ان سلاخوں کے پیچھے پہنچا یا کسی کو اتنی توفیق تھی۔ جو کام ہوئے بڑے ش زور نہ کر سکے وہ اس نازک لڑکی نے کیا تھا۔ اب اسی شستا کی روٹی ہوئی آنکھیں مجھے مجبور کر رہی تھیں کہ میں قید کے یہ بارہ سال سر جھکا کر اور انکارہ دل بجا کر کاٹ دوں۔ اپنے منہ زور جہیزوں کو اپنے اندر دفن کر دوں اور کوئی ایسا کام نہ کروں جس کے بعد پھر میری شستا کو کیڈنڈر کی طرف دیکھ کر اٹک بڑھتا رہے۔ اس روز میں نے شستا سے کہہ دیا تھا کہ اب وہ بھی مجھ سے ملنے نہ آئے اور میرے بچے کچھ خیر خواہوں کو بھی بتا دے کہ وہ مجھ سے ملاقات کی زحمت نہ کریں۔ اب میں اپنے چاروں کو اپنی شکل اسی وقت دکھائوں گا جب بارہ سال باشت کی بے ہماری شغوری میرے سر سے اتر چکی ہوگی۔

اس روز میں نے خود سے جو عہد کیا تھا اس پر اب تک حرف بہ حرف عمل کیا تھا۔ میں نے خود کو مکمل طور پر بدل لیا تھا۔ جیل کے خود سر، جتھ جتھ اور اکڑ کینوں کے درمیان رہ کر ایسا کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کمر میں نے کیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ جب میں جیل سے نکلوں تو اندر باہر سے میری مکمل معافی ہو چکی ہو لیکن۔ لیکن اب اپنی سماعت میں یہ پر اسرار صدا نہیں کا اعلان کر رہی تھیں۔ مجھے اپنی لہر ماضی کی ٹپ ٹپ میں جنش کیوں محسوس ہو رہی تھی۔ یہ قیامت سے پہلے کون زندہ ہونے والا تھا؟

ایک ایک مجھے اپنے خیالوں سے چھٹکارا۔ مجھ کو موٹی سائیں کی سرخ پھولدار ریشم اور سفید شلوار پہنے خوب صورت چال

چلتی اندر آگئی۔ اس کا جسم ہر حرکت کی ساتھ شاعری کرتا محسوس ہوتا تھا۔ اس شاعری سے صرف نظر کرتے ہوئے میں نے نگاہیں اس کے ہاتھوں پر جمادیں۔ ان میں ٹرے تھی اور ٹرے میں دوپٹہ کا کٹنا۔ مرغ مسلیم کی انھی ہوئی ٹانگ دوری سے نظر آ رہی تھی۔ گرم گرم تندوری دویاں سلاہ کے ہرے ہرے پتے، نماز کی سرخی اور ہاز کے چھلے زیادہ دلفریب تھا۔ سوٹ ڈش کا تھا۔ آج وہ ظالم فرنی لئے آ رہی تھی اور فرنی بھی وہ جس پر پتہ تھا۔ میں نے رال ٹھٹک کر گاؤں کیسے کا سارا لیا۔ وہ قریب چلی آئی۔ سب سے دلفریب تھا وہ ہوتا تھا جب وہ جھک کر ٹرے میرے سامنے رکھتی۔ لحاف پر رکھتی تھی۔ میری نظر دسترخوان سے اٹھتی تھی تو گریبان میں جا ابھرتی تھی اور پھر دامن بائیں کھینچ کر لگتی تھی۔ ایسے میں ایک آدھ گرم گرم قہو بھی ہو جاتا تھا۔ لیکن آج تو نظر کا راستہ مسدود تھا۔ اس نے سرخ دودھ بڑی دور اندیشی سے اٹھو رکھا تھا۔ تب میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی اور اندازہ ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ ویسے بھی وہ اس وقت کوئی آدھ پیریدہ کھائی دی تھی۔ ناشتا اور رات کا کھانا نرس ٹھیکہ نے مجھ تک پہنچایا تھا۔

”کیا بات ہے سو بیٹا؟“ میں نے بڑی اگاڑ سے کہا۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے بند کی تخت اپنا رکھا تھا۔ اس کی ٹپکیں تھراہیں اور کھانا رکھ کر جلدی سے سیدھی ہو گئی۔ ”کسی سے کوئی مارا ماری ہو گئی؟“ میں نے پوچھا۔ وہ پھر بھی خاموش رہی۔ میں نے لپک کر اس کا ہاتھ تمام لیا۔ ”کیا بات ہے؟“ میں نے ذرا بلند آواز میں پوچھا۔ وہ وحشی بہن کی طرح دامن بائیں دیکھنے لگی پھر بولی۔ ”چھوڑیں مسیب جی کوئی دیکھ لے گا۔“

”تو پھر بتاؤ کیا بات ہے؟“ ”چھاتی۔۔۔ میں۔۔۔ رات کو آؤں گی۔ جب باجی ٹھیکہ سو جائے گی۔“ اس کا اشارہ نرس کی طرف تھا۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا وہ جلدی جلدی کر کے کیچڑیں درست کرنے کے بعد باہر چلی گئی۔

معلوم نہیں کیا بات تھی جو وہ چھاتی پر بھیجی ہوئی دیا سلائی نظر آ رہی تھی۔ رات کا کھانا دیتے ہوئے مجھے وہ بالکل لئے دیے رہی۔ رات نو بجے کی بعد میں دیر تک انتظار کرنا رہا۔ مگر اس نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ اگلے روز بھی سارا دن یہ جدائی برقرار رہی۔ شام کو میں نے نرس ٹھیکہ سے پوچھا تو

اس نے کہا کہ اسے نزل بخار ہو گیا تھا ابھی آئی ہے۔
میں نے کہا۔ ”ذرا سنبھلو تو یہ نیچے کا غلاف اتار ملتا
ہو رہا ہے۔ اسے ہی بدل ڈالے۔“
نرس نے ”جھا“ کا اور باہر نکل گئی۔
کوئی دس منٹ بعد وہ شعلہ بدن، فحشہ بدن سیاہے وار
چال چلتی اندر آئی۔
”جی میس بی۔“

”نیک لی لی، ذرا پاس آ۔۔۔ اجنبی دور کھڑی ہے، میں
کہا جاؤں گا؟“ اس نے ہونٹوں کو عجیب انداز میں جیش دی
اور قریب آئی۔ میں نے کہا ”میرے کھنوں اکچہ تو تباؤ۔ یہ
معاہدہ کیا ہے۔ کیوں تو تھا جو بایا ہوا ہے؟“
”بس جی تو تھا یہ ایسا ہے۔“
”معاہدہ کیا ہے بتائے گی نہیں؟“

وہ خاموش کھڑی رہی۔ اچانک قدرت نے میری مدد
کی۔ جی چلی گئی۔ گپ اندر چرا چھایا۔ میں نے جھٹ کر
اسے پکڑا اور سامنے رشتائی پر رکھ لیا۔ ”ہائے میں مر گئی“ وہ
تربی اور خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے دونوں
بازوؤں سے اسے پکڑ لیا۔ اس کے دلکش گداز جسم کا سارا
بوجھ میری ہاتھوں پر تھا۔

”ہاں بلک ہوئی ایسا بے گئی نہیں کیا بات ہے؟“
”خدا اس کے لئے چھوڑ دیں۔ بیٹی شکلیہ آپاٹے گی۔“
اتنے میں بچ بچ نرس کی آواز آئی۔ ”بجود کھو ذرا۔
نیکل کے نیچے لائین رخمی ہوئی۔ وہ جلاوڑ۔“
نوجہ پھٹی پھٹی آواز میں بولی۔ ”اچھا بانی۔ میں ڈھونڈ
رہی ہوں۔ ابھی جاتی ہوں۔“

آواز دبا کر وہ پھر مجھ سے فریاد کرنے لگی کہ میں اسے
چھوڑ دوں۔ کوئی دیکھ لے گا میں نے کہا ”ایک ہی شرط ہے۔
مجھے بتاؤ کہ چپ شاہ کا روزہ کیوں رکھا ہوا ہے؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر اچانک اس نے ہاتھ پاؤں
ڈھیلے چھوڑ دیے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ یکدم بے حد سنجیدہ
ہو گئی ہے۔ میں نے بھی اس کے جسم سے اپنی گرفت ختم
کر دی۔ وہ آہستہ سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ مجھے اس کے
تأثرات نظر نہیں آ رہے تھے مگر لگتا تھا وہ مجھ پر کوئی اہم
انکشاف کرنے والی ہے۔

”ہاں۔ کوئی کیا بات ہے؟“
اس کی سسکی سسکی عجیب سی آواز آئی۔ ”میسب جی،
میسب جی۔ آپ یہاں سے ملیں جائیں۔ آپ کی زندگی کو
خطرہ ہے۔“

میرا جسم سستا کر دیا گیا۔ ”کیا خطرہ کون ہے دشمن
میرا؟“

اس نے اپنی سرو انگلیاں میرے ہونٹوں پر رکھ دیں۔
”آہستہ بولیں جی۔ یہ دیواریں بڑی چٹل خور ہیں۔ آپ
اس سڑن جو کی حویلی کو نہیں جانتے نہ ہی میں آپ کو کچھ بتا
سکتی ہوں۔ بس آپ کو جان پاری ہے تو۔۔۔“ اس کا کھلا
گوندہ گمیا وہ جلدی سے اٹھ کر جانے لگی تو پھر میں نے اس کا
ہاتھ تھام لیا۔ اتنے میں نرس شکلیہ کی آواز آئی۔

”نچو لائین نہیں لی؟“
”نہیں جی۔“ مجھے گھبراہٹ میں کہا۔
”اچھا رہنے دے۔ کوئی سوم جی ڈھونڈ لے۔ جزیئر
خراب ہو گیا ہے۔ دو گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گی جی۔ میں
ذرا ڈاکٹر رحمان کی طرف جا رہی ہوں۔“

میں نے سکھ کا سانس لیا۔ نرس کے بعد اب مجھ کو
پاس اٹھ جانے کا کوئی ہمانہ نہیں تھا۔ میں نے اسے گھیر کر
اپنے پاس بٹھایا اور اس خطرے کی نوعیت جاننے کی کوشش
کرنے لگا جس سے وہ مجھے آگاہ کر رہی تھی۔

یہ ایک طویل کوشش ثابت ہوئی۔ آخر میں مجھ کو پھر
کو سوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ گہری تاریکی میں پٹنگ
کے بازو پر بیٹھی تھی۔ اس نے کھوئے ہوئے افرادہ مجھے میں
کہا۔

”میسب جی، مجھے بتائیں۔ کوئی جمود کتنا بھی زور آور ہو
کتنا بھی دڑے دل کا ہو۔ ہو آؤ بندہ ہی ہے نا۔ اسے شکاری
گھوڑوں کے آگے جنگی سڑکی طرح بھگایا جائے تو وہ کہاں
تک بھاگ سکتا ہے کہاں تک چھب سکتا ہے۔“

میں نے پوچھا ”کس نے بھگایا تھا اسے؟ کس نے بھگایا
تھا؟“

وہ بولی ”میرے ماں جائے کو۔ میرے بھائی دلایت علی کو۔
جاگیرداروں نے بھگایا تھا اور وہ پہلا بندہ تو ذرا ہی تھا اور نہ
ہی آخری تھا۔ یہاں تو پتا نہیں کب سے ایسا ہو رہا ہے اور
ہوتا رہے گا۔“

”کیا کیا تھا تیرے بھائی نے؟“ مجھ پر حیرانی غالب آئی
جاری تھی۔

”کچھ کرنا ضروری تو نہیں ہوتا نہ۔ میرے دیر نے بھی
کچھ نہیں کیا تھا۔ اس نے پہلے میں کبڑی کھیلنے ہوئے
جاگیردار کے بیٹے سے خود کو چھڑا لیا تھا۔ میسب جی اس میں
دلایت کا کیا قصور تھا۔ اس نے قیدار بخت کو کبڑی کھیلنے پر
مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ تو کھینڈ تھی اور کھینڈ میں سب کچھ ہوتا

ہے۔ اس دن سے پیدا و بخت نے میرے دیر کو اپنا دشمن سمجھ
لیا۔ آخر ایک دن اس پر الزام لگ گیا کہ اس نے ماسٹر
رید کی کڑی کو کھیتوں میں خراب کیا ہے۔ جاگیرداروں
نے اسے پکڑ لیا۔ اسے نیلے کی سزا ہوئی۔ نیلے کی سزا کا
آپ کو نہیں پتا میسب جی، بوجھ سبک اٹھی۔ دس بارہ سیکنڈ
چپ رہ کر بولی ”جاگیرداروں نے مجھے پانی پلا پلا کر مارا ہوتا
ہے اسے نیلے کی سزا دیتے ہیں۔ اس پر نصیب کو نیلے کے
نکسے درختوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور جاگیردار اپنے بندوں
کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہو کر اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ شام
سے پہلے پہلے اگر وہ اسے مار لیں تو ٹھیک ہے۔ نہیں تو سمجھا
جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا ہے۔“
میں بے پناہ حیرت سے یہ دو داستان رہا تھا ”تو کیا۔
تیرا بھائی۔۔۔؟“

”جی میسب جی، اوہ مارا گیا۔ اسے مرنا ہی تھا۔ ہمیں پتا
ہے اللہ بھی ان کو معاف کرتا ہے جنہیں جاگیردار معاف
کر دیتے ہیں۔ یہ تو صرف ایک چال ہے لوگوں کو دھوکا دینے
کی۔ جاگیرداروں کی مرضی کی بغیر اس پہلے سے کوئی نہیں بچ
سکتا۔ اگر کوئی بچ سکتا تو میرا دیر ضرور بچتا۔ وہ شہر تھا صاحب
جی۔ دو تھو چوڑی چھاتی اس کی اچال بادامی آنکھوں والا۔
بڑا چمولا تھا وہ۔ کبڑی کھیلتا تھا تو نظری نہیں لگتی تھی اس پر۔
اغاراں سال کا تھا۔ انیسواں ابھی چھٹا نہیں تھا۔“
ایک بار پھر مجھ کی آواز رندہ گئی اور وہ اس جوان مرگ کی یاد
میں آنسو بہانے لگی۔

میں نے کہا۔ ”کیا یہاں کے لوگ اس بات پر احتجاج
نہیں کرتے؟“

”احتجاج۔ یہ کیا ہوتا ہے میسب جی؟“
مجھ نے میرے سوال کا بڑا مفصل جواب دیا تھا۔ میں
کت کر رہ گیا۔ ”احتجاج کیا ہوتا ہے؟“ دنیا کے اکثر مظلوموں کو
معلوم ہی نہیں ہوتا کہ احتجاج کیا ہوتا ہے۔
اچانک مجھ پر ایک سنسنی خیز انکشاف ہوا۔ میں نے
پوچھا ”جو تو۔۔۔ تو ان باتوں سے۔۔۔ مجھے کیا بتانا چاہتی
ہے؟“

نچو اندھیرے میں عجیب انداز سے میری جانب دیکھتی
رہی پھر اس کے ہونٹوں سے التجا بھری صدا نکلی ”میسب جی
نہ کہاں سے چلے جاؤ۔“
اس کے الفاظ بہت کچھ سمجھا رہے تھے مجھے میں نے
دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”نچو! کہیں تیرا
مطلب یہ تو نہیں کہ مجھے بھی ان حالات سے واسطہ پڑنے والا

ہے۔“

ایک ایک اس نے میرا بازو تھام لیا اور سر ہٹا کر سسکے
لگی۔ اچانک جی آگئی کرے کی آؤ جی رات چٹکی دوپہر میں
بدل گئی۔ کرنٹ جیسے بلب کے ساتھ ہی میرے جسم میں بھی
آگیا تھا۔ نچو پک کر مجھ سے جدا ہوئی اور لائین کو الماری
میں خسر ہو کر گئی ہوئی دوسرے کمرے میں غائب ہو گئی۔

نچو نے جو کچھ بتایا تھا وہ شامل ہونے کے باوجود مکمل
تھا۔ کچھ کڑیاں گشترہ ضرور تھیں مگر اس سے صورت حال کی
ایک دھندلی سی تصویر میری آنکھوں کے سامنے بن گئی تھی۔
اب اس بات میں شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ میں واقعی
اپنے دشمنوں میں ہوں۔ میری جو دیکھ بھال اور خاطر داریاں
ہوری ہیں وہ واقعی ہیں اور غریب مجھے کسی سخت امتحان میں
ڈالا جائے والا ہے۔ مجھ نے پہلے کی بات کی تھی اور کہا تھا کہ
جاگیردار اپنے مستحب کو گھنے کے درختوں میں چھوڑ کر اس
کے پیچھے گھوڑے لگا دیتے ہیں۔ یہ بات میرے حلق سے کچھ
نیچے نہیں اترتی تھی۔ شاید وہ کوئی سنائی بات کر رہی تھی۔
یہ بھی ممکن تھا کہ ایک آدھ بار کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا ہو
ہیے بڑھا چڑھا کر داستان بنایا گیا ہو۔ بہر حال یہ بات طے
تھی کہ میں اچھے لوگوں میں نہیں ہوں اور مجھے مستقبل میں
ان سے اچھائی کی توقع بھی نہیں کرنی چاہئے۔ غالباً میں ان
کے لئے بہت زیادہ اہم بھی نہیں تھا۔ ورنہ اتنے دنوں میں
کوئی تو میری خبر لیتا۔ مجھے صرف دو عورتوں اور دو مردوں پر
چھوڑ دیا گیا تھا۔

سوچتے سوچتے میری نگاہ کھڑکی کے باہر چلی گئی۔ میں دیکھ
کر حیران ہوا کہ آج پہلی بار گیت پر دروازہ قد سپرد نظر نہیں
آ رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید کہیں پشاپ وغیرہ کرنے گیا ہو گا
لیکن آدھ گھنٹا گزرنے کے باوجود وہ کھائی نہ دیا تو مجھے اندازہ
ہوا کہ وہ آس پاس موجود نہیں۔ میرے ذہن میں ایک خیال
جلی کی طرح گوندا۔ کیوں نہ اس سنہری سورج سے فائدہ
اٹھانے کی کوشش کی جائے میرا تجربہ ہے کہ بعض اوقات
طویل منصوبہ بندی کی بجائے آٹا فانا عمل کر گزرنے سے فیر
مترج کا سامنا حاصل ہوتی ہے۔ ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے مجھے
نچو نے یہاں سے فرار ہونے کی ترغیب دی تھی۔ فی الحال میں
ان لوگوں کی نظر میں ڈھکی چھپی تھا اور وہ میری طرف سے زیادہ
خطرہ محسوس نہیں کرتے تھے۔ میں ممکن تھا کہ آگے چل کر
میری گھرائی کے انکشافات مزید سخت ہو جائے۔ میں دو روز
سے جیکے جیکے کمرے میں چل پھر کر دیکھ رہا تھا اور مجھے کافی
افادہ محسوس ہوا تھا۔ کم از کم میں ایک دو آدمیوں سے تو بہت

سکتا ہی تھا۔ اتنا فانیں ایک اہم فیصلہ پر پہنچ گیا۔ میں نے بستر چھوڑ کر چل پھری۔ پھل کاتنے والی ایک دندانی دار چھری تاجی پر رکھی تھی میں نے وہاں میں پیٹ کر لیٹنے کے نیچے چھپا لیا۔ اب میرے پیٹ کی پٹی اتار چکی تھی صرف گردن پر لدی کا ایک پتہ نہیں سے چپکا ہوا تھا۔ کمرے کی جی بجھا کر میں نے اندر ہی دو تین چکر لگائے اور انگوں کو چالو کیا۔ پھر کبل اور ڈھارا اور لٹھ کا نام لے کر یہ آہنگی دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی میری نگاہ ایک چھوٹے سے کمرے میں پڑی۔ یہاں سرخیں دو اینٹیاں تھیں تو بیلے وغیرہ رکھے تھے ایک بنگ بھی ملا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ نرس کا کمرہ ہے۔ نرس ڈاکٹر رحمان کی طرف مئی ہوئی تھی۔ یہ بھی اچھا ہوا تھا۔ میں کمرہ پار کر کے ایک جالی دار دروازے تک آیا اور اسے بے آواز کھول کر باہر گیا۔ غالباً پندرہ بیس روز بعد میں کھلی فضا میں پہنچا تھا۔ ہوا میں بے حد خشکی تھی۔ تاروں سے ڈھکا ہوا آسمان تار ہوا تھا کہ یہ ایک خالص دیسی علاقہ ہے۔ میں چل کی آواز دیتا ایک دیوار کے سائے سائے کھڑی کے چھانک کی طرف بڑھا۔ چھانک کے قریب پہنچ کر میں نے انداز بدلا اور بڑے عام طریقے سے تیز تیز چلا ہوا باہر آیا۔ کبل میں نے سر کے اوپر سے اوڑھ رکھا تھا اور بادی الفکر میں مجھے پہچانا ممکن نہیں تھا۔ جو کے بیان کے عین مطابق مجھے کوئی سوز کے قاصد پر حویلی کی اندرونی عمارت نظر آئی۔ ٹیوب لائٹوں کی روشنی میں اس کا ایک حصہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ حویلی جدید قدیم کا امتزاج تھی۔ اس کی وسعت کا اندازہ "م از کم یہاں سے کرنا ممکن نہیں تھا۔ پیشانی پر وہی معروف الفاظ لکھے تھے صد افسن فصل روتی۔ کاش کوئی ان الفاظ کا مطلب بھی سمجھ سکتا۔ میرے قدموں کے نیچے ایک کپڑا اسٹ تھا جس پر اینٹوں کی سرخ گیری تھی ہوئی تھی۔ راستے کے کنارے پھولدار پودوں کی کیاریاں تھیں۔ بائیں جانب کوئی چپاس مڑ کر دیوری پر ایک بہت بڑا آہنگی گیت نظر آ رہا تھا۔ غالباً یہ وہی حویلی کا بیرونی گیت تھا۔ اس گیت کی جانب جانا حافط تھی۔ تاہم مجھے گیت کی موجودگی سے اندازہ ہوا کہ حویلی کی بیرونی دیوار کس طرف اور کتنے قاصد پر ہوگی۔ میں نے رخ پھیرا اور درختوں کے سائے سائے حویلی سے ہونے لگا۔ جلد ہی دیوار کے آثار نظر آئے۔ دیوار زیادہ بلند نہیں تھی۔ یہی کوئی آٹھ فٹ اونچی ہوگی۔ کوئی آدمی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ میں یوں یہ آسانی یہاں سے فرار ہو سکتا ہوں۔ بہر حال آگے تو بڑھنا ہی تھا۔ چتر گور نزدیک ہوا تو حوصلوں پر اوس سی پڑ گئی۔ دیوار کے اوپر

خادار تاروں کی دھنچ چوڑی باؤ نظر آ رہی تھی۔ میں ممکن تھا کہ اس میں گرٹ بھی ہو۔ ابھی میں اس صورتحال پر غور ہی کر رہا تھا کہ نزدیک سے کوئی چڑا چل کر تیری طرح میری طرف آئی۔ بچ نکلنے کا موقع نہیں تھا۔ میرے سینے پر زور دار دھکا لگا اور میں لڑھکا ہوا ایک درخت سے جا بٹھا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ کسی خنوار کتنے سے فوج پر چلانگ لگائی ہے لیکن یہ سوچ دیرا ثابت نہیں ہوئی۔ جوئے میری گردن کی پٹ کی تھی وہ کتنے سے کہیں سخت جان اور زور آور تھی۔ اس کی گرفت میں میری ذمہ گردن ہیں کر رہی تھی۔ پھر جو آواز اس آفت کے ملنے سے برآمد ہوئی تھی وہ کسی کتنے کی نہیں تھی۔ عجیب ڈراؤنی آواز تھی جیسے کسی نے تل کر چلا رہے ہوں اور تب مجھ پر آشرف ہوا کہ میں پہلی آنکھوں والے کسی وحشی ہونے کی زد میں ہوں۔ وہ نامر باداؤں بند کر کے طرح میرے کندھوں پر سوار ہو کر گردن کو اپنی سٹول انگلیوں میں جکڑ چکا تھا اور اب میرے بال کھینچ کھینچ کر کہہ رہا تھا کہ اس پیر تمہارا کیا کیا اور بھائی بند اندھیرے میں سے برآمد ہوا اور میری ٹانگ سے لٹ گیا۔ اس کے تیز نوکیلے دانت کچھا کچھ میری ران میں اتر گئے۔ بڑی قوت تھی کم بخت کے جیزوں میں تکلیف کی شدت نے میرے بدن میں ہنگامیاں بھروسہ۔ میں بخت کے تل زمین پر گرا اور دوسری ٹانگ پوری قوت سے ہونے کے پیٹ میں رسید کی۔ وہ گندک طرح اچھل کر کئی فٹ دور جا گیا۔ میرے کندھوں والا ہونا بھی کر پڑ کر میری طرح تڑپ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد ازاں پتا چلا میرے کرنے سے اس کی پشت سڑک کے کنارے سے غرائی تھی۔ یہ کنارہ نوکدار اینٹوں سے بنایا تھا۔ نیچے میں ہونے کی پردہ کی بڑی "مڑک" ہو گئی تھی۔ میرے سنبھلے سنبھلے ٹانگ پر حملہ آور ہونے والا ہونا مجھ پر آچھا میں نے ایک جھٹکے سے اسے بازوؤں پر اٹھالیا۔ ارادہ یہی تھا کہ سالے کو نوکدار اینٹوں پر دے ماروں لیکن اسی وقت دو جھگٹے ہوئے آدمی نظر آئے ان میں سے اگلے کے ہاتھ میں دیوالور صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ارادہ بدل کر بونے کو اس پر سیخ مارا۔ دیوالور والے کی کراہ بونے کی کہہ رہے تھے میں دب کر رہ گئی۔ میں ہینٹز بدل کر دوسرے شخص کو دوپٹا چاہتا تھا کہ اچانک عقب سے کوئی چار عدد افراد نے مجھے چھاپ لیا۔ ناں بس کی گندی گالیاں میرے کانوں میں گونجیں اور دیوالور کی گھنٹی برف تال گردن سے آگئی۔ ایک شخص نے ہاتھ جھرا کر میرے نیچے سے چل

لنے والی چھری کھینچ لی۔ میں نے جیسے خود سے پوچھا "ہاں ہی شاہ جہاں کچھ اور چلے گیا بس۔" گردن کی سیوں اور پٹ کی ٹراؤں سے شاہ جہاں کی ترجمانی کرتے ہوئے بیک فٹ زبان کو رس گیا "بادشاہو جان دیو۔" میں نے ہاتھ پاؤں چلے چھوڑ دیے۔ مجھے دوبارہ کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اگلے روز کوئی دس بجے تھا قار زماں کی صورت نظر آئی۔ اس وقت ڈاکٹر رحمان میری نئی اور پرانی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کرنے کے بعد لایا تھا۔ میں مسکری پر نیم دراز اپنے پیٹ کو سلا رہا تھا جب السلام و علیکم کی آواز کانوں میں گونجی۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ زماں صاحب اپنے دردی پوش ہونے باؤی گاڑ کے ساتھ دو روئے تھے۔ حسب سابق بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ "کو جوان کیا حال ہے؟" انہوں نے ملائم لہجے میں پوچھا۔ رات والے واقعے کا کوئی اثر ان کے چہرے پر نظر نہیں آتا تھا۔ "ٹھیک ہوں جناب" میں نے اٹھ کر بیٹھے ہوئے کہا۔ "مگر کا کا تو ذکر انہوں نے اپنے سرخ و سپید ہونٹوں میں لگا لگا۔ ایک ہونے نے جلدی سے آگے بڑھ کر امریکن لائسنز سے الگ دکھائی۔ وہ درواں چھوڑ کر مسکرائے "خیر انوشن کے قواعد سے فائدہ اٹھا رہے ہو۔" "میں کچھ سمجھا نہیں جناب۔" وہ سوال نظر انداز کر کے بولے "لیکن یاد رہے خیر انوشن نے فرار کا حق صرف جنگی قیدیوں کو دیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تو آپ کی نظر میں قیدی ہوں۔ اس بات کا پتا مجھے ابھی چل رہا ہے۔" "بہت خوب۔ تم قیدی ہی نہیں تھے اور فرار ہونے کی کوشش بھی کر رہے تھے؟" "میں تو صرف چل قیدی کے لئے نکلا تھا۔" "ہوں" انہوں نے ایک لمبی آواز نکالی۔ "لگتا ہے تمہیں چل قیدی کی عادت ہے۔ تو میرے ساتھ میں تمہیں "بہد شوق" میں نے بستر سے اترتے ہوئے کہا۔ زماں صاحب بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ میں ان کے پیچھے دروازے کی طرف بڑھا تو دونوں باؤی گاڑ پڑی ہوشیاری سے میرے عقب میں چلے گئے کمرے سے نکل کر ایک طویل راداری میں داخل ہوئے فرش بالکل صاف تھا اور دونوں طرف پلائی وڈ کے منش دروازے تھے۔ چلے

چلتے زماں صاحب بولے۔ "تم نے رات مجھے میرے قیدی حافط سے محروم کر دیا۔ پچھارہ بیٹھ کے لئے ناکارہ ہو گیا۔" میں سمجھ گیا کہ یہ اسی ہونے کی بات ہو رہی ہے۔ رات جس کی کمرہ چوٹ لگی تھی۔ زماں صاحب نے کہا۔ "یہ ہونے میں نے کیا سے منگوائے تھے تین چار بونیاں بھی ہیں۔ بچے دے رہی ہیں۔ دس بارہ سال میں اچھا خاصہ دست بن جائے گا۔ ویسے سارے بچے ہونے نہیں ہوتے کوئی کوئی ہوتا ہے۔" بونوں کی بات وہ یوں کر رہے تھے جیسے کسی پالتو چڑی بات کی جاتی ہے۔ راداری میں چلتے ہوئے زماں صاحب ایک دروازے کے سامنے رکے تو کھٹکے حافط نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ ہم اندر داخل ہوئے ایک قالین پوش فرش طے کر کے میں نے خود کو ایک گیلری نما کمرے میں پایا۔ اس کمرے کی آرائش سے جاگیرداروں کی امارت کا برلا اعتبار ہوتا تھا۔ سامنے دیوار پر ایک سرخ پردہ نظر آ رہا تھا۔ پردے کی بالکل سامنے تھار میں کوئی چار عدد کرسیاں رکھی تھیں۔ دائیں جانب ایک خوبصورت الماری تھی اس میں در آمدی شراب کی بوتلوں کی پوری دکان تھی ہوئی تھی۔ الماری کے نیچے ایک خانے میں کچھ بیڈ فوڈ وغیرہ پڑے تھے ایک بات کی مجھے بالکل سمجھ نہیں آئی۔ کرسیاں سرخ پردے کے بالکل قریب رکھی تھیں۔ اگر پردے کے پیچھے کوئی اسکرین وغیرہ بھی تو کرسیوں کو اتنا قریب رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ بہر حال یہ عمدہ تھوڑی دیر بعد حل ہو گیا۔ میں اور زماں صاحب کرسیوں پر بیٹھ گئے تو کھٹکے حافط ہمارے عقب میں چوکس ہو گئے۔ زماں صاحب نے اپنے مخصوص ملائم لہجے میں کہا۔ "تم فن حرب کے جادوگر ہو لیکن تمہارے پیچھے جو ڈنڈے پیر کھڑے ہیں ہر جادو کا توڑ جانتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہوں۔ جتنی دیر میں پلک جھپکتی ہے اتنی دیر میں ان کے دیوالور ہل سترے ہاتھوں میں آجاتے ہیں اور ان کا نشانہ بھی خطا نہیں جاتا۔" میرے اندر سے کوئی پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ "شاہ جہاں! تم کسی دلدل میں جھٹنے جا رہے ہو۔ یہ آقا قار زماں کوئی معمولی شخص نہیں کوئی بہت مہتمی ہے۔" اور یہ حقیقت تھی مجھے قار زماں میں کوئی منفرد رنگ نظر آتا تھا۔ میں نے اپنے چار سالہ دور آفت گری میں بڑے سورا دیکھے تھے لیکن اس شخص کی مسکراہٹ میں جو درندگی جھلکتی تھی اس کا ناپا ہی ڈھنگ تھا۔ مجھ جیسا شخص بھی اس سے بات کرتے ہوئے ایک سناہٹ سی جسم میں محسوس کرتا تھا۔ آپ نے بھی

کسی شخص کا بخار میں تپا ہوا چہرہ دیکھا ہے؟ بس ایسی ہی کیفیت ہر وقت قادر زمان کے چہرے پر طاری رہتی۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی اور ہونٹوں پر زہر خند۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور یہ اعتراف میرے لئے اور بھی خطرناک بناتا تھا۔ اس کے اشارے پر ایک نکلنے کا حفاظت نے بڑی پھرتی سے میری کمر ایک پٹی میں کس دی۔ یہ پٹی اس نے جہاز کی نشست کی طرح کرسی کے پیلو سے نکالی تھی۔ کمرے کی جتنی بجمادی تھی۔ دوسرے حفاظت نے سرخ پردے کی زوری بھی اودا اپنی آنکھوں سے کوئی دو ٹک کے فاصلے پر بیٹھے ایک شیشہ نظر آیا۔ چار ضرب آٹھ کا یہ ہلکا رنگ دار شیشہ ایک کمرے کا منظر نظروں کے سامنے لے آیا۔ یہ درمیانے سائز کا چوکور کمرہ پہلی منزل پر واقع تھا اور ٹیکری سے اس کا سامنے کا حصہ صاف نظر آتا تھا۔

پھر کمرے میں چند بلب مزید جلتے وہاں کی روشنی میں اضافہ ہو گیا۔ کمرے میں دو بیڑوں پر کوئی شیشہ پڑی تھیں جن کے بارے میں کوئی محسوس تجزیہ نہ کر سکا۔ ہمارے سامنے والے شیشے جیسا ایک اور شیشہ روشن کمرے کی دوسری جانب بھی نظر آ رہا تھا۔ شاید وہاں بھی کوئی ٹیکری تھی جس میں بیٹھ کر کمرے کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔ اچانک ہمارے نیچے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک بوڑھی عورت درجعت ہوئی اندر گئی۔ خدا کی پناہ۔ میں سر تپا کاپ گیا۔ یہ پچاس سالہ عورت کپڑوں کی قید سے آزاد تھی اور ہر کی طرح بیچ و بکار کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک ایک ٹیکس تھی جسے خوشخوار شکلوں والے چار بونے اس سے پیسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر میرے دیکھنے ہی دیکھتے وہ بوسیدہ ٹیکس پھٹ گئی اور بوڑھی عورت فرش پر گری ہو کر اپنا آپ بچانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ آہ بکا کر رہی تھی لیکن اس کی معمولی سی آواز بھی ہمارے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ غالباً وہ ہمیں دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ چار بونوں کی پیچھے چار بونے مزید داخل ہوئے۔ انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور بوڑھی عورت سے دھیانہ چہیز چھا کر کرنے لگے۔ میں نے انہیں سمجھنے لیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں یا یہ پھٹ بورے وزن کے ساتھ ہم پر آن کرے۔ خدا کی پناہ۔ کس کھانسی تھی۔ کبھی حیوانیت تھی۔ ایک ایسی ہی عورت نے جاگیردار قادر زمان کو ختم کیا تھا اور شاید اب بھی اس کی ماں تھی۔ کیا یہ لوگ ہوش و حواس سے بالکل بیگانے ہو چکے ہیں؟ اندرونی درد کرب سے میرا وجود ترنخ کر بڑا رہا

گھڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ میں نے محسوس کر دیکھا۔ دونوں؟ رو اوروں پر ہاتھ رکھتے چڑوں کی طرح ساکت کمرے سے وہ جیسے کیس بھی نہیں دیکھ رہے تھے اور ہر جگہ دیکھ رہے تھے۔ میری بد قسمت آنکھوں نے دیکھا، کمرے کے انہوں نے بڑھیا کو اب چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ا کے ہاتھوں میں باریک آہنی سوئے تھے، سگریٹ تھے ڈسپوز ایبل سرخیں تھیں، جبور تھے۔ ایک ٹھٹھے کے ہاتھ میں پینٹل کے نیچے تھے۔ وہ ان چیزوں سے بڑھیا کو بے ہتکلیف پہنچا رہے تھے۔ پتھاری کا جھروں بھرا جسم لولہو تھا وہ فرش پر پڑ رہی تھی، آٹھ ری بھی مگر ری بھی ہاتھ جو ری بھی پاؤں پڑ رہی بھی مگر وہ ابلیس زاوے اس کے گرد تاج رہے تھے۔ ہوا میں تلاپایاں کھا رہے تھے۔ جی جی چکراد نہیں نہیں کرب حال ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا وہ بڑھیا پتھاری، افریقہ کے کسی جنگل میں کسی آدم خور قبیلے کے ہتھے چڑھ کر ہو اور وہ اسے دیک میں اپالنے سے پہلے موت کا قص کر رہے ہیں۔ میں نے کن انکھوں سے جاگیردار کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی شیطانی مسرت تھی۔ ہونٹ ایک آسودہ مسکراہٹ کے زیر اثر نیچے ہوئے تھے۔ وہ بالکل نارمل انداز میں سگار کے کش لیتا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک لمبے کے لئے میرے دل میں آئی کہ سب اندیشے بھول کر اس رزبل ترین انسان پر جا بڑوں اور اس کی گردن توڑ کر اس کا قصہ پاک کر دوں۔ مگر پھر میں نے خود کو سنبھالا۔ میں مکمل طور پر تاریکی میں تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا میں جس دلدل میں ہوں یہ کتنی گہری ہے اس کی لمبائی چوڑائی کیا ہے۔ میں اس میں کتنا دھنسا ہوا ہوں اور کیوں دھنسا ہوا ہوں؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔

آغا زمان نے بالکل عام سے لہجے میں کہا "وہ دوسری جانب شیشہ دیکھ رہے ہوں۔ وہاں بھی ایسی ہی کرسیاں رکھی ہیں۔ جانتے ہو وہاں کون ہے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ مسکرایا "وہاں اس بڑھیا کا بیٹا بیٹھا ہوا ہے۔ بہت لطف اندوز ہو رہا ہوگا۔"

میرے کان سامیں سامیں کرنے لگے "بب۔ بڑھیا کا بیٹا؟"

"ہاں۔ یہ وہی پیرا رہا ہے جو رات تمہاری ڈیوٹی چھوڑ کر ماں کے پاس چلا گیا تھا اور تمہیں اکیلے چل قدمی کا موقع مل گیا تھا۔"

رات مجھے اپنے کمرے سے نکلے گا چانس ملا تھا اسے سزا دی باری تھی۔

میں نے پوچھا "یہ۔ یہ عورت؟"

جاگیردار مسکرایا "نہیں بتایا تو ہے۔ ماں ہے اس کی۔ بے خوف کستا تھا ماں بٹار ہے۔ اسے دیکھنے چلا گیا تھا۔ بٹار ملا ایسے اچھل کود کر سکتا ہے؟ بڑے دھوکے باز ہوتے ہیں بڑے۔"

جاگیردار کی باتیں میرے کانوں میں بکھلا سیسہ اندیل ہی تھیں۔ اوپر سے اس کا نرم لالہ لہجہ۔ بے حد کمرہ شخص ماہ اور انتہا وہ ہے کا سفاک بھی۔ سمان نوازی کے انداز میں بولا "اگر اندر کی آوازیں سنتا چاہو تو بیڈ فونز موجود ہیں۔"

"جی نہیں شکریہ" میں نے لہجے میں بے پناہ نفرت بیٹ کر کہا۔

اس کے ہاتھ پر بل تک نہیں آیا۔ اسی اثناء میں کمرے کے اندر بد نصیب عورت بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ وحشی لڑکا کھیل ختم ہو گیا۔ انہوں نے عورت کے بازو پکڑے اور اسے چلتے فرش پر گھٹنے ہوئے باہر لے گئے۔ آغا زمان نے پناہ گاہر لگایا۔ اس کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ ابھی کسی شخص کا تماشا بننا باقی ہے۔ اچانک بیڈ فونز دواڑے پر ٹک ہوئی۔ ایک حفاظت نے باہر سے کوئی چٹ لاکر آغا زمان کے کمرے میں تھما دی۔

چٹ پڑنے کے بعد آغا زمان نے گہری سانس لی۔ بے فکری سے بولا "چلو باہر! یہ کھیل اور حرا رہ گیا۔ ابھی اسی بڑھیا کی ہو کی انتہی بھی ہوتا تھی۔ خبر ہو رہی ہے گا یہ بے کوم، تو ہم چلتے ہیں۔ ایک ضروری کام پڑ گیا ہے مجھے۔" میں حیرت سے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ آغا زمان کے نارسے پر ایک بونے نے آگے بڑھ کر میری بیٹ کھول دی۔

پہلے کی طرح آگے پیچھے ہم کمرے سے باہر نکلے۔ ہراری کے سرے پر پہنچ کر آغا زمان کو بائیں جانب مڑنا۔ مڑنے سے پہلے وہ رک گیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوستانہ لہجے میں بولا "اس بڑھیا کی جگہ تمہاری بہن بھی کھتی ہے اس کا ہونے والا شوہر بھی ہو سکتا ہے" اور تم خود نا ہو سکتے ہو۔ میرا خیال ہے تم کافی سمجھا رہے ہو۔ اب چل کی کی کوشش نہیں کرو گے۔"

وہ مڑا اور تک تک اپری بجاتا رہا اور میں آگے بڑھ رہا۔ میں ٹھٹھے کا محفوظ کے درمیان ساکت کھڑا تھا۔ زمین

جیسے میرے قدموں کے نیچے سے نکل چکی تھی اور آسمان ٹوٹ ٹوٹ کر میرے کان سر گر رہا تھا۔ آغا زمان کے محسوس منہ سے نکلے ہوئے زہرناک الفاظ کا لے ناگ بن کر میری سماعت میں پھنکار رہے تھے۔ ان کی پھنکار صوبہ اسرائیل سے کم دہشت ناگ نہیں تھی "اس بڑھیا کی جگہ تمہاری بہن بھی ہو سکتی ہے۔ بہن بھی ہو سکتی ہے۔"

میری بہن جس کے چہرے پر فرشتوں کا نقوش تھا جو ایک نظر دیکھنے سے مٹلی ہوئی تھی۔ اس بہن کو اس سنگہ انسانیت نے ایسی خوش گالی دی تھی۔ میں نے بے پناہ درد کی کے ساتھ رو اوروں پر بڑا بڑا ہونٹوں کو دیکھا۔ اس لہجے سے بونے مجھے کچھ اور بھی بونے نظر آئے۔ ایک سماعت کی دیر تھی کہ میں ملائے نامانی کی طرح ان پر جا پڑا۔

اچانک ایک آواز نے مجھے چوکا دیا۔ یہ آواز بالکلنی سے آئی تھی۔ ایک پھلوان نما شخص جس نے ٹیکس کے نیچے تھو پانہ رکھا تھا تو راجیم جی راتھل کندھے سے لٹکائے کھڑا تھا۔ شاید اس نے میرے بدلے ہوئے اثرات دیکھے تھے۔ وہ پوری طرح چوکس نظر آ رہا تھا۔ ٹیکس لہجے میں بولا۔ "بھائی! ایدھر ادھر کی دیکھ دے۔ او۔ چلو انیاں چوئیاں ٹال اپنے کندھے سے دو جاؤ۔ چلو شاہی۔"

میں نے ایک قربانک نظر اسے قرب و جوار پر ڈالی اور ان چوٹوں یعنی ہونٹوں کے آگے آگے اپنے کمرے میں آگیا۔ میرے کمرے میں پہنچتے ہی دروازے کو مشکل کر دیا گیا۔ نرمی یا تجویج کیس نظر نہیں آ رہی تھی۔ آج واقعی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی ڈارے میں ہوں۔



رات ہوتے ہوتے مجھے شدید بخار ہو گیا۔ پتا نہیں یہ گردن کے اس زخم کا قصور تھا جو کل رات لڑائی بھڑائی میں آواز ہو گیا تھا یا پھر رنگ دار شیشے کی اوٹ سے میں نے انسانیت کی جو "عزت و کرم" دیکھی تھی اس نے خون میں آتش کھول دی تھی؟ میرا پورا جسم ٹھٹھے کا اور پھرنچ پھرنچ ہو پاچکا تھا۔ کچھ چلا گیا۔ کوئی آٹھ پہر میں ہوش و حواس سے تقریباً بیگانہ رہا۔ گاتے گاتے مجھے ڈاکٹر رحمان نرس یا نوجو کی صورت خود پر چمکی نظر آئی۔ کبھی کبھی ماتھے پر بیچوں کی ٹھٹھک بھی محسوس ہوتی۔ تھیرے روز مج کے دفت میرے بخار میں کی آئی اور میں گاؤ گاتے سے ٹک لگا کر بیٹھا۔ ڈاکٹر رحمان نے بتایا کہ اب میری حالت کافی بہتر ہے اس نے بخار کے لئے جو آہنی بائنگ دی تھیں انہوں نے زخموں پر بھی اچھا ڈاکٹر تھا اور "پیس" کینول ہوتی تھی بہر حال اس نے مجھے چار پانچ

روز مکمل آرام کا مشورہ دیا۔

اس کے بعد ڈیڑھ ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔ میرے چاروں طرف بے خبری کا اندھیرا تھا اور دیواریں مجھ سے حالات جوں کے توں تھے سوائے اس کے کہ میرے کمرے کے دونوں دروازے اب ہر وقت مقفل رہتے تھے اور جس وقت نرس نکلتی یا آنسو کمرے میں ہوتی ایک رائفل بردار کھڑکی کے قریب ملتا نظر آتا۔ یہ وہی پہلوان غما غصہ تھا جسے میں نے چند روز پہلوان لکونی میں دیکھا تھا۔ قادیان میں بھی اس دن کے بعد صورت میں دکھائی تھی شاید اس نے سمجھ لیا تھا کہ بقول شاعر

گوئے میں نفس کے مجھے آرام بہت ہے

وہ میری جیل سے ”رہائی“ کا کوئی پھیسواں چھینسواں دن تھا جب ایک روز صبح ایک جام میری خدمت میں حاضر ہو گیا۔ ساری جاموں کے برعکس وہ خاصا ماڈرن ثابت ہوا۔ اس کی زبان فینچی کی طرح اور فینچی مشین کی طرح چلتی تھی۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے کی محنت کے بعد اس نے میرے سر واڑھی اور نوچوں کے خورد و بخار جھکا دکھا کر چھانٹ کر بڑی مناسب سی شکل دے دی۔ بعد ازاں میرے منہ کے لیے کے باوجود اس نے میرے بالوں پر ایک خاص قسم کا امپورٹڈ اسپرے کیا اور ساتھ ساتھ کھینچی کر رہا۔ یہ عمل اس نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین بار دہرایا۔ مونچھیں اور ابو بھی اس اسپرے کی زد میں آئے۔ یہاں تک کہ ہاتھوں اور کلاٹوں کے بالوں پر بھی اس نے وہی اسپرے کر دیا۔ کوئی آدمہ گھنے بعد میں نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی اور جام کی کاریگری کا معترف ہوا۔ اذناں اس کے دعوے کے عین مطابق میرے تمام بالوں میں ایک خاص طرح کی چمک آگئی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں ایک ہلکا سا براؤن رنگ نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی سستے قسم کا بازار کی طرح نہیں تھا بلکہ بالوں کا حصہ بن کر بالکل نجیل ہو گیا تھا۔ میں اب ایک ہلکے سمورے بالوں والا شخص تھا جسے پختائی میں ”کلا بورا“ کہا جاتا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ چہرے پر کوئی بھی تبدیلی لائے بغیر صرف بالوں کی تراش خراش اور ان کی حرکت بدلنے سے آدمی اپنی شاہت کس حد تک بدل سکتا ہے۔

جام اپنے کام سے فارغ ہو کر گیا تو ایک گوری جینی مجھے مجھے جسم والی بیٹیس میں سالہ عورت کمرے میں آگئی۔ اس کے بال کٹے ہوئے تھے اور وہ صورت سے ہی آفت کی پرکائی لگتی تھی۔ وہ بڑی ڈراما دار پنپنی پنپنی شلوار لٹیں پہنے تھی۔ دوپٹے کی جگہ اس کے گلے میں

دور زیوں والا فنیہ جھول رہا تھا۔ یہ فنیہ اس کا مکمل تعارض تھا۔ اس نے اندر گھسنے ہی میرے خادو قسم کو کمر سے دیکھا۔ بڑی جھنجھی نظر تھی اس کی۔

”ایہ مر آؤ چوہری صاحبہ ذرا ناپ تے دیو۔ ٹیٹ پختائی لے کے میں بولی۔

میں نے کہا ”آغا صاحب کسیں میری شادی تو نہیں رہے؟“

”بڑا شوق ہے آپ کو شادی کا؟“ وہ میری چھاتی اور ناپے ہوئے بولی۔

”نہیں مجھے تو آم کھانے سے غرض ہے۔ شادی ضروری تو نہیں“ میں جان بوجھ کر خود کو دل پیچیک ظاہر تھا۔

”بڑے شرر ہو جی شئی“ وہ اندر ہی اندر گھڑک بولی۔ اس کے ہاتھ میرے بدن پر گردش کر رہے تھے۔ پانچ منٹ اس نے میرا ناپ لیا اور کولے مکان کی تعمیر باہر نکل گئی۔

اس کے بعد ڈاکٹر رحمان آیا۔ اس نے میری بدنیت دیکھ کر تعریفی انداز میں سہلایا۔ حال احوال پوچھ کر بعد کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی ڈیا کٹائی اس نے دیکھا۔ ”ٹاکا ڈیا میں آئی لیئر تھے ڈاکٹر رحمان نے کہ یہ تمہارے بالوں سے بچ کریں گے بالکل مع فرہر ہے۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ لگائے کا طریقہ تو یہی ہو گا۔“

میں نے ڈیا لے کر غور سے دیکھا۔ سستے سے آتے تھے بلکہ مجھے تو استعمال شدہ محسوس ہوتے تھے۔ میرے دھندلے پہلے بھی یہ تجربہ کر چکا تھا۔ بے پناہ خارش ہوئی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ میں نے ڈاکٹر رحمان معذرت کئی کہ میں یہ نہیں لگاؤں گا اور مجھے کوئی نہ بھی نہیں ہے۔

ڈاکٹر رحمان بولا۔ ”ضرورت ہونے یا نہ ہونے جاگیر دار جی کو ہے اور یہ ان کی ہدایت ہے۔“ میں نے کیٹیلے لے لیے میں کہا ”میں کسی کی ہدایت نہیں ہوں اور آپ لوگ یہ کیا کر رہے ہیں؟ کیا چاہا آخر مجھ سے؟“

ڈاکٹر رحمان نے میرا سوال مکمل طور پر نظر انداز کیا۔ ”چھ! میں ڈیا یہاں رکھ دیتا ہوں۔ تم اس بار سے صاحب سے بات کر لیتا۔“

ڈاکٹر رحمان کی دوا لگی کے بعد میں کمری سوچ

نہیں۔ معلوم نہیں یہ لوگ کیا چاہ رہے تھے۔ ابھی تک مجھے کچھ بھی تو بتایا نہیں گیا تھا۔ میں ایک قیدی تھا۔ چند ہفتے پہلے تک بڑی تنگ بندی تھی۔ اسے اپنی قید کاٹ رہا تھا۔ اور اب یہ میری جی خواہش تھی کہ میں جیل میں پنچوں اور میری مرا کا سلسلہ وہیں سے جڑ جائے جہاں سے ٹوٹا ہے لیکن حالات کے اشارے کچھ اور ہی نقشہ کھینچ رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا اور میرے ذہن پر دوسروں کی یلغار شدید تر ہوتی گئی۔

یہ کیفیت کوئی ایک گھنٹے بعد نجو کی آمد پر ختم ہوئی۔ وہ نام کا کٹا لائی تھی۔ جیل میں وہ کمری سوچنے کی حس کچھ زیادہ ہی تیز ہو جی تھی۔ نجو کے دروازہ کھولتے ہی مجھے اندازہ ہوا تھا کہ کھانے کی ٹرے میں کیا کیا ”شرشامانیان“ ہیں۔ بارانوں کی خوشبو تو مجھے آج کل ساتھ دالے گاؤں سے آتی تھی۔ جو سنی نجو قفل کھول کر اندر داخل ہوئی پہلوان نما خاٹریں لائے کا بائبل ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ نجو کو اپنے پاس ٹھکانے کا پورا انتظام کر چکا تھا۔ نرس چونکہ آج چھٹی پر تھی لہذا میں نے گردن کی بنی ڈھیلی کر کے پھیر دی تھی۔ میرے کتے راس نے کھانے کی ٹرے میرے رکھ دی۔

”پہلے یہ میری پٹی ٹھیک سے باندھ دو۔ پھر کھانا کھاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

اس نے ڈری ہوئی نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ پھر جھنجھی ہوئی جگہ کے بازو پر بیٹھ گئی اور پٹی کھولنے لگی۔ اس کے جوان جسم کی مخصوص دھناتی خوشبو میرے احساس کو سلگنے لگی۔ پہلوان کھڑکی پر آکر کچھ دیر گھورتا رہا پھر کچھ کے بغیر اپنی جگہ پر چلا گیا۔

میں نے بغور نجو کا چہرہ دیکھا۔ وہ اب اکثر خاموشی نظر آتی تھی۔ پہلے والی تنفس اس میں کس نہیں تھی۔ لگتا تھا اس کے مزاج کے ساتھ اس کے جسم کی جولانیاں بھی پہنے سے اٹھتی ہوئی ہیں۔ اعضاء کا ”سارے گاٹا پاتا“ تنگ اور رپا سے محروم تھا۔ میں نے اسے سر میں لانے کے لئے فوراً ہی شرارت کی مکر وہ ٹس سے سہارا نہ دیا۔ سنجیدہ ہوتے ہوئے میں نے کہا۔ ”نجو تو اتنی سستی تھی مجھے کسی پہلے ایلے کے چکر میں ڈالا جائے گا اور گھوڑوں کے آگے سوڑی طرح بھاگا جائے گا۔ یہ تو مجھے دلہا بیانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔“

وہ گھیر سنجیدگی سے بولی ”میب جی! اللہ آپ پر رحم کرے۔ مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے۔“

”کس سے؟ سوز سے یا دل سے؟“

اس نے میری بات نظر انداز کر کے کہا ”میرا خیال ہے جی۔ کہ اب جاگیر دار نے پروگرام بدل دیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”میب جی! اب آپ کو پہلے نہیں لایا جائے گا۔“

”پھر کیا کرے گا؟ اپنی گھروالیوں سے میرا تعارف کرائے گا؟“

”میب جی! وہ کھائے ہوئے بولی ”آپ سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔“

”کیسی غلطی جان جی۔“

”میب جی۔ اس دنیا میں پیار نہیں کرنا چاہئے۔ بندہ جتنا پیار کرے اتنا ہی دوتا ہے اتنا ہی بھڑکتا ہے۔ آپ نے بھی کسی سے پیار کیا ہے نا۔ آپ بھی پھنس گئے ہیں۔ گردن تک دھنس گئے ہیں۔“

”نجو کھل کر بات کر۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”میب جی! آپ کہ آپ کو اپنی بہن بڑی پیاری ہے نا۔ بڑا لالا ہے نا آپ کو اس سے۔ اسی لیے آپ کی زبان سے ایک ایسی بات نکل گئی ہے جس نے آپ کو گھیر لیا ہے“ میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ گردن سے دوٹی کا پتہ بٹاتے ہوئے بولی ”اپنی مصیبت کے ذمے دار آپ خود ہیں۔ آپ نے خود اپنا ہانڈا پھوڑا ہے۔ پچھلی جہمات آپ کو سخت بخار تھا نا۔ بخار کی حالت میں آپ پتا نہیں کیا کیا

بذیان تک رہے تھے۔ اسی حالت میں جاگیر دار جی آپ کو دیکھنے آئے تھے ان کے سامنے بھی آپ عجیب عجیب باتیں کرتے رہے۔ بے ہوشی میں کبھی جاگیر دار کو ماں بہن کی گالیاں دیتے لگتے کبھی اس کی منت ساجت کرنے لگتے اور کہتے ”میری بہن کو کچھ نہ کہنا۔ اسے کچھ نہ کہنا۔ تم جو کو گے میں کروں گا۔ کو گے تو اپنے ہاتھوں اپنا گھٹا گھٹن لوں گا۔ تمہاری ہر بات مانوں گا۔ میری شفت کو کچھ نہ کہنا۔ وہ بڑی لاڈلی ہے۔ وہ میری جان ہے۔ میری جان کو کچھ نہ کہنا“ لگتا تھا آپ کے دماغ پر کسی دانے کا اثر ہے۔ پتا نہیں آپ کیا کچھ کہتے رہے اور جاگیر دار جی خاموشی سے سنتے رہے پھر چپ چاپ باہر چلے گئے۔

میں ہفتوں کی طرح منہ کھولے نجو کو دیکھ رہا تھا۔ نجو کی سرسختی آنکھوں میں کمری تشویش تھی۔ وہ چور نظروں سے کھڑکی کو دیکھ رہی تھی۔

”میب جی! میری زبان میں اتنی طاعت نہیں کہ کچھ بتا سکوں۔ یہ حویلی بڑی ظالم ہے اور یہاں رہنے والوں کے ہاتھ

ہوئے لیے ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ پتا نہیں آپ۔ آپ سب کچھ کیسے برداشت کریں گے کاش آپ ان کے دشمن نہ ہوتے آپ کیوں ہوئے تھے ان کے دشمن؟
دل و دماغ بھانک اندیشوں کی زد میں تھا۔ سوچ کے پرندوں پر خوف کے عقاب چھوٹ رہے تھے۔ میں نے کہا "جو آجرا مطلب ہے کہ۔۔۔ قادر زماں۔ میری بہن کو۔۔۔ اس چارو پوری میں لاسکتا ہے؟"

نوجو نے میری بی بی کو آخری گرہ دی اور دو موٹے موٹے آنسو چھانکے گئے دوسری طرف پھیر لیا۔ ایک لمحے بعد اس کی ہینگی لڑتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "یہ کام ہو چکا ہے میسج جی۔ آپ کی بہن اسی جوبلی میں ہے۔" دھماکوں سے جیسے میرے کانوں کے پردے پھٹ گئے۔ رگوں میں خون اچھلا اور تندہ ریلے کی طرح ہوش و خرد کو ہمالے گیا۔ میرا جسم زلزلوں کی زد میں آیا اور ہر شے حس نس ہو گئی۔ میرے اندر سے کسی نے لٹکار کر جاگیر وار آغا زماں کو آواز دی۔ کہتے تھے پتا ہے کچھ؟ کچھ پتا ہے کچھ؟ میں لپکتا ہوا دروازے پر آیا۔ میرے سامنے کھٹے فرش والی طویل رابداری تھی۔ میں نے اپنا سانس اندر کھینچا، میرے حلق سے ایک خوفناک چٹکھار نکلی "شتتا" یہ آواز میرے اپنے لئے بھی بچپانا مشکل تھی۔ میں اندھوں کی طرح طویل رابداری میں بھانک چلا گیا۔ نجانے کس طرح میں کھلی فضا میں پہنچا۔ مسمان خانے کے ایک حصے میں بہت سی روشنیاں ہو رہی تھیں۔ درختوں کے نیچے سجے ستورے آتے، جیسے اور کاریں کڑی تھیں۔ اندر سے ہتھکڑیوں کی مدھم چھنا چھن اور طبل کی دھند دھن سنائی دے رہی تھی۔ کوئی طوائف ایک پرانے گانا لک لک کر گارہی تھی۔
"رنگ بدلتی رات بڑی رنگین ہے" ہائے بڑی سنگین ہے۔"

میں نے ایک لٹھ رک کر پیچھے دیکھا۔ ایم جی والا پہلوان موت بن کر لپکا آ رہا تھا۔ راتفل اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ کسی بھی وقت مجھ پر فائر کھول سکتا تھا۔ یہ فیضی کا لٹھ تھا۔ مجھے ایم جی سے ڈر کر رک جانا تھا یا جھپٹ کر ایک برآمدہ پھانگنا تھا اور اس دروازے میں گھس جانا تھا جہاں سے ہتھکڑیوں کی صدا آ رہی تھی۔ میرے ذہن نے آگے بڑھنے کے حق میں فیصلہ دیا۔ میں نے نیچے جھک کر پوری قوت سے دوڑ لگائی۔ یہ وہی نہیں سکتا تھا کہ میرے دروازے تک پہنچنے سے پہلے گولی نہ چلتی۔ گولی چلی اور

میرے پاؤں کے قریب دو فٹلے سے لپک گئے کچھ کما کر جاسکتا تھا کہ پہلوان کا نشانہ چوکا یا اس نے جان بوجھ کر میرے جسم کو نہیں چھیدا۔ میں بھاگتے ہوئے توپ کے گرنے کے مانند چولی دروازے سے ٹکرایا۔ بالائی شیشے جھٹک کر ٹوٹے اندر دلی چٹائی اکڑ کر دو در جاگری اور میں لڑا کھڑا اندر جا کر۔

ایک لمحے کے لئے میں نے خود کو ٹھٹھکے فرش پر پڑا یہ شطرنج کے خانوں جیسا ٹائل وار فرش فیتھوں کی رو میں چپک رہا تھا۔ سیکڑ کے دوسرے حصے میں میری نگاہیں جانب ایک کھلے دروازے میں گئی۔ رقص و سرودی تھی اسی کمرے میں جی ہوئی تھی۔ فرش پر چاندنی چھٹی ہوئی تھی مولی گردنوں اور صحت مند چہروں والے کوئی دس پندرہ افراد مجھے نظر آئے ان سب کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہو تھیں اور وہ میری طرف دیکھ رہے تھے دو گولیوں کی گونج میرے دروازے سے ٹکرائی کی صدا ابھی فضا میں باقی تھی۔ سازندوں کے ہاتھ ابھی سازوں پر پوری طرح رہے نہیں تھے۔ یہ سب ایک یاد و ساعتوں کا ماز تھا۔ میری قادر زماں پر پڑی جو ایک سرخ گاڑ تھکنے سے ٹیک بنا کر اس کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے دروازے پر کھڑے ہوئے اب اسے حفاظت کو دیکھا جو اپنی بندوق سیدھی گرا رہا تھا۔ مجھے کا یقین تھا کہ حفاظت کی بندوق سیدھی ہونے سے پہلے میں۔ چھین لوں گا اور اس سے پہلے کہ قادر زماں پورے قندہ کھڑا ہو کر دائیں بائیں بٹے اس بندوق کی نال اس کی کپڑے سے لگ چکی ہوگی۔

میں نے اپنی جگہ سے جست کی اور قریب آٹھ فٹ درمیانی فاصلہ طے کرتے ہوئے حفاظت پر جا پڑا۔ میرا ہاتھ سیدھا بندوق کے دے پر آیا تھا۔ اپنی جست کے ذریعے پر پیار سے بندوق چھیٹتا ہوا میں دائیں کندھے سے بل فرما کر پیچھی چاندنی پر گرا اور لڑا کھڑا کھڑا سیدھا کھڑا ہو گیا میرے ہاتھ کی بندوق جاگیر وار کی کینچی کی طرف سیدھی ہو لیکن میں غلطی کر گیا۔

میں جاگیر دار کے عقب میں ان دو بونے باڑی گاڑاؤں نے دیکھ سکتا تھا جو ہمہ وقت سامنے کی طرح اس کے ساتھ رہتے تھے اور جن کی پھرتی اور جستی کے بارے میں اب تک بہت کچھ سن چکا تھا۔ عین کسی شکاری کتے کی طرح ایک بونے جاگیر دار کے عقب سے چھلانگ لگائی اور سیدھا میری بندوق پر آیا۔ غیر ارادی طور پر میں نے ٹرائیکر دایا۔ بندوق کا تہ تبدیل ہو چکا تھا کوئی اس چودہ پندرہ سال کے خوبصورت لڑکے

لوگی جو ہتھکڑا بندھ کر رقص کر رہا تھا۔ ایک جج کے ساتھ س نے ہڈی پکڑی اور دہرا ہو گیا۔ حاضرین غفلت اٹھ کر تھک پادوں طرف بھاگ رہے تھے۔ ایک گھمراہ ہوا تھا۔ میرے سر پر کسی نے عقب سے زوردار ضرب لگائی اور میں ڈانٹ کھو کر ایک پاروشیم پر گرا۔ پھرتی سے محوم کر دیکھا ضرب لگانے والا وہی پہلوان تھا۔ وہ ایک لمحے پہلے تہہ گولے کی طرح اس کمرے میں داخل ہوا تھا اور آتی ہی اس نے جی کی کاؤنی کنڈا میری گدی پر آزما ڈالا تھا۔ میں ایسے بے تحاشے طریقے سے گرا تھا کہ بندوق میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اب میرا دایا ہاتھ ایک وزنی پائندہ پر تھا۔ میں نے ہاتھ کے نیچے لپٹے۔ یہ پائندہ پہلوان کی کمن پر پہنچے مادوں لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ مولی گردنوں اور صحت مند چہروں والے وہ تمام حاضرین جو پہلے میں تھے جیسے مارے ہوئے باہر کھسکے تھے اب تبھل کر لپٹ آئے تھے۔ انہوں نے مجھے پادوں طرف سے دوچ لیا۔ ایک لمحے بعد پہلوان کی کمن بھی میرے سینے سے آن گئی اور اس کے بے رحم دہانے مجھے سمجھا دیا کہ بازی پلٹ چکی ہے۔ اب اصولی طور پر مجھے دو جھڑک کر کرنی چاہئے تھی مگر میرے سینے میں ایسی آگ لگی ہوئی تھی کہ آنکھوں کے سامنے ایک کمرے دھوئیں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لڑائی بھڑائی کے تمام قانون قاعدے بھول چکے تھے میں بار کبھی ہار تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب کچھ بے سود ہے سخت باتوں کی گرفت میں پھل رہا تھا اور ایم جی کا بوجھ اپنے سینے سے بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے حلق سے ٹھٹھکاف پٹکھازیں نکل رہی تھیں۔ ان چٹکڑوں کا کدیف آقا زماں تھا۔
"تے! میں مجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تجھے جرات کیسے ہوئی۔ تو جانتا نہیں میں کون ہوں۔ میں تیرا نشان مٹا دوں گا۔ تیری نسلوں کو ختم کر دوں گا۔"

دو شاہ جہاں جس کی قبر لاہور جیل کے احاطے میں تھی زندہ ہو رہا تھا۔ اس کے نفن کے تمام بندھیل ہو گئے تھے۔ "مڑکی اولاد آتوئے میری بہن کو ہاتھ لگایا اس کی طرف نگاہ بھی اٹھائی تو میں تیری اس جاگیر کو را کھ کا میر کر دوں گا۔ خدا کی قسم قبرستان بنادوں گا ان ساری زمینوں کو۔ کہاں ہے میری بہن۔ میں پوچھتا ہوں کہاں ہے میری بہن۔ ازرازاے کچھ نہ کہتا اے۔"

میرے منہ میں جو اول فیل آ رہا تھا وہ کب رہا تھا۔ جاگیر دار بڑے اطمینان سے کھڑا نینا گارہا تھا۔ دو پہلوانوں نے پوری کوشش سے میرے ہاتھ موڑ کر پٹ پٹ لگا دیے تھے

اب تیسرا شخص انہیں رتی سے باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹھوڑی ہی دیر میں ان سب نے بل کر مجھے سے بس کر دیا۔ ایک چارپائی کی ادوا میں سے مجھے پوری طرح جکڑ دیا گیا تھا۔ سب حاضرین میری طرف ابھی ابھی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے غالباً یہ لوگ باہر کے تھے اور انہیں جاگیر دار نے میری ذہنی صحت کے بارے میں شک میں جھلا کیا تھا۔ اسی دوران میں نے ڈاکٹر رحمان اور نرس شکلیہ کو تیزی سے اندر آتے دیکھا۔ شکلیہ کے ہاتھ میں ایک بھری ہوئی سرنج تھی۔ وہ میری طرف پرہی۔ میرے تڑپنے مٹنے کے باوجود اس نے میرے بازو کی ٹس میں خواب آور انجکشن لگایا کھوں میں میرے ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ پوری طرح غافل ہونے سے پہلے میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر رحمان اس لڑکے پر جھکا ہوا تھا جسے میری گولی نے زخمی کر دیا تھا۔ لڑکا بری طرح گراہ رہا تھا۔ اس کی ہتھکڑی ٹانگ ڈاکٹر رحمان کے ہاتھ میں تھی اور اس کے کندھے دو مردوں کی گرفت میں تھے۔ لڑکے کے سینے سے قہقہے کھج گئی تھی اور اس وقت مجھے پتا چلا کہ وہ لڑکا نہیں ہے۔ وہ بوائے کٹ لڑکی تھی جس نے مروانہ تراش کی شلوار قہقہے بن رکھی تھی۔

میں اوندھے منہ بستہ پڑا تھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ کھڑکی کے پھاٹک پر دروازہ پھیرا اور ڈوبی دے رہا تھا۔ دھبہ کالی چھ آئی تھی۔ میں نے کوٹ بدلتی چابی توانہ ازاد ہوا کہ دونوں ہاتھ عقب میں کسی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ چند لمحوں میں رات کے تمام واقعات نگاہوں کے سامنے گھوم گئے میں قریب اس گھنے انجکشن کے زیر اثر رہا تھا۔ اب اثر ختم ہوا تھا تو روح اور جسم کے سارے زخموں سے ٹپس اٹھنے لگی تھیں۔

"شتتا" میرے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔ میرے جسم کا ہر عضو تن گیا۔ جی چاہا کہ ہانگوں کی طرح جھٹکا چلانا شروع کر دوں مگر جلد قدموں کی نازکی سی آواز نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کر لیا۔ کوئی آ رہا تھا۔ چند لمحے پر زمین آجمل کی جھٹک نظر آئی اور ایک سرود لڑکی ناشے کیڑے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ میں اس لڑکی کو آن پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ٹھوڑا سا کھرا ہوا چربہ صراحتی دار گردن اور ہموار کندھے۔ وہ قبول صورت تھی لیکن جویات نوجو کے پیکر جمال میں تھی وہ اس میں کہاں۔ اس نے گرا کر گرم حلوہ پوری۔ ابلے ہوئے دراندے اور چائے میرے سامنے رکھ دی تو میں نے پوچھا۔

”جو کہاں ہے؟“
وہ بے رخی سے بولی ”مجھے کیا معلوم“
”پھر تم کو معلوم ہے؟“

”انکوں کو معلوم ہو گا یا پھر اسے معلوم ہو گا جہاں وہ گئی ہے۔“ آخری الفاظ اس نے بت چاکر کہے تھے۔ ”اسے معلوم ہو گا جہاں وہ گئی ہے۔“ یہ الفاظ ایک خاص سمت اشارہ کر رہے تھے بات کچھ میری سمجھ میں آنے لگی۔
راہ میں نے اچانک اس کمرے سے بھاگ کر اور جاگیردار کی محفل طرب کو درہم برہم کر کے جہاں اپنا نقصان کیا تھا وہاں جو کبھی کسی مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ میری اس بیگمہ آرائی کا سبب اپنی بہن کے متعلق میری معلومات تھیں۔ یہ معلومات حویلی ہی کے کسی فرد نے مجھ تک پہنچائی تھیں اور سامنے کی بات بھی کہ ”نس“ بنو یا ڈاکٹر رحمان میں سے کسی نے پہنچائی ہیں۔ جاگیردار کو درست نتیجے تک پہنچنے میں چند لمحے کی دیر بھی نہیں لگی ہوگی۔ جس وقت میں آپ سے باہر ہو کر یہاں سے بھاگا اس وقت میرے پاس بچو کے سوا اور کون تھا۔

میں نے اس نئی لڑکی سے پوچھا۔ ”کیا۔۔۔ اسے کوئی سزا وغیرہ دی گئی ہے۔“
”مجھے نہیں پتا جی۔“ وہ ہچاڑ کھانے والے لہجے میں بولی ”اب ناشائستہ لٹھ مارا ہو رہا ہے۔“
مجھے بھی تاؤ آگیا۔ ”ناشائستہ اپنے سر سے کریں۔ ان تیرے خصوصیات نے ہاتھ تو میرے باندھ رکھے ہیں۔“ میں نے اپنی زنجیر زور سے جھنجھٹا کر اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔
لیکن اگر میرا خیال تھا کہ وہ میری زنجیر کھولیں گے تو یہ بچکانہ خیال تھا کہ لڑکی پر ایم جی والے پہلوان کی منوس صورت نظر آئی۔ اس نے نہایت قہر سے مجھے گھورا۔ پھر لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”جیجیجی! اٹھ اٹھ اسے نڈھے اپانچ کو اپنے ہاتھ سے بڑا محتاج ہے پتھارا۔“

لڑکی میرے قریب بیٹھ گئی اور پوری توڑ کر طوے سے نوالہ پانے لگی۔ بھوک تو میری ہر کرکھانے کس قبرستان میں دفن ہو چکی تھی۔ سینے میں ایک ٹپک فردزاں تھی اور گزرنے والا ہر کو اس ٹپک کی حدت میں اضافہ کر رہا تھا۔ لڑکی کا چڑیوں والا گورا ہاتھ جب لقمہ بنا کر میرے ہونٹوں کے قریب آیا تو کھانے کی خوشبو سے میرا جی متلاں لگا۔ میں نے خلاف کے پیچھے سے دونوں ہاتھیں جوڑ کر انھیں اور پوری قوت سے کھانے کی زبردستی مار دی۔ یہ زبردستی لڑکی اپنی گود میں رکھی ہوئی تھی۔ ایک ٹانگ زبردستی اور دوسری

لڑکی کے کولے پر پڑی۔ دونوں ”جیجی“ اڑتی ہوئی کمرے وسط میں جا پڑیں۔ زبردستی کے کھڑکھڑاہٹ اور لڑکی کی چٹا ساتھ کمرے میں گونجی۔ گرم گرم چائے اور طوے سے ہاتھ پر گل کاریاں کر دیں۔
ایک ساعت میں لڑکی کا رنگ لیموں کی طرح زرد اور وہ قالمیں پر ہی بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا منصوبہ دبانے لگی۔
پہلوان نے کھڑکی میں سے جھٹکا ڈکر مجھے گالی دی۔
نے رانقل کا رخ میرے سینے کی طرف کر رکھا تھا اور لگا ابھی گولی مار دے گا۔ تاہم وہ گولی مجھے مار نہیں سکتا تھا جسکے لات کے لئے اسے طویل چکر کاٹ کر کمرے کے اندر پڑا۔ لڑکا وہ کھڑکی ہی میں تاج کر گیا۔ مجھے اس کی جھٹا نے لطف دیا۔ اچانک سامنے والا دروازہ کھلا اور چوٹھ جاگیردار قادر زمان نظر آیا۔ اس کی نگاہ ایک ہی ساعت کمرے کی ہر شے پر زور ڈالتی۔

”جیجیجی۔۔۔ بہت بری بات ہے یار جی۔ ایسے بھلے جا آدمی ہو۔ کیوں ہم بے قصوروں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ ہو۔“ پھر وہ جیجیجیوں سے مخاطب ہوا۔ ”چل کر لڑے۔ تو باہر چل اور یہ بھانڈے شانڈے بھی لے جایاں۔“
جیجیجیوں کو رات ہی ہوئی اٹھی اور لنگڑاتی ہوئی قالمیں برتن اکٹھے کرنے لگی۔ باہر چلی جی تو آغا زمان بڑی حد سے کڑی پر بیٹھ گیا۔ بولنے باڑی گاڑ کر آغا زمان کی اس کے دامن بائیں تھے۔ آج ان کی زرد آنکھوں میں میرے لئے دشمنی کی نمایاں جھلک تھی۔ جاگیردار نے ان مخصوص دھبے لہجے میں میرا حال احوال دریافت کیا اور لینز والی ڈیا اٹھا کر دیکھنے لگا۔

”میرا خیال ہے یار جی! ان کو لگا ہی لو۔ یہ تمہارا فائدہ کی بات ہے۔“

میں اب تک مکمل خاموشی سے جاگیردار کی باتیں رہا تھا۔ ہر لکھ میرے سینے میں بڑا طوفان تندہ تیز ہوتا تھا۔ آخر میری زبان کو آج خاموشی نہیں رہی۔ میں اپنے لہجے کو کم سے کم خوفناک بنانے کی کوشش کرتے ہو گیا۔ ”جاگیردار! میں اپنی بہن سے ملنا چاہتا ہوں۔“
”اوہ اچھا“ آغا زمان نے لگا سا قہقہہ لگایا ”تو اتنی بات پر آنکھوں میں آنسو بھرنے کی کیا ضرورت ہے؟ خود بھی چاہتا تھا کہ تم اس سے ملو، چلو اٹھو ابھی۔ میں اس سے ملتا ہوں۔“

میں نے ہنسنے سے حرکت کی۔ کھٹکے باڑی گاڑے ہر دوسرے نظر آنے لگے۔ جو میں جیل میں کر دوڑاؤں سے لڑا کھو داؤہ میرے سینے پیچھے آگئے۔ دل بڑی شدت سے جھک رہا تھا اور ذہن میں اس حرکت سوال تھے۔ مجھے میری غیبت آنکھوں کو کھلانا تھا۔ کھٹکے فرش والی راہداری سے گزر کر ہم پہلو کے کمرے میں داخل ہوئے اور میرے سامنے ایک قالمیں پوش زینہ آیا تو ذہن کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ میرا آخری وقت آگیا ہے اور میرے ساتھ ساتھ شاید اس جاگیردار کا بھی۔ اگر میں اپنی بہن کو اس سرخ پرے کے پیچھے کسی عذاب میں مبتلا دیکھ لیتا تو پھر پانی کیا چر رہا تھا۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے تو کیا میری ٹانگیں تو آزاد تھیں۔ میرا جڑا تو زنجیر میں تھا۔ مجھے یقین کامل تھا کہ میں بولنے خاموشوں کی گولیوں کی پروا کئے بغیر جاگیردار آغا زمان پر جاڑوں کا اور اس کے زرخرے کو اپنے ہاتھوں سے اور جیڑوں کا گیا اس کی گردن کو اپنی ٹانگوں میں بکڑ کر اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دوں گا۔ یہ نہ ہو گا تو کچھ اور ہو جائے گا کچھ اور نہ ہوا تو کچھ اور ہو جائے گا۔ ہاں یہ نہیں ہو گا کہ مجھ میں زندہ رہوں اور جاگیردار بھی اس ٹیکری سے صحیح سلامت واپس آجائے ہاں۔ یہ بھی نہیں ہو گا۔

میں خود بخود یونوں کی زد میں زینے طے کر تا ہوا جاگیردار کے ساتھ اس منوس ٹیکری میں پہنچا۔ سب کچھ دیکھا تھا جیسا دوڑنے پہلے نظر آیا تھا۔ وہی کرسیاں وہی سرخ پردہ وہی شراب کی بوتلیں اور بیڈ فونز وغیرہ۔ آج یہ ٹیکری میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہی تھی اور سینے کے اندر کوئی ٹپک سا جھج رہا تھا۔ کوئی اٹھان سا ہوا تھا۔ حسب سابق جاگیردار نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک کرسی پر چھوڑ کر نشست سنبھال لی۔ بولنے عقب میں ہوشیار کھڑے تھے آج مجھے ہلک نہیں باندھ گئی تھی۔ شاید اس لئے کہ ہاتھ تو بندھے ہوئے تھے۔

جاگیردار کے اشارے پر ایک بولنے نے لائٹ آف کر دی اور دوسرے نے پردے کی زوری کھینچ کر پردہ ہٹا دیا۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا کیونکہ میں اپنی آنکھیں بند کر چکا تھا۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے میں مرنے کی پوری تیاری کر لیا تھا۔ آغا زمان نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں شیشے کی دوسری جانب قیثب میں مجھے روشن کرا نظر آیا۔ وہاں میری بہن موجود تھی۔ میں اپنی بہن کو آج ساڑھے تین برس بعد دیکھ رہا تھا۔ ساڑھے تین برس قبل وہ چلی آؤ۔ آخری بار مجھ

سے جیل میں لئے آئی تھی۔ اس کے بعد کتنے موسم اور کتنے شب و روز گزر گئے تھے۔ اپنی سادہ معصوم بہن کی صورت جیل کی تاریکیوں میں میری امید کا جگنو بنی رہی تھی۔ جیل کی تاریک راتوں میں میں نے بیسیکلوں مرتبہ اس کی ہنسی سنی تھی اور اس کی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ وہ مسکراہٹ جس نے مجھے چھوڑوں اور محفلوں سے آبادیہ کون میں بچپن کی بے فکر نیندیں دی تھیں اور مستقبل کے سامنے خواب بھی دکھائے تھے۔ میں نے دیکھا رنگ دار شیشے کی دوسری جانب میری بہن ایک آرام کر رہی تھی۔ اس کے پاؤں ایک پرات میں تھے۔ پرات میں گرم پانی تھا اور روٹی کے ٹکڑے تھے۔ ایک ملازمہ بڑے آرام سے اس کے پاؤں دھو رہی تھی۔ شیشے کے ہاتھ میں ایک تھالی کے اندر سیب کے ٹکڑے تھے۔ وہ بڑی بے دلی سے اور آہستہ آہستہ کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔

”شتت! شتت!“ میں پرے زور سے چلا۔ شتت چٹوٹ دور تھی لیکن اس تک میری آواز نہیں پہنچ سکی۔ میں نے بے قرار ہو کر اپنا سر رنگ دار شیشے سے ٹکرا دیا۔ ٹکڑے کی آواز نے دونوں ملازمان کو اوپر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ شتت نے بھی تھالی سے سر اٹھا کر ایک ملازمانہ نظر اوپر ڈالی لیکن تاثرات سے اندازہ نہ ہوا تھا کہ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا۔

میں نے اٹھا کے لیے میں کہا ”جاگیردار“ ایک بار مجھے اپنی بہن سے ملاؤ۔ صرف ایک بار۔“

جاگیردار نے میرے کندھے پر دوستانہ جھکی دی۔ اس کے اشارے پر یونوں نے زوری کھینچ کر پردہ برابر کھینچا اور حق جلادی۔ ”آؤ جاگانی! کمرے میں چلتے ہیں“ جاگیردار نے بے پناہ سفاسی سے کہا ”تمہاری بہن بھی وہیں پہنچ جائے گی۔“

جاگیردار کی ہدایت پر مکمل کرنے کے سوا میرے پاس چارہ نہیں تھا۔ ہم اپنی جگہوں سے اٹھے اور پہلے زانی ترتیب سے چلتے دوبارہ کمرے میں پہنچ گئے۔ نئی خادمہ قالمیں پر سے طوے اور چائے کی آلائش صاف کر چکی تھی اور اب یہاں کے دستور کے مطابق ہاتھ ناف پر باندھے ایک کونے میں مڑوب کھڑی تھی۔ ترس شکلیہ بھی مجھے دہانسن کا انجکشن دینے کے لئے موجود تھی۔

”چلو کڑیو! تم دونوں باہر چلو۔“ جاگیردار نے علم صادر کیا۔

وہ دو بے قدموں باہر نکل گئیں تو قادر زمان اور میں آٹنے سامنے کر سیں پر آ بیٹھے۔
زبان نے سکارا لگایا۔ ”بھئی اور سخت سوچوں کے پیچھے

سے اس نے خوشبو دار دھواں فضا میں چھوڑا اور غصے ہوئے لیجے میں بولا۔ "یاریجی میرے کچھ اصول ہیں اور ان اصولوں کو میں جانے سے عزیز رکھتا ہوں۔ میری دوستی دشمنی محبت نفرت سب اصولوں پر قائم ہے۔ تم میرے ان اصولوں سے اختلاف کر سکتے ہو لیکن مجھے بے اصولی کا طعنہ نہیں دے سکتے۔ تم اب تک یہ بات اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے کہ تمہاری حیثیت یہاں ایک قیدی کی ہے۔ تمہاری اس قید کا سبب کیا ہے یہ ایک دوسرا سوال ہے۔ فی الحال میں تمہیں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ جو بات میں اب تم سے کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے اپنی بہن کو دیکھ چکے ہو اور یہ بھی دیکھ چکے ہو کہ وہ ہمارے پاس بالکل محفوظ ہے اور اسے کسی طرح کی تکلیف نہیں۔ یہ صورت حال اسی طرح برقرار رہے گی لیکن اس کے لئے تمہیں ایک کام کرنا ہو گا۔"

میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے کہ میری بہن یہاں پر غمال ہے۔"

"ہاں یاریجی! تمہاری بہن، یہاں پر غمال ہے۔ تسلی ہو، ہو تو کچھ آگے عرض کروں۔"

"کمو۔"

جاگیردار نے ایک گہرا غصہ لے کر دھواں فضا میں چھوڑا۔ "تمہیں ایک شخص کو قتل کرنا ہے" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ میری سواہی نظریں بدستور جاگیردار کے چہرے پر لگی تھیں۔ اس نے دواکت کی جیب سے ایک تصویر نکالی اور میرے سامنے بتائی پر رکھ دی۔

میں نے تصویر اٹھائی اور ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں اس شخص کو پہچانتا تھا۔ یہ ایک جیتنا لیس پچاس سالہ شخص تھا۔ تصویر میں وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ کھڑا نظر آ رہا تھا۔ بچوں میں ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی۔ اچانک مجھے سب کچھ یاد آیا۔ اس شخص کا نام راجال سائی تھا۔ احمد راجال سائی لاہور جیل کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اپنی قید کا اولین سلسلہ میں نے اسی جیل میں کا کا تھا۔ مہاراجی راجال سائی کے بارے میں مجھے سب کچھ یاد آیا۔ وہ عام جیل افسران سے بہت مختلف تھا۔ دیکھتے ہی مجھے یہ بات کرنے والا اور انسان کو انسان سمجھنے والا۔ میں نے اسے زیادہ مرتبہ نہیں دیکھا۔ شاید پورے سال میں تین چار بار سامنا ہوا تھا۔ بریادار اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے لئے نرم خوئی کی ایک جگہ ملی تھی۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا تھا "شاہ جہاں میں نے تمہاری سبزی شیت دیکھی ہے اور فائل بھی دیکھی ہے۔"

خامسے دلچپ آدمی ہو تم" ایسی باتیں وہ اکثر دوسرے قیدیوں سے بھی کیا کرتا تھا۔ اس کے اندر آدمی کو سمجھنے اور پرکھنے کی لامحدود خواہش تھی۔ جیل میں بھی وہ سنت نئی اصلاحات کرتا رہتا تھا۔ وہ سپرنٹنڈنٹ سے زیادہ ایک رفتار مہر نظر آتا تھا۔ آج اس شخص کی تصویر میرے سامنے تھی اور ایک جاگیردار مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں اسے قتل کروں۔

مجھے سچوں میں گم دیکھ کر جاگیردار آقا زماں نے کہا۔ "کیا بات ہے چپ ہو گئے ہو۔"

میں نے کہا "اس کا تصور؟"

"تصور تو تمہاری بہن کا بھی کچھ ہے، اور تم نے بھی میرا کچھ نہیں بگاڑا لیکن تم دونوں گردنوں تک حالات کی پچیز میں دھنسنے ہوئے ہو۔ یاد رکھو شاہ جہاں یہ دنیا ایک جنگل ہے اور جنگل میں کسی شکار کو کسی شکاری سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اس کا تصور کیا ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ بہت دنوں بعد دل میں تباہی کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ میں نے کہا "ایک سگڑا مل سکتا ہے۔"

جاگیردار مکر کیا "سوری۔ یہ بھی میرا ایک اصول ہے۔ ہاں سگریٹ منہ ہو سکتے ہیں۔ کون سے پو گئے۔"

"جو منہ ہو سکتے ہیں۔"

اس نے ایک لمحے کو آنکھوں سے اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا گیا اور چند لمحوں بعد گولڈ لائف کا پورا ایک ڈبا تپائی پر لا رکھا۔ میں نے ایک سگریٹ نکال کر سگایا۔ چند کش لینے کے بعد جذبات کا بالان کم ہوا اور دماغ قدرے معمولی انداز میں سوچنے لگا۔

"اگر میں اس شخص کو قتل کروں تو پھر؟" میں نے کہا۔

"پھر تمہاری بہن پر طعنہ سے محفوظ ہوگی۔"

"زمان صاحب! اصل کربات کریں۔ اگر میں آپ کے کہنے پر اس شخص کو قتل کروں تو آپ مجھے اور میری بہن کو یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں گے؟"

جاگیردار کے چہرے سے مسکراہٹ کا قلاب اتر گیا۔ وہ گہری جھنجھکی سے بولا "یاریجی! تم اس وقت کوئی مطالبہ پیش کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو اور نہ ہی میں تمہارا کوئی مطالبہ مان سکتا ہوں۔ مجھے تمہارا جواب ہاں یا نہ ہاں چاہئے۔" میں سن ہو کر رہ گیا۔ جاگیردار کا بے پناہ اعتماد ظاہر کرتا تھا کہ وہ بچے پاؤں پر نہیں کھڑا۔ مجھے خاموشی پا کر اس نے کہا "ایک بات اور۔ میں اس کام کے لئے تمہیں زنا"

ملت بھی نہیں دے سکتا۔ آٹھ دس روز کے اندر اندر اندر نہیں یہ قصہ ختم کرنا ہو گا۔ دوسری صورت میں تمہیں ناکام نذر کیا جائے گا۔"

میں نے اوپر تلے سگریٹ کے چند کش لئے اور کہا "ٹھیک ہے زمان صاحب میں یہ کام کروں گا۔"

جاگیردار نے کہا "مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرنا شاہ جہاں مجھے پتا ہے تم کوئی ایویں شیوس نہیں بنے ہو۔ بی بی ہڈے باز روح ہے تمہارے اندر لیکن امید کرتا ہوں کہ تم مجھے اور خود کو کسی امتحان میں نہیں ڈالو گے۔ پھر میری آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے بولا "ہو سکتا ہے ہر چھڑے بازی طرح تمہارے دل میں بھی خیال ہو کہ یہاں سے جانے کے بعد کسی چال سے دوبارہ حویلی میں مٹس کر اپنی بہن کو نکالنے کی کوشش کرنا یا کوئی اور کمانڈو ٹیم ڈالنا یا کسی لڑاکا میری گزارش ہے کہ ایسے پکڑنا خیالوں کو دل میں جگہ نہ دینا میں کوئی شچی نہیں بگھار رہا۔ تمہارا واسطہ آقا قادر زمان سے پڑا ہے اور زمان جیسا ایک آدمی بھی تمہیں آج تک نہیں ملا۔"

آقا زماں کی بات میں خاصا وزن تھا۔ میں خود یہ محسوس کر رہا تھا کہ کسی اور ہی نسل کا شخص ہے اس کی طاقات اور سوچ میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ میری جماندہ نگاہیں دھوکا نہیں کھاسکتی تھیں۔ آقا زماں نے اس حویلی میں جن جن کراہیے غیظ سے جمع کر رکھے تھے جو اپنی مثال آپ تھے کوئی سندھ کا تھا تو کوئی پنجاب کا کوئی سرحد کا تھا تو کوئی بلوچستان کا۔ ان میں سے ہر ایک کسی بلا سے کم نہیں تھا۔ غالباً اسی انتخاب کے لئے اس نے زبردست محنت کی تھی اور منہ مانگے معاویے دیے تھے۔ ان میں سے چند ایک ڈسکوں کو میں پہچان بھی گیا تھا۔ پتا نہیں انہوں نے مجھے پہچانا تھا یا نہیں۔ یہ خطرناک قسم کے قاتل اور ذہنیت تھے۔ میں نے اب تک جو کچھ دیکھا تھا یہ حویلی کا صرف ایک رخ تھا یقیناً بہن پر وہ اور بھی بہت کچھ تھا۔ اور میری شفتا اس خطرناک حویلی میں مقید تھی۔ نہایت بدترین قسم کے عذاب اس کے گرد منڈلا رہے تھے۔

میں نے ہاتھ میں پکڑی تصویر کو غور سے دیکھا اور محسوس کیے میں کہا۔ "میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں زمان صاحب میں کوشش کروں گا کہ آپ کو کوئی شکایت نہ ہو۔ دیے یہ شخص اس وقت ہے کہاں؟"

"لاہور میں۔ اقبال ٹاؤن۔ سٹیج بلاک۔ کو بھی کا نمبر تمہیں بتا کر دیا جائے گا۔"

"رہنا ہے یا حاضر ہوں۔"

"حاضر ہوں۔"

زمان صاحب اگر میں اس کوشش میں پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوں تو؟

"یوں تو اس کا امکان بہت کم ہے۔ بہر حال ایسا ہوا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ تم گرفتار ہوئے ہو یا تم نے خود کو گرفتار کرایا ہے۔ اگر تم واقعی گرفتار ہوئے تو سمجھا جائے گا کہ تم نے اپنی ذمہ داری پوری کی۔"

"میری گرفتاری سے آپ پر بھی حرف آسکتا ہے؟"

"تم میری فکر چھوڑو۔"

"میری گرفتاری کی صورت میں کیا میری بہن کو چھوڑ دیا جائے گا؟"

"یاریجی! کیا میں نے ایسی کوئی بات کی ہے۔ میرا خیال ہے تم فضول سوالات سے پرہیز کرو۔ ویسے بھی یہ سوال اٹھانا وقت ہے۔"

"میں اس کام کے لئے کب روانہ ہو سکتا ہوں؟"

"جب چاہو۔ اگر چاہو تو آج ہی بلکہ اسی وقت جا سکتے ہو۔ کیا تم خود کو اس قاتل سمجھتے ہو؟"

"جی ہاں۔" میں نے مختصر جواب دیا "آپ اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

"جو تم چاہو۔ بہر حال ایک بات طے ہے کہ یہ کام تمہیں اکیلے ہی کرنا ہو گا۔"

"مجھے معلوم ہے" میں نے اپنے لہجے کی سختی چھپاتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا مدد چاہئے تمہیں؟"

میں نے نیا سگریٹ سگایا کہ "کچھ زیادہ نہیں۔ لباس وغیرہ تو آپ میرا سلاہی بچے ہوں گے۔ چھ سات ہزار روپیہ خرچ کے لئے۔ ایک دیوالیوار اور ہسکے تو ایک سواری۔"

"ٹھیک ہے یہ چیزیں تمہیں مل جائیں گی۔"

"میں آج ہی روانہ ہونا چاہوں گا۔"

"بھد شرق۔ سائی کے بارے میں تمہیں تمام معلومات ایک گھنٹے کے اندر اندر مل جائیں گی۔ ان معلومات کے بعد بھی اگر کوئی سوال ہو تو مجھ سے رابطہ قائم کر لیتا۔ میں کل تک حویلی میں ہی ہوں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چند منٹ کی مزید محنت کے بعد جاگیردار وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے دس منٹ بعد ایم جی والا پہلوان ایک منجی لے کر آیا اور اس نے میرے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ ہول دیے۔

مطلع صبح سے ابر اکوڑ تھا۔ بلکی پھوڑ پڑی تھی۔ میں کوئی کیا رہ بیٹھ چوٹی سے روانہ ہوا۔ ایک پرانے ماڈل کی نمائندہ خستہ حال اوپل کار میں ہم نے کچے کچے راستے پر کوئی چھ میل کا فاصلہ طے کیا "ہم" سے میری مراد میں اور ذرا نیور ہے۔ میں نے اعلیٰ کپڑے کی سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اس پر سیاہ شیروانی تھی۔ شیروانی کی جیب میں ہار کے دو قیمتی قلم اور کھاتی پر رازد کمری۔ بال میں نے سیدھے اوپر کوئی بار کے تھے۔ اس نیپ ٹاپ میں میں کسی سیاسی لیڈر سے کم نظر نہیں آتا تھا۔ چھ میل کی کچڑ پٹیائی کے بعد ہم پکی اینٹوں کے بنے ہوئے ایک چوٹی نما مکان کے سامنے بیٹھے۔ راستے میں جہاں جہاں کسی شخص نے ہمیں دیکھا تو بڑے ادب سے کھڑے ہو کر سر جھکا یا تھا۔ اس چوٹی نما مکان کے سامنے بھی چند لازم پیش غلام صورت لاشی برداروں نے جھک کر کورنش بنایا۔ کٹھنہ گاڑی سیدھی احاطے میں داخل ہوئی۔ یہاں کچے فرش پر مجھے کوئی ساتھ آٹھ گاڑیاں نظر آئیں۔ ایک جیب ایک نشان جیب تین نیوٹا کاریں۔ ایک نشان سی۔

ذرا نیور نصیب خان نے ڈیش بورڈ پر رکھی ایک چابی اٹھائی اور مجھے دیتے ہوئے کہا "صاحب! وہ نشان سی آپ کے لئے ہے۔"

میں اوپل سے اترا اور سلیم شاہی جو تابیانی سے بچاتا ہوا نشان سی میں ٹھہر گیا۔ گاڑی کے شیشے لٹکے رنگ دار تھے۔ ڈیش بورڈ پر دو تین فائلیں پڑی تھیں۔ مجھے معلوم تھا ان فائلوں میں اوٹ پناہ کاغذات کے سوا اور کچھ نہیں۔ انہیں یہاں صرف رعب داب کے لئے رکھا گیا ہے۔ میں نے دیوالور شیروانی کی جیب سے نکال کر سیٹ کے نیچے چھپا دیا۔ ڈیش بورڈ کا زیریں خانہ کھول کر گاڑی کے کاغذات چیک کئے۔ پڑول وغیرہ دیکھا اور دوا کی کے لئے تیار ہو گیا۔ میں احاطے سے باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ آگے کچے راستے کی بجائے ہم پختہ سڑک سے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ چوٹی کی تمام انچی گاڑیاں یہاں رکھی گئی تھیں۔ سڑک پر قیچی ہی میں نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی اور پڑی سڑک کی طرف روانہ ہو گیا۔ آج کوئی چار برس بعد میں ایک بار پھر آزاد تھا۔ گو یہ آزادی مشروط تھی مگر آزادی تو تھی۔ میرے چاروں طرف کھیت تھے، درخت تھے، ہوا تھی اور آسمان تھا۔ یہ سب چیزیں بے زبان خاموشی کہہ رہی تھیں "ابھی زندگی حسین ہے شاہ جہاں ابھی کچھ لوگ آزاد ہیں" ابھی کچھ لوگ خوش ہیں

ابھی پرندے شاخوں پر جھکتے ہیں اور ابھی سجے بارش میں بھاتے ہیں" ابھی کھروں میں چولے جلتے ہیں اور ابھی ساکنہ دہلیزوں پر کسی کا انتظار کرتی ہیں۔ میں کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول گیا۔ لاہور جیل "انگ جیل" جاگیردار کی چوٹی مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ میرے تصور میں وہی چھوٹا سا کھراٹا جہاں میں اپنی باری بن کے ساتھ رہتا تھا اور جہاں شام شام ہماری خوشیوں کے پھول کھلتے تھے۔ زندگی اپنے حسین اور مضمون رنگوں میں سکرانی تھی۔

گاڑی ہم پختہ راستے پر بھگولے کھاتی آگے بڑھتی رہی۔ میں چوٹی سے کوئی بیس میل کی طرف نکل آیا۔ آخر پختہ سڑک نظر آئی۔ یہ ایک پراچ روڈ تھی اور کہیں آگے جا کر بھی نی روڈ سے ملتی تھی۔ میں جب اس سڑک پر پہنچا شام کے سامنے پھیل رہے تھے۔ ابر اکوڑ شام نے کھوں میں گھٹا کوب اندھیرے کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا ذہن متحرک ہو گیا وہ منصوبہ جو چپکے چپکے میرے ذہن میں پرورش پا رہا تھا اب نمایاں صورت میں سامنے آ گیا۔

کوئی چار میل پختہ سڑک چلنے کے بعد میں نے گاڑی ایک چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے روکی۔ سلیپ کیمپ کپڑوں والا ایک لڑکا بیسے پاس آگیا۔ میں نے پوچھا "کیا کیا ہے؟" اس نے چار باغ سالن کر دیے۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے سب کی ایک ایک بیٹ لے آؤ اور گرم گرم روٹی" اس نے پلک جھپکتے میں آڑو کی۔ ٹیل کی۔ میں نے گاڑی کے اندر دھڑکاؤں لگا لیا۔ اکوڑ ماش کی وال "لوہا" شاہی باب میں نے مراد بھوک کے ساتھ کھانا کھایا اور چائے کی کراڈز کے اندر ہی سے ٹیلی ویژن کا تقارہ کرنے لگا یہ ٹیلی ویژن ہوٹل والے نے ایک چوڑے پر چڑھا رکھا تھا۔ چار سال بعد ٹیلی ویژن کا تقارہ عجیب سا لگا۔ نو بجے کی خبروں تک میں وہیں بیٹھا رہا۔ ہوٹل والوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ میں کسی چیز پر رہ جانے والے نام سزا کا انتظار کر رہا ہوں۔ گاڑی اشارت کر کے میں روانہ۔ در چند فرلانگ آگے جا کر اسے ایک کچے راستے پر ڈال دیا بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ دلہا راستے پر سبک ٹانگ اندام گاڑی کراہتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی نو آموز حسینہ ہو۔ میں گاڑی کو وہاں تک لے جانا چاہتا تھا جہاں تک یہ جا سکتی تھی اور جہاں بند ہو جاتی۔ میں دو حرف بھیج کر پیدل آگے بڑھ سکتا تھا۔ ہر طور گاڑی نے میرا پورا ساتھ دیا۔ میں قریباً چھ میل کا اشارت کٹ کر گرا بی منزل کے قریب دھواڑ میں پہنچ گیا۔ یہاں میں نے گاڑی کے لئے دو کھیتوں کے درمیان ایک محفوظ جگہ چھ

روشنیاں نظر آتے لگیں۔ میں اور عطاء ہو گیا۔ صبح بوت رو اگی میں محل وقوع کا جائزہ لے چکا تھا اور کھلی کے کھیتوں سے ہوتا ہوا میں وسیع و عریض عمارت کے پھوڑاؤں کی جانب نکل گیا۔ دور سے چوٹی کی شکل بے رحم چار دیواری نظر آنے لگی۔ اس چار دیواری کے کئی حصے ٹیوب لائنس کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ میں عطاء قدموں سے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ کٹھنہ کے کھیت بیوی چار دیواری سے لے ہوئے تھے۔ میں ان کھیتوں میں چلا اور پاؤں میں کانٹے توڑتا بیوی دیوار کے بالکل پاس پہنچ گیا۔ میں چوٹی وفد اس دیوار کے اتنا نزدیک آیا تھا۔ اس کی اونچائی میرے اندازے سے کوئی ایک فٹ سے زیادہ یعنی نو فٹ تھی۔ اور خاردار بازو تھی جو لوہے کے اہل آئرن کے ساتھ اندر کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ چاروں طرف مکمل سناٹا تھا۔ صرف بارش کی دھم دھماکی جو مسلسل کٹاؤ کے چوں پر گر رہی تھی۔ ایسا ابھی مجھے بلکی سی آہٹ سنائی دی۔ میرے اعصاب تن گھٹے کوئی میرے بہت قریب موجود تھا۔ کوئی انسان یا جانور؟ میں اپنی جگہ سے حرکت بیٹھ گیا اور فصل کی اوٹ سے تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا ایک ہاتھ خود بخود دیوالور پہنچ چکا تھا۔

چند لمبے بعد مجھے چوٹی کی دیوار کے ساتھ ایک بھلا سا نظر آیا۔ اس کا فاصلہ مجھ سے کوئی پچیس فٹ تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ بھلا کسی انسان کا ہے۔ دہلی دہلی سسکیوں کی آواز ابھی کی کچھ سمجھا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دھم دھم کی آوازیں آئیں۔ میں نے غور کیا تو پتا چلا کہ دیوار کی جڑ میں بیٹھا ہوا بھلا دیوار سے سر نکلا رہا ہے۔ خدایا یہ کیا ماجرا ہے؟ میں نے بے پناہ حیرانی سے سوچا اس بلاخیز سڑکی میں اس تاریکی اور بارش میں یہ شخص یہاں کیا کر رہا ہے؟ کیوں حسرت اور غم کی تصویر بنا ہوا تھا؟

اس شخص کا سر دیوار کی طرف تھا۔ یوں بھی میں بے آواز چلا یہاں تک پہنچا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میری آمد سے بے خبر رہا تھا۔ کچھ سوچ کر میں فصل کی اوٹ سے نکلا اور دھم قدموں سے ہولے کی جانب بڑھا۔ اچانک وہ پر اسرار شخص میری موجودگی سے باخبر ہو گیا اس کے سر نے تیزی سے حرکت کی۔ پھر کسی بد کے ہوئے جانور کی طرح وہ اٹھ بھاگا۔ اس کے انداز میں اتنا دہرے کا خوف شامل تھا۔ میں بے ساختہ اس کے پیچھے لگا۔ اس موقع پر آواز دہرست نہیں تھا۔ وہ دوڑ میں مجھ سے کم تیز نہیں تھا لیکن ایک جگہ اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اس کے کھیلنے کھیلنے میں سر رہا پہنچا۔ اس

دیوالور پیدل آگے بڑھنے لگا۔ گاڑی چھوڑنے سے پہلے میں نے اعشاریہ پچیس کا دیوالور دوبارہ شیروانی میں رکھ لیا تھا۔ راستے کچھ آگے تھے اور تاریکی میں پاؤں کہیں کے کہیں پڑ رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں بارش نے تمام کپڑے بھگو لیے اور نہایت ٹھنڈی ہوا براہ راست ہڈیوں میں سرایت کرنے لگی۔ ست کا ابھی کوئی صحیح اندازہ نہیں تھا لیکن میں بڑھا چلا جا رہا تھا۔ ایک عجیب طرح کی وارفتگی میری راہنما تھی۔ گرتا پڑتا پھلتا پھٹتا کچھ میں لت پت چلا جا رہا تھا۔ جلد ہی مجھے سلیم شاہی جو تے ہی اتار کر پھینکا پڑے۔ شیروانی کے ٹپن میں نے کھول دیے تاکہ کسی اچانک صورت حال پر حرکت کرنے میں آسانی رہے۔ میرا رخ جاگیردار کی چوٹی کی جانب تھا۔ ذہن میں کوئی واضح تصور نہیں تھا کہ مجھے وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔ صرف یہی ایک خیال تھا کہ مجھے بہر مزاحمت جاگیردار کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں اور اس کے حکم پر دوبارہ جرم کی راہ اختیار کرنے سے پہلے کچھ تڑپ چمک لینا چاہیے۔ ابھی تک میں بے گناہ تھا۔ مجھے جیل کی ایسٹینس سے زبردستی انگوٹیاں گیتھا اور اب تک میں جس بیچ میں تھا لیکن اگر اب میرے ہاتھوں کسی اعلیٰ سرکاری افسر کا قتل ہو جاتا تو مجھ پر لا قانونی اور عارت گری کا وہی دواؤہ مکمل جانا تھا جس میں ایک دفعہ داخل ہو کر میں اب تک پہنچتا رہا تھا۔ اپنی باری بن کے میری مصیبت نے میری سونے کھینچنے کی صلاحیتیں سلب کر لی تھیں اور کچھ نہیں سوچ رہا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ مجھے ذہن میں ایک موہوم سا منصوبہ تھا جو نہایت خطرناک تھی تھا اور ظاہری طور پر ناقابل عمل بھی۔ میں کسی بھی طرح چوٹی میں گھسنا چاہتا تھا۔ اس چوٹی کی بھول علیحدہ سے شتکا کو کھانا تو شاید دشوار ہوتا لیکن یہ تو ہو سکتا تھا کہ میں کسی ایسے فرد تک پہنچ جاؤں جس کی جان جاگیردار کو ایسے ہی باری ہو چمچے مجھے شتکا کی جان تھی۔ عجیب بات ہے گردش حال نے مجھے ہر ضابطہ اخلاق سے بے نیاز کر دیا تھا۔ حالات کو بھول جانا بھی انسان کی مجبوری ہے۔ اپنی بن کو بے رحم قاتلوں کے چنگل سے نکالنے کے لئے میں جاگیردار کے کسی بھی جیتنے کی کھینچ پر اپنا دیوالور رکھ سکتا تھا۔ چاہے وہ کوئی صد سال بوڑھا ہو یا دو سال کا بچہ۔ اس کے علاوہ میری سمجھ میں کوئی اور طریقہ نہیں آ رہا تھا۔ میں جانتا تھا قانون کا دواؤہ کھکھٹانے کا مطلب "شتکا" کی ازیتناک موت کے سوا اور کچھ نہیں ہو گا۔ یہ تصور ہی میرے لئے جان لیوا تھا۔

میں اپنے خیالوں میں غم تھا جب دور سے چوٹی کی دھم

سے پہلے کہ وہ اپنی سابقہ رفتار تک پہنچتا میں نے اس پر چلا تک لگائی اور اسے لیتا ہوا نرم نرم مدی جیسی بل پھری زمین پر گرا۔ اس کے جسم پر ہاتھ پڑتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مضبوط جسم کا مالک ایک کٹر بل جوان ہے۔ نیچے کرتے ہی اس کے منہ سے ایک خوش گالی نکلی اور اس نے بے دریغ میری پیشانی پر ٹکرایا۔

مجھے اس سے اس حرکت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ میں تو اسے نیچے بھی گرا نہیں چاہتا تھا۔ ایسا میں نے صرف اسے روکنے کی کوشش میں کیا تھا۔ ٹکر کھا کر میرا دماغ بھی گھوم گیا۔ میں نے جواباً ایک زوردار ہاتھ اس کی ٹھوڑی پر جما دیا۔ وہ زوردار کچھ پہلو کے بل گرانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت مجھے اس کے بائیں ہاتھ کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ بائیں ہاتھ مجھ سے بچہ آزمائیں تھا بلکہ کسی اور کام میں مصروف تھا۔ میری یہ خبر داری میری زندگی کی ضمانت بن گئی۔ ورنہ جو گمراہی وار چاقو میرے مقابل کی گھیس کے نیچے سے اس کے ہاتھ میں آنے والا تھا وہ ایک لمحے کے بعد میری آئیں کچھ پر ڈھیر کرتا۔ چاقو کے باہر آتے آتے میں نے مقابل کی کھائی جھلکی اور دوسرے ہاتھ سے ایک طوفانی ٹھکا اس کی ناک پر مارا۔ میرا واسطہ ایک سخت جان سے پڑا تھا۔ ورنہ وہ یہ ٹھکا کر ضرور ہاتھ بچھڑے ہوجوڑتا۔ اس نے نہ صرف اس ضرب کو برداشت کیا بلکہ ایک منہ زور جھٹکے سے مجھے نیچے کر لیا۔ میری سلامتی کا دوا دہار میرے دائیں ہاتھ کی گرفت پر تھا۔ اگر یہ گرفت ختم ہوجاتی تو بے شمار چاقو کھم کے کسی بھی حصے میں داخل ہوجاتا۔ دلہلیا زمین پر ہم دونوں کے درمیان ایک سنگین کشش شروع ہو گئی۔ میں کسی قیمت پر کھائی سے اپنی گرفت ختم کرنا نہیں چاہتا تھا اور میرا حریف ہر قیمت پر اپنے چاقو کے آزادانہ استعمال کی خواہش رکھتا تھا۔ اس کے منہ سے گالیاں بوجھاڑی صورت نکل رہی تھیں۔ لگتا تھا دنیا سے بت اٹکیا ہوا ہے۔ مرنا چاہتا ہے یا مار دینا چاہتا ہے۔ بتائیں کس کا ستایا ہوا تھا جو میری جان کو گھماتا تھا اور واقف اگر اس کے مقابل کوئی کڑور شخص ہوتا تو اس کا پتہ حال تھا۔ میں نے اسے بشکل قابو کر رکھا تھا۔ آخر کار مجھے ایک موقع مل گیا میں نے زور آزمائی کے دوران اپنی ایک ٹانگ غیر محسوس طور پر آزاد کرالی اور پھر گھٹنے کی ایک دھشاندہ ضرب اس کی ناف پر دے ماری۔ یہ ایکسپتہ کن ضرب تھی۔ ایک لمحے کے لئے مقابل کے رنگ نیچے ڈھیلے ہوئے اور میں نے پوری قوت سے اس کا بازو موڑ کر پیچھے پرکا لیا۔ اس کے مٹن سے بے ساختہ آہ نکلی۔ چاقو کے ہونے

پھل کی طرح اس کے ہاتھ کی خنسی سے جدا ہو کر کچھ جاگرا۔ میں نے اڑنا لگا کر اسے دھکا دیا اور دوسرے اوڑھے منہ کھیت میں گرا۔ مجھ پر اب وحشت غالب تھی اور اگر میرا حریف مزید قن فن دکھاتا تو میں بلا دریغ ام کندھا کاٹا ڈالتا۔

"کون ہے تو؟" میں نے غصیلی سرگوشی کی۔ جواب اس نے جاگروار اور حویلی کے کینوں کو شاہکار گالیاں اور مجھے بھی اس رگڑے میں رکھ لیا۔ غالباً وہ مجھے جاگروار کا رندہ سمجھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "اورانی خاں کے سلا اپنی زبان ذرا قابو میں رکھ اور دوست و دشمن کی پہچان میرا جاگروار سے کوئی حلق نہیں ہے۔"

اس نے مجھ سے ایک نازیبا رشتہ جو ذکر فرمایا۔ "میرم سے تعلق ہے تیرا؟"

دل چاہا کہ میں بھی جواباً اس سے کوئی اچھا رشتہ جو دونوں کے درمیان گلی گھونچ کر انیس تھا۔ میں نے کہا۔ "پاکل خانے اگر تو میری بات اطمینان سے سننے کا وعدہ کرے تو میں تیرا بازو چھوڑ دیتا ہوں۔"

اس نے زور سے نرم پڑتے ہوئے کہا۔ "تو کون ہے تو؟" میں نے ابھی سے اس کا بازو چھوڑ دیا اور وہ دم پیچے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ کچھ پوچش میرے سامنے تھا۔ میں نے کہا۔ "دیکھ بھائی۔ اگر زور آزمائی کا شوق ہے تو میں اب بھی حاضر ہوں لیکن اس سے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ ہم دونوں کسی ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ تو کیا کرنا تھا وہاں حویلی کی دیوار کے ساتھ؟"

میرے حریف نے مجھے سر تپا گھورا اور اس کا رویہ نرم پڑتا محسوس ہوا۔ وہ بولا "اگر تم جاگروار کے بندے نہیں تو تم وہاں کیا کر رہے تھے؟"

میں نے سر جھکایا "سوال تو تیرا معقول ہے بھائی۔ لیکن کیا میں کھڑے کھڑے جواب چاہتا ہوں؟"

ایکایک جیسے ہم دونوں کے درمیان بحث سے شکوک و شبہات دور ہو گئے۔ اس نے کہا "میرا نام صفدر علی ہے۔ میں اس سامنے والے گاؤں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اگر تم چاقو تو ہم وہاں جا سکتے ہیں۔"

میں نے بائیں جانب دیکھا۔ کھیتوں کے بارگاہوں کے آثار نظر آرہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ دو فرلانگ کا فاصلہ ہو گا۔ میں نے نیچے کچھ زمین ہاتھ پھیر کر صفدر علی کا گھسہ چاقو تلاش کیا اور اسے تھماتے ہوئے بولا "چلو ٹھیک ہے۔ میں چلا ہوں تمہارے ساتھ دیے بھی یہاں رکنا مطلب

نہیں۔"

ہم اونچے کادوں کے اندر گھنڈی گھنڈی چلتے گاؤں میں پہنچ گئے۔ اس وقت رات ساڑھے بارہ کا ٹٹل تھا۔ بارش میں بیگا اور سردی میں ٹھنڈا ہوا گاؤں تاریکی کا کھیل اڑنے سے خبر سو رہا تھا۔ کہیں کوئی پھریدار نہیں تھا۔ آواز نہ تھی بھی کوئی کھدو میں مجھے ہوتے تھے۔ صفدر علی اور میں گاؤں کے بیچوں بیچ پہلے ایک ٹھہرے ہوئے جوہڑ میں غوطہ زن ہوئے۔ کچھ سے کچھ رہائی حاصل ہوئی تو ایک مکان کے دروازے کے سامنے جا کر دھک پرلا تھی گی ٹھک ٹھک سنا دی اور کسی نے اندر سے کنڈی گرا دی میں نے دیکھا ایک تیس پینتیس سالہ شخص دو بیساکھوں کے سارے ایک ہاتھ کی انگلیوں میں لائیں پھسائے کھڑا تھا۔

صفدر علی نے کہا "معاف کرنا شامت۔ مجھے دیر ہو گئی۔ راستے میں یہ بھائی صاحب مل گئے تھے۔ مسافر ہیں ان کی گاڑی ایک نالے کے پاس خراب ہو گئی ہے۔"

شامت جلدی سے دروازہ چھوڑتے ہوئے بولا "آؤ آؤ جی آپ کا پانی گھر ہے۔"

ہم تینوں آگے پیچھے گھر کی بیٹھک میں داخل ہوئے۔ شامت ایک باخلاق دہائی تھا۔ وہ اس وقت گھروالوں کو بگا کر چائے پانی کا انتظام کرنا چاہتا تھا کہ میں نے اسے سختی سے روک دیا۔ صرف یہ درخواست کی کہ خشک کپڑوں کا ایک جوڑا مل جائے شامت نے ایک جھپٹے میں مجھے ایک تیند قیس لا کر دی اس دوران میرا "حریف" صفدر علی مٹی کی انگلی میں آگ جلا چکا تھا۔ ٹھوڑی ہی دیر میں کرا کر گرم ہو گیا۔ ہم دونوں کپڑے بدل کر آگ کے سامنے بیٹھ گئے۔ شامت کو مجبور کر کے ہم نے سونے کے لئے بھیج دیا۔ وہ صفدر علی کی پھولی ہوئی ناک دیکھ دیکھ کر خشک میں جھٹا ہوا رہا تھا۔ میرے زوردار گھٹنے نے صفدر علی کو بیس بوسہ دیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے چہرے پر بھی خراشیں تھیں اور شروانی کا کھار اڑھا ہوا تھا۔ باؤں میرے پہلے ہی ننگے تھے۔ ان حالات میں شامت علی کا خشک میں جھٹا ہونا غلط نہ تھا۔ شامت کے جانے کے بعد صفدر علی نے کہا۔

"پیارا بڑا اچھا آدمی ہے۔ میں نے خواخوہ اس سے بحث بول دیا۔ خیر کوئی بات نہیں سچ بتا دوں گا۔ اب آپ تاکیں یہاں کس طرح آنا ہوا؟"

وہ ایک دم سی "تم" سے آپ پر آ گیا تھا۔ شاید میرے جی لباس اور ٹیپ آپ نے اسے متاثر کیا تھا۔ میں نے بے تکلفی سے کہا "بھرا میرے! یہ" آپ شاپ" چھوڑ۔ مجھے

"تم" کہہ کر ہی بلا۔ سیدھا سا باندہ ہوں میں۔ تیری طرح۔" وہ ناک ہلکا کر لا "ہاں تو کیا مصیبت نہ پڑی تھی تم پر اس وقت؟"

میں نے کہا "یہی سوال میں تم سے بھی پوچھ سکتا ہوں۔"

درحقیقت ہم دونوں بل کرنے میں بچپنا رہے تھے۔ شکوک دور ہو چکے تھے لیکن اعتماد کی نفا ابھی پوری طرح قائم نہیں ہوئی تھی۔ باتیں کرنے ہوئے اچانک میری نگاہ اس کی شلوار پر جا پڑی جو ابھی صفدر نے آٹا کر کھوئی پر لٹکائی تھی۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شلوار پر پیچھے کی طرف خون کے تازہ دھبے ہیں۔ یقینی بات تھی کہ ان دو جوروں صفدر کی نظر نہیں پڑی ورنہ وہ ضرور انہیں چھپانے کی کوشش کرتا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"یہ خون؟"

اس نے چونک کر پیچھے دیکھا اور اپنا دھندرا لباس دیکھ کر جھل سا ہو گیا۔ خون کے پچھو دھبے اس کی قیاس پر بھی نظر آرہے تھے۔ گہری سانس لے کر بولا "آج صبح پلے میں تھیں اپنے بارے میں بتاتا ہوں۔ میں کھجرات کا رہنے والا ہوں۔ ذیل ایم اے کرنے کے بعد بیرون گار بھج رہا ہوں۔ جیسا کہ تم جانتے ہو اور تم نے کہا میں بھی پڑھا ہوا ہر پڑھے لکھے بیرون گار جو جوان کی ایک محبوبہ بھی ہوتی ہے۔ اپنے حاصل کرنے کے لئے اور جس کے بچوں کا باپ بننے کے لئے وہ دفتروں کے راستے میں جوتیاں گھستا ہے اور نوکری تلاش کرتا ہے۔ میرے حالات بھی اس سے ملتے جلتے ہیں۔ میں انجمن نامی ایک لڑکی سے پیار کرتا ہوں۔ وہ بی ایس سی کر رہی تھی۔ ان کی رہائش ہمارے ہی محلے میں ہمارے گھر کے قریب ہے۔ بے حد شریف اور خاموش طبع لوگ ہیں۔ انجمن تین بیٹوں میں سبھی ہے بھائی اور غیرہ کوئی نہیں۔ اس کے والد اکاؤنٹنٹ ہیں۔ انجمن سے میری دانشگری مت پرانی ہے۔ اس وقت وہ شاید نویں میں پڑھتی تھی اور میں سینئر ایئر میں تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری محبت میں شدت آتی گئی۔ گزرنے والے ہر موسم ادھ بیٹے والے ہر سال کے ساتھ ہم ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہوتے گئے۔

ہمارے اس تعلق نے قریباً چھ سال ہر ادھ بیٹے کا مقابلہ کیا تھا اور اب اتنا مضبوط ہو گیا تھا کہ اس کے ٹوٹنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ جلد یا بدیر ہم اپنی منزل پائیں گے۔ آج سے کوئی چار مہینے پہلے تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ روز بروز زندگی کے معمولی مسئلوں کے علاوہ کوئی بڑا

مسئلہ نہیں تھا لیکن پھر ایک واقعے نے سب کچھ الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا۔ انجم کے بڑوں میں ایک نے کرایہ دار انگر رہائش پذیر ہوئے یہ کوئی ایسا بھلے لوگ نہیں تھے۔ ان کی لڑکیاں بے حد فیشن ایبل تھیں۔ ایک لڑکی غلوں وغیرہ میں گلو کاروں بھی کرتی تھی۔ ایک روز وہ لڑکی دھوپ بیٹھنے آئے گھر کی صنعت پر چڑھی۔ اس نے لڑکوں کی طرح بال کٹوا رکھے تھے اور پتلون پیرس پتلی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر انجم نے اپنی چھوٹی بہن سے کہہ دیا۔

”دیکھو دیکھو یہ کیسی بگڑی۔“

یہ بات کسی طرح اس لڑکی کے کانوں میں پڑ گئی۔ وہ انجم کے ساتھ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئی۔ اس کی ہمیں بھی کوششیں اور گالی گھونٹیں۔ بات مردوں تک پہنچ گئی۔ انجم کے گھر ان کے دو دربار کا رشتہ دار آیا ہوا تھا۔ یہ ذرا بھڑا لڑکھن کا شخص تھا۔ اس کی وجہ سے یہ بھڑا اور بڑھ گیا۔ دونوں طرف سے تین چار آدمی زخمی ہوئے اور قاتل بھڑی بھڑی بات پہنچی۔ وہ شخص توڑا لڑی بھڑا کواپس دینی چلا گیا اور انجم کے گھر نے کی معیبت آگئی۔ انہیں روزگام خط اور دھمکیاں ملنے لگیں۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ بڑوسیوں سے دشمنی کا نشانہ ہے۔ محلے والوں نے ٹل جمل کر اس ناپسندیدہ گھرانے کو وہاں سے مکان بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اس واقعے کے تھوڑے ہی دنوں بعد دو بدلتاش شخص انجم کے راستے میں انجم کا پیچھا کرنے لگے۔ انجم نے گھروالوں کو اس بارے میں بتا کر پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے مجھ سے اشارہ کر دیا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس معاملے میں کیا کیا جائے کہ انجم انخوا ہو گئی۔ میرے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ پولیس میں رپورٹ درج ہوئی۔ انجم کے سابقہ بڑوسیوں کو شمال تفتیش کیا گیا لیکن کچھ پتا نہ چلا۔ یہ بہت با اثر لوگ ہیں۔ اپنے ہاتھ پاؤں پھاننا خوب جانتے ہیں۔ انہی دنوں اپنے ایک جاننے والے کی زبانی مجھ پر ایک خوفناک انکشاف ہوا۔ امفر نامی یہ شخص جی ٹی روڈ کے ایک پٹرول پمپ پر کام کر رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ کل رات ایک ٹیوٹا کار پٹرول پمپ پر پٹرول کے لئے رکی۔ اس میں کچھ سازندے اور ایک ایڈیٹر مرنا تھے۔ اس کے علاوہ سیاہ فتنے میں ایک لڑکی بھی تھی۔ لڑکی کے چہرے پر ایک غلبہ تھا۔ بتائی جیسے کے لئے اس نے غلبہ ہٹایا تو امفر کو کچھ رنگ بد گیا۔ وہ انجم تھی۔ اسے نانوے فیصد یقین ہے کہ وہ انجم تھی۔ اتنے میں گاڑی آگے چل دی۔ امفر کو کچھ اور تو نہیں سوجھا اس نے فہرٹ کر لیا۔ یہ خبر اگراس نے مجھے دے

دیا۔ یہ بھکر کا تجربہ تھا۔ میں نے ایک واقعہ کار کے ذریعے فوری طور پر پتہ کر دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ گاڑی کسی آقا قادر زماں کے نام رجسٹر ہے اور، یہ شخص گاڑی جموںک خاصاں کا رہنے والا ہے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ یہ شخص بہت بڑا جاگیر دار ہے اور نہایت با اثر شخص ہے۔ مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کیا کروں۔ پولیس کی طرف سے مجھ تلاش شخص کو کیا بدل سکتی تھی۔ با اثر افراد کے سامنے راز راز کے محاذوں کی کار کردگی ویسے بھی مضر ہو جاتی ہے۔ یوں بھی میں اس معاملے کی تفسیر کر کے انجمن کی بڑادی کو بدترین شکل دینا نہیں چاہتا تھا۔ بچپن کی محبت نے پکارا اور دل نے مجبور کیا تو میں تمام اندیشوں کو جھٹک کر اکیلا ہی سحرات سے براستہ جھٹک بھکر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ایک طویل اور کٹھن سفر کے بعد میں فقیروں کے چار
میں یہاں پہنچا۔ پیٹ میں بھوک اور جسم پر مٹلا پگھلا ہوا
تھا۔ میں اس گاؤں کے قریب سے گزر رہا تھا کہ رات کے
اندھیرے میں دہلی دہلی چہچہیں سن کر ٹھٹھک گیا۔ یہ نسوانی
آوازیں درختوں کے اندر سے آ رہی تھیں۔ میں حیران ہو کر
درختوں کی طرف بڑھا تو ایک دہلے پتلے دراز قد رسائی نے
میرا راستہ روک لیا۔ کہنے لگا ”کیا بات ہے یاؤ؟“

میں نے کہا ”ہاں لیکچروں کے پیچھے کیا ہو رہا ہے؟“
 کہنے لگا ”میری گھر والی ہے اس پر جن کا سایہ ہے۔ میر
 صاحب سے اس کا علاج کروا رہا ہوں۔“
 اتنے میں عورت کی جتنی ہوئی آواز آئی ”خدا کے لئے
 پہچاؤ۔ خدا اس لئے لے لے گا۔“
 میں نے دہلے پہلے غصے سے کہا ”پہلوان جی یہ تو کوئی
 اور معاملہ لگتا ہے۔“

اس شخص کے چہرے پر ایک کھسیانی سی مسکراہٹ نظر آئی۔ میرے گلے میں بازو ڈال کر مجھے ایک طرف لے گیا اور لوفرین سے بولا۔ ”باؤ جی! چھوٹو کس پیکر میں بڑھ گئے ہو۔ جو ان جہان آدمی ہو۔ چلو تم بھی رانجھا راضی کر لیتا۔ بڑی چلتی پھرتی لڑکی ہے۔ اسے دو دیا تین سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ یہ تو ازس نو ازس غرے میں نکال رہی ہے۔“

میرے ذہن میں انکارے بھر گئے یہ غیبت مجھے بھی
اپنے ساتھ گناہ میں شریک کرنا چاہتا تھا چور کو سارے چور
نظر آتے ہیں اسے بھی ہر شخص عزت کا لیرا نظر آ رہا تھا
وہ حقیقت وہ میرا ڈول دیکھ کر گڑو گڑا تھا اور اب اسے سمجھ میں
نہیں آ رہی تھی کہ حالات کو کیسے قابو کرے اسے میں لڑی
کی ایک اور سانچ بنائی دی۔ دس میں قابو سے باہر ہو گیا۔ نیچے سے

پہرہ پہن کر میں نے ایک زوردار ہاتھ اس کے منہ پر مارا
 اور انہیں کر جھاڑیوں میں گرا۔ میں ایک کرچوں کی سمت
 گیا۔ چند گز آگے ایک چھوٹی سی کھنیا نظر آئی۔ اندر لالین کی
 مٹم روکھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کھنیا میں داخل
 ہوا۔ دلچسپ شخص نے میرے عقب سے آواز دی۔
 ”اے۔۔۔ اے۔۔۔“

بادے اس شخص کا نام تھا جو کتیا کے اندر لڑکی
دست درازی کر رہا تھا۔ آواز سنتے ہی وہ باہر کی طرف لپکا۔
اس کے ایک ہاتھ میں لوہے کا وزنی چڑھنا تھا۔ مجھے اپنے سامنے
دیکھ کر اس نے چپے کو لاشعری کی طرح استعمال کیا اور بے دریغ
میرے سر کو نشانہ بنایا۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا اور ٹانگ
کی زردار ضرب و مقابل کے سینے پر لگائی۔ وہ لڑکھارائی گئی مگر
پچھے مجاز یوں میں گرا اور ایک دم اٹھ کر بھاگ نکلا۔ اتنے میں
مجھے عقب سے بھی بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ یعنی بات
تم کی کہ بلا پتلا شخص بھی فرار ہو رہا ہے۔ دونوں خامے پورے
ثبات ہوئے تھے۔ میں کتیا میں مگسا تو لاشعری کی روشنی میں
ایک لڑکی نظر آئی۔ اس کے جسم پر پانکائی لباس تھا شاید اسی
وجہ سے وہ اٹھ کر بھاگ نہیں سکی تھی اور ایک کونے میں
مکلی چنگیوں سے رو رہی تھی۔ میں نے اپنی گرم چادر اسے
توڑ دھانپنے کے لئے اور تسلی بخشی کی باتیں کیں۔ اس
نے بتایا "میرا نام مضران ہے۔ میرا بھائی ٹانگوں سے معذور
ہے۔ میری ماں بیمار رہتی ہے اور پچھلے سال میرا چاچا (باپ)
سانپ کے کاٹنے سے فوت ہو چکا ہے۔ یہ جھلی والا شیطان
مجھے سب "باداجی" کہتے ہیں۔ میری ماں کو اگلے سیدھے تعویذ
دیتا رہتا ہے۔ اس سے کہتا ہے کہ تیرے گھر پر کسی نے جادو کر
رکھا ہے۔ اس لئے تمہیں معصیت پر معصیت ڈرتی ہے۔ وہ
میری ماں کو روز جھلی میں بلا کر دم کیا کرتا ہے۔ کچھ دنوں سے
ماں زیادہ بیمار ہے اور آتھیں سکتی۔ اس کی جگہ وہ مجھے بلا لیتا
ہے اور مجھ پر دم کرتا ہے اور میں جا کر ماں کو بچھو کھنکھاتا
ہوں۔ آج اس کا دم کچھ لیا ہو گیا۔ مجھ سے کہنے لگا تیرے
گھر پر نعمت کے سامنے جوئے کمرے ہو گئے ہیں۔ تیری ماں
یا تیرے بھائی کی جان جا سکتی ہے۔ مجھے ایک دو سرا وظیفہ کنا
ہو گا۔ اس نے مجھے ڈرا دھمکا کر اس بٹھالیا اور جب عجیب
خوشیں کرنے لگا۔ گلتا تھا اس نے کوئی نشہ بھی کر رکھا ہے۔
کتنا قصامیں جو کچھ ہو اس کا ذہن باہر جا کر نہ کرنا۔ ورنہ منہ بھر
کی اذان سے پہلے تیرے گھر میں ایک موت ہو جائے گی۔
معدوی ہی در میں وہ بالکل شیطان بن گیا۔ میں نے پہلے اسے
لاسنے کی کوشش کی مگر جھجکا کر نہ کرنے لگا۔"

لڑکی کی ساری کمائی میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ کوئی نئی کمائی نہیں تھی۔ ایسی کمائیاں جہالت کے شانہ بشانہ گاؤں گاؤں اور دیسہ دیسہ بکھری ہوئی ہیں۔ میں صفرائی کو لے کر اس کے گھر گیا۔ شامت اور اس کی ماں کو سارا واقعہ معلوم ہوا تو وہ میرے بے حد ممنون ہوئے میں نے انہیں بتایا کہ میں ایک بے ٹھکانا آدمی ہوں۔ تھوڑی بہت ڈاکٹری آتی ہے۔ شہری زندگی سے گھبرا کر گاؤں گیا ہوں۔ سوچتا ہوں یہاں کوئی درواخانہ کھول لوں۔ ان لوگوں نے مجھے بے یقینگی کی کہ میں جس دن تھان چاہوں ان کے گھر میں رہ سکتا ہوں اور اپنے درواخانے کے لئے مناسب جگہ ڈھونڈ سکتا ہوں۔ یہ سادہ لوح و سہاٹی مجھے واقعی ڈاکٹر قسم کی چیز سمجھ رہے ہیں۔ ”میں ان کے قیام کے بعد مجھے شامت سے بہت قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔ مجھے پتا چلا کہ جاگیردار قادر زمان کون ہے اور کس کنزار کا آدمی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ خاندانی تماش بین ہے اور ہر سینے کو ان کے ایک بھرا اس کی حویلی میں ضرور ہوتا ہے جس میں ارد گرد کے زمیندار اور خوشحال لوگ بڑے شوق سے شرکت کرتے ہیں۔ وہ شہر سے نت نئی طوائف بلاتا ہے اور اسے بے پناہ انعام و اکرام کے ساتھ رخصت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دور دور کی طوائفیں اس کی حویلی میں آنے کے لئے بے قرار رہتی ہیں۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میری انجم بھی با معلوم حادثوں کا شکار ہو کر اس حویلی میں پہنچی ہے اور ابھی تک یہاں ہے۔ اپنی آمد کے دوسرے روز ہی رات کے وقت میں ایک خبر سے عیس ہو کر قادر زمان کی حویلی جا پہنچا اور کسی طرح اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ میری یہ کوشش نہایت طویل ثابت ہوئی۔ کئی راتیں میں لگا تار جدوجہد کرتا رہا لیکن کوئی ایسا طریقہ سمجھ میں نہیں آتا جو مجھے سلاحتی کے ساتھ اندر پہنچا سکے۔ میں کوئی کم بہتا نقص نہیں ہوں اور نہ ہی موت سے ڈرتا ہوں لیکن حویلی کے اندر میں پر نہیں مار سکا۔ شاید تم نے نہ دیکھا ہو وہ ار کے اوپر چاروں طرف ایک خاردار باڑ ہے۔ کم بختوں نے اس باڑ میں گرنٹ چھوڑ رکھا ہے۔ اندر پانی کی اونچی شکل ہے۔ یہ شکل داغ دار کا کام دیتی ہے۔ ایک بار وہ پیردا رواں ہر وقت موجود رہتے ہیں اور چاروں طرف نظر رکھتے ہیں۔ ایک روز چاندنی میں انہوں نے شاید کبھتوں میں میرا سایہ دیکھ لیا۔ ترخہ ہوائی فائرنگ ہونے لگی۔ ایک دو گولیاں میری طرف بھی آئیں۔ میں جان بچا کر بھاگ نکلا۔ ایک لمحہ رک کر مضرب علی نے سگریٹ سلگایا اور بولا ”تین روز پہلے مجھے معلوم ہوا کہ حویلی میں کام کاج کے لئے ملازم

بھرتی کئے جا رہے ہیں۔ میں نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور پناہ لیا۔ لیکن اس پر کلامت کی جستجو میں حوصلہ چلا گیا۔ وہاں جاگیردار قادر زماں کا ایک منشی امیدواروں سے سوال جواب کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ایک قریبی گاؤں سے روزگار کی تلاش میں آیا ہوں۔ میں نے اپنی پول چال ایسی رکھی جس سے ظاہر ہو کہ میں معمولی بڑھا لکھا ہوں۔ مجھے ملازم رکھ لیا گیا۔ میں اب خوش تھا کہ حوصلہ میں داخل ہو کر انجم کا سراغ لگا سکوں گا۔ مگر اپنی ملازمت کے پہلے ہی مجھے میں "میں پکڑا گیا۔ ایک شخص نے جاگیردار کے منشی کو بتا دیا کہ میں قریبی گاؤں سے نہیں بلکہ شہر سے آیا ہوں۔ میں نے بہت صفائی پیش کی کہ میرا اصل تعلق گاؤں سے ہی ہے اور میں واقعی بیوزگار ہوں مگر میری صفائی کا منشی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے نزدیک میرا یہ جرم ہی بہت تھا کہ میں نے جھوٹ بول کر نوکری حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ منشی حکم دین کے لیے دیت پر مجھے لکڑی کی ایک ٹھکنی میں کس دیا۔ اور پست پر تیس بیڑ مارے گئے۔ یہ بڑے ظالم قسم کے بیڑ تھے۔ میری کھال اڑھ گئی۔ یہ میرے لباس پر جو خون تھیں نظر آ رہے تھے انہی زخموں کا بچہ تمہارے ساتھ دھینکا منشی میں یہ زخم پھر چھل گئے ہیں۔ بہر حال میں پھر بھی خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ منشی نے مجھے صرف جھوٹ بولنے کی سزا دی۔ اگر ان لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ میری آمد کا اصل مقصد کیا ہے تو شاید اس وقت میری لاش کیس سڑ رہی ہوتی۔ اب مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا کروں۔ برسوں والے واقعے کے بعد میں بہت دل برداشتہ ہو گیا ہوں مگر بات تو یہی میں آتی ہے کہ بس خود کسی ہی کرلوں۔ کل صبح میں واپس چلا جاؤں گا۔ اب یہاں رہنے کا فائدہ بھی کیا ہے۔ اس بچاری کی مدد میں تو کیا شاید قانون بھی نہ کر سکے۔ بڑی بد نصیب نکلی ہے وہ۔ آخری الفاظ کہتے کہتے مندر علی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ بخیر تندرستی تارکی اور بارش میں بیٹھا اس حوصلہ کی جستجو میں سرکھیں پھوڑ رہا تھا۔ کیوں رو رہا تھا اور فریاد کر رہا تھا؟ اس دیوار کی دوسری طرف اس کی زندگی کی سب سے قیمتی متاع تھی اور وہ اس دیوار کو عبور کرنے سے عاجز تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہونا اسے روٹا ہی تھا۔ اچانک میرے ذہن میں اس لڑکی کا سراپا آیا جسے میں نے کچھ روز پہلے حوصلہ کے سمان خانے میں پائے دیکھا تھا اور جو میری گولی گھٹنے سے زخمی ہو گئی تھی۔ پہلے میں اسے نو عمر لڑکا سمجھا تھا لیکن بعد میں یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ کیس وی

قد انجم نہیں تھی۔

میں نے مندر علی سے کہا۔
"انجم وہ تو نہیں جس کے بال جھوٹے جھوٹے ہیں اور گردن لمبی ہے۔ بائیں رخسار پر ایک نمایاں تل ہے۔"
مندر علی نے اٹھ کھڑے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھ کر پھر اٹھ کر ایک تھیلے سے تصویر نکال لایا۔ یہ دیکھ کر یہ اس کی تصویر۔

میں نے تصویر دیکھی اور ہونچکا رہ گیا۔ میری گولی زخمی ہونے والی انجم ہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ تصویر میں اس کے بال کافی لمبے نظر آ رہے تھے اور اس نے بڑا خوبصورتی سے کاٹ کر انجیل سر پر ڈال رکھا تھا۔ وہ جگہ۔ ایک آپ میں تھی۔ یہ تصویر شاید کسی شادی میں اتاری ہو تھی۔ ایک خوبصورت دوشیزہ کی ایک دلکش تصویر تھی۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور پوری بات سمجھ میں آئی۔ مگر۔ عاتلہ انجم کے خوبصورت بال اس کے اغوا کے بن تراشے گئے تھے، اور اس بات کا تعلق اس چار ماہ پہلے جھگڑے سے تھا جس کے نتیجے میں انجم اغوا ہوئی۔ انجم ایک بد قماش گھرانے کی لڑکی کو پرانی کوہنتری لکھا تھا۔ اس ایک فقرے کا انتقام لینے کے لئے ان منشی القاب لوگوں نے اسے کیا ہے کیا بنا کر کہاں سے کہاں پھینکا تھا۔ انسان بھی کچھ کتنا سنگدل اور جنتی ہو جاتا ہے۔ ایک ذرا سی بات اس کے لئے زندگی موت کا مسئلہ بن جاتی ہے اور وہ اس بات کے مزے بھی جاتا ہے اور مار بھی دیتا ہے۔

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ محسن کی جانب سے "دوم" کی مدد مسم آواز سنائی دی۔ صاف پر محسوس ہوا جیسے کوئی چار دیواری پھانسی پر لٹکا رہا ہے۔ مندر نے جلدی سے لائین بجھا دی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ دروازے کی جھری سے آنکھیں لگائیں۔ ہمارے خدشات درست ثابت ہوئے۔ بیوی دروازے کے قریب دیوار سے ایک ساہوکار چپکا ہوا تھا۔ لمحہ بھر بعد سائے میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ لائین پر پاؤں بٹاتا بڑی احتیاط سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے بے آواز دروازے کی لکڑی گرائی اور پت کھول دیکر کم از کم پانچ آدمی اور اندر گھس آئے۔ ان ساروں نے چڑیوں کو ڈانٹوں کی صورت چوڑی پر لپیٹ رکھا تھا۔ وہ تین کے ہاتھوں میں لائین اور دو کے کندھوں پر راہنمائی تھیں۔ وہ کچھ دیر محسن میں کھڑے کل وقوع کا جائزہ لیتے رہے پھر دو آدمی اس کمرے کی طرف بڑھے جہاں شامت ماں اور بہن کے ساتھ سو رہا تھا۔ پہلے انہوں نے ٹھکانے پر

ڈال کر کھولنے کی کوشش کی پھر دروازے کو ہلانے لگے۔ آہٹ پر اندر سے شامت کی دہلی آواز آئی۔

"خون؟" مسلح افراد میں سے کسی نے جواب نہیں دیا۔ بہن نے؟ شامت نے دو بارہ پوچھا۔
جواب میں ایک لمبے لمبے شخص نے غصہ ناک لمبے میں گالی دے کر کہا "ماں دے دیر" دروازہ کھول۔ تیرے پو آئے۔

تین دو افراد نے ہماگ کر دروازے کو کندھے سے ٹکر ماری۔ وہ پرانی لکڑی کا ڈھلا ڈھلا دروازہ تھا۔ زراخ سے کھل گیا۔ اندر سے نسوانی چیخ سنائی دیں پانچواں افراد مار کر اندر گھس گئے۔ دو تین کردار آوازیں سنائی دیں اور چپنے والی آوازیں سسم کر خاموش ہو گئیں۔ مسلح افراد نے اہل خانہ کو ڈر دھکا کر چپ کر دیا تھا۔

"کہاں ہے وہ تیرا بیٹا؟" چند لمبے بعد کسی نے غرا کر کہا۔ پھر شامت کو ایک زوردار دھکا لگا اور وہ اپنی بیسیا کیوں پر لٹکا ہوا محسن میں آگرا۔

ایک چوڑے چٹکے شخص نے دروازہ قہقہے سے کہا۔ "استاد جی! ایک دروازہ وہ ہے۔" اس کا اشارہ ہمارے کمرے کی طرف تھا۔

تین چار آدمی کیلئے ہوئے ہمارے دروازے پر پہنچے۔ "دروازہ کھول دو اسے بھڑوے" دروازہ قہقہے سے استاد جی کہا گیا تھا۔ پناہ پیش ہو بلا۔

ہم دونوں تاریکی میں خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر زور سے دروازے پر دستک دی۔ یہ دستک بظاہر اس نے اپنی لاشی سے دی تھی لیکن آواز سے اندازہ ہوا کہ یہ لاشی نہیں بلکہ لمبا سا آہنی چٹا ہے۔ یہ کچھ مشکل نہیں تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔

مندر نے میرے کان میں سرگوشی کی "بادا اور اس کے ساتھ۔"
نور سے بھلی چمکی۔ چند لمحوں کے لئے محسن کا منظر واضح ہو گیا۔ میرا ہاتھ دیوار کی طرف بڑھا۔ یہاں میری لمبی شیر والی گولی ہوئی تھی جس کی جیب میں اعشاریہ پینٹیں کا بھرا ہوا دیوالو تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور شاٹنگ بیک کے اندر سے دیوالو نکال لیا۔

مندر لائین، مجھ پر چڑھا تھا۔ کمرے میں گری تارکی تھی۔ میں نے ہاتھ تھما کر مندر کا کندھا چھوا۔ ہمارے کان میں سرگوشی کی "میں چارپائی کے نیچے چھپ جانا ہوں" ہم

دروازہ کھول دو۔

"لیکن۔" مندر کے ہونٹوں سے لرزاں آواز نکلی۔

"لیکن کچھ نہیں" میں نے اس کی بات کالی "نہیں" کھولو گے تو وہ توڑ دیں گے۔ چلو کھول دو دروازہ۔"

میں نے اسے دروازے کی طرف دھکیلا اور خود جھاری ساز کی چارپائی کے نیچے رینگ گیا۔ یہاں ایک صندوق پڑا ہوا تھا۔ صندوق کے عقب میں دیوار کے ساتھ میرے لئے چھپنے کی بڑی موزوں جگہ بن گئی تھی۔ میں یہاں گھس گیا۔

میرا مندر دروازے کی طرف تھا اور دیوالو کی لمبی پر شامت کی انگلی بالکل تیار حالت میں تھی۔

دروازہ ایک بار پھر زور سے کھٹکایا گیا اور اس کے ساتھ ہی کمرے کی گلیوں کی بو چھار اندر آئی۔ ان گلیوں کے پس منظر میں شامت کی ماں اور بہن کی چیخیں گھنی گھنی تھیں۔ یوں لگتا تھا "عملہ" آدمیوں نے انہیں بڑی طرح خوف زدہ کر رکھا ہے۔ قہقہے کی چاپ سے میں نے اندازہ لگایا کہ

مندر دروازے کی جانب بڑھا ہے۔ اس کے ہاتھوں نے ٹھول کر گندی تلاش کی اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی لائین کی روشنی کمرے میں چلی آئی۔ اس کے ساتھ ہی مندر کو زوردار دھکا لگا اور وہ لٹکڑا ہوا چارپائی پر گر گیا۔ ان افراد

پیارا کر کے اندر گھس آئے۔ نیم تیری میں مجھے ان کی صرف زیریں کا نقش نظر آ رہی تھیں۔ اندر گھستے ہی انہوں نے مندر کو بے درخشاں مارنا شروع کر دیا۔ گھونٹوں اور ٹھوکروں کے علاوہ وہ اسے رانٹنے کے بٹ بھی رسید کر رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں کمرے کی کئی اشیائیں ٹوٹ گئیں پھر وہ اسے چھیننے ہوئے ساتھ دے کرے میں لے گئے ساتھ والے کمرے کا دروازہ اسی کمرے میں تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا تھا تو اس دروازے پر میری نگاہ پڑی تھی۔ پہلی نظر میں لگتا تھا یہ

ایٹھڈ ہاتھ دوم ہے مگر ایسے رومات میں ایٹھڈ ہاتھ دوم کا تصور ایسا ہی تھا جیسے کسی کچی ہستی میں قاتلہ اشارہ ہو لگا۔ یہ دروازہ قہقہے سے کمرے کا تھا اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ خاصا وسیع کمرہ تھا۔ عاتلہ پر آمد کے در بند کر کے اسے کمرے کی شکل دے دی تھی تاکہ سرجوں میں گھس بیٹھیں وغیرہ

باندھی جائیں یا پھر غلط ذخیرہ ہو سکے۔

مندر کا ہاتھ تارکے سے کمرے میں پہنچ گیا تو اس کے پیچھے ہی بیسیا کیوں کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ یہ بیسیا کیوں شامت کی انگلی تھیں اور ان کے عقب میں اس کی ماں اور بہن کے چٹے پاؤں نظر آ رہے تھے۔ عملہ اور انہیں بھی

دیکھتے اور ٹھہرتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بنگلہ دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔ صرف دروازہ ہی بند نہیں ہوا، اندر سے گنڈی بھی چھ گئی۔ اب چیخنے چلانے اور کرجے پرے کی آوازیں بت مدھم ستانی دے رہی تھیں۔ غالباً حملہ آور بھی یہی چاہتے تھے کہ یہ آوازیں مدھم رہیں ورنہ مار پیٹ تو وہ اس کمرے میں بھی پوری آزادی سے کر سکتے تھے۔

میں چند لمحوں پہلے اپنی جگہ ٹھکرا سنا، اندر سے آنے والی آوازوں پر غور کرتا رہا۔ صندوق پر دستور مار پڑی تھی، شامت اور شامت کی ماں حملہ آوروں سے رحم کی ہیک مانگ رہے تھے۔

میں بغیر آواز پیدا کیے پار چائی کے نیچے سے نکلا اور بنگلہ دروازے پر جا پہنچا۔ ایک روشن بھری سے آنکھ لگائی تو اندر سے وسیع منظر کا ایک حصہ سامنے آ گیا۔ دروازہ قفس نیچے اس کے سامنے "استاد" کمرے سے آئی سیاہ پگڑی، مار چکا تھا، یہ پگڑی اس نے صندوق کے گلے میں ڈال رکھی تھی اور پوری قوت سے مل دے رہا تھا۔ گلا ٹھنسنے سے صندوق کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور پیشانی کی رگیں ابھرتی تھیں، اس کی ٹھوڑی نیچے سے پھنی ہوئی تھی اور ناک سے بھی خون رس رہا تھا۔ پگڑی کی قیسم والے چوڑے نچلے قفس نے صندوق کے بال ٹسلی میں جکڑ کر رکھے تھے اور پورے زور سے اس کا سر نیچے جھکا کر کے کوشش کر رہا تھا۔

"کیس کیس نکال اوے۔ نکال کیس کیس" اس نے صندوق کو مان کی گائی دیتے ہوئے کھم کیا۔

صندوق نے پورے زور سے ٹانگ چلائی۔ پورا ڈچکا قفس اُچھل کر دور جاگرا اور میری نگاہ کے ذمے سے آؤٹ ہو گیا۔ دروازہ قفس نے پوری قوت سے پگڑی کو جھکادیا اور صندوق کو دیوار پر دے مارا۔ یہ ایک خوفناک ٹکڑ تھی۔ میرا کچھ دہل کر رہ گیا۔ کراچی کے ایک قمار خانے میں، میں نے اسی انداز میں ایک قفس کا بھیجا، سر سے باہر نکلے دیکھا تھا۔ دیوار سے ٹکرا کر صندوق کراہا اور سر قفس کے ٹھنڈوں کے بل زمین پر جاگرا۔ اسے شدید چوٹ آئی تھی لیکن وہ ابھی حواس میں تھا۔ دروازہ قفس نے اس کے بال ٹسلی میں لے کر چہرہ دو تین بار زمین پر رگڑا پھر اپنے ساتھیوں سے بولا "اس کئی کے پڑو کا باندھ کر ایک طرف ڈالو۔ اس سے بعد میں نہیں گے۔"

دو ڈھانچا پوش آگے چڑھے اور صندوق کو محبت کر ایک جانب لے گئے۔ میں نے پہلی بار غور سے دروازہ قفس کو

دیکھا۔ وہ سر تپا جتنا ہوا بد معاشی نظر آتا تھا۔ سر پر اُسترا ہوا، آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور مکاری سے بھری ہوئی۔ اس دائیں کپٹی سے بال اُڑے ہوئے تھے۔ وہ دھوئی لیس تھا۔ میں نے دیکھا، اس کی رچ بچھی آنکھیں ایک رخ مٹی تھیں۔ دروازے کی بھری سے مجھے نظر تو نہیں آیا، میں جان گیا کہ وہ کہہ دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہر ہوتی ہوس اور چرے پر چھائی ہوئی خباثت اعلان کر رہی کہ اس کی مرکز نگاہ شامت کی بہن ہے۔ سفاکی مسکراتے ہوئے اس کی باجیس کانوں تک چلی گئی تھیں۔ ہماری آواز میں بولا "ادھر لاؤ تاں ماس پڑے کو، ہم" دیکھیں کیوں آدھا پینڈا ہلکا ہو گیا ہے اس کے لئے۔

ایک تیز چیخ سنائی دی پھر دو افراد شامت کی بہر محبت گرد رازندہ استاد کے سامنے لے آئے۔ میں دیکھا، وہ ستر اٹھارہ برس کی ایک گوری چنی لڑکی تھی۔ نا اچھے تھے لیکن اس وقت دہشت نے اس کا چہرہ بگاڑ دیا۔ وہ سر اور پاؤں سے ننگی تھی۔ اپنے لباس اور اپنے میں کئی ہوتی وہ اصل قد کاٹھ سے کیسی مختصر نظر آ رہی اب میرے لئے اپنی جگہ کمرے رہنا ممکن نہیں تھا۔ بازو خود بخود اٹھنے جا رہے تھے اور انگلیوں کی پوریں سنسنار تھیں۔ ایک خوابیدہ قفس میرے اندر دے دار ہو رہا تھا۔ میں نے بہ آہستگی رخ پھیرا اور کمرے کے بیوی دروازے طرف بڑھا۔

باہر صحن میں مکمل تاریکی تھی۔ بارش مکمل کر رہی تھی اور گاہ بے گاہ بھی جھپک جاتی تھی۔ دروازے کی نیچے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ صحن میں کوئی نہیں۔ وہ پگڑی گینگ ساتھ والے کمرے میں ٹھسا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ چند قدم افکار میں طویل کمرے کے بیوی دروازے پر پہنچ کر دھنکی کی گونجیں میاں سے بھی پھوٹ رہی تھیں۔ اندر کسی کے غرائے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ "ناچو۔ ناچو۔ استاد تھا اور اس ڈوری سہی ہوئی لڑکی کو قفس کا حکم دے تھا جو تقریباً چند منٹ پہلے اپنی ماں اور بھائی کی حفاظت چھین کی فینڈ سوری تھی۔ ان بندہ منٹوں میں اس دیواری کے اندر قیامت گزر گئی تھی اور ابھی شہر ہوا والا تھا۔ میں نے دیوار پر گرفت مضبوط کر کے دروازہ آہستہ سے دھکیلا اور یہ جان کر ایسی ہوئی کہ میاں بھی سے گنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس دروازے میں بھی مجھ موجود تھیں لیکن یہ بہت باریک تھیں اور اندر جھانکنا ناممکن تھا۔ میں تیزی سے پہلے والے کمرے میں داخل ہوا۔

"ناچ۔ میں کتا ہوں ناچ، نہیں تو لاش کرادوں گا" استاد نے عجب دیوانگی بھرے لہجے میں کہا۔ استاد کی آواز بڑی خاموشی کی تھی، بیٹھی ہوئی اور بھرتی ہوئی سی۔ وہ پورے اندر سے بھی ہلکا ہوا تھا تو میں قدم سے دور آواز نہ جانی

ہوئی۔ استاد کا مطالبہ سن کر لڑکی ہاتھ جوڑنے لگی۔ ایک جانب سے اس کی ماں بھاگ کر آئی اور استاد کے قدموں میں گر گئی۔ استاد نے ایک زوردار ٹھوکر سے اسے پیچھے ہٹا دیا۔ پھر کھنٹی کھنٹی چیخوں کی آوازیں آئیں جن سے اندازہ ہوا کہ کمرے کے مشرقی کونے میں استاد کے کمانے عورت کو مار رہے ہیں۔

"ناچ" استاد نے بندوں کی ٹال لڑکی کی گردن میں دھنسا دی۔

لڑکی اب دہشت کی آفتاب چھوری تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ درخت کی دو ٹوٹی شاخوں کی طرح اٹھائے اور حد درجے کی بے بسی سے استاد کی طرف دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو "کیسے ناچوں؟ مجھے ناچنا نہیں آتا، میرے ماں باپ نے مجھے ناچنا نہیں سکھایا۔ انہوں نے مجھے سر ڈھانچا سکھایا ہے۔ سنبھل کر چلنا سکھایا ہے اور چلنے ہوئے نگاہ نیچی رکھنا سکھایا ہے۔ مجھے معلوم ہی نہیں کیسے گایا جاتا ہے؟" لڑکی کی معصوم آنکھوں میں چمکی ہوئی وہ بے بسی مجھے پوری جان سے تڑپا گئی۔ ایک لمحے میں اندیشوں کے پادل ہوا ہو گئے۔ میرے ذہن میں یہ سوچ چلی کہ کڑے کے مانند لڑائی "شاہ جہاں اگر تو آج اس معذور بھائی کی بہن کو نہ بچا سکتا تو اہلی بہن کو کھینچ کر بچا سکتا۔ یہ بہت سوچ، کس کی بہن معیت میں ہے۔ بس یہ سوچ کہ "بہن، معیت میں ہے، دور شہر معیت میں ہے جو ماں کے دودھ کی طرح پاک اور خالص ہوتا ہے۔" میری پوروں میں سنسنائی حرارت شعلہ بن گئی۔ میں نے ٹھوکر مار کر ایک کرسی کو الٹا اڑا دیوار سے جھک کر کھڑا ہو گیا۔ آہٹ ہوتے ہی کمرے میں چڑھ کر آواز فہم مٹی اور کھسکے سر سنائی دی۔ پھر "کیس کیس نکال اوے" مجھے ہوتے سے لہجے میں پوچھا گیا۔

چند لمحوں کے بعد خاموشی طاری رہی۔ تب کسی نے گنڈی

گرا، دروازہ کھولا۔ لالین کی روشنی کسی مستطیل کی صورت میں اندر آئی۔ اس مستطیل میں کسی راتقل بردار کا سایہ تھا۔ جو نشی راتقل بردار نے دروازے سے سر نکالا، میں نے جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑا اور پورے زور سے اسے دھکیلا ہوا اندر داخل ہوا۔ میری نگاہ سے پہلے استاد پر بڑی جھٹکیں چماڑے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی گرفت میں آئے ہوئے قفس کو پوری قوت سے دھکیلا کر استاد پر دے مارا۔ یہ سب کچھ ایک ساعت کے مختصر وقت میں ہوا۔ مجھ سچیم استاد اس آفتاد کے لئے قطعی تیار نہیں

تھا۔ زوردار دھکے سے وہ ڈکرا تا ہوا کرے۔ متوسط میں گرا۔ بارہ بور بندوں اس کے ہاتھوں سے نکل کر چارپائی کی طرف لڑھک گئی۔ دائیں جانب کھڑے دو افراد لاشیں سونت کر میری طرف آئے لیکن اس سے متحیر کہ ان کی انٹھی ہوئی لاشیں میرے جسم کو چھوتیں میں نے ہماگ کر ایک تسلی بخش نگر ایک لاشی بردار کے سینے پر ماری۔ اس اثنا میں دوسرے کے پیٹ میں لات پڑی اور وہ کچھ سے کی طرح ڈہرا ہو کر فرش پر گر گیا۔ تیسرا راتقل بردار چپنی ہوئی انھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ راتقل اس کے ہاتھ میں بھی لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کوئی چلائے یا تھا شاید کہتا رہے پھر عاتل اس نے کوئی چلانے کے لئے ہی راتقل سیدھی کی تھی کہ ٹپاک کی کوئی شے اس کے ہاتھوں سے ٹکرائی اور وہ تکلیف سے ڈہرا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ صفدر کے ہاتھ میں شامت کی ایک بیساکھی تھی۔ اس نے زین پر پڑے پڑے اسی بیساکھی سے راتقل بردار کو شدید ضرب لگائی تھی۔ درحقیقت یہ لمحہ اس لڑائی میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔ میں راتقل بردار سے کوئی چار گز کے فاصلے پر تھا۔ اگر وہ کوئی چلانے میں کامیاب ہو جاتا تو میرا زخمی یا مرحوم ہوتا جیسی تھا لیکن اب مجھے اتنی سہولت مل گئی تھی کہ میں راتقل بردار کے دوبارہ بھٹلنے سے پہلے اس پر جا پڑوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے ایک طویل جست بھری۔ اس جست کا اختتام ایک زوردار غلبہ پر ہوا۔ یہ نگر راتقل بردار کی سین پٹائی پر پڑی تھی اور پھر وہی آواز آئی جو تاریل کے کپے فرش پر کرنے سے آتی ہے۔

راتقل بردار اٹ کر دوڑ جاگرا۔ میری نگاہ استاد پر پڑی۔ وہ اپنی راتقل اٹھانے کے لئے بھاگا ہوا تھا۔ میں نے ایک قدم بڑھا کر راتقل کو ٹھوکری مار دی۔ وہ چارپائی کے نیچے ٹھس گئی۔ اس کے ساتھ ہی میرا بایاں بازو سانپ کی طرح استاد کی گردن سے لپٹ گیا اور دیوار کی سرد ٹال اس کی کینٹی سے لگ گئی۔

”خبردار! میں نے غار کر کہا، کوئی ماروں گا۔“

اپنا لہجہ سن کر مجھے یک گنا تسلی محسوس ہوئی۔ اس لیے میں وہی وحشت سٹ آئی تھی جو میرے ذہن مقابل کو مسحور کر کے اسے حوصلہ ہارنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ یہ لہجہ مصنوعی نہیں تھا کہ اس بچے کے اداکاری کی طرح جس جاب چاہے اپنا لیتا یہ تو ایک قدرتی عمل تھا جس پر میرا اختیار نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے کہ اس وقت میرے غیظ و غضب سے تھا۔ جب یہ غضب ایک خاص نقطے پر پہنچتا تھا تو یہ لہجہ آپوں آپ میرے

لہجوں میں آتا تھا۔ اس شفاک لہجے نے مجھ کو استاد کو چپے بجلی کا جھکا دیا۔ اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا اور بسمک کر رہ گیا۔

”خبردار! میں پھر چلاؤ، کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے ورنہ ماروں گا۔“

خدا کا وہ ہے اس کڑی مجھے وہ خود اندازہ چوٹیوں کے مانند نظر آ رہے تھے لگتا تھا جب چاہے انہیں مسل کر رکھ دوں۔ باوے نے اپنے آہنی چنے کو نیزے کی طرح سنبھال رکھا تھا اور پوری طاقت سے صفدر پر حملہ آور ہوا۔ کوٹا کر میری آواز نے اسے ٹھکانا۔ ”پچھے ہٹ جاؤ گے پچھے ہٹ جاؤ گے۔“ وہ بار کے ساتھ کھڑا ہوا۔ ”میں نے خودخواہی میں حکم دیا۔ باوا! اٹلے قدموں چلا پچھے ہٹ گیا۔ اس کمرے میں موجود ہاتھوں حملہ آور دم بخود کھڑے تھے عاتل انہیں توقع نہیں تھی کہ بازی اتنی تیزی سے اور اس انداز میں لپٹ جائے گی۔

”تم راتقل پھینک دو“ میں نے استاد کی گردن کو بجا دینے ہوئے راتقل بردار کو حکم دیا۔

وہ جیسے پہلے سے میرے حکم کا متحیر تھا اس نے راتقل یوں فرش پر پھینکی جیسے اس میں کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ میرا اشارے پر زخمی صفدر ٹھٹھکا تا ہوا اٹھا اور راتقل تک پہنچ گیا۔ راتقل ہاتھ میں آتے ہی اس نے اسے وارے لگا دیے اور اپنے قریب کھڑے دونوں افراد پر زور لگایا۔ ایلہ ہاتھوں میں وہ خاصا ہوشیار دکھائی دیتا تھا۔ سخت جان بھی درندہ جیسی مار اسے بڑی تھی ”وہ ہتھوں پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا راتقل پکڑنے کا انداز دیکھ کر میں سمجھ کر وہ اس طرح آٹھا ٹھس ہے۔

”کھنکھی کھنکھی چپیں ایک بار پھر میرے کانوں سے گزرائیں میں نے دیکھا کہ شامت کی بن اور ماں کمرے کے ایک تارک کوٹے میں سٹی بیٹھی تھیں۔ لڑکی نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے دھرا رکھا تھا لیکن چپیں پھر بھی اس کے ہونٹوں۔ ٹھٹھکی جاری تھیں۔ شکر کا مقام تھا کہ اس لڑائی کے دوران میں اپنی کمرے سے نکل نہیں سکی تھیں۔ اگر وہ باہر جا تیں تو اس وقت پورا محلہ محسن میں جمع ہو چکا ہوتا۔ میں شامت سے کہا کہ وہ اٹھے اور ساتھ والے کمرے کا دروازہ بند کر لیں۔ اس نے معمول کی نرح میرے ہم عمل لیا۔ اپنی چپنی ہوئی قمیص سے خون آلود ہونٹ پونچھ لیا۔

میرا لہجہ سنبھل کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے دینے کے لئے میں نے مجھ کو استاد کو کھینٹ کر ایک کمرے میں لے گیا۔

میں کر لیا۔ استاد کی گردن پر بے پناہ دباؤ تھا اور اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آئی پڑی تھیں۔ اگر وہ مزاحمت نہیں کر رہا تھا تو اس کی ایک ہی وجہ تھی۔ میرا لہجہ۔ اسے یاد کر چکا تھا کہ اگر وہ مزاحم ہوا تو میں اسے ”ٹانڈہ“ کرنے میں ذرا سی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔ وہی سہی کر میری گردن کے پوری کڑی تھی۔ یہ گرفت اس بات کا محسوس ثبوت تھی کہ آؤٹ پٹاز کے نیچے کیا ہوا ہے زور آور ہونے کے باوجود استاد گردن کو معمولی سی حرکت بھی نہ دے سکتا تھا اور اگر دیتا تھا تو ہونٹوں سے کراہ نکل جاتی تھی۔

دروازہ اندر سے بند ہو گیا تو میں نے شامت سے کہا کہ وہ چارپائی کے نیچے سے دوسری بندوں بھی نکال لے اور اسے آن لوڑ کر کے گولیاں مجھے دے دے۔ توڑی سی کوشش کے بعد شامت نے گولیاں نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔ اب میں بالکل بے فکر تھا۔ میں نے باوے کو حکم دیا کہ وہ پکڑیوں سے اپنے تئوں ساتھیوں کے ہاتھ پٹت پر باندھ دے۔ باوے نے شنگ لیں پر زبان پھیر کر استاد کا تارک چڑھ دیا اور پھر فوراً میری دیانت پر عمل کرنے کے لئے حرکت میں آیا۔ اس نے کئی بعد دیگرے تئوں افراد کے ہاتھ باندھ دیے۔ صفدر نے اپنی گمرانی میں مضبوط گریں لگوائیں۔ بعد ازاں باوے کے ہاتھ صفدر نے باندھے۔ اس عرصے میں استاد بہ دستور کھنکھی کھنکھی آواز میں بولتا رہا۔ معلوم نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن پر دست نہ ڈالا اور رکھا تھا۔ وہ بول تو سکتا تھا مگر اس کی بکواس میری سمجھ خراشی نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ کوئی کام کی بات نہیں کر رہا صرف پچھسی دھمکیاں دے رہا ہے یا مصالحت کی پیش کش کر رہا ہے مجھے ان دونوں معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

چاروں افراد کے ہاتھ بندھ گئے تو میں نے استاد کی کھنکھی چپنی سے ہتھول ہٹا کر گردن چھو ڈی۔ وہ شہ رگ کو سستا ہوا غزیا ”دیکھو تمہیں بچھتا پڑے گا۔ تمہیں معلوم نہیں“ میں کون ہوں؟“

”اوئے خنجر ہے تو۔“ مجھے پتا ہے ”میں نے غزا کر کہا۔ میرا غصہ موج پر تھا۔

”شامت نے عاجزی سے میری طرف دیکھا اور بولا ”اب اس معاملے کو اور نہ جھانیں۔“ میرا ان سے کوئی ٹھکانہ نہیں۔ آپ ان کو جانے دیں۔“

”اگر یہ کل پھر تمہاری بن کو بچانے آجائیں؟“ میں نے ہر خند لیے میں کہا۔

شامت منہایا ”یہ زور والے لوگ ہیں۔ میرا ان کا

محی الدین نواب کے قلم سے ایک
(دل گداز داستان)

شارٹ کٹ

قیمت: ۱۲۵ روپے

ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں۔

ایک ایسا نادار جسے آپ شروع کرنے کے بعد ختم تھے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

اپنے ہار یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون: ۲۲۴۲۱۲

اسٹاکٹ: علی بکسٹال

نسبت روڈ چوک میوہ ہسپتال، لاہور۔

فون: ۲۲۳۸۵۳

کوئی مقابلہ نہیں۔ آپ تو چلے جائیں گے لیکن یہ ہمیں زندہ درگور کر دیں گے۔

میں نے کہا "گھبراؤ مت پارے۔ اگر اس بات سے ڈر رہے ہو تو یہ بات کبھی نہیں ہوگی۔ میں ان کو اس قاتل نہیں چھوڑوں گا۔ پتہ قبروں سے بھی مرے نکلے دیکھیں تم نے نہیں دیکھے؟"

شامت نے مسکایا کہ "دو منٹ کے لئے ایک طرف اگر میری بات سن لیں۔"

میں نے کمری نظروں سے شامت کو دیکھا۔ شامت کے عقب میں اس کی ماں اور ہمیشہ نظر آ رہی تھیں۔ دونوں کمرے کے اسی نیم تاریک گوشے میں کبھی بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں بھی فریاد تھی جیسے یہ زبان خاموشی درخواست گزار ہوں کہ میں شامت کی بات سن لوں۔ میں نے صندوق سے کہا کہ وہ استاد کو نشانے پر رکھے اور ذرا سے نیچے پر اس کی مصیبت آسمان کو دے۔ صندوق نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ سخت زخمی تھا لیکن میرے اعتماد نے اسے جان وچھین کر دیا تھا۔ میں شامت کو لے کر ساتھ والے کمرے میں آیا۔

شامت نے دوتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔

"بھائی صاحب، ہم پر رحم کیجئے۔ یہ تم بڑے لوگ ہیں ان کو چھوڑ دیجئے۔"

میں نے کہا "اٹنی بات کر رہے ہو بھائی۔ بڑے کو چھوڑاتے ہیں کہ کچھ داتے ہیں۔ دیے استاد ہے کون؟"

شامت نے کہا "اس کا نام کارین ہے۔ بڑا خطرناک فتنہ ہے۔ میں نے سنا تھا کہ 'پادے' سے اس کی جان بچان ہے۔ آج آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ یہ بڑا ظالم ہے جی۔ قبر تک بندے کا چچا نہیں چھوڑتا۔ اور۔"

بولتے ہوئے شامت چپ ہو گیا۔ سہم کر اپنے خول میں سمٹ گیا "رک کیوں مجھے بولتے کیوں نہیں؟" میں نے اسے گھورا۔ وہ خون آنسو ہونٹوں پر زبان بھر کر رہ گیا۔ خوف سے اس کی ٹھٹھکی بندھی ہوئی تھی اور کوشش کے باوجود وہ کچھ بول نہیں پارہا تھا۔ میں نے مناسب الفاظ میں شامت کی ڈھارس بندھائی۔ پھر اسے کہا کہ وہ ماں اور بہن کو لے کر اسی کمرے میں چلا جائے جہاں وہ سو رہا تھا۔ اس کمرے کے معاملات ہم جائیں اور ہمارے حریف۔ لکچر ہیں وچوں کے بعد شامت نے میری بات مان لی اور دونوں عورتوں کو لے کر صحن کی دوسری طرف والے کمرے میں چلا گیا۔ حالانکہ میں نے شامت کو کافی حد تک مطمئن کر دیا تھا، پھر بھی اس کی طرف سے خلع موجود تھا۔ میں ممکن تھا کہ جب ہم استاد

"کارین اینڈ کمپنی" سے غصے میں مصروف ہوں وہ خوف ہو کر ماں بہن کے ہمراہ گھر سے نکل جائے ایسی صورت! سارا کھیل چوٹ ہو سکتا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے میں شمار اور دونوں عورتوں کو خود دوسرے کمرے میں چھوڑنے تاکہ باہر سے گنڈی لگا سکوں۔ بیس پر میری نگاہ ایک سے کمرے پر پڑی۔ یہ کمرہ فلیش کن سنیت ایک بڑے صندوق پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے شامت سے کہہ کر یہ کمرہ حاصل کر لیا اور اصل غنا طویل کرے میں داخل ہو کر یہاں صورت حال جوں کی توں تھی۔ باوا سمیت چارہ افراد مسافر کی کمریوں کی طرح دیوار کے ساتھ بندھے پڑے تھے۔ اور استاد کارین کو صندوق کی زد میں لے لیا تھا۔ صندوق کی انٹری لکچر پر تھی اور آنکھوں میں وہی دلیری جو اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دینے والے شخص کی آنکھ میں نظر آیا کرتی ہے۔ صندوق نے اب تک خود کو ایک بڑی سا مٹی ثابت کیا تھا پھر بھی مجھے احساس ہوا کہ مجھے یوں۔ استاد کارین کے پاس تھا پھر ذکر نہیں جانا چاہئے تھا۔ وہ ہوا بد معاش کسی درندے کی طرح زور آور اور خطرناک تھا۔ اگر وہ زخمی صندوق سے بچ جاتا تو انکھوں میں اس پر غالب آتا تھا۔

میں نے کارین کے سامنے پہنچتے ہوئے کہا "ہاں! جی۔ فرماؤ اب آپ کی کیا نسل سیدو کی جائے۔"

وہ اپنی نیکی ہوئی آواز میں بولا "دیکھو کا! اس بات بتنا بڑھاؤ گے، بڑھتی جائے گی، تم مجھ کو دلیر لگتے ہو۔ میرے ہاتھوں موٹے تو مجھے افسوس ہو گا۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟" میں نے چارپائی پر بیٹھ کر سگٹے ہوئے پوچھا۔

"ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ، خود بھی اٹھ رہو گے اور جن کی حمایت کر رہے ہو، وہ بھی فائدہ نہ رہیں گے۔"

میں نے چہرے پر سوچ کے اثرات پیدا کیے "اگر تمہاری بات مان لوں تو شامت کا چچا چھوڑ دو گے؟"

استاد کی باریک آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ شامت نے مجھے دوسرے کمرے میں جا کر اس کا ٹھیک ٹھاک تعارف کرا دیا ہے اور اب میں معاملہ رفع دفع کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی دھمکی ہوئی تو میری ہی تن گئی۔ کچے فرش پر خون تھوک گر ہوا۔ شریفوں کے ساتھ شریف اور بد معاشوں کے ساتھ بد معاش ہیں۔ چارہ جو فرے کسی سے پوچھ لو جس نے کارین کے ساتھ

نہ آگے بڑھ کر راتقل کی مال کارین کے تختے پر ماری۔ وہ درد سے تڑپ گیا۔ چوہا لال جھموکا کر کے اس نے صندوق کو ایک کھاسیکل گالی دی اور خوفناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔

میں نے صندوق سے کہا "یار! میرا تو ارادہ تھا کہ اس بہن کے بچکنے کو مقابلے کی دعوت دوں لیکن یہ تو راز بیخرا نکلا۔ ایک ہی جھگڑے میں ہی بڑا بیخرا۔ یار کچھ! کہیں یہ واقعی بیخرا تو نہیں۔ اتنی نرم و نازک ہڈیاں ایک مرد کی جیسے ہو سکتی ہیں۔"

"ہاں، یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا۔" صندوق نے کہا اور پھر جس انداز میں کارین کی طرف بڑھا۔

یہ بے عزتی کارین کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اس کے منہ سے گالیوں کا غلط فوارہ پھوٹ پڑا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ صندوق سے بچنے کے لئے پیچھے رہ رہا تھا۔ جو خبی وہ میرے قریب پہنچا، میں نے پوری غرت سے ایک ٹانگ اس کی پیٹھ پر بٹائی اور وہ چیخا ہوا باوے پر جا بیٹھا ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا میں اس کے سر پر پیچھ لگا تھا۔ میرے دماغ میں چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں ٹھوڑی دیر پہلے کا وہ منظر گھوم رہا تھا۔ یہ فیض انسان ایک بے گناہ لڑکی کی گردن میں بندوق دھنسا کر اسے ناچ دکھانے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ نوٹنی شاخوں کی طرح اٹھے ہوئے ہاتھ اور ایک فریادی نگاہ میرے تصور میں چمک رہی تھی۔ میں نے فرش پر پڑے استاد کی ایک ٹانگ پر پاؤں رکھ کر دوسری ٹانگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کا زخمی تھڑ میرے ہاتھ میں آیا تو وہ زنج ہوئے تھکے کی طرح بچھا۔ اگر اس کا لاڈلا ہیکر خراب نہ ہوتا تو یہ آواز گلی کے آخری سرے تک جاتی مگر اب یہ آواز کمرے کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ میں نے تختے کو دونوں جھکے دیے تو استاد سر زمین پر پڑنے لگا۔ کتاب کہتا ہے انسان۔ پھر بھی من ایناں کرتا ہے۔ ظلم کرتے ہوئے یہ نہیں سوچتا کہ ظلم نہ بھی سکتا ہے یا نہیں۔ یہی احساس میں استاد کو دلا تا جاتا تھا۔ اس کا تھڑ ٹوٹ چکا تھا اور چوٹ ٹھنڈی ہو کر ناقابل برداشت ہوئی تھی۔ ایسے میں معمولی سی جھجش بھی برداشت نہیں ہوتی۔ کہاں میں اس کا پاؤں رید کی طرح مروڑ رہا تھا۔ تکلیف کی شدت سے استاد کارین جیسے ہلکے ہو گیا۔ پہلے اس نے مجھے خوفناک گالیاں دیں۔ پھر میں نے اسے جھجھکیا کرتے لگا۔ تھیں تھیں ناکام ہو میں تو مجھ پر بچھنے کی کوشش کی۔ نتیجے میں اونڈے منہ زمین پر گر اور ایک بار پھر گالیاں بڑا تر آیا۔ میں بھی سہی جاتا تھا کہ اس کے اندر گالیاں کی جھجی "دراکشی"

خاک لگایا ہے اپنی قسمت کو دیا ہے۔" پھر اس نے صندوق کو اپنی نظروں سے دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تمہارے اس بندے نے باوے کو مارا ہے اور باوا اپنا جگر بے خدا کی قسم اس وقت گور زخمی آجیانا تو اس کی اور مات کی جان نہ چھڑا سکتا۔ پر تمہاری خاطر میں ان دونوں معاف کر سکتا ہوں۔"

کارین جیسے بڑے بڑے بد خصلت میں نے دیکھے تھے۔ بے لگوں کی لعلنی زبان پر اگر تو ماں اور بہن جیسے الفاظ اپنی بات کھدیتے ہیں! وعدوں اور سمجھوتوں کی تو کوئی وقت ہی میں ہوتی۔ اپنے تجربے کی بنا پر مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ اگر خدا ناخواستہ۔ خدا ناخواستہ میری عقل پر چھڑا نہیں اور میں کارین کی باتوں میں اگر اس کے گناہوں کو لول دوں اور اسلحہ اس میں لوٹا دوں تو وہ اس سترے موٹے سے فائدہ اٹھانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کریں گے۔ عین کھن تھا کہ صبح اس مکان میں ہم سب کی لاشیں پڑی ہوں اور مات کی بہن کسی دیران ڈیرے میں شرابی مردوں کے زخمی جاری ہو۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھیل گئی۔ میں نے استاد کارین سے مخاطب ہو کر کہا "اس کا مطلب ہے، تم شامت اور صندوق کو معافی دینے پر تیار ہو؟" وہ ک بات پر عجیب سا منہ بنا کر رہ گیا "میں نے اپنا سوال مکمل کر لیا ہے تمہارے؟" لیکن اگر انہوں نے معافی نہ دے تو؟

"کیا مطلب؟" استاد نے خشک لہجے میں کہا۔

"مطلب یہ کہ اگر انہوں نے معافی لینے کے بجائے ہماری دم میں منہ فٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو؟"

کارین کا چہرہ ایک لمحے میں کئی بدل گیا۔ میرے لہجے نے اسے سمجھایا تھا کہ اس کی بد بختی کا خاتمہ ابھی نہیں ہوا۔ وہ کراہ کر بولا "گناہے! تم اپنی ماں کو یقین کر کر رہو گے؟" پھر کھٹکے ہوئے اس نے ایک پاؤں کا زدن بے قراری سے دوسرے پاؤں پر ڈالا تھا۔ میں اس کے بائیں پاؤں کی لڑش منٹ محسوس کر رہا تھا۔ میرے لئے اس نتیجے پر پہنچنا قطعی مشکل نہیں تھا کہ کارین کا بائیں تھڑ شدید زخمی ہے یا ٹوٹ چکا ہے۔ اور غالباً وہی وجہ تھی کہ میرے جانے کے بعد اس نے صندوق پر پہنچنے یا اس سے راتقل چھیننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں نے صندوق سے کہا "یار! صندوق! گناہے! استاد کارین ایک بڑے بچہ ہو چکا ہے، ذرا دیکھ تو سہی۔"

استاد کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے وہ ابار ٹھٹھکے ہونٹوں پر زبان بھیر رہا تھا۔ میری دیانت پر صندوق

ہے، کج خرچ ہو جائے اب اس کے منہ سے رال نکل رہی تھی اور رنگ لیموں کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ سرور کو شش کے باوجود وہ اپنی انگلیں میرے پہلو اتنی آواز سے آزاد نہیں کر سکا تھا اور میری بات اس کے ساتھیوں کے لئے زیادہ دہشت ناک تھی۔ وہ دم بخود بیٹھے تھے۔

کارلین نیم جان ہو گیا تو میں نے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔ وہ دیکھ کر دھڑکنے لگا رہا تھا اور "ہائے ہائے" کر رہا تھا۔ میں نے منہ سے کہا "بھئی چنا بھانا آتا ہے؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میرے اثرات دیکھ کر منہ پر دم بھی بخود سا نظر آتا تھا۔ میں نے زمین پر پڑا چنا اٹھالیا اور استاد کارلین کو حکم دیا کہ وہ دائیں کرے۔

"ہائے میرا گنا۔ ہائے اوئے میں مر گیا۔"

استاد بچوں کی طرح رو رو کر ہانے بازی کرنے لگا۔ ایسے کچھ عظیم آدی کا بچوں کی طرح گڑگڑانا اور ہانے بازی کرنا ذرا مشکل سے تصور میں آتا ہے لیکن ایسا ہوتا ہے میں نے بار بار ایسا دیکھا ہے۔ بڑے بڑے چستے خاں اور زور آور لوگ اذیت سے بے بس ہو کر بچوں کی طرح ہلکتے ہیں اور قہقروں کی طرح رحم کی جھلک اٹھتے ہیں۔ استاد کارلین بھی یہی کر رہا تھا۔ اس کا نغز چٹا چور تھا اور میری "دسترس" میں تھا "اسے اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے ایک قدم بڑھا کر اس کے نغز پر ہلکی سی ٹھوک ماری وہ تڑپ گیا۔

"مناج حرام زائدے" میں نے بے پناہ غصہ سے کہا۔

استاد کارلین نے بے بسی سے پہلے میرے ریلو اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ یکبارگی اس کی ساری ہمت خالی ناگ کے راستے پر نہ رہی۔ وہ رتیلی دیواری کی طرح مگر اور میرے قدموں میں بٹھ گیا۔ اپنی جان کو عذاب سے نکالنے کے لئے وہ بے ہوش ہونے کی اداکاری کر رہا تھا۔ اس کی حاضر دماغی نے مجھے دل ہی دل میں مسکرائے پر مجبور کر دیا لیکن میں اسے ایسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے اسے سنبھلے تان کر دوبارہ دیوار کے سارے بٹھادیا۔ وہ کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف گرجا تھا۔ میں نے اسے ایک طرف سے سارا دیا۔

"منہ زور مجزی لاؤ" میں نے فرش پر پڑی سیاہ مچھری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

منہ زور فوراً میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے کارلین کے ہاتھ کس کر پشت پر باندھ دیے اور منہ زور سے کہا کہ وہ اسے سنبھال کر رکھے۔ پھر میں ساتھ والے کمرے سے ایک دوپٹا جیل کے دو بندے اور لپ اسٹک لے آیا۔ یہ اشیائے

اس صندوق سے لیں جو چارپائی کے نیچے پڑا ہوا تھا اور جس کی اوٹ میں مجھے چھپنے کی جگہ ملی تھی۔ کارلین بدستور "بے ہوش" پڑا تھا یعنی بے ہوش بنا ہوا تھا۔ میں نے اس کے کانوں میں بندے ڈال دیے اور سر ہر دوپٹا پھیلا دیا۔ بعد ازاں لپ اسٹک سے اس کے ہونٹ دنگے لگا۔ کارلین اپنے سر کو دائیں بائیں جھٹکے دینے لگا۔ وہ عجیب مصیبت میں تھا۔ عورت بننے کی ذلت بھی برداشت نہیں کیا رہا تھا اور "ہوش" میں اگر مزاحمت کرنے کا ریسک بھی نہیں لے سکتا تھا (کیونکہ ایسی صورت میں اس کا نغز پھر ٹھوکروں کی زد میں آجاتا) وہ بے ہوش کا ڈرا اور چائے ہوئے جو تھوڑی بہت مزاحمت کر سکتا تھا کر رہا تھا۔ استرا پھرے سر کا دھارو دینا اور کانوں میں بندے، کارلین کی صورت قابل دید تھی۔ منہ زور بھی اپنی چونچیں بھول کر مسکرائے پر مجبور ہو گیا۔

میں نے قریبی درجے سے کھیرا اٹھایا اور فلیش مین چارج کر کے کمان کھٹ کاڑھیں کی تصویریں اتار لیں۔ دیوار کے سارے ناگھیں پھیلائے پڑا وہ جتنا مضحکہ خیز لگ رہا تھا شاید میں بیان نہ کر سکوں۔ اس کے ساتھی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے اور فریادی نگاہوں کی زبان میں مجھے صلا دینی کی تلقین کر رہے تھے۔ سب سے پہلی حالت باؤسے کی تھی۔ وہ جانتا تھا "یہ سارا بکیرا اسی کا پھیلا ہوا ہے۔ نہ وہ شہادت کی ہن پر بری نظر ڈالتا نہ منہ زور کی مداخلت پر اسے اپنی جھل سے بھانپتا پڑتا نہ انتقام کی خاطر وہ استاد کارلین کو اس چار دیواری میں لا آتا نہ استاد یوں یادگار طریقے سے ذلیل و خوار ہوتا۔

میں نے سب سے پہلے باؤسے کی کو تھپتھپاتی بنا دیا۔ اس کے سر ہر دوپٹا ڈال کر ہونٹوں پر لائی لگائی۔ جھٹکے پٹائے اور پھنکارا زور چرے کی تصویریں لے لیں۔ پھر یہی عمل باقی تینوں افراد کے ساتھ بھی دہرایا۔ کسی نے چون و چرا نہیں کی۔ بس دنگوں کی طرح سر ہٹائے بیٹھے رہے اور مونچھیں پھڑکاتے رہے۔ استاد اب لڑھک کر فرش پر گر چکا تھا۔ وہ بے ہوشی کی انجھی اداکاری کر رہا تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ یہ اداکاری ہے۔ اگر میں ابھی اس کے نغز سے محبت کرتا تو وہ ستر سے لوٹ پوٹ ہو جاتا اور اٹھ کر میری بلائیں لینے لگتا۔ بہر حال وہ کافی ذلیل ہو چکا تھا "اب میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا چاہتا تھا۔

میں نے منہ زور سے کہا "جیسے کما تھا نا یہ کارلین بیچروں کے قبیلے سے ہے۔ دیکھ لابی کتنی سچ رہی ہے اس کے دونوں پر گستا ہے ابھی اٹھ کر ٹھٹھکا گئے گئے" منہ زور مسکرائے

میری کٹائی کی گھڑی رات کے تین بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ بیوی دیوانے کو اندر سے گھڑی چڑھانے اور مال غنیمت یعنی ہندوؤں کو سنبھالنے کے بعد میں اور منہ زور شہادت کے پاس پہنچے۔ منہ زور کی آواز پر شہادت نے دروازہ کھولا۔ نیند ان تینوں کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ شہادت کی ہن منہ زور ایک کونے میں کھٹی بیٹھی تھی۔ وہ دو کمران بیٹی کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔

شہادت کی بیمار ماں نے ہلک کر کہا "اب ہمارا کیا ہو گا پتہ پادا اور اس کے بد معاش ہمارا جینا حرام کر دیں گے۔"

"اب کا جینا حلال رہے گا ماں جی" میں نے اطمینان سے کہا "باؤسے کی اب جرات نہیں کہ اس گھبراہٹوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ اللہ نے چاہا تو اب آپ کو اس کی صورت نظر نہیں آئے گی" میں نے یہ بات پورے یقین سے کہی تھی۔ میں بد معاشوں کی تمام اہم اقسام اور ان کے پڑاؤں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کارلین بد معاشوں کی کن کئی قسم سے تھا۔ یہ لوگ عام طور پر مرنے مارنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ زیادہ سے زیادہ کسی کا ہاتھ پاؤں توڑ دیا، کسی کا مونچھیں لیا۔ ایسے لوگ صرف اپنے ذلیل ڈول اور بول چال کے سبب لوگوں پر اپنی دہشت قائم رکھتے ہیں۔ ان کی دہشت برقرار رکھنے میں سب سے اہم بدل ان کے بچوں کو بچوں کا ہوتا ہے۔ اپنے سے بڑے بد معاش کے چھتر کھا کر بھی چپ رہتے ہیں بشرطیکہ یہ کسوائی سر عام نہ ہو۔ یہ تمام صفات کارلین میں بھی بدرجہ اتم موجود تھیں لہذا مجھے یقین تھا کہ وہ اب کوئی مسئلہ کنٹرول نہیں کرے گا۔

ماں بیٹی کو ہر طرح کی تسلی بخشی دینے کے بعد منہ زور اور شہادت کے ساتھ دوسرے کمرے میں آگیا۔ بستر گیر پڑا دیکھ کر شہادت نے کہا "آپ نے اس کمرے سے باؤسے وغیرہ کی تصویریں اتاری ہیں؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا "لیکن اس میں تو ہم ہی نہیں تھے۔"

میں نے کہا "مگر اس کے بغیر بھی تو تصویریں اتاری جاسکتی ہیں۔ یہ سارے اخباری فوٹو گرافر دعوتوں اور پارٹیوں میں کئی کچھ تو کرتے ہیں۔"

منہ زور اور شہادت حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر منہ زور میری بات سمجھتے ہوئے مسکرایا۔ مسکرائے سے اس کی کبھی ہوئی یا بچہ خون ابلد ہو گئی۔ وہ مجھے درد سے کراہا۔ اٹھا۔ چونچیں اب ٹھنڈی ہو کر تکلیف دینے لگی تھیں۔ کندھے کے پچھلے حصے پر آنے والا زخم تو خاسا گھین تھا۔ میں

کا میں نے کہا "کیا خیال ہے، تمہارا سا ٹھٹھا لگوا دیا جائے۔ وہ کون سا کورس ہے قلم نہیں مار خان کا۔" او میری جھانجھ جھن جھن پھٹکتے۔ او میری جھانجھ۔ استاد نے گانا گائے تو بالکل خیریں بائی ہلکے ذرا غور سے دیکھ کر "اس کی شکل میں نیچے خیریں کی جھٹک نظر نہیں آتی، وہی ناگ ڈی کان۔ دیسی بھاری وجود۔"

منہ زور کے لئے ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ یاد اٹھ گیا کہ بولا "معاف کر دے جیون جو گیا۔ بہت ہو چکی ہے ہم سب سے ہماری توبہ" ہمارے اگلے چھیلوں کی توبہ۔ بس اب جانے دے ہم کو۔ ہمارے سروں پر قرآن رکھوالے اگر ہم اس واقعے کا کسی سے ذکر کریں یا دوبارہ کوئی ایسی حرکت کریں تو۔"

ایک دو سرا غنڈا جو نسبتاً نوجوان تھا باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگا۔ اب معلوم نہیں یہ رونا خوف کے سبب تھا یا جوت کے سبب۔ اس شخص کی ناگ پر میری ٹکڑی تھی۔ آٹھ ہی گھنٹے میں یہ ناگ بھول کر گیا ہو گئی تھی اور اب مونچھیں آنکھوں کو چڑھ رہی تھیں۔ میں نے باؤسے کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں۔ اگر تم چاہو تو اس واقعے کا ذکر ہر کسی سے کر سکتے ہو بلکہ مسجد سے اعلان کر سکتے ہو اور اس گھر میں آنے پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے، جب چاہو دیوار چاند کر آجا لیکن ایک بات یاد رکھنا، تمہاری تصویریں اس گھر سے میں محفوظ ہیں اور میں خود بھی اس گاؤں کے ارد گرد ہی موجود رہتا ہوں۔ جب بھی تمہاری محبت پکارے گی میں کپکپا دھماکے سے بندھا چلا آؤں گا۔"

وہ چاروں منہ زور بیٹھے رہے۔ پھر اوپر دیوار میری گود میں رکھا تھا۔ میں نے منہ زور سے کہا کہ وہ چاروں کے ہاتھ کھول دے۔ اس نے ہاتھ کھول دیے۔ میں نے ان کی بندھنیں تو قبضے میں رکھیں لیکن چنا اور لاٹھیاں وغیرہ واپس کر دیں۔ پچھلی ہوئی ناگ والا نوجوان ان میں سب سے قد آور تھا۔ میں نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنے استاد محترم کو کندھے پر لاوے۔ دو ساتھیوں کی مدد سے اس نے بے ہوش کارلین کو پٹھل کندھے پر لاوا۔ پھر وہ چاروں اس کمرے سے یوں نکلے جیسے یہ چھت ایک دھماکے سے ان پر گرے والی ہو۔ ذرا بعد میں نے بیوی دیوانہ کھلے اور بند ہونے کی آواز سنی۔

بچوں بد معاش اپنی دھن کو اڑانے ہو چکے تھے۔ میں نے کچن میں نکل کر دیکھا۔ بارش ٹوک چکی تھی۔ بیلوں کی اوٹ سے بھی بھی چاند اپنی جھٹک دکھا جاتا تھا۔

نے اندازہ لگایا کہ ٹانگے لگانے کی ضرورت ہے مگر اس وقت کسی ڈاکٹر تک رسائی ناممکن تھی۔ مادھ رکھ کر خون بند کیا گیا اور پتی پانڈہ دی گئی۔ دیگر چوڑوں کو بھی حسب شدت زہنت منت دی گئی۔ شامت کے پاس اسپرین کی گولیاں موجود تھیں۔ دو گولیاں کھا کر صفدر چٹک پر نیم دراز ہو گیا۔ میں نے شامت سے کہا کہ وہ اب جا کر آرام کر لے۔ وہ کہنے لگا "صفر! آپ کے لئے کھانا تیار کر رہی ہے۔ اگر آپ نے سوتا ہے تو کھانا کھا کر سوئے۔"

میں حیران ہوا کہ رات ساڑھے تین بجے یہ کھانے کا کون سا وقت ہے۔ شاید اہل خانہ نے سمجھا تھا کہ لڑائی مار کٹائی سے ہمارا کھانا بیاہتم ہو چکا ہے لہذا بیڑیانی کے تقاضے پورے کرتے ہوئے انہوں نے چولہا روشن کر لیا تھا لیکن زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ یہ کھانا ان کو ششوں کے لئے خراجِ حسین ہے جو ہم نے کارین اینڈ کینی کو میاں سے رخصت کرنے کے سلسلے میں کی تھی۔ محبت کا کتنا ساہو سا اکتار تھا۔ کھانا۔ رات کے ساڑھے تین بجے گرما گرم کھانا۔ انڈوں پر انھوں کی خوشبو ذرا تیز ہوئی تو صفدر کے چہرے پر بھی بدوش نظر آنے لگی۔ دو گھنٹے بارش میں بیٹھنے اور پھر زبردست دھیمکا شتی کے بعد اسے واقعی ہموک لگی ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد شامت کی والدہ ایک گول نرے میں کھانا لگائے اندر داخل ہوئیں۔ عقب میں صفر! تھی۔ اس نے دودھ سے بالاب بھرا بگ اور گلاس وغیرہ اٹھا رکھے تھے۔ میں نے کہا "ماں جی! آپ نے اس وقت کیوں تکلیف کی؟" وہ گھوگر آواز میں بولی "پڑا ہوں گے لئے کیا تکلیف ہوتی ہے؟"

اس جھوٹے سے فقرے میں اس نے تفکر، محبت اور بددلی کے تمام جذبات سو سہے تھے۔ باہر بارش ایک بار پھر شروع ہو چکی تھی۔ بجلی ٹپک رہی تھی اور بوندیں چائپ بجلی میں گر رہی تھیں۔ لائین کی خواب ناک روشنی میں انڈوں پر انھوں اور نیم گرم دودھ کا وہ ناشا یادگار تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں بھول گیا کہ میں کس صورت حال سے دوچار ہوں اور ابھی ایک گھنٹہ پہلے ساتھ والے کمرے میں کیسا میدان کارزار گرم ہوا تھا۔

اس ناشے کے بعد مجھے اور صفدر کو تھائی نصیب ہوئی تو رات کی سیاسی آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ کس دور سے کسی جھگڑے ہوئے مرغ نے بڑی ذہیلی وصالی اذان بلند کی۔ صفدر نے کھوئے کھوئے انداز میں سرگرت کے چند طویل کش

لئے اور بولا "ہماری بات تو درمیان میں ہی رہ گئی۔"

"کون سی بات؟"

"انجم والی۔"

"ہاں۔" میں نے چونک کر کہا "اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کتنے بالوں والی وہ لڑکی انجم ہی تھی۔" صفدر کی آنکھوں میں ایک دم آنسو تیرنے لگے "کتنا بد بخت ہوں میں۔ سب کچھ جانتا ہوں پھر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے سامنے حویلی کی اونچی دیوار ہے اور دوسری طرف وہ لڑکی ہے جس کے ساتھ میں نے جیسے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ جس کے بغیر زندہ رہنے کو میں نظر سمجھتا تھا۔"

ایک دم ہی مجھے بھی کمری اداسی نے ڈھانچ لیا۔ ہم دونوں ایک ہی شتی کے سوار تھے۔ اس اونچی دیوار کی دوسری طرف صفدر کا پیار تھا اور میری پیاری بہن تھی۔ وہ دیوار ہم دونوں کی دشمن تھی۔ اس میں لگا ہوا اینٹ گارا اس پر کھپے ہوئے خاردار تار اور تاروں میں دوڑتا ہوا کرنٹ! یہ سب کچھ ہمارے جذبات کا استخوان تھا۔ صفدر علی کی باتوں سے یہ حقیقت اب مجھ پر واضح ہو چکی تھی کہ میں نے حویلی کے متعلق جو اندازے قائم کیے تھے وہ زیادہ درست نہیں تھے اور اگر میں چڑی چھپے اندر گھسنا چاہوں تو اس میں ناکامی یا موت کے سوا کوئی تیسری چیز مشکل سے ہی ہاتھ آئے گی۔ میرے خیال میں حویلی کی بیرونی دیوار سے بھی اہم رکاوٹ! وہ اونچی بجلی تھی جو صفدر کے بقول داچ ٹاور کا کام دیتی تھی اور جہاں ہر وقت مسلح محافظ موجود رہتے تھے۔ حویلی میں قیام کے دوران میں ایک دفعہ بیرونی دیوار کے قریب پہنچ کر دوکھ بکا تھا۔ قریب پوری دیوار پر روشنی کا انتظام تھا۔ بجلی کا نوموڈو پچھلی دیوار پر کرنے کی کوشش کرنا تو بلندی سے نظر آ جاتا۔ صفدر کے بقول خاردار تار میں کرنٹ تھا۔ اس کرنٹ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ جہاں کرنٹ دوڑایا جاتا ہے وہاں اکثر الارم کا انتظام بھی کر دیا جاتا ہے جو نہی بنی رو منقطع ہوتی ہے یا کسی کو کرنٹ لگتا ہے، مخصوص الارم بجنے لگتے ہیں۔ یہ ساری رکاوٹیں مجھ سے تقاضا کر رہی تھیں کہ جوش کے بجائے ہوش سے کام لیا جائے لیکن میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ جوش سے کام لیا جائے؟ کیا ہوش کی چارپائی بچا کر اس پر غور و فکر کا تکیہ رکھا جائے اور آرام کیا جائے یا پھر قدم بڑھائے جائیں اور اس دیوار کو چیلنج کیا جائے جو غلم اور احتساب کے درمیان حائل تھی۔

مجھے سوچ میں غلطان دیکھ کر صفدر نے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا "میری گاڑی میاں سے کوئی ایک میل دور کھینے کھیتوں میں کھڑی ہے۔ اگر یہ گاڑی پکڑی گئی تو بیڑی معیت کھڑی ہو جائے گی۔"

"تو تم گاڑی پر میاں آئے تھے؟"

"ہاں۔"

صفدر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے کہ رہا ہو۔ دیکھو! میں نے تو سب کچھ بتا دیا لیکن تم نے اب تک ایک لفظ اپنے متعلق بتا کر نہیں دیا۔

مجھے احساس ہوا کہ صفدر سے ذہنی ہم آہنگی کے لئے ضروری ہے کہ میں بھی اسے مختصراً اپنے بارے میں آگاہ کر دوں۔ میں نے نیا سرگرت سٹکیا اور اپنے بائیں کو گوشہ تاریکی میں رکھتے ہوئے اسے اپنی کمائی سانا شروع کی۔ جیل کے شب دروز، خود پر ہونے والے قاتلانہ حملوں کی روداد، اسپرینس گاڑی سے اپنا اغوا، آقا قادر زماں کی حویلی میں گزارے ہوئے روز و شب، اپنی بہن کی بد قسمتی کا تذکرہ اور آخر میں ایک اہم مہم پر دو اٹھی، میں نے اختصار کے ساتھ سب کچھ صفدر کو بتا دیا۔ صرف وہ باتیں چھپائیں جن کا چھپانا میرے اور اس کے لئے سودمند تھا۔

صفدر حیرت کے سمندر میں غلطان، ستارہا۔ چچ چچ میں اس نے سوالات بھی کئے۔ جب یہ روداد ختم ہوئی تو میرے اور صفدر کے درمیان آپس آپ ہی اپنا تپتے اور بددلی کا مضبوط رشتہ استوار ہو چکا تھا۔ اس شخص سے ملے مجھے چو گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوئے تھے لیکن لگتا تھا میں چو برس سے اسے جانتا ہوں۔ کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کے لئے پہلے سے دل میں ایک گوشہ خالی ہوا ہے جو صفدر نے کمری سانس لیتے ہوئے سرگرت کو ایک خالی پلٹ میں ملا اور بولا "تمہاری تشویش بجا ہے وہ گاڑی کسی بھی وقت قادر زماں کے بندوں کو نظر آ سکتی ہے۔ انہیں تمہاری تلاش میں اس گاڑی تک پہنچنے آدھ گھنٹہ بھی نہیں لگے گا۔"

"پھر تمہارا کیا مشورہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

صفدر نے جیسے خیرا سوال سنا ہی نہیں۔ تاثرات سے لگتا تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی اور تشویشناک سوال سر اٹھا رہا ہے۔ مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھنے کے بعد بولا "تم نے کبھی باؤس کو پہلے بھی دیکھا ہے۔ میرا مطلب ہے قادر زماں کی حویلی میں؟"

"نہیں تو؟" میں نے چونک کر کہا "قادر زماں سے باؤس کا کیا تعلق؟"

"تعلق ہے" صفدر نے کہا "میں نے شامت سے سنا ہے کہ میری ٹریدی کے علاوہ باؤس کی ایک اور وجہ شہرت بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ قادر زماں کے لئے تجزیہ کرتا ہے ہر گاؤں دھند میں قادر زماں کا کوئی نہ کوئی خبر موجود رہتا ہے اور اس گاؤں میں باؤس کو تجزیہ کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔"

تشویش کی ایک لہ میرے جسم میں بھی دوڑ گئی۔ اگر باؤس کا حویلی سے کوئی تعلق تھا اور اس نے مجھے حویلی میں دیکھ لیا تھا تو زبردست گریز ہو سکتی تھی۔ میری میاں موجودگی کی اطلاع قادر زماں کو ہو سکتی تھی۔ امکان آٹھ دس فیصد سے زیادہ نہیں تھا لیکن امکان تو تھا۔ پھر ایک اور بات میرے ذہن میں آئی۔ اگر قادر زماں نے تجزیہ کا نظام قائم کر رکھا تھا تو میں ممکن تھا کہ یہ سلسلہ شریک پھیلا ہوا ہو۔ خاص طور پر ان لوگوں کے گرد جو قادر زماں کے نشانے پر تھے یا اس سے کسی قسم کا تعلق رکھتے تھے۔ ایسی صورت میں سرشنڈنٹ جیل! احمد رجال سہی کے گرد بھی قادر زماں کے خبر موجود ہو سکتے تھے۔ خبر قادر زماں کو اطلاع پہنچا سکتے تھے کہ کل جو شخص رجال سہی کو قتل کرنے کے مشن پر حویلی سے روانہ ہوا ہے وہ ابھی تک راستے ہی میں کہیں اٹکا ہوا ہے۔ میں اس بارے میں جتنا سوچ رہا تھا، مجھے یہ ضروری محسوس ہو رہا تھا کہ میں جلد سے جلد لاہور پہنچ جاؤں۔

○●○

ابھی پوچھی نہیں تھی کہ میں شامت کے گھر سے رخصت ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔ صفر! نے میری شطراں دھو دی تھی اور جہاں تک بوسا کا شہروانی سے کچھ دیر بھی صاف کر دی تھی۔ میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ جوتوں کا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے اپنا تسلیم شاہی جوتا میں نے گاڑی سے اترنے کے بعد راستے ہی میں ادا چھوڑ دیا تھا۔ شامت کے گھر میں ننگے پاؤں پہنچا تھا اور اب تک ننگے پاؤں تھا۔ میں اپنے ننگے پاؤں دیکھ رہا تھا۔ جب صفدر نے میری مشکل آسان کرنے کے لئے اپنی سنواری دیکھ کر گرگاہی میرے سامنے بیٹھ دی۔

"پہن لو! میرا خیال ہے تمہارے لیے۔"

میں نے گرگاہی میں پاؤں پھیرا۔ صفدر کے "خیال" کی تصدیق ہوئی۔ گرگاہی مجھے پوری تھی۔ جو تھوڑی مدت تھی وہ پہلے پھرتے سے دور ہو سکتی تھی۔ میں جانے کے لئے

تیار ہوا تو شامت کی بان روتی ہوئی میرے گلے سے لپٹ گئی
 ”چرا آج تو ہمارے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر آیا ہے لیکن
 تیرے بعد ہمارا بیانا بے گناہ ہنس لاوارث کر کے مت جا۔“
 شامت نے بھی دبے لفظوں میں خدشے کا اظہار کیا کہ
 کیس باوا اور اس کے بندے پھرتے آجائیں۔
 میں نے کہا ”آپ مجھ پر محمود سار کھیں۔ ایسے نشہوں
 سے مننے کا مجھے بڑا طویل تجربہ ہے اور اسی تجربے کی بنا پر میں
 آپ کو گارنٹی دے رہا ہوں کہ وہ آپ کو اپنا کالا منہ نہیں
 دکھائیں گے۔ ویسے بھی میں آپ کی طرف سے بے خبر
 نہیں رہوں گا، ہو سکتا ہے ایک دو روز میں پھر یہاں کا چکر
 لگاؤں۔“ پھر میں نے مندر کو ایک طرف لے جا کر کہا ”مجھے
 ایک فیصد بھی یقین نہیں کہ کاربن پھر اصرار کا رخ کرے گا۔
 اگر تم زیادہ ہی احتیاط کرنا چاہتے ہو تو ”مالِ نیت“ میں سے
 ایک رات نقل لوڑ کر کے پاس رکھ لو، کچھ اور نہیں تو تمہارے
 میزبانوں کا حوصلہ ہی بلند رہے گا۔“
 وہ اقرار میں سمجھتا نہ تھا مجھ سے کافی متاثر نظر آتا تھا۔
 اس کی آنکھوں میں ابھی تک اس منظر کی پرجائیاں تھیں
 جب گراؤنڈ کاربن میرے پہلوئی طرے کے داؤ میں کبوتر کی
 طرح پھر پھرا رہا تھا اور نکلنے سے قاصر تھا۔
 میں نے اس کا کندھا دباتے ہوئے کہا ”اور اب خود کو
 اکیللا نہ سمجھتا۔ میرے لئے انجم اور اپنی بہن میں کوئی فرق
 نہیں، انشاء اللہ وہ دونوں رہا ہوں گی اور بہت جلد ہوں گی۔“
 اہل خانہ کو خدا حافظ کہہ کر میں شامت کے مکان سے
 نکلا اور نیم تاریکی میں اسی احتیاط سے چلا جنوب کی طرف
 بڑھنے لگا۔ شامت کے گھر سے ایک بہت پرانی رسائی مجھے
 دستیاب ہو گئی تھی۔ اس کئی پہلی رسائی نے بارش کو خیر کیا
 روکنا تھا۔ میری سیاہ شروانی ضرور پھیلائی تھی۔ اب راستے
 میں کوئی دیکھ بھی لیتا تو وہ زیادہ حیرت کا اظہار نہ کرتا۔
 گاؤں سے نکل کر مجھے قدرے اطمینان ہوا اور میں کئی
 کے کھیتوں میں ایک تنگ راستے پر آگے بڑھنے لگا۔ بارش
 نے جبکہ جبکہ دلدل بنا رکھی تھی۔ ایک قدم آگے اور دو قدم
 پیچھے جانے والا لطف مجھ پر صادق آتا تھا۔ گاؤں سے تین
 فرلانگ آگے آتا تھا کہ اچانک بارش شدت اختیار کر گئی۔
 اس کے ساتھ ہی ازلے بھی پڑنے لگے یہ موسمی تبدیلی
 میرے حق میں تھی۔ میں گاڑی تک پہنچے ہوئے کم سے کم
 افراد کا سامنا کرنا چاہتا تھا اور بارش اس سلسلے میں معاون
 ثابت ہو رہی تھی۔
 قریباً ایک گھنٹے بعد میں اس کھیت میں پہنچا جہاں گئے کے

ڈٹے، محلے، ہڑدوں کے درمیان سرخ زبان سنی کی جھلک
 دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے وہ ایک چم چم کرتی ہوئی نہروں ہوا
 اپنی رومانی مجھ پر ایسی بیٹھ گئی کہ انتظار کر رہی ہو۔ اندھا دھند
 بارش نے خیب و فراز ایک کر رکھے تھے اور ٹانگوں کے
 نشانات پانی میں تھپ تھپ ہو چکے تھے میں چھاپ چھاپ پانی میں
 چلنا گاڑی تک پہنچا اور دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ اندر
 پہنچنے ہی پر ہست ہوا سے نجات مل گئی۔ میں نے عقب نما آئینے
 میں اپنا چہرہ دیکھا۔ چہرے اور سر کے بالوں کا براؤن رنگ
 بھینکنے کے باوجود جوں کا توں تھا۔ بالکل اصل معلوم ہو رہا تھا۔
 میں نے ڈیش بورڈ سے نکلتا نکال کر بال پھر سیدھے اوپر کو
 تپا لے۔ براؤن مومچوں اور بھوٹوں نے میری صورت حیران
 کن حد تک بدل رکھی تھی۔ وہی سسی کسرتی لیس نے
 پوری کردی تھی۔ طے کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے
 گاڑی کو اشارت کیا اور پورس گیزر لگا کر کھیت سے باہر لے
 آیا۔ اب ایک طویل بل کھانا پکا یا راستہ میرے سامنے تھا جو
 جگہ جگہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔
 ایک بار پھر میں نے وہی شامت کٹ استعمال کیا جس
 نے جوتی تک میرا سفر قریباً ۱۵ میل تک کر دیا تھا۔ چھ میل کا
 نہایت ٹھنک سڑک کے میں قریباً ایک گھنٹے میں اس پراچ روڈ پر
 پہنچ گیا جو تینوں بیڈ روڈس کے قریب تین روڈ سے جا ملتی
 تھی۔ اس وقت تک آٹھ بیج چکے تھے چھپا جوں پرستی بارش
 میں! گاڑی کا گزیاں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے ایک جگہ
 رُک کر چائے پی۔ آٹھ اخبار پر نظر دوڑائی اور پھر پوری رفتار
 سے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔
 سہ پہر کے ڈھائی بجے تھے جب میں نے راوی کا پل پار
 کیا اور لاہور میں داخل ہو گیا۔ راوی روڈ پر بادشاہی مسجد کی
 جھلک نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی بیٹا پرستان سرخائے گھرا
 تھا، پس منظر میں شاہی قلعے کے دو دروازے تھے۔ بھولے ہرے
 مناظر آنکھوں میں آتے تو سینے میں یادوں کی کئی گھنٹیاں
 غل گھٹکتیں۔ غصاؤں سے جالی پھیلائی خوشبو آنے لگی اور
 ساعت میں وہ آوازیں رس گھونٹ لگیں جو ہر شہر کی الگ
 پہچان ہوتی ہیں۔ میں نے اگر پچھلے کئی گھنٹے سے آنکھیں بند
 بھی رکھی ہو تو میں تو یہاں پہنچ کر میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ
 جس شہر میں ”میں پہنچا ہوں وہ لاہور ہے۔ زندگی سے معذور
 زندہ دلوں کا گمراہ“ زندہ لاہور۔
 مختلف بانی پچائی سڑکوں سے گزرتا ہوا میں لوڑ مال کی
 طرف چلا آیا۔ میں راستے ہی میں طے کر چکا تھا کہ مجھے گاڑی
 کہاں روکنی ہے۔ لوڑ مال سے چوڑی کی طرف جاتے ہوئے

میں راستے میں ایک ہوٹل کی بارنگ میں جاڑکا۔ یہ جگہ
 میرے لئے ہر طرح سے محفوظ تھی اور یہ بھی امید تھی کہ کرا
 مل جائے گا۔ گاڑی لاک کر کے میں باہر نکلا تو ایک ”یوٹیس
 پارٹی“ ہوٹل سے نکلنے کے بعد راتوں میں خیال کرتی اپنی
 پڑونگ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ میں اس وقت ایک مفور
 تھا اور ہر مفور پولیس کو دیکھ کر اندر سے رکتا ضرور ہے۔
 میں بھی تھوڑا سا رکا لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ یہ
 ”یرکاہٹ“ چہرے تنگ آجائی۔ میں نے ایک اچھتی نگاہ
 قانون کے محافظوں پر ڈالی اور ان کے پاس سے گزرتا ہوا
 ہوٹل میں آگیا۔ حسب توقع مجھے ایک ڈبل بیڈ دستیاب
 ہو گیا۔ فرضی شامتی کا ڈپر میرا نام چوہدری احسان الہی درج
 تھا۔ میرا کمرہ ایسی نام سے لگ ہوا۔ میں ہونڈیو کو کھانے اور
 لباس کے متعلق کچھ ضروری بات دے کر اپنے آرام دہ
 کمرے میں آگیا۔
 کھانے سے فارغ ہوا تو شام کے پانچ بجے تھے لیکن میں
 نے اس پانچ کوڑا کا ایک جانا اور لکھی تان کرسوئے کا ارادہ
 کر لیا۔ سوئے سے پہلے آنکھوں کی طرح مجھے بھی ہلکا ہلکا
 میوزک بھاتا ہے۔ بیڈ کے سرہانے سائز ٹیبل میں ایک ریڈیو
 نیپ ریکارڈز فٹ تھا۔ میں نے ریڈیو آن کیا۔ ایک اسٹیشن
 سے فلیکس گانے اور غزلیں وغیرہ نشر ہو رہی تھیں۔ میں نے
 تاب تھما کر آواز صاف کی اور کئی پر سر کر کہ آنکھیں موند
 لیں۔ موسیقی کی لہروں پر تیرتا ہوا دھرجے دھرجے نیند کی
 پُرسکون جھیل کی جانب بہنے لگا جہاں سفید براق ٹیلیں تیر رہی
 تھیں اور آبی پر بندے چمک رہے تھے۔ ایک جیسے کسی نے
 میرے کانوں میں خنجر گھونپ دیا۔ دد کی ایک شدید لہر دماغ
 سے اٹھی اور پورے جسم میں دوڑنے لگی۔ ساعت میں ایک
 ہانے گانے کے بول پوری سٹائی سے گونج رہے تھے۔
 ”یہ زندگی کے ٹپے دو دنیا میں کم نہ ہوں گے۔ افسوس
 ہم نہ ہوں گے۔ یہ زندگی کے ٹپے۔“
 میں نے تپ کر ہاتھ بوسیا اور ریڈیو آف کر دیا۔ اس
 سے پہلے کئی بار اس گانے نے مجھ پر ایسا ہی اثر کیا تھا اور
 جب بھی یہ واقعہ رونما ہوا تھا میں کئی ماہ تک ریڈیو اور نیپ
 ریکارڈز وغیرہ سے دور رہا تھا۔ میری بگڑتی یادیں وابستہ
 دھنیں اس گانے سے۔ ایسی یادیں جو دل دماغ پر پلغار کرتی
 دھنیں جو کم کے ہر سام سے پسینہ پھوٹ نکلتا تھا اور دل زخمی
 کبوتر کے مانند پسوں پھر پھرتا آ رہا تھا۔ کسی عجیب بات ہے
 بعض نغموں یا اشعار کے ساتھ ایسی یادیں بندھ جاتی ہیں کہ
 باوجود نغمہ لازم و ملہوم ہو جاتے ہیں۔ پھر اندر دفنے میں سے

کوئی ایک جب بھی ہمارے احساس کو کچھ کاٹا ہے، دوسرا
 خود بخود در خیال پر دسک دینے لگتا ہے۔ جیسے انک نیل کے
 دوہام میں گونجنے والا گیت ”گاندی آہل راجن دے“ میں
 ”لک لک تیرا ناواں“ ان بولوں کے ساتھ ہی نور محمد کا چہرہ اپنی
 تمام تر زیبائیت کے ساتھ تصور میں آ جاتا تھا۔ نور محمد کا خیال
 آتے ہی میری سوجوں کا چارہ ایک نکت مختلف سمت میں زواں
 ہو گیا۔ آہ نور محمد! کیا جیتی تھی۔ کسی حادثوں ہمیری رات
 تھی وہ جس نے مجھ سے جد کیا۔ کتنے ہولناک مناظر تھے
 وہ! میں یاد کر کے لرز گیا۔ معلوم نہیں نور محمد کے لواحقین کو
 اس کی موت کی خبر پہنچی تھی یا نہیں اور اگر پہنچی تھی تو ان
 کا کیا حال ہوا تھا وہ بیچارہ بیوی کی دوا لینے گھر سے نکلا تھا اور
 ایک سال تک واپس نہیں لوٹا تھا اور اب اسے کبھی نہیں
 لوٹا تھا۔ کسی جہزات کو نہیں، کسی تہوار کو نہیں، کسی موسم
 میں نہیں۔ پھر کالوگرانی کا خیال ذہن میں آیا۔ نیل کے گلے
 نے مارا مار کر اسے نیم جاں کر دیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس حال
 میں تھا اور تھا بھی یا نہیں۔ اس کالے شخص کا روشن تصور
 ہاتھ باندھ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور سر تھکا کر بولا ”ماشا!
 اہن کو بھل مت جانا، اہن کو یاد رکھنا، اہن انک نیل کی
 ہرک نمبر ۴ میں چکی پیتا ہے لیکن اہن کا دل تمہارے
 قدموں سے لپٹا رہتا ہے۔“
 رخ سوجوں کا سلسلہ ایک بار شروع ہوا تو دروازہ ہوتا
 چلا گیا۔ وہ غلظت بھی ذہن میں ڈر آئے جن کے خوف سے
 میں کبوتر کی طرح آنکھیں سچ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ درد کی
 ایک اور شب خواب کے گوند لگوں میں کٹ جائے اپنی
 معصوم بہن کی مجبوریاں قضا اندر قضا میرے سامنے آئیں
 جیسے عہد قدیم کی زر خرید لڑکیاں بندھے ہاتھوں اور رستے
 زخموں کے ساتھ ستاک آقاؤں کے سامنے کھڑی ہوں۔ میں
 نظر پھر کر ان مجبوریوں کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ایسا
 کرنے سے میرے اندر ایک آتش فشاں دیکھنے لگتا تھا اور
 مجھے لگتا تھا ”میں پھٹ پڑوں گا اور قرب و جوار کی ہر شے کو
 جلا کر خاکستر کر دوں گا۔ اس آتش فشاں کو کھنڈا رکھنے کے
 لئے میں نے ہاتھ روم میں گھس کے دو گلاس پانی یا پھر تین
 سلیپنگ پلو کھائیں اور بند حال ساہو کر بسر کر گیا۔
 اگلے روز میری آنکھ دس بجے سے پھٹ نہیں نکلی۔
 حسبِ بدایت بیڈ وینر نے میرے لئے ایک چلوں گھیس کا
 بندوست کر دیا تھا۔ نادھو کر میں نے لباس بدلانا تھا کیا اور
 اس کام کے لئے تیار ہو گیا جس کے لئے یہاں پہنچا تھا۔
 میرے پاس پرنسٹنڈنٹ احمد رجاں سانی کا مکمل ایڈریس

موجود تھا۔ مگر کاش اہل خانہ اور ملازمین کی تعداد مختلف معمولات سب کچھ میرے پاس نوٹ تھا۔ میں نے گاڑی نکالی اور جانے پہچانے راستوں سے گزرتا ہوا اقبال ٹاؤن پہنچ گیا۔ سٹیج ہالک اور مظاہر کو بھی دھونڈنے میں مجھے زیادہ وقت پیش نہیں آئی۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹہ میں یہ ایک شاندار کوٹھی تھی۔ ہم پلٹ کر "سای ہاؤس" کے حروف چمک رہے تھے۔ میں گاڑی گیٹ کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوٹھی بند پڑی ہے۔ کچھ آگے جا کر میں واپس پلٹا اور کوٹھی کے عین سامنے ٹک گیا۔ وہ حلوں فرش یعنی "ریسپ" جو کوٹھی کے گیٹ تک پہنچتا تھا گرد آلود تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ جھیلے دو تین دن میں کوئی گاڑی کوٹھی میں آئی نہ تھی۔ ہر سال اگر کوئی کوٹھی میں تھامی تو میرے لیے اندیشے کی بات نہیں تھی۔ یہ دفتری اوقات تھے اور اس فیصد امید تھی کہ پرنسٹنٹ صاحب اس وقت کام پر ہوں گے۔ ان کے سوا مجھے اس گھر میں اور کون پہچان سکتا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر کال بیل پر انگلی رکھی اور اُن الفاظ کو ترتیب دیا جو مجھے اہل خانہ سے کہنے تھے اور جن کی تراش خراش میں رات سوئے سے پہلے ہی کرچکا تھا۔ قریباً ایک منٹ بعد گیٹ کی دوسری جانب ٹھٹ پٹ سنائی دی اور چھوٹی سی چمدنی واٹر می والے ایک بھائی بابا جی نے دروازہ کھول دیا "جی جیاب؟" انہوں نے کھوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔

ایک نظر محسن کے اندرونی حصے میں ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اہل خانہ گھر سے باہر ہیں "میں نے کہا" مجھے سای صاحب سے ملنا ہے۔

بابا جی نے پوچھا "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"خبر ات سے۔ میرا نام احسان الہی ہے۔"

بابا جی بولے "سای صاحب تو تھپالی گئے ہوئے ہیں۔"

"کب سے؟"

"دو روز ہوئے۔"

"کب تک واپس ہوگی؟"

"نہیک طرح پتا نہیں جی۔ ڈیڑھ دو مہینے کا پروگرام ہے۔"

"اوپ" میں نے ہونٹ کھینچے "گھر میں اور بھی کوئی نہیں۔"

"نہیں جی۔ گھر والے بھی ساتھ ہی گئے ہیں۔"

بابا جی سخت مزاج چوکیدار ہونے کے باوجود کہ آپرہ

نگاہ میں آیا تھا۔ میں نے ہوٹل کی طرف جانے کا ارادہ لہتی کر دیا اور سید صاحبزادی چوک میں پہنچ کر سبز چٹائی کی طرف مزید۔ یہاں سے میں نے تین روز کا راستہ اختیار کیا اور دوبارہ چین مندر کی طرف چل دیا۔ اب یہی کہ کوئی گھٹا نہیں تھی۔ رکنا مسلسل پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے کار سے درمیانی فاصلہ پر قرار رکھنے کے لئے سرخڑی بازی لگائی ہوئی تھی۔ کھلی سڑک آتی تو وہ پیچھے نہ جاتا لیکن جوئی تھکان بڑھنے کے سبب میں رفتار دھیمی کرنے پر مجبور ہوتا۔ وہ گاڑیوں کے دائیں بائیں سے رست بناتا میرے قریب پہنچنے لگتا۔ قریباً تین منٹ کی بھاگ دوڑ کے بعد میں نے گاڑی جناح گارڈن کے ایک مشی گیٹ سے اندر داخل کر دی اور لاک کر کے باہر نکل آیا۔ رکنا شور مچانا اور دھواں پھونکا

گیٹ کے عین سامنے آڑھا۔ اس کے اندر سے ایک لڑکی برآمد ہوئی۔ وہ جدید تراش کے خوب صورت لباس میں تھی۔ لمبے براؤنش بالی شانوں اور پٹ پر بھول رہے تھے۔ ایک شانے سے ہینڈ بیگ لٹک رہا تھا۔ دوپٹا کسی تیلگو آبشار کی طرح گردن کے عقب سے نمودار ہوا تھا اور خوب و فراز کو لے کر تھکنوں تک پہنچ رہا تھا۔ وہ رکشے سے اتر کر ایک حسین مجسمے کی طرح ساکت کھڑی ہوئی اور بائی بائی کی ایک ٹک میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے آنکھوں کا ٹوکس درست کیا اور بکھٹ رنگ میں خون سننا اٹھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا وہ غزالہ تھی۔ میں اسے کہے بھول سکتا تھا؟ بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ بھول کر بھی مجھے یاد رہتی تھی۔ جیسے یہ یاد رہتا تھا کہ ایک سانس کے بعد مجھے دوسرا سانس لینا ہے۔ چلتے ہوئے ایک ہاؤس اٹھانے سے پہلے دوسرا ہاؤس زمین پر رکھنا ہے۔ سوتے ہوئے آنکھیں موندتی ہیں جانتے ہوئے پلٹیں جھپکاتی ہیں اور پانی پیتے ہوئے کھونٹ بھرتا ہے۔ ان سب افعال کی طرح غزالہ کی یاد بھی میری عادت بن گئی تھی۔ یہ دور مرحلہ ہوتا ہے جہاں بھولنے یا نہ بھولنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جہاں خیال اور بے خیالی ایک دوسرے میں کم ہو جاتے ہیں۔ اور غزالہ اس وقت مجھے سامنے تھی۔ اپنی نگاہوں میں اُن گت ٹکڑے سینے، دو ٹکڑے دیکھی چلی جا رہی تھی۔ مجھ کو مجھے قدموں سے چٹکی میری طرف آتی جیسے ایک بلند دھالا لہر ساحل کو دھالا کرتے کے لئے بڑھ رہی ہو لیکن بظاہر خاموش اور ہموار ہو، کوئی شور ہونہ شریہ مری۔ وہ میرے بالکل سامنے آڑھی۔ میں نے سہا "اب وہ چہ دوڑے گی۔ ساحل کو دھالا کوئی کی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی فطری عمل مزاجی نے

نگاہ میں آیا تھا۔ میں نے ہوٹل کی طرف جانے کا ارادہ لہتی کر دیا اور سید صاحبزادی چوک میں پہنچ کر سبز چٹائی کی طرف مزید۔ یہاں سے میں نے تین روز کا راستہ اختیار کیا اور دوبارہ چین مندر کی طرف چل دیا۔ اب یہی کہ کوئی گھٹا نہیں تھی۔ رکنا مسلسل پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے کار سے درمیانی فاصلہ پر قرار رکھنے کے لئے سرخڑی بازی لگائی ہوئی تھی۔ کھلی سڑک آتی تو وہ پیچھے نہ جاتا لیکن جوئی تھکان بڑھنے کے سبب میں رفتار دھیمی کرنے پر مجبور ہوتا۔ وہ گاڑیوں کے دائیں بائیں سے رست بناتا میرے قریب پہنچنے لگتا۔ قریباً تین منٹ کی بھاگ دوڑ کے بعد میں نے گاڑی جناح گارڈن کے ایک مشی گیٹ سے اندر داخل کر دی اور لاک کر کے باہر نکل آیا۔ رکنا شور مچانا اور دھواں پھونکا

گیٹ کے عین سامنے آڑھا۔ اس کے اندر سے ایک لڑکی برآمد ہوئی۔ وہ جدید تراش کے خوب صورت لباس میں تھی۔ لمبے براؤنش بالی شانوں اور پٹ پر بھول رہے تھے۔ ایک شانے سے ہینڈ بیگ لٹک رہا تھا۔ دوپٹا کسی تیلگو آبشار کی طرح گردن کے عقب سے نمودار ہوا تھا اور خوب و فراز کو لے کر تھکنوں تک پہنچ رہا تھا۔ وہ رکشے سے اتر کر ایک حسین مجسمے کی طرح ساکت کھڑی ہوئی اور بائی بائی کی ایک ٹک میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے آنکھوں کا ٹوکس درست کیا اور بکھٹ رنگ میں خون سننا اٹھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا وہ غزالہ تھی۔ میں اسے کہے بھول سکتا تھا؟ بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ بھول کر بھی مجھے یاد رہتی تھی۔ جیسے یہ یاد رہتا تھا کہ ایک سانس کے بعد مجھے دوسرا سانس لینا ہے۔ چلتے ہوئے ایک ہاؤس اٹھانے سے پہلے دوسرا ہاؤس زمین پر رکھنا ہے۔ سوتے ہوئے آنکھیں موندتی ہیں جانتے ہوئے پلٹیں جھپکاتی ہیں اور پانی پیتے ہوئے کھونٹ بھرتا ہے۔ ان سب افعال کی طرح غزالہ کی یاد بھی میری عادت بن گئی تھی۔ یہ دور مرحلہ ہوتا ہے جہاں بھولنے یا نہ بھولنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جہاں خیال اور بے خیالی ایک دوسرے میں کم ہو جاتے ہیں۔ اور غزالہ اس وقت مجھے سامنے تھی۔ اپنی نگاہوں میں اُن گت ٹکڑے سینے، دو ٹکڑے دیکھی چلی جا رہی تھی۔ مجھ کو مجھے قدموں سے چٹکی میری طرف آتی جیسے ایک بلند دھالا لہر ساحل کو دھالا کرتے کے لئے بڑھ رہی ہو لیکن بظاہر خاموش اور ہموار ہو، کوئی شور ہونہ شریہ مری۔ وہ میرے بالکل سامنے آڑھی۔ میں نے سہا "اب وہ چہ دوڑے گی۔ ساحل کو دھالا کوئی کی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی فطری عمل مزاجی نے

اسے اس جذباتی پن سے دور رکھا۔ بس دو آنسو اس کے شاداب رخساروں پر دھلک آئے "اس نے ایک دم مہم سسکی لی اور میرے کندھے سے لگ گئی۔

"کب تم کہاں تھے شاہ جہاں؟"

ایک آواز اس کے سینے کی گہرائیوں سے نکلی اور میرے دل کی گہرائیوں کو چھو گئی۔ کبھی کبھی انسان ماحول سے کتنا بیگانہ ہو جاتا ہے۔ ویران کوٹھے میں رنگ و بو کی دنیا بایا ہے اور بھی بھری پری سڑک پر مکمل خالی دھونڈ لیتا ہے۔ غزالہ اس وقت خود کو تنہا سمجھ رہی تھی حالانکہ کم از کم دس افراد کی نگاہیں ہم پر تھیں جن میں سائیکل اسٹینڈ والا، رکشے والا، خزانے والا اور چھ سات دیگر افراد شامل تھے۔ میں نے یہ آہستگی اسے جڈا کیا "یہ کیا حرکت ہے؟ لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں؟"

وہ جانتے ہوئے میرے شانے سے چٹ سی گئی۔

اس کی ناک میرے گوشت میں دھنسی رہی تھی اور سسکیاں خبر دے رہی تھیں کہ میرے شانے سے قمیض جھپکنے والی ہے۔ میں نے اس کے کندھوں کو بظاہر ہری لیکن سختی سے پکڑا اور خود سے ہٹا کر دیا۔

"غزالہ! خود کو سنبھالو۔ لوگ ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لمبے جسم کی موکر آئی تھی۔

وہ میرے دھکے سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ چہرے پر بے بسی تھی جیسے کوئی بچہ بڑے چاؤ کے ساتھ اپنے بزرگ کی

جب میں ہاتھ ڈالتے اور دھکے سے دور مٹا دیا جائے۔ میں چاہتے ہوئے بھی غزالہ سے بھر دی کہ ایک لفظ نہیں کہہ سکا

اور پارکنگ والے سے ٹوکس لے کر درختوں کی طرف بڑھ گیا۔ یہ سراسر اضطرابی حرکت تھی۔ میں میرے موڈ میں تھا

اور نہیں چاہتا تھا کہ غزالہ میرے پیچھے آئے اور قلمی بیہوشوں کی طرح میری منٹیں سانس کرے۔ درحقیقت یہ واقعہ میرے لئے طبعی غیر متوقع تھا۔ اس حد تک غیر متوقع کہ

میں پکڑا گیا تھا اور فوری طور پر میرے ذہن میں یہی بات آئی تھی کہ یہاں سے نکل جاؤں۔ میں ایک نوٹش پر دل بندہ

قدم آگے لگا تھا کہ چوڑیوں کی چمک نے فخرے کی اُن گت گھٹیناں بجا دیں۔ غزالہ میرے عقب میں آ رہی تھی۔

"شاہ جہاں! اس کی دوبارہ آواز ابھری۔

صورت حال لمحہ بہ لمحہ مشکوک تر ہوئی جارہی تھی۔ وہ میرے تعاقب میں تھی۔ مجھے بکار دی تھی اور میں چلتا جا رہا

تھا۔ یہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔ میں ٹک گیا۔ اس دفعہ حد ہو گئی۔ مجھے لگا "ہم سچ کسی رومانی کہانی کے دو کردار ہیں اور

جیتی جاتی دنیا سے نکل کر نفوس اور سطوں میں گم ہو گئے ہیں۔ اور گرد کو خاطر میں لانے بغیر غزال بھاگ کر مجھ سے پلٹ گئی جیسے ایک تیل جڑے لے کر آخری کو تیل تک کسی درخت سے پیوست ہو جائے۔

وہ مجھے بازوؤں میں پھینچتے ہوئے بولی "مجھے چھوڑ کر مت جاؤ شاہ جہاں! میں مرادوں گی۔ مجھے معاف کر دو! اگر معاف نہیں کرتا۔ تو میری جان لے لو۔"

میں مضبوط اعصاب کا مالک ہوں لیکن صورت حال کی سنگینی میری پیشانی کو عرق اکود کرنے لگی۔ کئی نگاہوں کے سامنے ایک حسین و جمیل لڑکی مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اور دوری تھی۔ اس کے منہ زور جذبات نے اسے ہر احساس سے بیگانہ کر رکھا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میرا سینہ جذبات سے عاری تھا۔ دونوں دل جو پیچیدہ دھاریں ہوئی تھیں وہ کچھ میں ہی جانتا تھا لیکن میں نے خود پر قابو رکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں ایک مرد تھا! شاید اس لیے کہ خود پر قابو پانے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ گزرتی صورت حال کے پیش نظر میں نے حکمت سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ غزال کو یہ آہستگی خود سے مجھ اکیلا اور نری سے کہا "غزال! آؤ! کو سنبھالو۔ کیوں تم شکاری ہی ہو۔ چلو آؤ گاڑی میں بیٹھو۔"

اس نے منہ ہاتھوں میں چھپایا اور گردن جھکا کر رونے لگی۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اپنے ساتھ چلا ہوا گاڑی تک لے آیا۔ غزال کو اگلی نشست پر بٹھا کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اسی وقت میری نگاہ رکشا ڈرائیور پر پڑی۔ وہ فریادی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو "اے اگلی دقا ہم بھی راہوں میں پڑے ہیں۔ اگر ٹوٹے دلوں کو جوڑنے کا انعام شام نہیں تو گرا نی ہی دیتے جائیے۔ میں نے جب سے سو کاوٹ نکال کر اس کے حوالے کیا۔ وہ میرے بجائے غزال کا شکر ادا کرتے ہوئے رکنے کی طرف بڑھ گیا۔ دیگر تماشا بھی۔ بیسیاں نکال نکال کر کمر ہر کر رہے تھے۔ ہر حال یہ بھی ان کی مہربانی تھی کہ خاموش تھے اگر ان میں سے کوئی شوق طبع آواز سے بھی کسنے لگتا تو اس کا ۱۳ حتماً تھا۔

جناح کا رڈن سے گاڑی نکالنے کے بعد میں نے مال روڈ کے ایک چائیز رستوران کے سامنے روکی۔ ڈنر کا وقت ابھی بہت دور تھا۔ ڈاننگ ہال قریباً خالی پڑا تھا۔ ہم ایک نیم ٹارک کوٹے میں جا بیٹھے۔

مکونڈ کافی "میں نے دفتر سے کہا۔ غزال نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی جھنجھ

دملی شفاف آنکھوں میں ایک بھولی بھری یاد جھنکی ما چمک گئی۔ میں نے سگریٹ سلگایا۔ وہ اب سر جھکا لے! پنڈ بیک کے بگل کو ناخن سے کھج رہی تھی جیسے کنگ سارا کام اس نے مجھے سونپ دیا ہو۔

میں نے احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کیا اور لمبے میں ساخت گلت سمیٹ کر کہا۔ "غزال! ام نے میرے قریب غلطی کی ہے۔ کچھ لوگ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ چاہوں بھی تو تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ تم مجھ! اگر کچھ کہنا چاہتی ہو تو میں نے بھی تم سے بہت کچھ کہنا لیکن اس کے لیے فرصت اور مناسب موقع کی ضرورت ہے۔"

وہ ہلکی آنکھ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ بچپوں کے آ! میں یقین کم اور شہادت بہت زیادہ تھے۔ میں نے سنے لفظ سے ان شہادت کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے با کرانے لگا کہ میری یہ بے مرفی مستقل نہیں ہے۔ کچھ ماما مجبوریوں کے سبب میرا اس سے دور رہنا ضروری ہے۔ سختی رہی۔ چہرے پر خاموشی کا کبیرہ پڑا تھا۔ اس پر دے دوسری جانب دیکھنا میرے لیے نہ پہلے کبھی ممکن ہوا تھا اب تھا۔ اس نے مجھ سے لمبی فون ٹیبل اور ایڈریس مانگا۔ نے اسٹیشن کے ایک ہوٹل کا پتہ دیا۔ وہ ٹوٹے والی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ ان نظروں سے بچنے کے لیے میں۔ جلدی جلدی ٹال دیا کہ فی الحال میرا مستقل پتہ کوئی نہیں ہے۔ رہائش میں نے اس کا پتہ بھی لکھ لیا اور وعدہ کیا کہ میں آج شام کسی وقت اسے فون کروں گا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی زور مسکراہٹ کھیل گئی۔ یہ مسکراہٹ میرے کھولے وعدے ایک سخت تمبر کے کی حیثیت رکھتی تھی۔ نہایت گلت میں متفقہ سینے کے بعد میں غزال کے ساتھ ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا۔

اس رات میں ہوٹل میں تقریباً دس بجے تک جاگتا اور خالی نظروں سے دی وی اسکرین کو گھورتا رہا۔ خالی نظروں سے دی وی اسی وقت دیکھا جاتا ہے جب ذہن بے حد معصوف ہو۔ غزال نے اچانک سامنے آنے والی سڑکوں کی دنیا میں خشک دیا تھا۔ بے شمار زخموں کے منہ کھل گئے تھے اور ان تک خوابیدہ درد جاگ اٹھے تھے۔ میں اپنے آپ سے لڑتا ہوا اس لامتناہی کرب پر قابو پانے کی سعی کرتا رہا۔ وہ رہ کر سوال ذہن میں ابھر رہا تھا کہ غزال میرے پیچھے کیے گت گئی۔ عالیادہ رکنے پر سوار کس جارہی تھی مجھے دیکھ کر اس نے ڈرائیور کو میرے تعاقب کا حکم دے دیا تھا اور آخر مجھ تک

خواب دیکھ رہا تھا لیکن نہیں۔ میرے سامنے قالین پر غزال بیٹھی تھی۔

میں خیالوں میں گم پڑی۔ دو اوازہ متقل کے بغیر نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ میرے سوتے میں غزال اندر چلی آئی تھی۔ میں نے بے یقینی سے وال کھاک کی طرف دیکھا۔ رات کے ڈھالی بجے تھے خدا کی پناہ! رات کے ڈھالی بجے غزال ڈنر اس ہوٹل تک پہنچی تھی اور میرے کمرے میں آگئی تھی۔ میرے عمیق ترین خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے تھے۔ میرے ساتھ گاڑی میں سڑکرتے ہوئے غزال نے ہوٹل کا کی رنگ دیکھ لیا تھا۔ نتیجے کے طور پر وہ اس وقت میرے کمرے میں موجود تھی۔ غزال کا سامنا کیے بغیر لاہور چھوڑنے کا میرا منصوبہ دھرے کا زحرا ہو گیا تھا۔

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میرا دل معمول سے دو گنا رفتار سے دھڑک رہا ہے۔ گری نیند سے اچانک جاگنا بڑے تو عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے صرف گری نیند سے جاگا تھا۔ ایک بو شہر باختر بھی دیکھ رہا تھا۔ کچھ عجیب و غریب جینے تھی میرے سامنے۔ جیسے وہ کوئی تال شے ہو جو میرے قدموں میں برہ رہی ہو یا پھر کوئی بچان اسے وجود کی نفی کر کے اپنے دونا کے چروں میں برہے بچاؤ کر کے کاراوارہ باندھے ہوئے ہو۔ میں اندر سے کانپ گیا۔ میں اس قاتل نہیں تھا۔ وہ کیوں مجھے آزمائش کے کانٹوں پر کھینٹ رہی تھی۔ میں دونا نہیں تھا! ایک انسان تھا۔ ایک جوان مرد تھا! میری رگوں میں کولہا ہوا تھا اور اس لوہی شیطانیت کے بے رنگ جڑوے بھی تھرتے تھے انسانیت کے جڑوے کسی بھی وقت ان بے رنگ جڑوؤں سے شکست کھا سکتے تھے۔ رگ و پے میں ہر دم جاری رہنے والی اس جنگ میں کسی بھی وقت حیوانیت کا پتہ بھاری ہو سکتا تھا۔ اس کمرے میں یہ حیوانیت جیت جاتی تو کیا کچھ نہ ہو جاتا۔ ایک حسین جوان لڑکی سراپا خود پیردی میرے قدموں میں پڑی تھی! میری نگاہ کرم کی کھنکھری اور میرا دل معمول سے دو گنا رفتار کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔

"غزال! تم یہاں؟" میں نے بے حد محتاط لمبے میں پوچھا۔

اس نے سر اٹھایا۔ مانک کی روشن کیر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کی ہلکی آنکھیں اور نگاہیں میرے چہرے پر جم گئیں۔ میں اس کی آنکھوں میں بھاگ کر کانپ گیا۔ وہاں ایک اور ہی رنگ تھا۔ کوئی بڑا ہی موسم تھا۔ میرا تہ اپنی گود میں پڑا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ میری گود میں رکھا۔

بچنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ فوٹ کرنے والی بات یہ تھی کہ اس نے میرے پلے ہوئے کھلے کے باوجود مجھے بچان لیا تھا۔ بعد کوشش تقریباً بارہ بجے میں نے خیالات کی اس امبر بل سے نجات پائی اور دل ہی دل میں اس فیصلے کا اعادہ کیا کہ کل علی الصباح میں تنہا گلی کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔

مرد و رات سے قانع ہو کر میں بستر دراز ہونے کا ارادہ کری رہا تھا جب میری نگاہ ساہیل تیل پر رکھی "دوم کی" پر پڑی۔ رواج کے مطابق اس "سی" کے ساتھ بھی ایک دیدہ زیب "کی رنگ" تھا۔ بیوی شکل کا یہ "کی رنگ" چمکدار اسٹیل کا تھا اور اس پر ہوٹل کا نام دیا گیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں بڑی طرح چونک گیا۔ جس وقت غزال میرے ساتھ گاڑی میں سڑک رہی تھی یہ کی رنگ دلش بورڈ کے نیچے خانے میں پڑا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں اسے صاف دیکھ سکتا تھا تو کیا... کیا غزال نے اس کی رنگ کو نہ دیکھا ہوگا؟ سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کی رنگ کی دونوں جانب ہوٹل کا نام نمایاں حروف میں کندہ تھا۔ تو کیا غزال میرے جھوٹ سے واقف ہو چکی تھی۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ یقیناً ایسا ہو چکا ہے۔ غزال جیسی بائیک میں لڑکی میری اس غلطی سے فائدہ نہ اٹھاتی! لیکن یہ نہیں تھا۔ وہ میرا ڈرائیور نہیں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں نے ہوٹل کا نام بتایا تو وہ کیسے کشادہ آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی تھی۔ میں گری سانس لے کر رہ گیا۔ اگر مجھے ایک آدھ روز لاہور میں مزید قیام کرنا ہوتا تو صبح نہ اند میرے میرا ہوٹل تبدیل کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں غزال سے ڈھ بجز کا خدو کوئی طور پر نہیں لے سکتا تھا۔ یہ دوری میرے لیے کڑی آزمائش تھی لیکن قربت اتنی جان لیوا تھی کہ میں اس کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

خیالوں میں غلطاں میں نیند کی واہی میں چلا گیا۔ نچانے رات کا کون سا پیر تھا جب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں بستر پر آواز چھاپ رہا تھا۔ یہی سوچا تھا اور اب ایسی پوز میں آنکھ کھل گئی تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے دائیں ہاتھ پر کوئی شے رکھ رہی ہے۔ یہ ہاتھ بستر سے نیچے جھول رہا تھا۔ میں نے اضطرابی طور پر ہاتھ کھینچا لیکن وہ گہری کی گرفت میں تھا اور اسی وقت میری نگاہ ایک نیل بنت خرم پر پڑی۔ نیل لیب کی نہایت دم دم روشنی میں لائٹ میں خرم میرے ہاتھ پر چبھی ہوئی تھی۔ اس کی مانک لائٹ میں بائیک کی کھلی کھری طرح دکھائی دیتی تھی۔ میں بڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں کھلی کھلی رہ گئیں۔ شاید میں

میرا ہاتھ اس کے رخسار سے جا لگا۔ بھگی ہوئی چیز نہیں ملتی لیکن رخسار پر ہوا تھا اور دل رہا تھا۔ وہ عجیب خوابیدہ آواز میں بولی "مجھے سے دور نہ جاؤ شاہ جہاں۔ میں گناہگار ہوں تو مجھے سزا دو۔ میں تمہارے سامنے ہوں جو چاہو مجھ سے سلوک کرو لیکن مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔"

میرے دل کی سلاخ زہن سے ایک ہی کی رستے لگی۔ یہ وہ آنکھیں آنسو تھے آنکھوں سے بہت دور تھے لیکن تھے تو آنسو میں نے اپنی آنکھوں کی حیرانہ شان پر قرار رکھنے کے لیے ان آنسو کو سینے کے ریگزار میں جذب کر دیا۔ غزالہ کا سر میری گود میں تھا۔ شہر رنگ۔ کبھی بال میری ہانوں پر اور میرے ہنر پر دو رنگ منتشر تھے۔ اور بال ہی منتشر نہیں تھے وہ خود بھی منتشر تھی۔ بے ترتیب تھی بے قاعدہ تھی۔ یہ بے قاعدگی بے حد جذبات انگیز تھی اور غزالہ کی خاموشی نے اسے اور بیان خیز بنا دیا تھا۔ وہ نرم و گداز پس وہ ماسوں کا زبردست وہ خود فراموشی و خود ہمدردی کی ادا "ایک قیامت تھی جو مجھ پر ڈھے گئی تھی۔ میرا ہاتھ غزالہ کے ملائم بالوں میں سرایت کر گیا پھر بھٹی آنکھوں نے بالوں کو منہ میں جکڑ لیا۔ یہ ہاتھ اور انگلیاں جیسے خود کار ہو گئی تھیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ دماغ میں تند و تیز اندھیاں چل رہی تھیں یادوں کے بکولے پکڑا رہے تھے کوئی دور افتادہ فقرہ کوئی بھولی ہنسی کے سانس میں گونجنے لگی۔ جیسے کوئی ہنس بی بی بلکہ اینڈر وائٹ فلم چل رہی ہو زرد زرد ہنسی ہنسی۔ ٹھنکتے کریں والا خستہ حال سینا بال ہو اور آواز گونج رہی ہو۔ "یہ زندگی کے میلے۔ یہ زندگی کے میلے" پھر وہ بے نیگوں مردہ چہرے آنکھوں کے سامنے آئے پھر ایک کرفت چہرہ عورت دکھائی دی۔ وہ دیکھتے ہی میری ہنسنے لگا۔ گودا غنا چاہ رہی تھی۔ میری ہنسنے لگی تھی۔ چھین چھین اور پھیلنے لگی تھیں۔ قرب و جوار کی ہر آواز ان جھجھکیوں میں دب گئی۔ میں نے جھکا دیا۔ غزالہ جیسے آپس کے قائلین پر جاگری۔ اس کی سہمی ہوئی حیرت زدہ نگاہیں میری طرف اٹکیں۔ میں رخ پھیر کر اپنا الماری کی طرف پھرا۔ اپنی کھیمت کر رہا ہر نکالا اور بیچکوں سے کپڑے اُتارنے شروع کر دیے۔

دو یا تین منٹ کے اندر میں اپنے مختصر سامان کی ہر شے بیک کر چکا تھا۔ دو م سوس کا فون اٹھا کر میں نے استقبال پر اطلاع دی کہ میں کرا چھوڑ رہا ہوں۔ علی تیار کر دیا جائے۔ غزالہ ابھی تک اسی طرح قائلین پر مگر پڑی ہوئی۔ چہرہ بازوؤں میں پچھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے جھپٹ کر نہ کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ میں اسے اس کے حال پر چھوڑ

کر کرے سے نکل آیا۔ کاؤنٹر خوابیدہ ملازم مجھے جڑ دیکھ رہا تھا۔ پچھلی رات کا یہ "چپک آؤٹ" اس کی آنے والا نہیں تھا۔ میں نے بل ادا کیا۔ ایک پورر۔ اپنی کس اٹھایا اور میرے ساتھ پارکنگ کی طرف چلے



ڈرائیونگ سے میرا اوصالی تاؤ اکثر دور ہوا گاڑی لاہور سے مری تک میں نے دو بھی رفتار سے گاڑی کا سات گھنٹے کا سفر تقریباً دس گھنٹے میں طے کیا۔ مری کو میں اپنے اندرونی بیجان پر خاصی حد تک قابو پا چکا۔ مری کے لیے میں نے ایک شب مری میں قیام کیا۔ اس قیام سے نہ صرف بے خوابی اور سستی ہوئی بلکہ میں خود کو "کام" کے لیے آمادہ محسوس کر میرے حاصل کردہ ایڈریس کے مطابق احمد راجال ما گلی کے فواح میں ایک نجی رہائشی تفریح گاہ میں مقیم۔ دوڑ سے تقریباً ایک میل ہٹ کر یہ نہایت پر فضا تفریح گاہ بنائے والوں نے ایک پوری پہاڑی خرید کر وہاں بونٹ، اسٹوکر، نیش کورٹ، سونٹنگ ٹول، طرح کی دیگر تفریحات فراہم کی گئی تھیں۔ قیام بندوبست بھی منظر تھا۔ اعلیٰ طبقے کے افراد جو بھل اور بو بھل جیہوں کے ساتھ یہاں آتے تھے اور انہیں ہو کر وہاں لوٹتے تھے۔ مری پہنچ کر مجھے ایک اور کا علم ہوا۔ "الفر دوس" نامی اس تفریحی مقام پر صرف کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ یعنی مجھ جیسے "چھڑے چھاٹ" والے کے بل بوتے پر اس گوشہ فردوس کا سکون بر باد نہیں تھا۔ یہ اطلاع میرے لیے خوش کن نہیں تھی پروگرام کے مطابق مجھے الفر دوس میں رہائش پر ہر دو راجال سائی سے مل کر یا لے بغیر۔ جاننے کی کوشش کہ کچھ لوگ انیس عدم آباد روانہ کرنے پر تھیں۔ ہیں اور کیا میرے اور ان کے اس حادثے سے بچے صورت ہے؟

بہر حال اگلے روز میں نے تخیلی کا رخ کیا۔ آخری ہفتہ تھا۔ چھ ہزار فٹ کی بلندی پر خشکی کا تھا۔ آئیم یہ ایک چمکیلی صبح تھی اور قرب و جوار سے پیش سے زیادہ گھمے نظر آتے تھے۔ میں بل کمانے درمیانی رفتار سے ڈرائیونگ کرتا تقریباً بارہ بجے پہنچ گیا۔ اس مقام کے بارے میں جیسا سنا تھا وہاں ہی پر سکون اور خوب صورت جگہ تھی۔ ایک پوری خاردار آبادوں کے درمیان محفوظ کر لیا گیا تھا۔ اہ

رہی تھیں، معنوی جمیل تھی اور پھولوں کے تختوں میں کھاتی ہوئی پختہ ہو چکی تھیں۔ پارکنگ لٹ میں کڑی آہستہ گاڑیاں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہاں "پارکسٹ" نہیں موجود ہے۔ "گلش میڈیم" ہے۔ چیتے چلاتے اور ہر جگہ رہے تھے۔ ان کی سرخی آواز میں پناہوں میں دور گونجتی تھیں۔ گرا سی میدان میں افسرانہ شان والے تین و حضرات گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے ایک بوجوان سل کے شوق نما کتے بڑے مینٹن کھیل رہے۔ دوسری طرف دو یورپین خواتین تصویر کشی میں مصروف۔ میں اپنا اپنی کس اٹھا۔ استقبال میں پہنچا۔ کاؤنٹر پر دو لڑکیاں نے خوش دلی سے استقبال کیا۔ اس کی آنکھوں نے اپنے لیے توجہ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ سزے راجل زیادہ "ٹائٹ" نہیں کیا۔ اپنے لیے جیسے میں چاشنی پٹ کر میں نے اس مہ جبین سے ایک عدد کرے کی فرمائش کی۔

"آپ دوہہ چلی؟" "شیریں آواز میں پوچھا گیا۔ "تو" مجھے اپنے کس کے سب سے کمزور پہلو پر روشنی ناپڑی۔ "بٹ ذہن بلی تیرا ان نو آخری ڈیز۔" لڑکی کا چہرہ ساٹ ہو گیا۔ وہ اپنی مجبوریاں بیان کرتے ہوئے۔ "دوبی سادی سر۔ ہمارے کچھ روز ہیں۔ چلی ابھریم آپ کو یہاں خوش آمدید نہیں کہہ سکتے۔ ویسے دو رہے کا ایک سوٹ خالی ہے۔ اگر آپ ریزرو کرنا چاہیں تو الیک۔"

میں نے اس پری چوک کو قائل کرنے کی کوشش کی لیکن نہیں بنی۔ اس بے چاری کے پاس اتنی اقداری نہیں ہے۔ اصل اقداری نیچر کے پاس تھی اور نیچر کسی کام سے ناپور کیا ہوا تھا۔ میں نے سوچا "اب آٹومیا ہوں نیچر سے درخواست کر کے دیکھ لوں یہ وہی جو کسی نے کہا ہے ناکیا وہی ہے کہ سب کو لے ایک سا جوا ہے۔"

دو تین استقبال میں بیٹھ کر میں "فردوسیوں" کی ہوائیات دیکھا۔ وہ اپنا مطلوبہ چوڑھونڈا رہا۔ میرے اڑنے کے مطابق یہاں کم از کم چالیس فیملیہ قیام پذیر تھیں۔ ان میں سے پندرہ میں افراد اور بچے کاؤنڈ میں نظر آئے تھے۔ باقی سب کے سب میری آنکھوں سے او بھل نہ تھے۔ راجال سائی صاحب بھی ان ہی میں سے ایک تھے۔ مہرے گا۔ اگر نیچر نے بھی انکار کر دیا (اور امکان بھی یہی تھا) تو میرا آخر عمل کیا ہو گا۔ کیا الفر دوس میں رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے ایک عدد خاتون کا انتظام کرنا پڑے گا۔

یعنی کوئی خوش رو لڑکی جو میری منکوحہ یا غیر منکوحہ بن کر میرے ساتھ یہاں قدم رنجہ فرما سکے۔ کہاں سے کیا جائے اس لڑکی کا انتظام؟ جلدی تو شاید کوئی چاکلیٹ قلعی ہو جو یہ بندوبست نہ کر سکے۔ سراسر اٹھلی پر سرسوں بھانے والی بات تھی۔ چاکلیٹ میرا دھیان واپس مری اور میری سے واپس بھکر چلا گیا۔ وہاں سے لڑکی کا انتظام ہو سکتا تھا بلکہ "انتظام" کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ آقا قادر زان کی حویلی میں درجنوں لڑکیاں بھری پڑی تھیں اور ان میں سے کوئی مناسب لڑکی منتخب کی جاسکتی تھی۔ کہاں تھی کالی اور کہاں بھکر۔ سزے بہت طویل تھا اور پھر آخر بھی ہوتا تھا۔ فوراً ذہن نئی فون کی طرف چلا گیا۔ آقا قادر زان کے تین نمبر اس وقت میرے پاس موجود تھے۔ دو بھکر کے اور ایک لاہور کا۔ میں نے سوچا "فون پر اسے اپنی ضرورت سے آگاہ کروں اور کسوں کے اپنے کسی گھاسٹے کے ساتھ ایک یا دو لڑکیاں یہاں روانہ کر دے۔ ابھی میں اسی سوچ میں تھا کہ ایک یا خیال برق کی طرح ذہن میں گوند گیا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے نئی فون کے استعمال پر ایک لاکھ بار لعنت بھیجی اور فی الفور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

کاؤنٹر کے پیچھے کڑی لڑکی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "چوہری صاحب آپ جارہے ہیں؟" "ہیں! میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔ بہر حال آپ ایک ہفتے کے لیے سوٹ بیک کر دیتے" میں نے شیر وانی کی جب میں ہاتھ ڈال کر بڑا نکالا اور بے منٹ کو دی۔ بڑے میں مستحضر قسم کے نوٹ دیکھ کر لڑکی امپریس ہوئی۔ درخواست سے بولی "آپ تو ہوا سادیت کر لیتے" سر آئے ہی والے ہیں۔"

مجھے اب "سر" کی ضرورت تھی نہ اس سے کوئی اپیل کرنے کی بلکہ میں اب اس کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتا تھا، مادہ چچا اس کا دل بیچ جائے اور وہ اپنے قواعد و ضوابط پر لات مار کر میری درخواست قبول کر لے۔ رسید لے کر میں استقبال سے نکلا اور سیدھا اپنی گاڑی میں آیا۔ ذرا سی دیر بعد میں واپس مری کی طرف جا رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے زائیدہ بالوں والی اس لڑکی کی صورت تھی جسے میں نے حویلی میں ٹائپ دیکھا تھا اور جو بعد ازاں صفدر علی کی بد نصیب محبوبہ انیم ثابت ہوئی تھی۔ آج کل وہ حویلی میں تھی۔ یہ بعد از امکان نہیں تھا کہ میں آقا قادر زان سے ایک لڑکی کا مطالعہ کروں تاہم یہی کی رہائی کی کوئی سبیل نکل آئے۔ امکان معدوم تھا لیکن ناپید نہیں تھا۔ میں اس سوچے

سے قائمہ اٹھا کر کوئی ایسی صورت حال پیدا کر سکتا تھا کہ قادر زماں انجم کو میرے ساتھ خفیہ گلی روانہ کر دے۔ اس کے نزدیک وہ ایک عام بازاری لڑکی تھی اور ایسے کاموں میں عموماً بازاری لڑکیاں ہی استعمال ہوتی ہیں۔

○☆☆○

ٹھک ایک روز بعد رات کی تاریکی میں میری گاڑی نے مجھے حویلی تک پہنچا دیا۔

یہ وہی سمان خانہ تھا جہاں میں کئی روز قیام پزیر رہا تھا، سانولی سلونی تجھ نے میری تیار داری کی تھی۔ اپنے پرشاپ جسم سے میرے افسردہ دل کے ناموں کو چھڑا تھا اور پھر ایک روز مجھ سے ہمدردی جنائے کی بادشاہ میں اسے منظر سے ہٹا لیا گیا۔ کسی اور منظر میں فٹ کر دیا گیا تھا اور وہ منظر کیا تھا، میں کچھ نہیں جانتا تھا، مجھے اپنے قرب و جوار میں اپنی معصوم بہن کی خوشبو محسوس ہوئی اور بیٹے میں وحشی گھوڑوں کی رائیں دھکی پڑنے لگیں۔ میں نے ان گھوڑوں کو قابو میں رکھنے کے لیے اپنے حواس کو جکڑ لیا۔ انہیں ایک نقطے پر مرکوز کر کے قرب و جوار سے لائق ہو گیا۔

آقا قادر حویلی میں تھا۔ اسے میرے آنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اب وہ حویلی کی نشست گاہ میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ سب آدمیوں کی معیت میں مجھے نشست گاہ کے اندر پہنچا دیا گیا۔ یہ نشست گاہ ایک وسیع ایوان کی طرح تھی۔ فرش پر دبیز قالین دیواروں پر جہازی ساز کے قایمے اور جیشتر فریج پر دوسے رنگ و روغن غرض ہر شے اپنی مثال آپ تھی۔ اہم بات یہ کہ آرائش میں بھونڈا این نہیں تھا۔ کوئی کدہ ہی نہیں لٹکا تھا کہ یہ جس حویلی کی نشست گاہ ہے وہ ایک مضائقہ علاقے میں زرعی زمینوں کے درمیان کھڑی ہے۔ نشست گاہ کی بڑی دیوار پر ایک سیاسی جماعت کے کچھ قائدین کی تصویریں آویزاں تھیں۔ ان تصویروں کے ایک شاہانہ گری پر آقا قادر زماں شب خرابی کے لباس میں بیٹھا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ میری آمد سے پہلے وہ خواب گاہ میں جانے والا تھا یا جا چکا تھا۔ اس کے منہ میں سگار تھا اور دونوں پہلوؤں پر حسب معمول دو ٹھٹکے بازی گاڑے چوکس کھڑے تھے۔

”آؤ یار جی!“ اس نے اٹھ کر خوش اخلاقی سے معاف کیا اور نشست پیش کی۔ میں بیٹھ گیا ”خیریت تو ہے یار جی“ اس نے بڑے ملائم لہجے میں کہا۔

”خیریت ہی ہے“ میں جواب دیا۔ ”ایک کام آ رہا تھا آپ سے“

”حکم کرو بادشاہو۔“

”مجھے ایک لڑکی چاہیے“ ایک دو سینٹے کے لیے۔“

”لڑکی؟“ قادر زماں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں۔ احمد راجال سائی لاہور میں نہیں تھا یا جی؟“

”اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے میرے ساتھ ایک لڑکی کا ہونا ضروری ہے۔“

”کھل کر بات کرو یار جی۔“ قادر زماں نے کرسی پر ہلکا بدلا۔

میں نے مختصر لفظوں میں ساری صورت حال بتائی اور وضاحت کی کہ مجھے لڑکی کیوں دوکار ہے۔ پوری بات سن کر قادر زماں نے ایک کمرائش لیا۔ ”یار جی! بستر تھا کہ تم یہاں نہ آتے تھمارے پاس رقم تھی لاہور چلے جاتے، وہاں کی اڑے سے کرانے کی لڑکی لے جاتے“ ایک چھوڑو درجنوں مل جاتی ہیں۔“

میں نے بات بتائی۔ ”یہ میں نے بھی سوچا تھا لیکن بازاری لڑکیوں کے چہرے پر چھاپ سی گئی ہوتی ہے۔ دور سے سے بچانی جاتی ہیں اور میں کسی طرح کا ریسک نہیں لینا چاہتا۔ کوئی ایسی لڑکی ہو جو ابھی کھیلے۔“

قادر زماں نے کہا ”تو حویلی سے دیکھ لے کوئی لڑکی۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ کافی عمر ہے اس کی اور ویسے بھی جلد گھبرا جانے والی ہے۔“

”تو پھر ایسا کرو یا جی“ چارپانچ لڑکیاں منگوا لیتے ہیں“ ان میں سے جتن لو۔“ قادر زماں اب میرے ذہب پر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی ”تجویز“ مان لی۔ قادر نے آواز دی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی اور ایم جی والا وہی پہلوان نظر آیا۔ مجھ پر کڑی نگرانی رکھتا تھا۔ ایک لمبے کے لیے ہم دونوں کی نگاہیں ملیں اور ہمارے درمیان نفرت کی ایک چنگاری کا چھوٹ گئی۔

”جی جاگیر دار“ پہلوان نے قادر زماں کے سامنے جھک کر کہا۔

قادر زماں نے اسے لڑکیوں کے بارے میں ہدایات دینا اور ساتھ ہی گاٹا لانے کو کہا۔ پہلوان چلا گیا۔ قادر زماں کے کہنے پر میں اسے اب تک کی کارکردگی سے آگاہ کرنے لگا۔ وہ بڑی توجہ سے سنتا رہا۔ اس کا لہجہ بیٹ کی طرح شہد پکارا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ آقا قادر زماں کا حساب الٹ ہے۔ اسے جب کسی شخص پر غصہ آتا ہے تو

لاہور نرم دلا تم ہو جاتا ہے۔ غصہ دھڑکا جائے تو لہجہ ملائم ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس شخص کو آپ۔۔۔ حضور جیسے القاب سے نوازنے لگتا ہے اور پھر اس شخص کی کم بختی آجاتی ہے۔

غورزی دیر بعد ایک ملازمہ شاندار نرالی میں کافی کے قتلے آئی۔ اس کے پیچھے ہی پہلوان چند لڑکیوں کے ساتھ در داخل ہوا۔ ان کی تعداد چھ تھی اور وہ ساری تھول ورت تھیں لیکن ان میں تجو تھی نہ انجم۔ نرس کھیلے بھی میں تھی۔ وہ ساری کچی ہند سے بے دار ہوئی تھیں اور بڑی زلفی میں تیار ہو کر یہاں پہنچی تھیں۔ کچھ شرابی شرابی کی تھیں۔ معلوم نہیں۔ وہ یوں طلب کیے جانے سے کیا مطلب“ نکال دی تھیں۔ میں نے لڑکیوں کے چہروں کو غور سے دیکھا۔ ان میں سے تین تو صاف طور پر بازاری نظر آ رہی تھیں۔ بقیہ وہ طوائف تھیں اور ناز و نوش کی محفلوں کو رونق دینے کے لیے یہاں موجود تھیں۔ باقی تینوں میں سے دو بڑی لہجی ملازمہ تھیں۔ دیکھی ملازمہ میں جو شیخ و امراء کے محلات میں ہوتی ہیں اور انہیں احساس دلاتی رہتی ہیں کہ ”میسوس صدی میں بھی آقا کی کالٹ اٹھا سکتے ہیں۔۔۔“

زب اور قانون میں خود ساختہ سقم تلاش کر کے پرشاپ جسوں میں طمانیت و حوصلہ رکھتے ہیں۔ آخری لڑکی کے بارے میں میں کوئی واضح اندازہ قائم نہ کر سکا۔ مجھے وہ کوئی نو عمر سی سنائی نظر آتی جو کسی ایلے کے بیچے میں یہاں آ پھنسی تھی۔

بازاری لڑکیوں کو تو میں نے پہلی نگاہ ہی میں زد کر دیا۔ باقی تین لڑکیوں کو بھی کسی نہ کسی وجہ سے قابل قبول نہیں پائے۔ آخری فیصلہ مجھے ہی کرنا تھا لہذا آقا قادر زماں نے نام لڑکیوں کو واپس بھیج دیا اور پہلوان سے کہا کہ وہ اور لڑکیاں لا لائے۔

اس دفعہ پہلوان نے آنے میں زیادہ دیر نہیں کی۔ شاید وہ باقی لڑکیوں کو بھی پہلے بھیرے میں ہی اطلاع دے آیا تھا۔ اس مرتبہ جو لڑکیاں قادر زماں کے سامنے حاضر ہوئیں ان کی تعداد پانچ تھی اور ان میں انجم بھی موجود تھی۔ اسے دیکھ کر میرا دل شہت سے دھڑک اٹھا۔

اس کھپ میں دو لڑکیاں تو عمر میں کسلانے کی سطح تھیں۔ انہیں دی جھٹ کرنے میں مجھے کوئی تردد نہیں ہوا۔ باقی تینوں میں سے ایک بازاری خود خال کی تھی جبکہ دوسری ضرورت سے زیادہ تو خیر نظر آ رہی تھی۔ میں نے انجم کو غور سے دیکھا۔ کچھ دیر نگاہوں میں تو رہا لیکن فوراً پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔

”کیا بات ہے؟“ قادر زماں نے پوچھا۔ ”کوئی پسند نہیں آتی؟“

میں نے کہا ”آپ ہی کچھ مدد کریں۔ میری تو اصل خطا ہو رہی ہے۔“

قادر زماں نے تو خیر لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کا نام فرزانہ ہے۔ بڑی حاضر دماغ ہے لیکن۔ لیکن عمر کی ذرا بھٹی ہے۔“

”جی ہاں“ میں نے فوراً تائید کی۔ ”اس سے تو یہ باتیں طرف دہالی ٹھیک رہے گی۔“ میرا اشارہ انجم کی طرف تھا۔ قادر زماں کے چہرے پر ایک لمبے کے لیے انجم کے آثار نظر آئے اور پھر غائب ہو گئے۔ وہ بولا ”تو تم اسے مناسب سمجھتے ہو؟“

میں نے کہا ”جو موجود ہیں ان میں سے تو یہی مناسب نظر آتی ہے۔“

”چھا ٹھیک ہے۔“ قادر زماں نے کہا۔ اس نے پہلوان کو اشارہ کیا۔ وہ لڑکیوں کو لے کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ نوجوان عورتوں کو یوں سامنے کھڑا کر کے ان کا انتخاب کرنا اور پھر محلے کے بیروں تک کر لے جانا بڑا ہنگامہ آئیز محسوس ہوتا تھا مگر اس جتنی حویلی میں ایسے واقعات معمول کے مطابق ہی سمجھے جاتے تھے۔ قادر زماں نے نئے سگار کا کونا توڑتے ہوئے کہا ”یہ لڑکی زیادہ قابل اعتبار نہیں۔ اس کی طرف سے ہوشیار رہنا ہوگا۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔ ”بھاگ جائے گی؟“

”نہیں۔ خیر ایسا بھی نہیں ہے لیکن ذرا تنگی ہے۔“

”کس بازاری کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔ حیرت ہے کہ پھر بھی نہیں پسند آئی ہے۔“

میں نے کہا ”محل سے تو نہیں لگتی۔ چال دھال سب مختلف ہے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے“ قادر زماں نے تائید کی۔ پھر اس نے ہتھکڑا کا رخ نامہ راجال سائی کی طرف موڑ دیا اور یہ جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ میں نے اسے ختم کرنے کے لیے کیا منصوبہ بنا رکھا ہے۔ کوئی منصوبہ تھا ہی نہیں تو میں اسے کیا بتاؤں۔ بس یہ یقین دلاؤں کہ ایک ڈیڑھ ہفتے میں یہ کام ہو جائے گا۔

○☆☆○

اگلی شب رات دس بجے میں حویلی سے انجم کے ہمراہ روانہ ہو رہا تھا۔ وہ رزق برق لباس میں تھی۔ زر بخت کی

شلوار قمیص جس کی سنری زمین پر نیگیوں بٹیاں تھیں۔ اووا رہی دھواؤں لگے کام رنگ سوڑے کانوں میں چم چم کرتے آویڑے "انہیوں میں بکراج کے چیلے چرے پر ہلکا سا میک اپ بنان سی سی بیجی وہ واقعی گہرک کی کوئی نوجوان مسز لگ رہی تھی۔ وہ خاموش تھی۔ اس خاموشی کا تعلق اس کے اندر کے خوف اور ادا سی سے تھا۔ وہ ڈری سہی بیٹی تھی جیسے آغا قادر زماں کی آنکھیں اب بھی اس کی مگران ہوں۔ حویلی سے یہاں تک ہم دونوں کے درمیان ایک لفظ کا تبادلہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی بات تو جہاں رہی میں نے بھی بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ جانے کیوں ایسا لگتا تھا کہ یہاں کی ہوائیں بھی قادر زماں کی خبریں اور جو میں کون گاہہ کسی نہ کسی طور اس تک پہنچ جائے گا۔ اس وقت ہم حویلی سے تقریباً دس میاں دور آچکے تھے جب میں نے پہلی بار اسے مخاطب کیا۔

"تمہارا نام انجم ہے؟"

"جی"

"کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"لاہور کی؟"

"جانتی ہو میں تمہیں کہاں لے جا رہا ہوں؟"

"شاید کسی بیل اسٹیشن پر۔"

"اور کیا معلوم ہے؟"

"میں آتا تھا کیا ہے کہ مجھے آپ کی بیوی بن کر جانا ہے۔ میرا نام ثویہ احسان ہے اور ہم جی مون پر نکلے ہوئے ہیں۔"

میں نے پوچھا "کیا میرے ساتھ جانے میں تمہاری رضامندی شامل ہے؟"

وہ بولی "جہاں میں ہوں وہاں رضامندی کا لفظ بے معنی ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا میں یہ سمجھوں کہ تم جس بے جا میں ہو؟"

اس نے سہی نیگیوں سے مجھے دیکھا "پلیز احسان صاحبہ! ایسی باتیں نہ پوچھئے جن کا میں جواب نہ دے سکوں۔"

میں نے مسکرا کر کہا "کیا ایسی باتوں کی کوئی لسٹ تمہارے پاس ہے جو میں پوچھ سکتا ہوں۔"

وہ خاموش رہی۔ میں نے کن آنکھوں سے دیکھا "مفرد کا انتخاب قابلِ داد تھا۔ انجم وہاں نسوانی خوبیوں کی حامل تھی۔ وہ دلکش جسم کی مالک تھی لیکن چہرے پر مصعوبیت کا

پراؤ تھا۔ یعنی شباب اور مصعوبیت اس کے ہیکر میں کچا ہو گئے تھے۔ اچانک سینے سے آہی نکل گئی۔ نہ جانے اس خوب صورت ہیکر پر گزشتہ شب دروازے میں کیا بیت چکی تھی۔ اس لاوارث باغ کی فصل پر کن کن لوگوں نے ہاتھ صاف کیا تھا۔

میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ تمہارا تعلق کسی شریف گھرانے سے ہے اور ان لوگوں کے چنگل میں پھنسنے تمہیں چند ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

وہ بولی "احسان صاحب! میں درخواست کرتی ہوں انجم سے اس طرح کے سوال نہ کیجئے۔"

"کس قسم کے سوال؟" میں نے زور دے کر پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔ میں نے جواب پر اصرار کیا تو وہ دوبارہ آواز میں بولی "میرے ماضی کے بارے میں کچھ نہ پوچھئے ورنہ میرے ساتھ ساتھ آپ اپنا بھی نقصان کریں گے۔"

"تو حال کے بارے میں پوچھ لوں؟"

"کیا پوچھا ہے؟"

"تم ہی بتاؤ کیا پوچھوں۔ اچھا۔ مفرد کے بارے میں پوچھ لوں؟"

وہ سیٹ سے یوں اٹھ بیٹھی جیسے بچہ نے ڈنک مار دیا ہو۔ میری نگاہیں دغا اسکرین پر پھیں لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔

میں نے مسکرا کر کہا "بھئی مفرد تو ماضی نہیں ہے۔ وہ حال ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"کون ہیں آپ؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"تمہارا خیر خواہ۔"

"تک۔ کس مفرد کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"اس مفرد کی جو تمہیں گلی گلی اور کوچے کوچے میں ڈھونڈ رہا ہے۔ جس کی بے خواب آنکھوں میں تمہاری تصویر ہے اور ہونٹوں سے تمہارا نام چکا ہوا ہے۔"

وہ ہٹلا کر بولی "میں کچھ نہیں جانتی وہ کون ہے۔"

"لیکن میں تو جانتا ہوں۔ میں نے اسے حویلی کی دیواروں سے سر ٹکراتے دیکھا ہے۔ وہ تمہاری تلاش میں دیوانہ ہو رہا ہے۔"

"آپ کون ہیں؟" انجم نے پوچھا۔

"میں مفرد کا دوست ہوں اور اسی کے کہنے پر تمہیں یہاں سے نکال کر لے جا رہا ہوں۔"

وہ حیرت کی تصویر بنی میرا چہرہ دیکھتی رہی۔ شاید وہ سوچا

بھی نہ سکتی تھی کہ کوئی اسے اس بلند دیوار حویلی سے نکالے گا اور یوں آسانی کے ساتھ۔ کوئی بیگمہ ہو گا نہ کوئی چیلے گی۔ خون کا ایک قطرہ میرے گانہ نہیں آہٹ ہوگی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں نے براہِ اعتماد لہجے میں کہا "ہاں انجم۔ میں تمہیں قادر زماں کے چنگل سے چھڑا لایا ہوں۔ تم آزاد ہو۔ کم از کم اس وقت آزاد ہو۔"

"مفرد۔ مفرد کہاں ہے؟" انجم نے بے تابانہ سے پوچھا۔

"وہ بیس قریب ہی موجود ہے لیکن اسے دیکھنے کے لیے جہیں تمہارا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"نہیں نہیں" وہ ہلہائی انداز میں بولی "مجھے اس سے نہیں ملنا۔ مجھے نہیں ملنا اس سے۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو۔ چھوڑ دو مجھے" میں نے دالہس جاؤں گی۔" اس کا ہاتھ خود بخود دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بولی "یہ۔ یہ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اٹا رہی ہیں مجھے مجھے کہیں نہیں جانا۔"

گاڑی کی رفتار اب کافی تیز ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میں جان چکا تھا کہ وہ کم از کم جھٹاک نہیں لگائے گی "بے وقوف مت بنو انجم! میں نے حکم سے کہا "خدا کا شکر ادا کرو" تم ان منحوس دیواروں سے باہر ہو اور ایک بات یاد رکھو۔ جو ہاتھ تمہیں حویلی سے نکال سکتے ہیں وہ تمہاری حفاظت بھی کر سکتے ہیں۔"

وہ کراہی "میں کتنی ہوں" آپ گاڑی روک دیں۔ میں اس حویلی سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی۔"

میں نے اطمینان سے کہا "تم جا سکتی ہو۔ اور جاری ہو۔" وہ ہٹلا کر رہ گئی۔ تمہاری دیر بعد وہ ڈیش بورڈ سے سر نکالے بچکیوں سے رو رہی تھی۔

ہم پراچ روڈ پر پہنچے تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ دونوں اطراف تاریک کھیت تھیں۔ سڑک بھی سنسان تھی۔ بس کسی وقت کوئی لوکل وگن یا ڈسٹرنگز ٹریلر شرعیاتی گزر جاتی۔ تمہارا آگے جا کر سڑک خراب ہو گئی اور مجھے رفتار دھبی کرنا پڑی۔ اچانک ایک شخص کنارے سے بڑبڑا ہوا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے روکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ یہ کوئی اویز عمر و رسائی تھا۔ بڑبڑا نہیں اس کا بلانا۔ بند اور سرخ ڈوسے کا سفید کپڑا صاف نظر آ رہا تھا۔ میرا ارادہ گاڑی روکنے کا نہیں تھا مگر پھر رسائی کے انداز نے ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا اور یہ گھبراہٹ کسی اداکاری کا نتیجہ نہیں

تھی۔ میں نے بریک لگائے۔ رسائی لپک کر گاڑی پر پہنچا۔ "بڑی! بڑا کوڑا ہو گئے ہیں۔ اللہ رسول کے واسطے ہماری مدد کرو۔"

"کہاں ہیں ڈاکو؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سامنے درختوں کی پچھلی طرف مکان میں سب کو لہولہا کر رہے ہیں۔ اندر سے بچوں کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔" یہ فقرہ ادا کرتے کرتے وہ پچھلا دروازہ کھول کر نشست پر بیٹھ گیا۔ پچھلی آواز میں بولا "تمہارا آگے پہنچنے کے پاس ٹکلی فون ہے۔ تمہانے کا نمبر بارہ بارہ چوتالیس ہے آپ ذرا جلدی پہنچا دیں۔"

رسائی کے لب و لہجے سے سچائی جھٹک رہی تھی۔ میں نے پہلا گھیر لیا اور چند سیکنڈ میں رفتار چالیس تک پہنچا دی۔ جی الامکان رفتار سے گاڑی دوڑا کر کم کوئی ایک منٹ میں پہنچنے پہنچ گئے۔ یہاں ٹائٹل کی ایک دکان تھی ایک پان سٹرٹ کا کھوکھا تھا اور ایک چھوٹی سی دکان پر ندیم میڈیکل اسٹور کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ تینوں دکانیں بند پڑی تھیں۔ گاڑی روکتے ہی رسائی دوڑا اور میڈیکل اسٹور کا بند دروازہ دھڑ دھڑ بجانے لگا۔ فوراً اندر روشنی ہوئی اور کسی نے دروازہ کھول دیا۔ یہ ایک نوجوان تھا۔ اس نے شلوار قمیص پر نیلے رنگ کی جری پہن رکھی تھی۔ قمیص جری کے اندر ہی سمٹ سٹائی تھی اور شلوار کے بل آزار بند تک نظر آ رہے تھے۔ بکھرے بالوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نیند سے جاگا ہے۔ رسائی اور میڈیکل اسٹور والا چند لمحے تیز لہجے میں باتیں کرتے رہے پھر دونوں بھاگتے ہوئے گاڑی تک آئے۔ دونوں کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔ رسائی نے روہانے لہجے میں کہا "ٹکلی فون تو خراب پڑا ہے جی۔"

"تمہانے کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہانے نہیں جانتی چوکی ہے۔" میڈیکل اسٹور والا بولا "یہاں سے کوئی چار میل دور ہے لیکن آگے جا کر کچے سے گزرتا پڑتا ہے۔"

رسائی بھڑائی ہوئی آواز میں بولا "وہ تو مار دیں گے جی" چھوٹے چھوٹے بچوں کو بالکل جتا رہے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "چلو! دو چہرہ ہم تینوں چلتے ہیں۔ راستے میں کوئی اور ملتا تو اسے بھی ساتھ لیتے چلیں گے۔"

رسائی کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلا گئے۔ یہی تاثر اسٹور والے کے چہرے پر نظر آیا۔ رسائی بولا "میں جانتا ہوں جی ان کو۔ بڑے خونی بندے ہیں وہ۔ ان سے تو پوئیس ہی بٹ سکتی ہے۔"

کے ساتھ یوں چار کرنے والے شخص کے آگے بھاگنا نہ جانے یا پیچھے نہ ہنا جانے تو معمولی کوشش سے اسے فیصلہ کن ضرب لگائی جاسکتی ہے۔ میں پوری چوکی سے اپنی جگہ کھڑا رہا، نگاہیں حریف کے چاقو پر تھیں۔ جوئی اس نے اپنی دانت میں مجھے "قل" کیا۔ میں نیچے بیٹھ گیا۔ چاقو والا ہاتھ لڑتا ہوا میرے سر کے اوپر سے گزرا۔ میرے دونوں ہاتھ برقیات کے کولوں پر جم چکے تھے۔ وہ اپنے زور میں میرے اوپر چڑھا رہا تھا۔ یکایک میں نے اسے پھول کی طرح سر سے اونچا اٹھالیا۔ یہ سارا سامعین کا کھیل تھا۔ اور اس کھیل میں میری طاقت سے زیادہ توازن اور ناممکن کا عمل دخل تھا۔ اس توازن اور ناممکن کو ایک بارہ سالہ بچہ بھی سمجھ لیتا تو حملہ آور کو سر سے اوپر اٹھا سکتا تھا۔ میں نے وہ قدم بھاگ کر اس شخص کو گنڈھڑی پر پڑا دیا۔ کیمت میں اس لیے نہیں چٹا کہ وہاں ہل چلا ہوا تھا اور اسے چوٹ "نہ" لگنے کا احتمال تھا۔ وہ سر کے بل ایک بیری کی جڑ میں گر اور لوٹ پوٹ ہو کر رہ گیا۔ میں نے اسے چھانے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کی۔ اس کا دایاں ہاتھ خالی تھا۔ یعنی سر کے بل گرنے کے بعد وہ اپنے ہتھکڑیاں پر گرفت قائم نہیں رکھ سکا تھا۔ میں نے اس کا بازو موڑا تو وہ تڑپ کر اندھا ہو گیا۔ میں نے ریو الوور نکال کر اس کی کینچی پر رکھ دیا۔

"ہاں۔ دانی خاں کے سالے۔ بتادوں کھوپڑی میں رو شدان؟" میں نے استخار کیا۔

وہ کراہ کر رہ گیا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ اس کی تن پھن خم ہو چکی ہے، غالباً گرنے سے ٹھیک ٹھاک چوٹ لگی تھی۔ طفیل اور اسٹور والا لڑکا اب میرے قریب پہنچ چکے تھے۔ طفیل کے ہاتھ میں گاڑی کا آئینی جیک راڈ تھا اور لڑکا بھی کسی ڈنڈا نما شے سے مسلح نظر آ رہا تھا۔

میں نے طفیل کو اشارہ کیا۔ اس نے آہنی راڈ لڑکے کو تھما کر حملہ آور کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ ہم اسے ڈنڈا ڈولی کر کے گاڑی میں لے آئے۔

گاڑی کی اندرونی جی روشنی کی توانجہ کی جھجک تھی۔ میں بھی ایک لمحے کے لیے ہولناک کر رہ گیا۔ خوف ناک پھل چاقو ابھی تک حملہ آور کے ہاتھ میں تھا لیکن اب یہ بائیں ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔ معلوم نہیں کس وقت اس نے چاقو دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں منتقل کر لیا تھا۔ مقام ٹھیک تھا کہ اسے چاقو استعمال کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ ورنہ جب ہم اسے ڈنڈا ڈولی کر کے لارہے تھے، وہ بڑی سلی سے میرا پیٹ چاک کر سکتا تھا۔ میں نے سمجھ کر چاقو اس کے ہاتھ سے

نکال لیا۔ سر کے بل گرنے سے اس کی پیشانی پر شدید چوٹ آئی تھی۔ بائیں بازو کے اوپر نیلا گنبد بن گیا تھا اور خون رس رس کر کان کی انارکلی میں ٹھس رہا تھا۔ اس کے حواس اب قدرے بحال ہو رہے تھے۔ نیم باز آنکھوں سے مجھے گھور کر وہ انٹھے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ کسی حد تک خوف زدہ بھی تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو پائی تھی کہ وہ چاقو کھونچنے کی کوشش میں اچانک گنڈھڑی پر کیسے جا کر۔

وہ چوہ میں بچتیں برس کا ایک غنڈا صورت شخص تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنی پیشانی کا نیلا گنبد نڈلا اور زخمیہ لیے میں ہولا "تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ استاد تمہاری ٹانگیں چیر کر رکھ دے گا۔"

"کون ہے وہ درم خاں؟" میں نے پوچھا۔

"نام سنو گے تو پیشاب نکل جائے گا۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

میں نے مسکرا کر کہا "مجھے بڑی رکاوٹ ہے پیشاب میں" تم نام لوشایہ میرا بھلا ہو جائے۔"

"استاد کارین کتنے ہیں اسے۔ وہ سامنے مکان میں موجود ہے۔" میرے حریف نے دھماکا کیا۔

میں چند لمحوں کے لیے شانے میں اٹھیا۔ استاد کارین سے اتنی جلدی بھر ملاقات ہو جائے گی یہ امید نہیں تھی۔ یہ ہمارے سامنے بڑا ہوا غنڈا غالباً ان افراد میں شامل نہیں تھا جو پانچ روز پہلے شامت کے گھر مجھ سے اپنی رگرت ہوا چکے تھے۔ میں نے طفیل وغیرہ کی طرف دیکھا۔ استاد کارین کا نام سن کر ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ طفیل نے سخی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ بے زبان خاموشی کہہ رہا تھا "باڈی! یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ کسی اور کی بات پر نہیں تو میری بات پر اعتبار کرو۔ یہ ناکوں پنے چوادر میں گئے آپ کو۔"

میں نے بڑی مایوسی کے انداز میں کہا "تو تم۔ استاد کارین کے بندے ہو؟"

اس کی گردن تھوڑی سی تن تھی۔ ایک دم ہی وہ ہوشیار اور چوکس نظر آنے لگا جیسے وہ ہمارے قبضے میں نہ ہو بلکہ ہم سب اس کے قبضے میں ہوں۔ میری بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے ہتھکڑیوں سے مکان کی طرف دیکھا۔ غالباً اسے یقین تھا کہ ابھی استاد غیرہ اس کی مدد کو پہنچ جائیں گے۔ اب میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یہ شخص مکان کے اندر سے ہی آیا ہے۔ ہوائی فائرنگ کے بعد یہ شخص مکان کے پچھواڑے سے نکلا تھا اور صورت حال

جاننے کے لیے کھیتوں کھیتوں چلتا میاں پہنچ گیا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے بند کی ڈب میں ایک وڈو کیٹ تھا۔ میں نے ڈب کھول کر کیٹ نکال لیا "یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سب کچھ تمہیں استاد ہی بتائے گا۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ موقع دیکھ کر ساتھیوں کو آواز دینے کی کوشش میں ہے۔

"استاد محترم کو میاں بلانا چاہتے ہو تو بلاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ وہ ابھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے ریو الوور نکال کر ہاتھ میں لیا اور اس کا گریبان کھینچتے ہوئے بولا "پلے آؤ بلالو استاد کو۔ اسے کوکھ تمہاری ماں کا قصص چوہڑی احسان آیا ہے لیکن یہ بھی بتادینا کہ وہ خالی ہاتھ نہیں ہے۔ اگر اس نے چلت بھرت دکھائے گی کوشش کی تو دوسرا سرانجام بھی تو دوں گا۔" جاڈ بلالو! ان سب بمن کے چمکنوں کو۔"

اس شخص کے چہرے پر خوف اٹھ آیا۔ میں نے اسے گاڑی سے نکال کر دکھا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دوڑ چلا گیا۔ پھر مکان کی طرف اس طرح بڑھا کہ ایک آنکھ میری طرف تھی اور دوسری مکان کی طرف۔ اس کی ست روئی دیکھ کر میں نے ایک ہوائی فائر کیا۔ اس فائر کے سبب اس شخص نے آخری دس گز کا فاصلہ بھاگ کر طے کیا اور دروازہ کھلوا کر اندر ٹھس گیا۔ میں بڑے اطمینان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا رہا۔ ریو الوور میری گود میں تھا۔ طفیل، انجم اور اسٹور والا لڑکا تہذیب میں میری طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ تو وہ خان ہی گئے تھے کہ میں ان بد معاشوں کو جانتا ہوں لیکن کیا وہ بھی مجھے پہچانیں گے اور میرے سامنے سر مطاعت خم کریں گے اس کا میں یقین نہیں تھا۔

میری گردن کا زخم ابھی اندر سے کچا تھا۔ دھیک دھیک ہوتی تھی تو کھاسانے کی طرف سے دھکے لگتے تھا۔ میں دھیرے دھیرے گلے پر ہاتھ پھیرتا رہا اور چوکس نظروں سے مکان کی طرف دیکھا رہا۔ ہمیں تقریباً تین منٹ انتظار کرنا پڑا پھر مکان کا بیرونی دروازہ کھلا اور لائین کی روشنی چمکی۔ اس روشنی میں میری نگاہ سب سے پہلے استاد کارین پر پڑی۔ وہ پراسکھوں پر کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں دو سونے تازے گر گئے تھے۔ ان میں سے ایک وہی دروازہ قد جوان تھا جس کی ناک پر میں نے اسے سر سے بوسہ دیا تھا اور جو بعد ازاں بے ہوش کارین کو اٹھا کر شامت کے مکان سے نکلا تھا۔ اس کے پاس اب بھی راتفل تھی لیکن یہ راتفل ہاتھ کے

بجائے کندھے سے لٹک رہی تھی۔ استاد کارین سمیت یہ تین افراد درمیانی رفتار سے چلتے گاڑی کی طرف آئے۔ انجم کا ہاتھ بے اختیار میرے کندھے پر اٹھیا۔ میں اس کے خوفزدہ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے گاڑی سے نکلا اور استاد کارین کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ استاد کارین کمری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں دونوں منڈے پوری طرح چوکس تھے۔ کچھ معلوم نہیں تھا انگلے لمحے کیا ہو جائے گا۔ بالکل ویشٹن انشاکل فلوں کا سین تھا جن میں لوگ اچانک اسلحہ ہاتھ میں لے کر ٹھانڈا شروع کر دیتے ہیں۔ چند لمحے اس کنبسیر خاموشی میں کئے پھر استاد کارین ہراساں ہو کر حرکت دے کر ایک قدم آگے آیا "باڈی! تم میاں کیسے؟" وہ اپنی بیٹی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے جواب دیا "تم سے کہا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ جب بھی تمہاری محبت میری محبت کو آواز دے گی۔ میں سر کے بل چلا آؤں گا۔"

استاد کارین نے بڑا سانس بچایا "باڈی! میں سیدھا ساہو بندہ ہوں، مجھ سے سیدھی سادی بات کرو۔ میں تم سے متھا لگتا نہیں چاہتا۔"

میں نے کہا "میں جانتا ہوں، تم مجھ سے متھا لگتا نہیں چاہتے تم تو متھا لگنا چاہتے ہو کمزور نیسے لوگوں سے جو تمہاری نہیں سمجھتیں کریں۔ تمہارے بھندے کھائیں اور تمہارا ظلم بھی بڑا دشت کریں۔ مجھ جیسے ٹوٹکے سے متھا لک کر تمہیں ٹوٹے ہوئے گونڈے کیڑوں کے سوا کیا ملے گا۔"

کارین خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ میں صاف طور پر دیکھ رہا تھا پانچ روز پہلے کی وہ مولا دھار رات اس کی چشم تصور میں محسوس رہی تھی۔

وہ ذرا الجاست سے بولا "باڈی! تم تو ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے ہو کون سا گناہ ہو گیا ہے ہم سے؟"

"ہاں گناہ تو انہی لوگوں کا ہے۔" میں نے جواب دیا "کتنے باپ ہیں یہ لوگ، کھدوں کے دروازے اندر سے بند رکھتے ہیں، تمہیں دیواریں بھلا کئی پڑتی ہیں پھر جس کا کھانا دہاتے ہو ہی تمہیں نکالتا ہے جس کی عزت تار مار کرتے ہو وہی پیچ دیکار کرتا ہے۔ بھلا یہ کوئی بات ہے! ظلم سنے کا بلیقہ بھی نہیں آتا ان شہوں کو۔"

میرے کھڑے کمرے نے کارین پر گھڑوں بانی ڈال دیا۔ اس کے اندر پانچ روز پہلے والی تن پھن میں نظر نہیں آتی تھی۔ وہ لمبے لمبے بولا "باڈی! اگر یہ تمہارے کوئی عزیز شہزاد ہیں تو ہم چلے جاتے ہیں میاں سے۔ مولا قسم ہم تو جنوں کے جن

ہیں۔ کبھی آزما کے تو دیکھو ہم کو۔
میں نے کہا "آزما کے تو دیکھ لیا ہے۔ ہمیں کما نہیں تھا۔ بندے کے بہترین جاؤ۔ چھوڑ دو یہ علاقہ۔"
وہ جڑ بڑھو گیا "باؤ یا رام نے کوئی ڈاکا تو نہیں ڈالا۔ پوچھ لے گھر والوں سے۔ کیا زناؤ کی ہے ہم نے ان سے۔ وہ چھوٹا میڈا بھی خود ہی بھاگتے ہوئے کر گیا ہے۔ اور کسی کو ہاتھ بھی لگایا ہو ہم نے تو کوڑے ہو جائیں۔"
"تو پھر کیا کر رہے تھے اندر؟" کاظم رارہے تھے؟
وہ میرے لیے کوٹھڑی اندر لے کر گیا "بس ایک رات کا بیکرا تھا تیار۔ صبح باگ کے ٹیم نکل جانا تھا یہاں سے۔"
رات کا بیکرا۔ یہ تمہارے بہنوئی کا گھر تھا؟ میں نے پھر جھگڑا لگایا۔

وہ بیچ و تاب کھا کر بولا "یار باؤ! کیوں ناراض ہوئے ہو اپنے بھجنوں سے۔ ہمیں برا لگا ہے تو دفع ہو جاتے ہیں یہاں سے۔ پھر دروازہ تو جو ان سے مخاطب ہو کر بولا "جھالے! اجا بلا لکیرے اور رخت کو۔"

"عمو" میں نے جھالے کو ڈانٹ پلائی "تجی جلدی کس بات کی ہے؟ پہلے اندر جا کر تمہارا رین سپر اوٹو دیکھ لیں۔"
کارین کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ انجم حیرانی سے مجھے دیکھ رہی تھی لیکن زیادہ حیرت طفیل اور اسٹور والے کے چہرے پر تھی۔ وہ کارین کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس شیر کے منہ سے میاؤں میاؤں کی آواز نکل رہی ہے۔ ان کا خیال غالباً یہ تھا کہ کارین یہاں پہنچتی ہے ہم سب کو گاڑی میں بند کرے گا اور پٹرول وغیرہ چیز کرک اٹک لگاے گا لیکن وہ توفیق کی ٹھنڈی ٹھارڈی بنا میرے لیے کی حرارت سے پھلتا جا رہا تھا۔ ریو اور میں نے بینک کی جیب میں ڈال لیا لیکن اس طرح کہ اس پر میری گرفت بدستور قائم رہی "چلو آؤ در اندر دیکھیں تمہاری شرافت کے نمونہ جات۔"

میں نے کارین کو ساتھ لیا اور مکان کی طرف بڑھنے لگا۔ رات نکل برادر میرے واپس پہلو پر تھا۔ اس کی ہر جنبش میری نگاہ میں تھی لیکن محسوس ہوتا تھا کہ وہ مزاحمت کا ارادہ نہیں رکھتے شاید کارین وغیرہ کو یقین تھا کہ یہ معاملہ زیادہ بگڑنے نہیں پائے گا۔ کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی تھی۔ بہر حال وہ شرافت سے میرے ساتھ چل رہے تھے۔ میری ہدایت پر طفیل اور اسٹور والا لڑکا انجم کے پاس ہی رگ گئے تھے۔ بیوی دروازے سے گزر کر ہم مکان میں داخل ہوئے۔ سامنے کے چھوٹے کھن میں بلب روشن تھا۔ یہ ایک حویلی نما

دو منزلہ مکان تھا۔ شاید علی گڑھ کالج سے بھی پہلے کا تعمیر شدہ۔ کلکی کے منتشر دروازے، جگہ جگہ طائفان، ٹانگ چندی انہیں اکثر جگہوں پر پلستر کے پچے سے جھانک رہی تھیں۔ پہلو کی دیوار پر بے شمار ایلے لگے ہوئے تھے۔ ان ایلوں کے قریب ہی ایک وچھیری اور مرل سی بھینس بندھی ہوئی تھی۔ بھینس کی گھٹی کے پاس مرثوں کے بے شمار پرے تھے اور تازہ خون دکھائی دے رہا تھا۔ لگتا تھا "ٹھوڑی دیر پہلے آٹھ دس مرغیاں کالی مٹی ہیں۔ مکان کے پہلو سے ایک ٹنگ راباوری لڑکتی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ پچھواڑے میں کالی کھلا احاطہ ہے اور وہاں کئی اقسام کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ برآمدے سے گزر کر ہم ایک کمرے کے سامنے پہنچے۔ اس کمرے کے دروازے پر بڑا سانگ اکوڑ تالا لگا تھا۔ انجمی طفیل نے بتایا تھا کہ عطا محمد کے گھر میں چھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ پھر اس تالے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ یہاں دو لافضیاں کھڑے تھے۔ پانچ دو پہلے یہ دونوں میرے ہاتھوں پر پٹ چکے تھے اور اس پٹائی کے آثار جدیدہ ان کے چوڑوں پر پائے جاتے تھے۔ کارین نے انہی کے نام رحمت اور کیرے لے لیے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ رحمت کیرے اور کارین سمیت یہاں موجود پانچوں بچے بلانے سمان نشے میں ہیں۔ اس امر کی تصدیق جلد ہی ہوئی۔ میں نے مقتل کمرے کے عین سامنے ایک کشادہ کمرے میں جھانکا تو وہاں اور ہی رنگ نظر آیا۔ ایک اچھلی سی درمی چھٹی تھی۔ اس پر تاش کے بچے بکھرے ہوئے تھے۔ قریب ہی شراب خانہ خراب کی بوتلیں اور گلاس رکھے تھے لیکن یہ بوتلیں ابھی کھلی نہیں گئی تھیں اور تاش کی بازی بھی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ ابھی تاشی کے مراحل میں تھا۔ کمرے کے مشرقی کونے میں کلکی کی پٹائی پر ٹپل وین رکھا تھا اور اس پر ایک بوسیدہ سا وی سی آر ہوا تھا۔ وی سی آر کے پاس دو ٹین کیسٹ رکھی تھیں۔ کالی لیے چوڑے انتظامات تھے رات گزارنے کے کمرے میں جو سب سے چوکا دینے والی شے نظر آئی وہ بیوی کی اسکرین تھی۔ اس پر ایک نہایت بے ہودہ نقش قلم چل رہی تھی۔ یوں لگا تھا وہ انجی کی اسکرین پر دنیا جہان کی شیطانی سمیت دی گئی ہے۔ انفرادی تقری میں رحمت اور کیرے کو بیوی آف کرنے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ اب مجھے اسکرین کو کھورتے دیکھا تو کیرے نے لپک کر سوچ آف کر دیا۔

"بست خوب۔ بست خوب" میں نے بینک کی جیب سے ہاتھ نکال کر تالی بجائی "شب بیری کا اچھا انتظام کرو گھا

ہے تم نے۔"
اسے میں کبیں نزدیک ہی کوئی دروازہ کھٹ کھٹ بجے لگا۔ ساتھ ہی کوئی کھٹی کھٹی آواز میں پکار رہا تھا۔ یہ آوازیں سن کر کارین کے چہرے پر مزید ہچکچاہٹ برپا ہوئی۔ چند لمحوں کے لیے تو مجھے لگا کہ وہ باجی دودھ پیلے کا سینہ فراوانش کر کے ایک دم مجھ پر چڑھائی کرے گا۔ اپنی اگلی ٹانگ پر اچھلے گا اور بلائے نالمانی کی طرح جھپٹ پڑے گا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا اور بے بسی کا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔
میں نے کہا "ستار" لگتا ہے تمہارے بھائی ان تم سے کچھ زیادہ ہی خوش ہیں۔ آؤ در ہم بھی ان کی خوشی میں شریک ہوں۔"
وہ مصالحتانہ انداز میں بولا "باؤ یا رام! ہمیں شرمندہ کر رہے ہو۔ کوئی دیکھتی نہیں کی ہے ہم نے یہاں۔ بس ذرا تفریح کرنے کے لیے آئے تھے۔ عطا محمد کے مکان میں بجلی ہے۔ میں نے کما چلو ٹیلی وین چل جائے گا۔ دو ٹین قلیں دیکھ کر ان مشنوں کا رانچا رانچا ہو جائے گا۔ میں تو مرغیوں کے پیسے بھی دے رہا تھا عطا محمد کو لیکن وہ خواہ مخواہ بھڑک گیا۔ کتنے لگا میں یہاں یہ سب کچھ نہیں ہونے دلا۔ مجبوراً اسے پھیلے کمرے میں بند کر دیا۔"

"بالکل ٹھیک کیا ہے تم نے۔ ایسے بے لحاظ شخص کی یہی سزا ہونی چاہیے۔ تم نے ٹھوڑی سی تفریح ہی کرنی مٹی نا۔ شراب پینی مٹی یا بیو پرنٹ دیکھا تھا۔ بت ہوتا تو انہیں میں مار کٹائی کرتا مٹی یا بیو پرنٹ اتار کر بھگوا ڈال لیتا تھا۔ اس کی بھلا عطا محمد کو کیا نذیف تھی۔ وہ بیوی بچوں کو لے کر دریا رہتا آرام سے ایک کمرے میں۔ صبح سویرے ہمیں ٹھوٹے پرائے کا اشتا کرانا اور رخت کدوت۔"
کارین نے بے بسی کی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ کوئی شے اسے مجھ پر ٹوٹ پڑنے سے روکے ہوئے تھے۔ میں لیکن تھا کہ وہ مجھے خانا نہ سمجھ رہا ہو۔ اس کے ذہن میں یہ بات آ سکتی تھی کہ میرے سامنے میرے ارد گرد موجود ہیں۔ میری خود اعتمادی۔ اسے اسے بری طرح مرعوب کر دیا تھا۔ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ میں اس روز کی طرح آج بھی یہ بازی ہار چکا ہوں۔ میں نے کارین کو ساتھ لیا اور اس دروازے پر پہنچا جو اندر سے دھڑ دھڑ رہا تھا۔ یہ کوئی اسٹور کمرہ لگا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر گنڈی گرا دی۔ اندر چوہہ بارہ اور دس سال کی عمر کے تین لڑکے تھے۔ ان کا باپ ایک سفید ریش شخص تھا جس کی بچی گلی میں بیڑی مٹی اور گرجان پنا ہوا تھا۔ اس نے سب سے چھوٹے لڑکے کو پہلو

سے لگا رکھا تھا اور بچی کا ایک پلو اس کی پیشانی پر دبا رکھا تھا۔ لڑکے کے رونے دھونے سے پتا چلتا تھا کہ اس کی پیشانی پر زخم آیا ہے۔
مجھے دیکھ کر بڑھے نے پر ہی سے کہا "تم یہ دروازہ کھل دو اور جو حرام کاری کرنی ہے اس کمرے میں کرتے رہو۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"
وہ گلی سے مجھے بھی کارین کا سامنے سمجھ رہا تھا۔ اس کی آواز سن کر کبیں پاس سے ایک اور میزمرعوت بھی آگئی۔ اس کے ہاتھ کیلے آئے میں لہجے سے ہوتے تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ باورچی خانے سے آئی ہے۔ وہ بھی دوپٹا زمین کے دو رہی تھی۔ عورت کو دیکھ کر زخمی لڑکا اور زور زور سے رونے لگا۔ عورت نے "میرا پتر" کہہ کر اسے گلے سے لگایا اور سر جھونے لگی۔ کارین اینڈ کینیڈا بچہ بکڑی تھی۔ میں نے بوڑھے عطا محمد سے کہا "میاں جی! آپ گھبراہٹ میں پولیس کا آؤ ہوں کوئی زیادتی نہیں ہونے دوں گا آپ سے۔ آپ اس کمرے میں آرام سے بیٹھیں۔ بچے کی مرہم پٹی کریں۔ میں ذرا ان "ماں کے شیروں" سے دو باتیں کر لوں۔"

"پولیس" والی ہوائی میں نے یوں ہی چھوڑی تھی لیکن اس ہوائی کی روشنی نے اہل خانہ کے چہروں کو متور کر دیا۔ دوسری طرف کارین اینڈ کینیڈا جن کے چہرے پہلے ہی تاریک تھے اور تاریک ہو گئے۔ میں کارین کو ساتھ لے کر پہلے والے کمرے میں آیا۔ اس کے ساتھیوں کو میں نے باہر ہی رکھنے کا اشارہ کیا۔ تھائی پاکر کارین نے اپنی رہی سہی اکڑوں کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ عاجزی سے بولا "باؤ یا رام تو پولیس والا ہے یا نہیں لیکن میں تجھے عزت کی جگہ ہی سمجھ رہا ہوں۔ میں نے تجھے یار کہا ہے اور کارین نے ایک باریاد کہہ دیا ہے اس کے پاس کی جڑی ہو جاتا ہے۔"

"بڑے کی ماں کا سر یار ہو تم" میں نے بلا جھجک کہا "تم صرف ڈنڈے کو پونے والے لیکن بدعاش ہو۔ اپنی کئی زبان سے یار اور یاری جیسے لفظوں کو ٹانگ نہ کرو۔ صرف یہ تاؤ کہ یہاں کیا کرنے آئے تھے۔" میں اسے پوری طرح ذلیل کرنے پر تھکا ہوا تھا۔
وہ آخر کا گھونٹ بھر کر بولا "میں نے جس حقیقت بتادی ہے اس گھر میں رکھا ہی کیا ہے جو ہم چھینے آئے۔ یقین نہیں تو خود چل پھر کر دیکھ لو۔ صرف رات گزارنے آئے تھے۔ صبح ہوتے ہی چلے جانا تھا۔ اب تم ناراض ہوئے ہو تو ابھی دھکان ہو جاتے ہیں۔"

”وہ تمہارا حرامی یا رباؤا کہاں ہے؟“ میں نے رعب سے پوچھا۔

”وہ تو لاہور گیا ہوا ہے۔ اپنے بڑے بھائی صاحب کے پاس۔“ کارین اب میری گالیاں بھی آسانی سے ہنسنے لگی تھیں۔

میں نے انگلی اٹھا کر کہا ”دیکھو“ اس بہن کے دیر کو سمجھاؤ اگر پھر اس نے شامت کے گھر کی طرف آنکھ بھی اٹھائی تو دی چٹا گرم کر کے۔ تمہارے دوں گے سمجھ رہے ہوں میری بات؟“

کارین کا سر بے اختیار اثبات میں ہل گیا۔ غالباً سر کی اس حرکت پر اسے بعد میں سختی پہنچے شرمندگی رہی ہوگی۔ میں کارین کو ذلیل تو کر رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ دیر بھی رہا تھا۔ مجھے غصہ تھا کہ میں وہ حد نہ گزر جائے جس کے گزرنے پر مرل کتا بھی دانت چکانے لگتا ہے۔

اتنے میں دیوانے پر بوڑھے عطا محمد کی صورت نظر آئی۔ وہ دہائی آواز میں بولا ”انپکڑ صاحب! دو منٹ کے لیے میری بات بھی سن لیجئے۔“ بغیر کسی کلفت پڑھت کے بوڑھے عطا محمد نے مجھے انپکڑ مان لیا تھا۔

”جی فرماؤ میاں جی“ میں نے دیوانے میں آتے ہوئے کہا۔

عطا محمد نے اپنے پیچھے چلاتا دیکھ کرے میں لے آیا۔ پھر یہاں بھی ٹہلی نہیں ہوئی تو وہ اس کمرے میں گیا جسے کھانا پکانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں چولے پر دیگیا چڑھا ہوا تھا اور ایک بڑی برات میں آٹا گوندھا رکھا تھا۔ دیکھ کے پاس ہی مرنی کا مٹلا ہوا گوشت رکھا تھا۔ یہ سارے شب بکری کے انتظامات تھے جو کارین اینڈ کمپنی نے اہل خانہ سے زبردستی کرائے تھے اور اب جو میری وجہ سے درہم برہم ہو گئے تھے۔

عطا محمد نے کہا ”انپکڑ صاحب! اب اکیلے تو نہیں ہیں نا۔ میرا مطلب ہے یہ بڑا خطرناک ذہن حاش ہے۔ دس پندرہ بندے آپ کے ساتھ ہوں تو پھر ہاتھ ڈالیں اس پر۔“

میں نے کہا ”یہ میرا کام ہے عطا محمد تم فکرت کرو۔ باقی ان لوگوں نے تم سے کچھ جھگڑا تو نہیں ہے؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔ عطا محمد نے مجھ سے جوابی سوال کیا ”۱۳ مارچ، جیسا کہ

والے نے کیا بتایا ہے آپ کو؟“ ”کچھ نہیں۔ کہ رہا تھا کہ ہم یہاں رات گزارنے لے آئے تھے تم لوگوں نے بات نہیں مانی تو ہمیں کمرے میں بند کر دیا۔“

عطا محمد کے چہرے پر لیکوں کا جال تھا۔ مجھے اس آنکھوں میں تشویش اور سوچ کی گہری پرچائیاں نظر آئیں وہ بولا ”پتہ چلی؟ اتنی سی بات نہیں ہے یہ کوئی بہت گمراہ ہے۔ دراصل۔۔۔ دراصل کچھ لوگ ہمیں اس مکان سے داخل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم یہ مکان بچ کر چھوڑ کر چلے جائیں۔“

میں نے عطا محمد کے لیے سے متاثر ہو کر پوچھا ”کیا ام سے پہلے بھی کوئی ایسی بات ہوئی ہے؟“

”ہوئی ہے پتہ چلی؟ اسی لیے تو تم رہا ہوں اور ایک دفعہ بھی کئی دفعہ ہوئی ہے۔“

”کیا مطلب؟ پہلے بھی یہ مسئلہ یہاں آتے رہے ہیں؟“

”نہیں“ یہ اختصار تو انہوں نے پہلی دفعہ چلایا ہے۔ ام سے پہلے دھمکیاں دیتے رہے ہیں اور وہ ابے شاہے مارے رہے ہیں۔ اور ملک روف ہے خزان والی گاؤں کا ”اسی“ حویلی ہے یہ۔ آلے دوالے کی زمین بھی اسی کی ہے۔ ہم اور دادو والا سے گھرا ہوا چھوڑ کر آئے ہیں۔ بس دشمنی چل رہی ہے۔ بڑا لڑاکا اسی دشمنی کی آگ میں مریگا۔ اور جوان لڑکیاں ہمیں گھر میں اور میں بوڑھی جان۔ نہ کوئی باز نہ سارا۔ میں نے سوچا کل کلاں کو کچھ ہو گیا تو کیا کروں گا کس کے ہاتھ پر اپنی عزت کا کوئی تلاش کرتا چھوڑا گا۔ چہ چاہ زمین اور حویلی پتی اور کان لپیٹ کر یہاں آیا۔ کاشکاری کے سوا کاشکار اور کیا کر سکتا ہے۔ میں نے بھی نا کچھ کرنا تھا۔ یہاں باج پچ کھیت ملک روف سے لے لے او کام شروع کر دیا۔ ایک رات ساڑھے تین بجے لیا تھا کمرہ توڑے دن پہلے بیٹیوں کی شادی پر پیتا پڑا۔ یہ حویلی بکر زمین کے ساتھ ہی ملی تھی۔ ابھی کچھ دوپہر رہا ہے اس۔ اینٹ گارے کا۔ سوچتا ہوں آڑے آڑے سے تین چار سال اور گزر جائیں۔ دوا پتر اپنے منہ سر ہو جائے تو میرے گردے ٹوٹے میں بھی جان پڑ جائے لیکن یہ تو بے ی ہے کہ سر چھپانے کو جبکہ لی رہے اور کسی طرح دال دلی نہ رہے۔“

میں نے کہا ”کون کتنا چاہتا ہے آپ کو اس مکان سے؟“ کس نے وہی پچھلی دشمنی تو نہیں۔“

عطا محمد بولا ”تیس پتہ چلی۔ شاید قسمت میں ہی پکر ہے۔ لگتا ہے کچھ لوگ ملک روف کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ جیسے بھی ہو وہ ہم سے یہ مکان خالی کرانے پہلے تو وہ نہ رہا کرتا تھا۔ پھر دھمکیاں دیتے لگا۔ میری بیٹیوں کی شادی تھی۔ گاؤں کے سیناؤں نے کہا کہ وہ کم از کم شادی تک تو چین سے بیٹھے شادی کے تیرے چوتھے دن ہی کوئی شخص ہمارے گھر میں گھس آیا۔ ایک بالو کتا تھا۔ یہ شہر جیسا اللہ بننے میرے وڈے پتر کی نشانی۔ پتا نہیں اس شخص نے اسے کھلا کھلا دیا کیا کر دیا۔ صبح اس کی لاش دیکھی تو میرے بچے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ پھر ایک دن پچھلے معاملے سے کوئی ساری سبزی تو ڈر کر لے گیا۔ اس سے اگلے دن دو رت کے دن نے گھر میں گھسنے کی کوشش کی۔ شہر ہے میری نظر پڑی میں نے دو بوائے فیر کھالے تو وہ بھاگ گئے۔“

میں نے کہا ”تمہارا مطلب ہے کہ یہ لوگ ہمیں ڈرانے دھمکانے کی کوشش کر رہے ہیں؟“

”بالکل جناب۔“ مجھے پکا یقین ہے یہ بندے بھی ملک روف نے بھیجے ہوں گے۔ وہ ہر صورت اس حویلی کو خالی کرنا چاہتا ہے۔“

میں نے کہا ”۱۳ بھی تم کہہ رہے تھے کہ ملک روف کو کوئی دھمکا رہا ہے۔“ ”جی مطلب ہے میرا جی۔ ملک کو حویلی کی ضرورت ہوئی تو وہ چھ مہینے پہلے بیچا ہی کیوں۔ اب بھی مجھے یہ نظر آ رہا ہے کہ اسے حویلی کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کا چنگا بھلا کو کام ہے گھر ہے۔ اسے اس کا باز خانے کی کیا ضرورت ہوگی۔ کوئی اور ہے جو اس سے یہ حویلی خالی کرنا چاہتا ہے اور تیرا لی بات ہے کہ میرے کہنے کے بھی نہیں صرف تین چار مہینے کے لیے پچھلے تھے ملک روف مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اگر میں حویلی چھوڑنا نہیں چاہتا تو تین چار مہینے کے لیے خالی کر دوں۔ وہ اشتیاق لکھ کر دے سکتا ہے کہ وہ حویلی میں بطور کراہے دار رہتا ہے اور مقررہ وقت پر حویلی خالی کر دے گا۔ میں نے جواب میں کہا ”ملک صاحب اس کا مطلب ہے یہاں ضرورت کوئی غیر قانونی کام ہوگا۔ اب یہ حویلی میرا گھر ہے میں اس گھر میں خرام کاری نہیں ہونے دوں گا۔ ملک روف منہ سے کچھ نہیں بولا لیکن لگتا تھا اندر سے ہانڈی کی طرح اٹل رہا ہے۔“

میں نے عطا محمد سے پوچھا ”تمہارا کیا خیال ہے ملک

روف کیا کرنا چاہتا ہے یہاں؟“ ”بوڑھے کے چہرے پر ایک بار پھر سسکی کے آثار نظر آئے۔ اس کی آنکھوں میں تشویش اور ابھرن اس طرح کیجا ہو گئی تھی کہ ایک کو دوسری سے جدا کرنا مشکل تھا۔ اس نے ایک نظر کھینچ کر باہر دیکھا۔ استاد کارین اور اس کے گھر کے کرا خالی کر رہے تھے عطا محمد کا بڑا لڑکا ان کے سرانے کھڑا گھمرائی کر رہا تھا۔ عطا محمد نے کہا ”آپ کس خانے میں ہیں جی؟“

یہ غیر متوقع سوال تھا۔ میں سنبھلا لیکن فوراً سنبھل گیا ”میں شاہ پور سے آیا ہوں۔ ایس ایچ او ہوں وہاں کا۔“

”ایس ایچ او تو ڈاؤن تھانیدار ہوتا ہے نا؟“ ”وہی تو اللہ کی ذات ہے بابے۔“ بس آپ مجھے تھانیدار کہہ سکتے ہیں۔“

عطا محمد نے اپنی دلی ہوئی آواز کچھ اور دہائی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے لیے میں خود بخود ایک لرزش سی آگئی۔ کسے لگا ”مجھے لگتا ہے یہاں کوئی بہت ڈرا پکڑ چکے والے ہے۔ بہت ہی ڈرا اور ڈرنا۔ اندر ہی اندر کوئی ڈراؤنی سازش ہو رہی ہے یہاں۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا ”کوئی تین مہینے پہلے کی بات ہے ایک روز ملک روف دو انجان بندوں کے ساتھ میرے گھر آیا۔ یہ دونوں شہری بابو تھے۔ کئی اونچے لمبے اور صحت مند۔ ان میں سے ایک نے مجھے میں کھیر ڈال رکھا تھا۔ ملک روف نے کہا کہ یہ اس کے دوست ہیں شہر سے آئے ہیں۔ انہیں گاؤں کے پرانے ڈیروں اور حویلیوں کی تصویریں اتارنے کا شوق ہے۔ یہ حویلی کی تصویریں وغیرہ لینا چاہتے ہیں۔ اس وقت مجھے ملک روف نے حویلی خالی کرنے کے لیے دھمکیاں وغیرہ بنا شروع نہیں کی تھیں۔ میں نے ان بیٹیوں کو ”جی آئیوں“ کہا اور حویلی میں لے آیا۔ وہ سامنے والے پڑے کمرے میں بٹھایا۔ ملک روف نے کہا کہ مسمان لکھی کی روٹی کھانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ابھی کھانا لاتا ہوں۔ میں نے گھر والی کو آٹا گوندھنے کا کام۔ مجھے شک تھا کہ ملک روف مجھ سے حویلی اس لیے خالی کر رہا ہے کہ ان لوگوں کو پیتا چاہتا ہے۔ چھپ کر کسی کی بات سننا گناہ ہے لیکن میں شک کے ہاتھوں مجبور ہو کر دوڑے کمرے کی طرف چلا گیا۔ دروازے سے کان لگا کر میں نے سنا ”کیرے دالا بابو جیل کا نام ناصر تھا“ ملک روف سے کہہ رہا تھا کہ گاڑی میں کوئی شے رہ گئی ہے“ وہ لے آئے پتا نہیں کوئی سیل وغیرہ تھے جو انہوں نے کمرے میں ڈالنے تھے ملک روف ”اچھا صاحب“ کہہ کر نکل گیا تو وہ دونوں بندے ایک

دم جو کس ہو گئے سب سے پہلے وہ اس دوازے کی طرف آئے جس کے پیچھے میں کھڑا تھا۔ انہوں نے بغیر آواز پیدا کئے اندر سے گنڈی چڑھا دی۔ پھر وہ بڑی تیزی سے کمرے کی دیواریں دیکھنے لگے۔ میں ان کی صورتیں دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ لگتا تھا وہ اس کمرے میں پہلے بھی آئے ہیں اور یہاں کوئی خاص نشانی ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ بالکون کی طرح دیواروں پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ پھر پھرت کو ٹھوڑے لگے تب وہ دوازے کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

ناصر نے کہا "یہی ہے؟"

دوسرے نے کہا "ہاں ہی ہے، بالکل ہی ہے۔" ناصر کے چہرے پر خوف سا نظر آنے لگا "بولو! یا راجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

دوسرا ہنس کر بولا "ڈر میں وہ جو مرس گئے جن کی لاشیں سڑکوں پر تھیں کی اور مژدہ خاؤں میں اکڑیں گی۔ ہمیں جھپٹ کیا اڑنا۔"

ناصر نے کہا "یا ر! آہستہ بولو، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

دوسرے نے کہا "گاؤں میں نہیں ہوتے۔ بڑے بادشاہ لوگ ہوتے ہیں یہ۔ سن کر بھی کچھ نہیں سنتے وہ لطیفہ سنا ہے تم نے۔"

اتنے میں برآمدے کی طرف سے آہٹ ہوئی۔ ملک رؤف واپس آ رہا تھا۔ دونوں ٹھک کر چپ ہو گئے ناصر نے جلدی سے اندرونی دوازے کی چوٹی اُتار دی اور اپنی جگہ یوں بیٹھ گیا جیسے یہاں سے ہلائی نہیں تھا۔ میں باورچی خانے میں واپس آیا۔ میری بیٹیوں نے میرا اڑا ہوا رنگ دیکھ کر پوچھا "کیا ہوا ہے اب؟"

میں نے کہا "کچھ بھی نہیں" مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں نے کیا دیکھا کیا سنا ہے اور اس کا کیا مطلب ہے "ڈر میں وہ جن کی لاشیں سڑکوں پر تھیں کی اور مژدہ خاؤں میں اکڑیں گی۔" وہ دونوں شرمی بابو تو تھوڑی دیر کے اور تصویریں وغیرہ اُتار کر واپس چلے گئے لیکن مجھے سوچنے کے

ڈونگے سمندر میں بھیج دئے گئے۔ پتا نہیں وہ کیا بات کر گئے تھے۔ چار پانچ روز غم میں نے سب کچھ رپ تو کٹی چھوڑ دیا۔ بس اتنا کیا کہ اس کمرے کو تالا لگا دیا جس میں وہ دونوں بابو کچھ ڈھونڈتے رہے تھے۔ آپ نے برآمدے کے پاس وہ تالے والا کمرہ دیکھا ہی ہوگا۔ اس دن سے آج تک وہ اسی طرح بند ہے جس تو اللہ کی ذات پر مجھوسا رکھنے والا بندہ ہوں گی۔ جب تک وہ سوہتا رہ نہ چاہے کوئی چور ڈاکو یا جن

آسیب بندے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جیوں اللہ رسوا اونوں کون چھپے چھپے دنوں ایک اللہ والے سے دو تہا کرا کے میں نے دوازے سے باندھ دیئے تھے۔ جہاں اللہ نام ہو وہاں خیر ہی خیر ہوتی ہے۔"

بوڑھے عطا محمد کی باتیں مجھے اپنے ساتھ بھا کر کہیں کہیں لے جا رہی تھیں۔ اگر اس کی بات درست تھی، ملک رؤف اسے حویلی سے نکالنے کے لیے کوششیں کر رہا تو یہ چکر واقعی کھرا ہو جاتا تھا۔ میرا دھیان کاربیں اور کارب کے باؤں کی طرف جا رہا تھا۔ "ادا! آقا قادر زماں کا بھرم جاتا تھا اور یہ علاقہ آقا قادر زماں کی جاگیر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس معاملے کا تعلق راست آقا قادر زماں سے ہو۔ آقا قادر زماں برائی کا درخت تھا جس سے جراثیم کے بے شمار ضعیف پھونپھون پھیلے یہ درخت اتنا گھنا تھا کہ اس کے نیچے کوئی اور پودا پروان ہی نہیں سکتا تھا۔ نجانے کیوں میرا دل گواہی دینے لگا کہ اس خست پال دیہاتی مکان میں کوئی گزبڑے یا ہونے والی تو اس کا تعلق آقا قادر زماں سے ہوگا۔ انہی استاد کا اپنے گناہوں کے ساتھ یہاں سے رٹو چکر نہیں ہوا تھا۔ چاہتا تو اسے روک کر اس سطلے پر پوچھ کچھ کر سکتا تھا کہ اندازہ ہوتا۔ کم از کم یہی پتا چلتا کہ وہ یہاں صرف را گزرنے کے لیے تھے یا کسی سازش کو پروان چڑھا کے لیے۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ کاربیں وغیرہ کچھ بھی سمجھ رہے تھے لیکن یہ حقیقت تھی کہ میں یہاں تھا۔ اگر کاربیں کے سامنے اپنی جھپٹا ہٹ کو خرید کر میرے مقابل آجاتے تو لینے کے دینے دے دیتے تھے۔ مگر کہ اس وقت ان پر اور رعب نہ گناھا جائے اور وہ بے سے ٹھک رہے ہیں تو انہیں ٹھیکے دیا جائے۔ اس معاملے نوہ بعد میں بھی لگائی جاسکتی تھی۔ اس وقت میرے سا اصل ٹارگٹ احمد راجال سا ہی تھا۔ مجھے تنہا کھی پچھتا چھا جلد سے جلد ان فردوس میں اپنا کمرہ آباد کرنا تھا۔

○

استاد کاربیں اور اس کے ساتھی اپنے رہی آتے سفید گھوڑی پر بیٹھ کر نکل گئے تو میں نے عطا محمد کو تسلی دی اور خود بھی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ بطور اسپیئر میں نے اسے یقین دلادیا تھا کہ اس معاملے کی چھان بین کون گا اور اگر واقعی کوئی سازش پروان چڑھ رہی ہے تو اسے بے نقاب کیا جائے گا۔ عطا محمد، ٹھیل اور والا "سب کے سب میرے بے حد احسان مند نظر آتے۔"

ابا عطا محمد نے میری باتیں لیتے ہوئے کہا "تھاندا رٹو! آتے تھے اور تیری تھاندا رٹو! کو سلامت رکھے۔" نیراری سے اس کی مراد انجم تھی۔ انجم کو بات سمجھ میں آئی تھی اس لیے وہ شرم سے سرخ ہو گئی۔ میں جلدی سے ڈی میں بیٹھ گیا کیونکہ اپنی "تھاندا رٹو! سلامت رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ میں جلد از جلد یہاں سے روانہ جاؤں۔ اگر قریبی گاؤں کا کوئی معزز پولیس والا یہاں پہنچتا تو مجھے اپنا بھرم قائم رکھنا مشکل ہو جاتا۔

پتہ سڑک پر پہنچنے ہی میں نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ چند رات کے تقریباً دو بج چکے تھے۔ پروگرام کے مطابق میں بتا تھا کہ ہم ہشتا جہلم میں کریں۔ جی ٹی روڈ کے کنارے قریب ایک ہوٹل اس "کلام" کے لیے نہایت مناسب تھا۔ لاہور والے چکر میں ہم تقریباً ڈیڑھ گھنٹا ٹھہرے تھے۔ انی وہاں سے رخصت ہوتے ہوتے ہمیں ڈیڑھ بج گیا تھا۔ ہم میں نے یہ ایٹ نکال لی اور صبح ساڑھے سات بجے ہم ملے بیٹھ گئے۔ راستے بھر انجم کے ساتھ بلی چسکی گفتگو ہوتی رہی۔ وہ اب مجھ سے کافی متاثر نظر آتی تھی۔ ظاہر ہے وہ استاد کاربیں وغیرہ ہی تھے۔ ان باہمی کراہی غنڈوں نے جس طرح میرے سامنے برکتیم خرم کیا تھا وہ یقیناً انجم کے لیے براں کن تھا۔ کاربیں کے چاقو بردار پیچھے سے میری جھپٹ انجم کے سامنے ہی ہوئی تھی۔ میں نے اسے سر سے اڑھائی لے کر گنڈی پڑے مارا تھا۔ انجم کے لیے طاقت اور پھرتی ایسا مظاہرہ مرغوب کن تھا اور وہ اپنی مرغوبیت کا اظہار بھی کر چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ انجم کے دلوں میں وہ بے حد جوش تھا جو آغاز میں نظر آ رہی تھی، خاص حد تک کم ہو گئی۔

بہت دور میری باتوں پر بھڑکانے لگی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے سینے میں امینہ کی ایک تسلی سی کرن بھی روشن ہو رہی ہے۔ وہ میری کبھی ہوئی باتوں کی بازگشت سن رہی ہے اور سوچ رہی ہے کہ کیا واقعی وہ قادر زماں کے آہنی جال سے غلج گئی ہے۔ راستے میں اس نے میرے بارے میں کئی سوالات کئے تھے۔ میں نے مختصراً انداز میں ان سوالوں کے جواب دیئے اور اسے یقین دلادیا کہ میں مندر کا ایک دیرینہ دوست ہوں، حال ہی میں کویت سے آیا ہوں اور بہت جلد اسے مندر سے ملانے والا ہوں۔

جہلم کے اس ہوٹل کا کمرہ کون محل انجم کو بھی پسند آیا۔ نیم گرم پانی سے منہ دھو کر وہ خاصی فریض نظر آ رہی تھی اور اس کی دھواں دوری گئے کام رنگ سوسٹراس کی سائے رخت پر خوب بیٹھ رہا تھا۔ ہوائے کٹ بال کم لڑکیوں

کے چہرے پر اتنے ایسے نظرتے ہیں۔ وہ اونچی اڑی می کی جوتی ہر نزاکت سے چلتی میری طرف آتی تو میں مندر کے انتخاب کا معترف ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بیٹنی کے زخم کی وجہ سے انجم کی چال میں ابھی تک بلی کی نظر ابٹ ہے لیکن یہ نظر ابٹ ابھی نہیں تھی کہ عام غصے کو اپنی طرف متوجہ کر لی۔ زیادہ سے زیادہ کی سمجھا جا سکتا تھا کہ ایک پاؤں کی جوتی تھوڑا سا کٹ رہی ہے۔

ناشتے کے دوران اور بعد میں ہمارے درمیان مسلسل بلی چسکی گفتگو ہوتی رہی۔ اس گفتگو نے انجم کو میری ذات پر مزید اعتماد بخشا۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم نے دوبارہ سفر شروع کیا تو ماحول اس امر کے لیے سازگار تھا کہ میں انجم سے وہ حالات پوچھوں جن سے وہ اغوا ہونے کے بعد دوچار رہی ہے۔ میرے اس سوال کا جواب انجم کے لیے بہت مشکل تھا لیکن وہ اس کھٹائی پر قابو پانے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ بہت آہستہ روی سے سہی لیکن آقا قادر زماں کا سحر اس پر سے ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے جھکی جھکی نظروں سے جو کچھ بتایا اور اس کی باتوں سے میں نے جو نتائج اخذ کئے اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

تقریباً چار ماہ پہلے انجم کو مگرات سے دوبہ قاش افراد نے اغوا کیا تھا۔ اس لڑکی کے بھائی تھے جسے انجم خرابی تقدیر کے باعث پرکھی کو بڑی کمرہ بنی تھی۔ انجم نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس بات کا پتہ کون جانے گا اور پتہ کون بھی ایسا کہ نتیجے میں وہ ایک دن اغوا ہو کر بے خبر لوگوں کے رحم و کرم پر ہو گی۔ انجم کو اغوا کرنے والے لادوں افراد کے نام علاء الدین اور شبیر احمد تھے۔ ان کا ایک دوست بھی تھا لیکن انجم اس کے نام سے بے خبر تھی، انہوں نے انجم کو نہ پرکھی کی حالت میں بڑیہ ٹیکسی کار وہ اسے لاہور لے گئے ایک قلیٹ میں لے جا کر وہ اس کی عزت برباد کرنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر اس قلیٹ پر پولیس کا چھاپا بڑھ گیا۔ علاء الدین اور شبیر نے پوری افراغی میں انجم کو چھپائی بیڑیوں سے نیچے اتارا اور ایک کار میں ڈال کر دو گھنٹے تک پونی شرم میں گھماتے رہے۔ اس وقت انجم کی ٹھیکس کسی ہوئی تھی۔ من میں کپڑا خنسا ہوا تھا اور وہ رے میں لپٹی ہے چارکی کے عالم میں دو نشٹوں کے درمیان غلامی پڑی تھی۔ دو گھنٹے کی اس شرگردی میں علاء الدین اور شبیر نے دو تین افراد سے ملاقات بھی کی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جلد از جلد انجم سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ رات کوئی تین بجے وہ ابے لے

انجم کے بول لاہور کے بازار حسن میں اُناری گئی تھیں اور ٹائیک زہرہ بان کے پاس محفوظ تھیں۔ وہ تصویریں انجم کے لیے سمیت کا باعث بن سکتی تھیں لیکن یہ اسی صورت میں ہوتا جب انجم زہرہ بان یا قادر زباں سے بغاوت کرتی یا انہیں دعا دیتی۔ میں نے انجم کو اس طرح اس پکڑ سے نکالنا تھا جیسے کہیں سے ہال میرے لیے کوئی ایسی صورت حال پیدا کرنا مشکل نہیں تھا کہ ٹائیک زہرہ بان، انجم کو مہرہ تصور کر لیتی یا اس کی گمشدگی کو حادثہ جان کر بیش کے لیے فراموش کر دیتی۔

میں خیالوں کے تانے بانے میں الجھا رہا اور ہماری منزل نزدیک آگئی۔ میں نے انجم کو ایک بار پھر انجم ہدایات ذہن نشین کرائیں اور اسے پیش آمدہ حالات کے لیے پوری طرح تیار کر دیا۔

اس مرتبہ مجھے القردوس میں یہ آسانی داخل مل گیا۔ میرا کمر پہلے سے ٹھیک تھا۔ بڑی طرح دار جگہ تھی۔ یہ دوسری منزل کا ایک سجا سجا ہوا سوٹ تھا۔ ایک بیڈ، ایک شنگ روم، ایڈجڈ باٹھ اور شاندار بالکنی جہاں سبک مرمر کے کتلے دھرے تھے اور ان میں مولسری اور گلاب کے پھول مہک رہے تھے، عقب سے ایک مٹھی ٹھلائی شفاف سڑک گزرتی تھی جس کے دونوں کناروں پر چڑ اور اخروٹ کے درخت پھیرے دیووں کے مانند کھڑے تھے۔ یہ القردوس کی ہی سڑک تھی اور ایک نیم دائرے کی شکل میں پوری تفریح گاہ کا حامل کرتی تھی۔ اس سڑک کے پار پھل دار درختوں کی قطاریں تھیں۔ چری، خربانہ وغیرہ کے پڑ صاف نظر آ رہے تھے۔ اس سے آگے پھاڑوں اور وادیوں کا وسیع و عریض سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ان میں سب سے نمایاں "میرا جانی" کی چوٹی تھی۔ کسی نوخیز سرکش جینہ کی طرح وہ اپنے بلند دست نمایاں کئے تھے سے کھڑی تھی اور ہر آنکھ کو دعوتِ نقارہ دے رہی تھی۔ ہمیں یہ سارے مناظر اس پانچ ضرب آئینہ فٹ کی کھڑکی سے نظر آ رہے تھے جو کمرے کے مشرقی رخ پر کھلتی تھی۔ انجم نے کمرے کو باقاعدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "اچھا کمرہ ہے۔"

میں نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا "اگر باہر دیکھتے رہو تو کرا اور بھی اچھا ہے۔"

وہ میری بات پر مسکراتے گئی اور کھڑکی میں آکر باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ اب سہ پہر ہو چکی تھی۔ پھاڑوں کی شام تیزی سے اپنے سامنے پھیلا رہی تھی۔ سبزے سے گہری ہوئی جھکرا سڑک پر القردوس کے خوب صورت اور خوش لباس

رہائشی چل قدمی میں مصروف تھے۔ کوئی جو ٹھگ کر رہا، کوئی بچہ گاڑی دھیل رہا تھا۔ کوئی یونی اکیلا مستی میں دو دواں چلا جا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا، شاید اسی سڑک پر

رجال ساسی صاحب کی بھی دید ہو جائے۔ اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آواز مجھے بائیں جانب کوئی پانچ بیڑی دوری سے سنائی دی تھی۔ اُبھاری بھر کم بار بھر مردانہ آواز۔ میں بے ساختہ کھڑکی سرنگالنے پر مجبور ہو گیا۔ ذرا آگے جھٹک کر بائیں طرف، تو دیر سے پچھے رہ گئے۔ جس شخص کو میں سامنے سڑک پر رہا تھا وہ میرے بالکل قریب موجود تھا۔ بائیں جانب ایک کمرے چھوڑ کر وہ ایک کھڑکی میں کھڑا تھا اور کسی سے بات کر رہا تھا۔ میری مڑا اور رجال ساسی سے ہے۔ جیسا کہ تاجپا ہوں لاہور جیل میں ایک برس تک ساسی صاحب واسطہ رہا تھا۔ میں انہیں پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی وہ ان شخصیات میں سے تھے جن سے ایک جانے تو حالانکہ پر ان مٹ نقوش بن جاتے ہیں۔ کھڑکی مجھے ساسی صاحب کی جو جھلک دکھائی دی تھی، اس میں سے کچھ فریاد اور عمر رسیدہ نظر آ رہے تھے لیکن تھے تو صاحب ہی۔ پاکستانی قلم اشار سنوٹش کماری کی طرح نازک چہرے اور امیرانہ خدو خال والے ساسی صاحب کی آنکھیں ہمہ وقت کمرے کے نظروں ڈوبی رہتی تھیں عام زندگی میں بھی وہ جیل پیر بنڈنٹ سے زیادہ ایک قسم کی شخصیت نظر آتے تھے تاہم انہیں قریب سے والے اچھی طرح سمجھتے تھے کہ نرم ملائم لمبے میں ہونے اس شخص کے اندر ایک آہنی انسان چھپا ہوا ہے جو جاں نثار محافظ ہے اور باطل کے سامنے چٹان کی طرح جانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

ساسی صاحب نے مجھے نہیں دیکھا تھا کیونکہ جب نگاہ اُن پر پڑی تو وہ دوسری طرف دیکھ رہے تھے۔ دیکھ بھی لیتے تو شاید اس مسئلے میں مجھے فوراً نہ پہچان کسی خاتون سے بائیں کر رہے تھے۔ گاہے گاہے آہو حرم نہی اور انتہائی ریلی آواز سے اندازہ ہوتا تھا تو ان کوئی نوجوان لڑکی ہے۔ میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ صاحب کے اہل خانہ میں سے ہوگی۔ انجم بنور میرے چہرے کا آثار چھاؤ دیکھ رہا پوچھنے لگی، کوئی واقف مل گیا ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا اور ایک بار ساسی اور اس لڑکی کی باتوں پر کان لگا دیئے۔ وہ کسی

پرست کر رہے تھے۔ اس بحث کا کوئی کوئی لفظ میرے کانوں میں نہ آتا تھا۔ ویسے بھی یہ میرے مطلب کی گفتگو نہیں تھی۔ اس گفتگو سے مجھے صرف یہ بات معلوم ہوئی کہ ساسی صاحب سے ہکلام لڑکی ان کی بیٹی ہے۔

○☆☆○

القردوس میں دو روز ہم نے کھوتے پھرتے، کشتی چلائے اور لوڈ کھینچتے گزار دیئے۔ اس دوران ایک مرتبہ ساسی صاحب سے بھی آمنا سامنا ہوا لیکن حسب توقع وہ مجھے فوری طور پر پہچان نہیں سکے۔ ویسے بھی یہ مڈمہ مجیز تقریباً سو گز کی دوری سے ہوئی تھی۔ میں ساسی صاحب کے سامنے آنے کے لیے کوئی مناسب موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ ایسا موقع جو ہمیں آدھ دن گھٹنا تھائی فراہم کر سکے اور میرے منصوبے کے عین مطابق بھی ہو۔ یہ سوال میرے ذہن میں ہر گھڑی بیج کی طرح گزرتا تھا کہ آقا قادر زباں اتنے بڑے سرکاری افسر کو قتل کرانے کا برسب کیوں رہا ہے۔ ایسی کیا انتہا اس پر آن بڑی ہے کہ اسے یوں "سرکاری دیوار" سے براہ راست ٹکر لگیا رہی ہے۔ ایک بات تو طے تھی کہ میں قادر زباں کے شیطانی عزم کی، تھیل، نہیں کر سکتا۔ قتل اور وہ بھی ساسی صاحب جیسے نر بندے کا میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن جس ترازو کے ایک بازو میں میرا یہ ارادہ تھا اسی کے دوسرے بازو میں میری بہن تھی۔ وہ بہن جو میری خزاں رسیدہ زندگی کا آخری پھول تھی اور جسے تازہ بہار کا چھو دکھانے کے لیے میں اپنی پوری زندگی سخت ترین موسموں کی غدر کر سکتا تھا۔ حالات کی خدو کا یہ توازن میرے لیے جان لیا تھا، خود کو اس کرناک کیفیت سے نکالنے کے لیے مجھے ایک تیرا راستہ درکار تھا۔ ایسا راستہ جس پر چل کر میں رجال ساسی صاحب کے ساتھ اپنی بہن کی زندگی بھی بچا سکوں۔

اب تک میں نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق ساسی صاحب کے ساتھ ان کی علیل سز کے علاوہ عین سنے اور دو توکر بھی تھے۔ بچوں میں دو تو واقعی بچے تھے۔ یعنی ان کی عمریں اندازاً بارہ اور چودہ سال تھیں۔ یہ دونوں لڑکے تھے اور سارا دن اسنوکر روم میں کھیلنے رہتے تھے جبکہ تیسری لڑکی تھی۔ اس کی عمر تقریباً بیس سال رہی ہوگی۔ اس کی آواز بے حد خوب صورت تھی۔ صورت بھی اچھی تھی لیکن وہ لڑکی جو دور سے دیکھ پاتا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ وہی تھا جسے میں نے ساسی صاحب کے ساتھ تصویر میں دیکھا تھا۔ جیسا کہ آپ کو یاد ہو گا کہ یہ تصویر مجھے قادر زباں نے

جوبلی میں دکھائی تھی اور اپنی دانست میں مجھے مختل کا "چھو کر آیا" تھا۔ میں نے سز ساسی کو بھی دیکھا تھا۔ ماں بیٹی کی شکل کافی ملتی تھی۔ سز ساسی جوانی میں خاصی حسین رہی ہوں گی مگر عمر اور بیماری نے ان کے چہرے پر گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ میں نے انہیں بالکنی میں آرام کر رہے دیکھے تھے۔ اس وقت بڑا لڑکا ان کے کندھے پر رہا تھا۔ میں نے اپنے قیام کے دوران یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس تفریح گاہ میں رجال ساسی صاحب کی مع اہل و عیال موجودگی دراصل سز ساسی کی غلات کے سبب ہی ہے۔ شاید ڈاکٹروں نے انہیں تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ دے رکھا تھا۔

یہ تیسرے دن کی بات ہے۔ سہ پہر کے بعد میں اور انجم گھر سواری کے لیے نکل گئے۔ دیگر تقریحات کی طرح گھر سواری کے لیے بھی یہ شرط تھی کہ دوران تفریح القردوس کی حدود سے باہر نہ نکلا جائے۔ پختہ سڑک پر ہم نے تفریح گاہ کا ایک راز ڈھکھل کیا اور پھر موٹہ چلی ٹوکتے ہوئے پیدل ہی واپس روانہ ہو گئے۔ مجھے اوّل دن سے یہ احساس ہوا تھا کہ یہاں چند آنکھیں ہماری گھراں ہیں لیکن ابھی تک اس امر کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ میرا وہم ہی ہو۔ اپنی گھرائی کا شبہ ہونا ایک سنسنی خیز تجربہ ہوتا ہے۔ آدمی کی حرکات و سکنات، سوچ و چار، مصروفیات، ہر چیز پر اثر پڑتا ہے۔ یوں لگتا ہے، پاؤں میں اُن دیکھی بیڑی کی پڑ گئی ہے۔ اگر گھرائی کے ساتھ موت یا گرفتاری وغیرہ کا خطرہ بھی وابستہ ہو تو ہر بل شہی پر گزرتا محسوس ہوتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ بعض نازک مزاج قسم کے لوگ زیر گھرائی ہونے کے احساس سے ہی اعصابی مریض بن جاتے ہیں۔ بہر حال اس روز گھر سواری سے واپس آتے ہوئے میں نے اپنے تنگ کو کسی نیچے تک پہنچانے کی کوشش کی۔ پختہ سڑک پر ہر وقت چل پھل رہتی تھی۔ میں انجم کو لے کر ایک سرسبز خطوان پر اتر گیا۔ چڑ کے بلند و بالا درختوں کے درمیان ہم منبھل منبھل کر نیچے اترنے لگے۔ کیمرا میرے گلے میں تھا، گاہے گاہے میں انجم کی ایک آدھ تصویر بھی اُٹار لیتا تھا۔ اس خطوان کا ایک مختصر پیکر کات کر ہم دوبارہ پختہ سڑک پر پہنچ سکتے تھے۔ اس دوران کوئی ہمارے پیچھے آتا تو بھی یہ آسانی نظر آ سکتا تھا۔ چندہر میں منٹ گزر گئے لیکن اسنے قریب و جوار میں مجھے کوئی متنبھس دکھائی دیا نہ کوئی ایسی دیکھی سرگرمی نظر آئی۔ ہم دھیرے دھیرے سڑک کی طرف بڑھنے لگے۔ اب ہمارے سامنے چڑھائی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ انجم کو دشواری پیش آ رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اسے سارا دینے کے

لے آگے بڑھتا اس کا پاؤں رٹا اور وہ لڑھک کر اٹھ دس فٹ نیچے جڑے تھے سے جا گرالی۔
وہ کافی زور سے گری تھی۔ میں نے لپک کر اسے سنبھالا۔ وہ کپڑے جھاڑ کر جلدی سے کھڑی ہو گئی لیکن اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ مشہور ہے کہ کوشی جگہ دکھ جاتی ہے انجم کی بھی زخمی پنڈلی پر ہی چوٹ آئی تھی۔ اس نے میرے سارے سے اور بچنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوئی۔ میں نے کیرا اس کے گلے میں ڈالے ہوئے کما "چلو میں تمہیں آٹھایا ہوں۔"

اس نے سٹ کر میری طرف دیکھا لیکن میری آنکھوں میں کوئی ایسا تاثر نہیں تھا جو اسے مزید سننے پر مجبور کرتا۔ بلاشبہ وہ جوان اور حسین تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ کھوم پھر رہے تھے۔ رات کو ایک ہی کمرے میں سو رہے تھے لیکن میرے لیے وہ صندوق کی امانت تھی۔ وہ صندوق جو صرف چھ کھٹے میرے ساتھ رہا تھا لیکن برسوں سے شناسا لگتا تھا۔ سچ کہا گیا ہے کہ کبھی برسوں کی قربت سے بھی اجنبیت دور نہیں ہوتی اور کبھی کھوں کے شناسا رنگ جاں سے قریب ہو جاتے ہیں۔ کچھ عجیب طرح کی اپنائیت محسوس کی تھی میں نے صندوق کے لیے اور اسی حوالے سے انجم کے ساتھ بھی میرا ایک پیارا سا بے نام رشتہ قائم ہو گیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اہم اعتماد لیے میں کما "آؤ انجم! میں تمہیں آٹھایا ہوں۔" میرے لیے کی سچائی نے انجم کا ہر دوسرہ دور کر دیا۔ وہ میری طرف جلی اور میں نے اسے پھول کے مانند اٹھالیا۔ ڈھلوان طے کر کے ہم پختہ سڑک پر پہنچے تو وہ اصرار کر کے میرے بازوؤں سے آڑ گئی۔ میں اسے سہارا دے کر کمرے تک لے آیا۔

گرنے سے اس کے نچنے اور پنڈلی پر گہری خراشیں آئی تھیں۔ پرانے زخم سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ میں نے فون پر پیچھے سے رابطہ قائم کیا۔ مجھے فرسٹ ایڈ پیکس کی ضرورت تھی لیکن نیچر صاحب ڈاکٹر فراہم کرنے پر تامل نہ کیا۔ ڈاکٹر کی مجھے ضرورت تو تھی لیکن میں یہ خدو مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ انجم کی پنڈلی پر گولی کا زخم تھا اور ڈاکٹر کے آنے سے خواہ خواہ ہماری حیثیت مشکوک ہو سکتی تھی۔ میں نے خود ہی پنڈلی کا زخم دھو کر پی کڑی۔ چند "پین" گولیوں کا گازی کے ڈش بورڈ میں موجود تھیں۔ وہ میں نے لاکر انجم کو دیں۔ خیال تھا کہ رات سکون سے گت جائے گی لیکن یہ خیال خام ثابت ہوا۔ میں مٹی دی سے شام سات بجے کی انٹش خیر سن رہا تھا جب بند روم سے انجم کی ہائے ہائے سنائی دینے لگی۔ اسے

درد ہو رہا تھا۔ رات کو درد بڑھ بھی سکتا تھا۔ ضروری تھا کہ انجم اس کا سہو باب کر لیا جائے جو درد کش دوا انجم استعمال کرتی رہی تھی وہ تنصیہ کلی یا پھر ایسٹ آباد سے مل سکتی تھی۔ میں نے سوچا "رات بے چینی سے گزارنے سے بہتر ہے کہ انجم تھوڑی سی وقت برداشت کر لی جائے میں نے الیکٹرک ہیٹر تھا کہ انجم کی طرف رکھا۔ پانی کا جگ اور گلاس بھی تیار کر رکھا۔ پھر جیکٹ پن کر رہا رہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ انجم کی آنکھوں میں خدشات کا سیلاب اٹھ آیا۔

"کہاں جا رہے ہو آپ؟ اس وقت نہ جائیں" اگر جا رہے تو مجھے ساتھ لے کر جائیں۔

میں نے اسے پکارا۔ "موصول رکھو انجم! میں زیادہ سے زیادہ آؤہ کھٹے میں آجاتا ہوں" چارپائی میں مل کا تو سر پہ تھم گئی تھک۔

"نہیں شاہ جہاں صاحب" اس نے بند کھڑکی سے بار جھانکتے ہوئے کما "میں اب کالی ٹھیک ہوں۔ درد کم ہو رہا ہے۔ آپ آئیں جیکٹ۔"

میں دیکھ رہا تھا وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ خوف کی اذیت سے بچنے کے لیے زخم کی اذیت سے انکار کر رہی ہے۔ مگر نے پینز ابلے ہوئے کما "اچھا ابھی نہیں جانا، لیکن نیچے کر ڈاکٹر سے قول سکتا ہوں۔ شاید وہ کوئی حل بتا دے۔"

یہ بات بھی انجم کے دل کو نہیں گئی لیکن یہ کسی نہ کسی طرح اسے قائل کر کے باہر نکل آیا۔ مطلع آبر آلود ہو چکا تھا اور رنج بستہ ہوا سائیں سائیں کرتے پالکوں سے گزر رہی تھی۔ دور نیچے دادی میں عثمانی روشتیاں بادلوں کے سپہ نگاہ سے اوپر جھلکیں۔ میں نے دروازہ باہر سے لاک کیا اور چابی دروازے کی پچھلے درز سے اندر کھسکا دی۔

بارنگ لائٹ تک پہنچنے میں مجھے دو منٹ سے زیادہ نیچے لگے پھر تھوڑی سی دیر بعد میں تیزی سے تنصیہ کلی کی طرف جا رہا تھا۔

میں جس وقت تنصیہ کلی میں دوڑ پر پہنچا ساڑھے آٹھ وقت تھا۔ ڈاکٹر نہیں ملے ہوئی تھیں اور سڑک پر گہما گہما تھی ایک میڈیکل انسور کے سامنے میں نے گاڑی روکی اور اندر داخل ہو گیا۔ اسی وقت ایک شخص تیز قدموں سے باہر نکلا رہا تھا۔ وہ میرے بالکل قریب سے ہو کر سڑک پر پہنچا اور ڈاکٹر کی پکار میں بھاگ گیا۔ اس وقت میڈیکل انسور کا صحت نوٹ کر میرے سر پر آن گئی یا سامنے کھڑا ہوا سلاٹ ہوا میں مسلح ہو جاتا تو مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی، جتنی اب شخص کو دیکھ کر ہوئی۔ کتنی سی دیر تو مجھے اپنی بصارت پر

ہی نہیں آیا۔ میں اپنی ایدہوں پر محسوس کر سکتے کی کیفیت میں نیچے جب کی طرف دیکھا جلا گیا۔ حیرت کا یہ شدید ترین رپلا گزر گیا تو دل و دماغ میں تشنگی سا جھجکا۔ یوں لگا "بسم کے تمام مساموں سے پیسے کے دھارے برس گئے ہیں اور میں ابھی یہاں کھڑا کھڑا اپنے حق میں غرق ہو جاؤں گا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ مکان میں موجود لوگ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے ہیں اور ابھی ابھی جو خاتون مکان میں داخل ہوئی ہے وہ آگے جانے کے لیے مجھ سے رست طلب کر رہی ہے لیکن مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ میڈیکل انسور تنصیہ کلی، الفردوس، الفردوس میں کراہتی ہوئی انجم مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ یاد رہا تھا کہ اتنا کہ میں نے ابھی اس شخص کو دیکھا ہے جو جرائم اور قتلہ گری کی دنیا میں جکا ہے۔ جو ہلاکت، بربادی اور تباہی کا دوسرا نام ہے اور جسے کسی شریا بستی میں دیکھے جانے کا مطلب اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ اس شریا بستی میں بربادیاں ڈیرے ڈالنے والی ہیں۔ دل کی گمراہیوں سے صدا ابھری "یارب! یہ شخص کیوں ہے یہاں؟ میرے باک وطن میں، پاک فضاؤں میں یہ پلیڈ صورت کیوں نظر آتی ہے۔ کیوں دیکھا ہے میں نے اسے یہاں؟" ایک ٹیس پیسے کی گمراہیوں سے ابھری اور میں جیسے مدد سے پاگل ہو گیا۔ میرے اندر سے کسی نے پکار کر کما "شاہ جہاں! اس شیطان کو پکڑو۔ اسے بھاگنے نہ دینا۔ یہ نکل گیا تو اس بستی میں سرباگت کر جائے گا۔ ذہن کر زمین کی شریانوں میں دوڑ جائے گا اور قیامت بن کر خشیب و فراز کو دھماکے لے گا۔ اسے پکڑو شاہ جہاں، ختم کرو اسے۔ قدرت نے نہیں ایک ستراموقع دیا ہے۔ اگر بس چلا ہے تو اسے مار ڈالو۔ اس سے ایک لفظ کا تبادلہ کے بغیر اسے گولیوں سے چھلنی کرو۔" عجیب جوتی انداز میں، میں نے جیکٹ کی جیب سے پستول نکالی۔ دیوالوری کی موجودگی کا یقین کیا اور سامنے کھڑی عورت کو دھکیلا ہوا سڑک کی طرف بھاگا۔

شیطان کو لے کر وہ شیطان کی گاڑی تقریباً دو سو گز آگے نکل چکی تھی۔ میں نے فراتو جیکٹ سیٹ سنبھالی، انجم اشارت کیا اور گرنے لگا۔ ایک سیلی پڑو اور ادا ہوا۔ زبان سنی مکان سے نکلے تھر کی طرح بچاؤ کے پیچھے لگی۔ ارد گرد کھڑے لوگوں نے حیرت آمیز خوف کے عالم میں مجھے دیکھا اور بھاگ بھاگ کر میری زد سے نکلے۔ میری نگاہیں جیب کی نیل لائٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں دوڑ پر کچھ آگے جا کر تاج محل اور تیر تاج محل ہوئی کے سامنے مجھے ٹکنا پڑا۔ ایک بلی کا ربارنگ کے لیے رپورس ہو رہی تھی جس کی وجہ سے

ٹریک ٹک گیا تھا۔ میں نے سائیل سے گاڑی نکالنا چاہی لیکن ناکامی ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے درجنوں ہارن بجنے لگے اور ٹریک کانسٹیبل کی پیشانیوں کو بجنے لگیں۔ میں جج کر رہ گیا۔ جی چاہا "سراج کی روتا کے بغیر گاڑی دوڑانا چلا جاؤں اور جس قیمت پر بھی ہو" نیچے جب کہ جاؤں۔ بے بسی کے وہ لمحات میرے لیے ناقابل فراموش تھے۔ پچانو جیب اس ٹریک سے نکل کر نگاہوں سے اوپر چل چکی تھی اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ اسٹیشنرنگ سے سرگرا کر گرا کر خود کو لبو لبان کر لوں۔ ٹریک سارا جٹ مجھے کھن اکھیں سے دیکھ رہا تھا۔ غالباً اسے احساس ہو گیا تھا کہ میں کسی شدید عذاب میں گرفتار ہوں اور پلک جھپکنے میں اس ٹریک جام سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ وہ اپنی قوت سنبھال کر آگے آیا اور میری گاڑی کے سامنے سے ٹریک کر دیاں کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میرا ہاتھ مسلسل ہارن پر بجا ہوا ہے اور لوگ تعجب سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ شاید وہ میری ذہنی حالت پر شک کر رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں کیا قیامت گزر گئی ہے۔ اس ٹریک جام کے سبب ایک آدم خود روندہ، مکمل موت کی گرفت سے نکل گیا ہے، ملا نہیں بھرتا ہوا ہے خبر انسانوں کے ہجوم میں گم ہو گیا ہے۔ یہ کتنا بڑا سانحہ تھا! یہاں پر کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔

ٹریک بحال ہونے میں تقریباً دو منٹ لگے۔ راستے ملنے ہی میں اندھا خد گاڑی بھاگنے لگا۔ ایک سوہوم امید کے سارے میری نگاہیں ہر طرف گردش کر رہی تھیں۔ جی چاہ رہا تھا کہ ہر بندہ دروازہ توڑ دوں اور اس کے پیچھے جھانک کر دیکھوں کہ وہاں نیچے جیب تو موجود نہیں۔ تقریباً دس منٹ میں یونسی دیوانوں کی طرح تنصیہ کلی کی تیم باریک سڑکوں پر چکرانا رہا۔ شیطان اور شیطان کی گاڑی کبیں نظر نہیں آئے۔ آہستہ آہستہ میری نگاہیں عقب نما آہستہ پر مرکوز ہونے لگیں۔ پچھلے دس منٹ سے اس آئینے میں مسلسل جنگاٹ نظر آرہی تھی۔ بلکہ یہ جنگاٹ "الفردوس" سے ہی میرے ساتھ تھی۔ برسوں سے جو دوسرے مجھے گھیرے ہوئے تھا وہ آج حقیقت نکلا تھا۔ میری نگرانی کی جارہی تھی۔ ڈاکٹر بلو رنگ کی جو سوزی کار میرے پیچھے آرہی تھی اسے میں الفردوس کے پارنگ لائٹ میں بھی دیکھ چکا تھا۔

نیکایک میرے اندر حیرت کی ایک شدید لہر دوڑ گئی۔ ہتھیلیاں اور انگلیوں کی پورس ملنے لگیں۔ میں نے گاڑی کا رخ خان پور جانے والی سڑک کی طرف موڑ دیا۔

نہیا گلی سے نکلے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈارک بلو گاڑی میرے عقاب میں ہے۔ میں اسے عقاب میں رکھ کر تقریباً چار کلومیٹر آگے سنسان سڑک پر لے آیا۔ اب مجھے کسی اندھے موٹر کی تلاش تھی۔ خان پور اور نہیا گلی کے درمیانی راستے میں "نمہ حاموڑ" تلاش کرنا ایسے ہی تھا جیسے حافظ آباد میں تیرہ سو کا کھیت تلاش کرنا اور میں دودھ دینی کی دکان ڈھونڈنا یا پشاور میں کسی خان صاحب کی دید کا آرزو مند ہونا۔

تھوڑی سی دیر میں مجھے ایک مناسب موڑ نظر آیا۔ میں نے گاڑی موڑنے ہی کنارے پر کھڑی کر دی۔ روٹھیاں بچائیں اور پھر بھرا ہوا ریو الوڑ قاضی کر باہر نکل آیا۔ مجھ پر ایک دشت ناک موڑ طاری ہو چکا تھا اور اس موڑ کے زیر اثر ہر ممکنہ خطہ سچ نظر آ رہا تھا۔ ریو الوڑ ہاتھ میں لے کر میں سڑک کے چپوں سچ کھڑا ہو گیا۔ سب سے پہلے میں تمہیں پکینڈ اور بعد ڈارک بلو گاڑی کی روٹھیاں چمکیں اور وہ جھڑ سے نمودار ہوئی۔ گاڑی کی رفتار تقریباً چالیس کلومیٹر تھی۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ بیس میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ نتیجے میں وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ جو خلی میں بیڈلائس کی زد میں آیا "ڈرائیور نے اضطرابی طور پر بیک واڈ بیٹے اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ اس خالی سڑک پر اتنی سخت سروی میں یوں کوئی اس کا راستہ روکے کھڑا ہوگا۔ ٹائروں نے پتلی سختی سچ اندک اور گاڑی لڑائی ہوئی میری گاڑی کے پہلو میں جا گئی۔ اس سے پہلے کہ میرا "متعاقب" صورت حال دوری طرح سمجھ بانیات میں تڑپ کر گاڑی تک پہنچا۔ بایاں ہاتھ لگے دواڑے کے پینڈل پر آیا اور دروازہ کھٹکے سے کھل گیا۔

”ہلک کیا ہے؟“ گاڑی چلانے والے کے طلق سے
قابلِ شناخت آواز نکلی۔

مجھے خواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کیونکہ
پیشانی سے چھوئے والے ربوہ اور نئے فواری سوال کتنہ کی
کلی کوئی تھی۔ مگر وہ دوسری میں "میں نے رکھا وہ تقریباً
پچیس برس کا ایک پٹاٹا محض تھا۔ اسے دیکھتے ہی میاںوالی
کے کچلے جھٹو کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ خوش حالی اور امن
کے دور میں ایسے جھٹو عید قربان پر ہمارے گھر کے آگن
میں بھی فوج ہوا کرتے تھے۔ میرے سامنے بیٹھے ہوئے
جھٹو نے گاڑی کی ہم رنگ شلوار کیس پہن رکھی تھی۔
مددِ خال خالص، بظاہر کم کے تھے وہ گاڑی میں تھا تھا۔
"خبردار" میں نے ہنکار کر کہا "چلا کی دکھاں تو اسی جگہ

لہذا اٹھارہ کروڑ لگے۔^{۱۸} اپنے لیے کی اجنبیت کا احساس خود مجھے بھی ہوا تھا۔ یہ سب میرے اندرونی غصے کا کرشمہ تھا۔ اسے من کر بیٹھو کی آنکھیں حیرت سے پھیل چلی گئیں۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے دہن کھولا لیکن ہجر زبان کو زحمت کا کام دینے بغیر جبراً بند کر لیا۔ میں نے اسے دوا دے سے اٹھ داخل کر کے پچھلے دوا دے کا کھٹکا اٹھایا اور دوا دہ کھول کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

[illegible]

”میں دمکانے کی کوشش نہیں کر رہا۔ میں نے تیری ہوم میں متعدد فٹ کر دیا ہے اور اگر ایسی ہیٹلی کرے گا تو وہاں میں جمل میرا پتہ پورس کر گاؤں کر۔“

شوارفیس والے نے ایک باجر میرے چہرے پر لگا دوائی اور جو دکھا اس کے پیچھے میں چپ چاپ گاڑی پورس کرنے لگا۔ میرا ریا اور بدستور اس کی پیش پڑھا۔ میں ہاتھ سے میں نے اس کے سنواری کوٹ کی جیبیں ٹوکیں۔ ایک جیب ریا اور کی گولیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا ریا اور بھی موجود ہے۔ جیبیں ٹونے کے بعد میں نے آگے جبک کر ڈش بورڈ کا خانہ کھولا تو ریا اور کی ٹاکس ختم ہو گئی۔ ہتھیار ہاتھ سے نکلے دیکھ کر مجھ پر صدمہ کھلا لیکن کچھ کر نہیں سکا۔ میں نے دکھا، بچائی کیفیت سے اس کا سارا جسم لرز رہا ہے۔

گامی تخیلی کی طرف نصف کلومین کا قافلہ طے کر چکی
 ہیں نے۔ جیسڈ کو روکنے کا حکم دیا۔ اس نے ہتھریلے کنارے
 آتا رہ کر گامی روک دی۔ بائیں طرف خیب میں تاریک
 سلطان تھی۔ چہرہ اور دیوار کے دو قامت دورست ماسطوم
 قتی سے ابھر کر ماسطوم بلندی تک چلے گئے تھے میں نے
 پوچھو کہ کج بستہ مال جیسڈ کی چینی دار گردن میں دھنسا
 ہے۔ ”جہل اسیر تک موز کر اس ماں کو نیچے آ رہ۔“
 ”کھسکے کیا؟“

”میں پشتوں میں گفتگو نہیں فرما رہا۔ چل اُتار اس گاڑی
نیچے۔“

”متہ تمہارا دماغ تو خراب نہیں۔“ وہ ہکھلایا۔

”خواب تو نہیں۔ لیکن ہو جائے گا اور بس میرا دماغ
خواب ہو جائے تو میں بندے کو ایسی جگہ گولیاں مارنا ہوں کہ
وہ پست مارٹم کراتے ہوئے بھی شرماتا ہے۔ چل ماں
مددے! مار دے اس کاڑی کو نیچے۔“

”جھنڈو نے لرز کر گاڑی وِطوان کی طرف موڑ دی۔ اسے آگے اور پیچھے دونوں طرف موت نظر آرہی تھی۔ وِطوان خطرناک قسمی لیکن میں جانتا تھا“ ایسی خطرناک بھی نہیں۔ تنہا لگی جاتے ہوئے میں نے یہاں رک کر انجم کو دور بین سے بندوں کی خرمسٹیاں دکھائی تھیں۔ یہ سارا جگل بندوں سے اُٹا ہوا تھا۔ جو کچھ دن کی روشنی میں یہ جگہ اچھی طرح دیکھ جاتا تھا اس لئے مجھے یقین تھا کہ اور کچھ ہو جائے تو ہو جائے لیکن گاڑی یہاں اُلٹنے کی نہیں۔ وہ پچھلے وِطوان سے نیچے اُتر گئے تو جھنڈو نے ہجریک لگا دیے جیسے کوئی پہاڑی بکرا چترے کو دے کر خود تے جُجک جائے میں نے دواور بے رحمی سے اس کی گردن میں وضو سچا۔ آہنی ہال کے دواور میں دینا کی خطرناک ترین وِٹھکی پشیدہ تھی۔ موت کی دھمک دھو سے وہ دم وِجود میں چلے جانے کی دھمکی۔ مجبوراً جھنڈو کو پاؤں پر یک پیدل سے ہٹانا پڑا۔ گاڑی جبر جبری لے کر قشع میں اُتری اور اچھلتی کودتی کچھ چلی گئی۔ قریباً تیس میٹر پہنچے جا کر ایک عمارت روشت سے اس کا تسلی بخش ٹکراؤ ہوا۔ جھنڈو کے سہیل لائٹس بجھ گئیں اور وہ اسکرین ترخ گئی۔ جھنڈو کے منہ سے بے اختیار ”بے“ کی آواز نکل گئی تھی۔ وہ قفل و صورت کے لحاظ سے ایک چننا ہوا بد معاش تھا لیکن اچانک چننا تھا اور اس بُری طرح چننا تھا کہ بولکھا کر رہ گیا تھا۔

”دیکھ لیا؟“ وہ احتیاجی انداز میں پوچھا۔

”ہاں دیکھ لیا ہے“ میں نے جواب دیا۔ ”اور اب جو تم نے دیکھا ہے وہ اللہ کسی کو نہ دکھائے“

میرے لیے کئی سفاکی محسوس کر کے، بیٹھو کی آنکھیں اور جھل نکلیں۔ کیا جانا ہے میں نے تمہارا؟" وہ اپنے لیے میں دینا بھری مصیبت سمیٹ کر بولا۔ یہ عجیب سن کر مجھے لگا جیسے القیروس کے مین گیٹ پر چکر اڑنے والا خوشخوار کتا کسی شایخ پر بیٹھ کر چمک رہا ہے۔ مصیبت میں انسان کیسے کیسے داپ بدل جاتا ہے اپنے ہی اُتھوں تراشے ہوئے آنا اور محمدؐ کے خداؤں کو کتنی بے دردی سے ٹھوکریں مارتا ہے۔ یہ خوشخوار صورت والا بد فطرت شخص اپنی زندگی میں نبھانے کئے لوگوں کو کتنی کاناچ کاناچ تھا لیکن اس وقت خود کو محصور جان کر اڑھت سیان کی گائے میں رہا تھا۔ یوں پول رہا تھا

جیسے منہ میں دانت نہیں۔ روٹی کو مٹھوئی، مکہ رہا تھا لیکن میں اس کی آواز سن رہا تھا۔ اداکاری دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہوں میں تو ایک شیطان کا چھوٹا مگر طاقتور کائناتوں میں پناہ گزینی ہوا اس کا شور تھا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ میں نے جھٹکے کے گلے سے ادنیٰ نظر آتا رہا اور اس کی ٹھوڑی کے پیچھے کے کنارے کر "ہیڈ ریسٹ" کے ساتھ گرہ دے دی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ جیسوٹ مزاحمت کے لیے صرف تیار ہی سی پکڑ سکا۔ وہ جب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوا تو اس کی گردن بیڈ ریسٹ کے ساتھ ٹکس ہو چکی تھی۔ اب وہ جب تک ہاتھ پیچھے لے جا کر گرہ نہ کھول کر گردن کو نشست سے آزاد نہیں کر سکا تھا اور میرے ہاتھ میں رہا اور تھا۔ میں اسے ایسا کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دے سکا تھا۔ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ ”مجھے ہاتھ پر شمار رہا ہوں۔“
 ”کیا مطلب؟“ اس نے ہکا کر پوچھا۔

میں نے جواب میں دیا لیکن کہ مجھے معلوم تھا کہ صاحب جلد مطلب اس پر واضح ہو جائے گا۔ گاڑی کے تیار شدہ بوٹ ہیں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور پلاسٹک دھیرہ جلنے کی بو آ رہی تھی۔ یہ آگ کو ابھی دس گھنٹے تک بجھ سکتی تھی۔ اس کے بعد یہ کار ایک بم ہی تھی۔ میں نے دونوں کھولا اور قریب ہی میں فٹ دور ایک چڑے کے تنے سے ٹپک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ رپالور کا رخ مینو کی سمت ہی تھا۔ یہ ایک اس کے حلق سے ڈری ڈری آواز سن نکلتی اور بدحواسی کے عالم میں اس نے خود کو کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ صدمہ حال کی تھک پہنچ گیا تھا اور اب ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گاڑی سے نکل جانا

”خجور“ میں دہاڑا۔ ”پنے ہاتھ مظر سے دور

خوف کی فراوانی میں اس نے میری بات سنی اُن سنی کر دی۔ میری انگلی نے اوپر سے دو بار زنگ پر حرکت کی اور دو گولیاں دھماکوں کی آواز سے گاڑی کی نشست میں بیست ہو گئیں۔ شور سے جنگل کو بھگ اٹھا اور ترقی ٹھکانوں پر سونے ہوئے اُن بکت پر بندے پہنچا کر کڑھ گئے۔ کہیں شب سے خواہیدہ بندوں کی چیخ سنا کی دی۔ اس کے علاوہ کچھ نامائوس آوازیں تھیں جنہیں میں اپنی ناخیر کاری کے سبب کسی جانور سے منسوب نہ کر سکا۔ دھماکوں نے دہی کام کیا۔ بسیرہ یا کے مریض کے مت پر تھپڑ کرنا ہے۔ بھیدو نے کرز

ہاتھ مٹھ کر گھر سے دور ہٹا لے۔
”مجھے مت مارو۔“ وہ ٹھٹھکیا۔ ”میں مرنا نہیں چاہتا۔ مہ مجھے یہاں سے نکالو۔“ اس کی نگاہیں گاڑی کے منسلکے پونٹ پر تھیں اور وہ دو واڑہ کھول کر اپنا نصف دھڑ گاڑی سے باہر نکال چکا تھا۔ تاہم مجھے اطمینان تھا کہ جب تک مٹھ کر گھر کا قلم ہے وہ مکمل طور پر گاڑی سے باہر نہیں آ سکتا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے سپاٹ لمبے میں پوچھا۔
”کل۔ گھڑا احمد۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔
”کیوں پوچھا کر رہے تھے؟“

”تمہارے میں پوچھا نہیں کر رہا تھا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”میں نے کہا۔“ دیکھ سکتے تھے۔ جتنی دیر کرے گا اتنی غلطی پڑے گا۔ اگر تیرے دماغ میں گوبر نہیں بھرا ہوا تو بیڑول کی بو مجھے آری ہوگی۔ آری ہے نا؟“

اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور ایک بار پھر گردن چمکانے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا۔ میں نے تاک کر فائر کیا۔ اعشاریہ پینس کی گولی اس دھند اس کے گلن کو چٹھوئی گزر گئی۔ اس دھندہ دو چ پڑا۔

”مہ مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ جو پوچھتا ہوں لیکن مجھے یہاں سے نکال لو۔“
”تم صرف اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔“ میں نے بے حد اطمینان سے کہا۔ ”جب تک میرے سوالوں کے جواب نہیں دو گے میں تمہیں یہاں سے نکلنے نہیں دوں گا۔ بہتر ہے کہ مٹھ کر کی طرح ہونا شروع کر دو۔ جو میں پوچھتا جاؤں بتاتے جاؤ۔ شاید یہ گاڑی پہننے سے پہلے میرے سوال پورے ہو جائیں۔“

میرے لمبے کی قطعیت نے گھڑا کو جیسے لرزے کا بخار چڑھا دیا۔ گاڑی کی اندرونی روشنی میں مجھے اس کا رخ مخموس نظر آ رہا تھا۔ سخت سردی کے باوجود اس کے چہرے پر پسینے کی دھاریں بر رہی تھیں۔

”جو پوچھو کیا پوچھتے ہو۔“ وہ گڑ گڑایا۔
”تمہیں اتنا قار زباں نے بھیجا ہے؟“
”ہاں۔“ اس نے پھرتی سے جواب دیا۔
”تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟“
”دو بندے اور ہیں۔ ایک کا نام مشتاق اور دوسرے کا اکبر نازی ہے۔ مہ باری باری تم پر نگاہ رکھتے ہیں۔“
”تمہارے جال ساتھی صاحب کو کیوں مروایا جا رہا ہے؟“

”مجھے کچھ معلوم نہیں۔ خدا کی قسم میں نہیں جانتا۔“
”تمہارے پاس تاہم تم کہہ میرے خیال میں بیڑول لائن ایک ہو چکا ہے۔ کار کے آس پاس بیڑول پھیلا ہوا ہے اور آگ اس جگہ سے زیادہ دور نہیں ہے۔“
گھڑا نے کھنی ہوئی آواز میں کہا۔ ”جاگیر دار صاحب مجھے بھوکے تھوکوں سے نچوڑیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تو جب ہو گا تب ہو گا مگر یہ گاڑی اب جہیں زیادہ وقت نہیں دے گی۔“ گھڑا پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے میں گاڑی سے کچھ اور دور چلا گیا۔

گھڑا نے کراہ کر کہا۔ ”ساتھی صاحب ایک ایسے شخص کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں جو جاگیر دار صاحب کا گھوڑا جن ہے جاگیر دار صاحب کے سامنے اب وہی رستے ہیں۔ اپنے جن کو بچالیں یا ساتھی صاحب کو ٹھکانے لگا دیں۔“

میرے ذہن میں ایک ہفت رنگ پھیل چکی تھی۔ میں نے لرزاں لمبے میں پوچھا۔ ”کیا جاگیر دار کا وہ جن بھی اس وقت تھیکاگی میں موجود ہے؟“

”ہاں۔“ گھڑا کے ہونٹوں سے بے اختیار نکل گیا۔ موت کے خوف نے اس کی مزاحمتی سوچ کو کڑی کر پئی کر ڈالا تھا۔

میں نے اپنی نگاہیں گھڑا کی دہشت زدہ آنکھوں میں گاڑ دیں اور ایک ایک نظر پر زور دے کر پوچھا۔ ”کیا یہ وہی شخص ہے جو ابھی تمہاری دیر پہلے نکل پھاؤ میں بیڑول پپ کی طرف گیا ہے؟“

”مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔“ چہرے دان میں پہننے ہوئے گھڑا نے ایک بار پھر فریاد کی۔
”نہیں! پہلے بتاؤ۔“

”کیا پھر مجھے چھوڑ دو گے؟“
”نہیں! یہ کوئی وعدہ نہیں ہے۔ تم اپنا وقت ضائع مت کرو۔ جلدی بکو۔“

”ہاں۔ ہاں۔ یہ وہی شخص ہے۔“ گھڑا کے سینے سے کراہتی ہوئی صدا بلند ہوئی۔

”تم جانتے ہو؟ یہ کون ہے؟“ میں نے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔
”نہیں۔ صرف اتنا پتا ہے۔ یہ بارڈر پار سے آیا ہے۔ شاید چندی گڑھ سے یا کپور تھلہ سے۔ کسی بہت دور سے۔ چوہدری کا پتہ ہے۔ ایک پورا پنڈ جلاوا تھا اس نے دس باہ بندے بھی مارے ہوئے ہیں۔“

گھڑا اپنی طرف سے شہنی خیر انکشافات کر رہا تھا۔ میں نے چکر

اس کی بے خبری پر افسوس کرنے کے سوا اور کیا کر سکا تھا۔ اسے اس شخص کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ کچھ بھی علم نہیں تھا۔ وہ غنی آدمی کو ہوا کا جو ٹکا کہہ رہا تھا۔ کینسر کے نامور کو پھنسی پتا رہا تھا۔ ایک حضرت کا تعارف اس نے مجھ سے معمولی قاتل کے طور پر کرایا تھا۔ نجانے کیوں میری سماعت میں وہ الفاظ کو جتنے جگے جو کسی نامرئی شخص سے اس کے سامنے نے کئے تھے اور میں نے تین روز پہلے بڑے عطا محمد کی زبانی سنے تھے۔ ”ہم کیوں ڈریں۔ ڈریں وہ جن کی لاشیں سڑکوں پر ترچیں گی اور مکروہ خانوں میں اکڑیں گی۔“ ان الفاظ کی بازگشت ابھرتی اور پھیلتی چلی گئی۔ سوئی لہریں لپکتی گئیں۔ آگے اور آگے۔ اس نئی پکا دو تک جو کسی کیران میں کسی پوچھ میں یا کسی چار دیواری میں کھڑی تھی۔ یا پھر کسی سڑک پر بھاگی جا رہی تھی۔

پایک میں اچھے خیالوں سے چونک گیا۔ مٹھ کر گاڑی کے پونٹ سے دو دھند ”ٹھک ٹھک“ کی آواز آئی پھر ایک ساعت ٹھنک دھکا ہوا اور گھڑا سمیت سونڈی کے پر پٹے اڑ گئے۔

میں چند لمبے سموت گھڑا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا ہوا ہے۔ گاڑی کا ایک جٹا ہوا دو واڑہ مجھ سے صرف پانچ قدم کے فاصلے پر پڑا تھا۔ فضا میں اب تیزی سے بھٹنے پلانگ کی بو پھیل رہی تھی۔ دھماکا میری توقع سے زیادہ زور دار تھا۔ صرف بیڑول کی ٹینگ پہننے سے ایسا شدید دھماکا ہرگز نہ ہوتا۔ شاید گاڑی میں کوئی آتش گیر مادہ بھی رکھا تھا۔ یہ

سارے خیالات دو تین سیکنڈ کے اندر میرے ذہن سے گزرے۔ اچانک مجھے کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ میں سمجھنے کی سی کیفیت سے نکل کر آوازوں کی طرف متوجہ ہوا۔ قریبی دو تھوکوں سے ایک ساتھ ساٹھل کر پڑی تیزی سے اٹھواڑوں پر چڑھ رہا تھا۔ بلا سوچے سمجھے میں نے بھی اپنی جگہ سے حرکت کی اور سامنے کے پیچھے لپکا۔ بھرا ہوا ریوالور بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ بھاگنے والے نے پھلون کوٹ پہن رکھا ہے۔ یعنی وہ کوئی مقامی شخص نہیں تھا۔ اس کے بھاگنے کا انداز مجھے واضح طور پر سرخ جھنڈی دکھا چکا تھا۔

”رک جاؤ۔“ نہیں تو کوئی مار دوں گا۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

میری وارننگ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے ایک بار پھر اسے روک دیا۔ کی اور اس بدایت کو بے اثر باکر گیر دبا دیا۔ میں نے ہاتھوں کا نشانہ لیا تھا لیکن کوئی بھاگنے

والے کو نہیں لگی۔ ہاں اتنا فائدہ ہوا کہ وہ پھسل کر گر گیا۔ یہ چند ساتوں کی مہلت میرے لیے بہت تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اٹھ کر بھاگتا۔ میں اس کے سر پر پتھ چلا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کا جائزہ لیا۔ ہاتھ جیسارے خالی تھے۔ میری بھرپور شوگر اس کی کمر پڑی۔ وہ اٹھا اٹھا بھرتہ کے بل کر اس میں نے جھلا جھلا لگا کر اسے دو بج لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ چلائے کی کو شش کرے گا لہذا ریوالور والا ہاتھ میں نے اس کے منجے سے پوں گزارا کہ اس کی گردن میری کسی کے ٹھٹھے میں دب کر رہ گئی۔ خالی ہاتھ سے میں نے اس کے بال جکڑ لیے۔ وہ ٹھٹھے ہوئے دن کا طاقتور شخص تھا لیکن یہ جانتے ہوئے کہ میرے ہاتھوں میں ریوالور بھی ہے اس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ گردن پر بے پناہ دباؤ کے سبب اس کے حلق سے ”خرو خرو“ کی آواز برآمد ہو رہی تھی۔ یہ آواز اس بات کا اعلان تھا کہ میرا حریف چپٹنے چلائے سے قاصر ہے۔ میں نے اس کے سر کو دو تین بار سنگھڑا زمین سے چٹاؤ اور پھر کھینچ کر سیدھا بھاڑ دیا۔

”خبردار۔ آواز نکالی تو بھیجا پھلا دوں گا۔“ میں نے ریوالور کی ٹال اس کی کینٹی سے لگا دی۔

ایم اے راحت کی ایک خوبصورت اور دلچسپ کہانی

پرواز

اُس نوجوان کی سرگزشت جہاں کی رگڑاں میری وطن کا مجھتے دوسرے تھی

کوئی شکست کوئی ناکامی اُسے اپنی راحت سے متزلزل نہ کر سکی

ایڈ ونچر سے لہریں

۵۰

ناشر علی صابح بیگم کٹر غفران مارکیٹ اردو بازار لاہور

اشاعت علی بک شال نسبت و دو چوک میونسپل لاہور

اب ہم دونوں ایک خود بخود جھڑی کی اوٹ میں دیکے بیٹھے تھے۔ مجھے غدر تھا کہ کار میں ہونے والا زوردار دھماکا اور پھر فازی آواز کسی کو یہاں پہنچانے لگی۔ یہ ایک سنسان علاقہ تھا۔ اوپر ہر کوئی بھی آدور نہ ہونے کے برابر تھی۔ پھر بھی کسی کی مداخلت کا خدوہ ابھی جب موجود تھا۔ کم از کم پانچ منٹ ہم اپنی جگہ بالکل بے حرکت بیٹھے رہے۔ شروع کے ایک دو منٹوں میں تو میرے حریف نے تڑپنے کی بجائے کوشش کی لیکن پھر خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ وہ درمیانی عمر کا ایک بڑھو دار شخص تھا۔ لگتا تھا کسی ہفتوں سے اس نے صابن کو ہاتھ نہیں لگایا۔ دسی سسی کسر شراب نے پوری کردی تھی۔ اس کے منہ سے الکحل کے بھلے گندھ رہے تھے۔ کوٹ کی جیب میں ایک پورا اس وقت بھی موجود تھا۔ اس نے ہاتھوں پر سیاہ دستانے چڑھا رکھے تھے اور گلے میں منظر تھا۔ اس کیٹ اپ سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ موٹر سائیکل یا اسکوٹر پر یہاں پہنچا ہے۔

پانچ منٹ میں گاڑی کے شعلے گرم ہو گئے۔ میں اپنے شکار کو دوپہر دو بجے اٹھا اور گھبتا ہوا "جائے حادثہ" پر لے آیا۔ یہاں آگ کی وجہ سے خوشوار حرارت موجود تھی لیکن اس حرارت کا مزہ کرنا کرنے کے لیے سوختہ گوشت اور پلاسٹک کی بو بھی بھیلی ہوئی تھی۔ میرے گھٹنے میں جکڑے ہوئے شخص کی ٹانگیں کار کی طرف اٹھیں اور ان نگاہوں میں خوف کا تاثر ابھرا تو میں جان گیا کہ اسے گزار کی جلی ہوئی لاش نظر آتی ہے۔ میں نے نگاہوں کو اس کمرہ منظر سے بدھڑکنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور اپنے شکار کو کھیت کر ایک درخت کی جڑ میں بٹھادیا۔ گردن سے بازو بٹھا تو اس نے پھل پار مجھے اپنی آواز سے متعارف کرایا۔ ذیل ڈول کے برعکس اس کی آواز خاصی مٹھی تھی۔ یوں لگا جیسے سلطان رائی پابا شریف کی آواز میں بول رہا ہے۔ ممکن تھا گردن پر پڑنے والے دباؤ نے اس کے گلے میں یہ "سوانیت اور مٹھاس" بھری ہو۔

وہ کراہ کر بولا "تم قاتل ہو۔ تم نے گزار کو جان سے مارا ہے۔ قادر زمان صاحب ہمیں کتنے کی موت دیں گے۔" اس کا یہ قہوہ مجھے سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ یہی وہ دوسرا ہر کا وہ ہے جو قادر زمان کے حکم پر میری عمرانی کر رہا ہے "مروجہ گزار" نے اس کا نام مشتاق عرف مشتاق بتایا تھا۔ میں نے بے پروائی سے ریلوور کو گردش دی اور پھنکار کر کہا "میرے خیال میں اگر اب میں تمہیں شوت کردوں تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ تم خود ہی مجھے یہ

سمجھا چکے ہو کہ ہمیں چھوڑنے کا مطلب کتنے کی موت مرنا ہے اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ کتنے کی موت تو بالکل نہیں" میں نے ریلوور والا بازو بالکل سیدھا کیا اور اس کی پیشانی کا نشانہ لے لیا۔ "چلو چلے کی تیار کیو۔" میری سر آواز ابھری۔

"نکلے کہاں؟" وہ لرز کر بولا۔
"جہاں تمہارے بڑے چاہتے ہیں" اور جہاں ابھی تمہارا سانس بھی پہنچا ہے۔" کلہ و فیروہ بول بھائی۔"
اور میرے مشتاق کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اور وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ میں جو کہ رہا ہوں اسے مہل جانا پڑتا ہے میں تاخیر نہیں کروں گا لیکن زبان سے نکلے الفاظ واپس لینا بھی ناممکن تھا۔ اس نے بدستور ہٹ دھرمی کا لہجہ اختیار کیا۔ رکھا اور بولا "دب دیکو، تم غلطی پر غلطی کر رہے ہو۔ میں جانتا ہوں" گزار گاڑی میں آگ لگنے سے مر رہا لیکن مجھے کوئی بارو کے تویہ سراسر قتل ہو گا۔

"تمہاری کس بات پر یقین کروں؟" میں سفاکی سے مسکرایا "ابھی تم مجھے قاتل قرار دے رہے تھے اب اس مقدمے سے بری کر رہے ہو۔"

اس نے خوف زدہ نظروں سے ارد گرد دیکھا جیسے کوئی اہم بات کہنے سے پہلے خدائی کا یقین کرنا چاہتا ہو پھر اس کی لرزاں آواز ابھری "دیکھو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ خاموش رہوں گا۔ میں تمہیں گا" میں نے یہاں کچھ دیکھا ہی نہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم سے۔ اگر تم کو تو سمجھ میں جا کہ بڑی سے بڑی قسم اٹھا لیتا ہوں۔ یہ بات بیش ہم دونوں کے درمیان رہے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم سے" ایک ہی سانس میں اس نے تیسری بار مجھ سے وعدہ کیا۔

سے تڑپ رہتی تھی اور اپنی وہ بے شمار مجبوریوں کو انہیں جن کے سبب وہ قادر زمان کی نوکری کرنے اور مختصر خواہ کے عوض ماں باپ کی گالیاں سننے پر مجبور تھا۔ پھر اس نے جان بچانے کے لیے آخری راؤ بھی چل دیا۔ اس نے دانشگاہ اعلان کیا کہ مرنے والے کی موت سے اسے خوشی نہیں ہوئی تو غم بھی نہیں ہوا۔ وہ کئی محاللات میں اس کا رقیب تھا اور اس کی موت سے اسے مستقبل میں روحانی و جسمانی سکون حاصل ہونے کی امید ہے وغیرہ وغیرہ۔

آہ کتنی بجا کہ ہے موت! عاقل بالغ انسان بھی بچے کی طرح جھٹکنے اور چلنے کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مشتاق مجھے قاتل کرنے کے لیے جتنا زور لگا رہا تھا میرے اندر اس کے لیے اتنی ہی بے رحمی پروان چڑھ رہی تھی۔ دل کا موسم تو اس وقت بدل گیا تھا جب ایک گھنٹے پہلے میں نے میزیکل اسٹور میں شیطان کی صورت دیکھی تھی۔ اب ایک شخص کو جہنم داخل کرنے کے بعد سینے میں ہونے والی زندگی جوں پر آئی تھی۔ اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کے لیے اس وقت میں ایک نو تو کیا آٹھ دس افراد کو بھی عدم آباد کے ٹکٹ تھا۔ مشتاق کو قاتل نام قابل عار قائم سے کام لیتے ہوئے میں نے مشتاق کو بولنے کا موقع دیا۔ جب وہ خوب بول چکا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے دوستانہ عزائم کے ثبوت میں میرے چند سوالوں کے جواب دے۔ اسے تاریکی کے آئینے میں موت کی شکل نظر آ رہی تھی۔ انکار اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ میں نے پوچھا اور وہ فر فر بولنے لگا۔ اس نے تصدیق کی کہ اس کا نام مشتاق ہے۔ ان کا تیسرا سانس ابھی اکبر نیازی آج شام ہی جنگ واپس چلا گیا تھا۔ مشتاق نے یہ وضاحت بھی کی کہ مرنے والا "گزار" القوروس کے اندر میری عمرانی کرنا تھا جبکہ وہ اور اکبر نیازی یہ کام القوروس کے باہر انجام دیتے تھے میں نے پوچھا کہ گزار میری عمرانی کے لیے القوروس میں بغیر ایک عدد خاتون کے کیونکر کھسکا؟ جواب میں مشتاق نے بتایا کہ اس کے ساتھ ایک عدد خاتون بھی موجود تھی اور وہ اب بھی کمرانمبر ۲۸ کے آرام دہ بیڈ پر لیٹی گزار کا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں نے مشتاق سے خاتون کا نام طیلے حسب نسب سب پوچھ لیا۔ میرے پوچھنے پر مشتاق نے وضاحت کی کہ جاگیردار کو رپورٹ پہنچانے کا ڈر ہے دار اکبر نیازی تھا۔ وہ اب برسوں واپس آئے گا اور اس کی واپسی سے پہلے اگر کوئی اہم اطلاع ہوئی تو جاگیردار صاحب سے گزارنے فون پر رابطہ قائم کرنا تھا۔

جو اہم باتیں مشتاق مجھے بتا سکتا تھا پتا چکا تھا۔ اب مجھے

اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ اس نے مجھے اپنی بہت سی پریشانیاں اور الجھنیں بتائی تھیں۔ میں نے اسے ان تمام الجھنوں سے آزاد کرنا بہتر سمجھا۔ اس جیسے شوہر کی کمائی اور باپ کے سامنے سے لواحقین محروم ہی رہتے تو افضل تھا۔ ریلوور کا رخ اس کے چرے کی طرف کیے کیے میں اس کے قریب پہنچا اور اچانک اپنا دایاں بازو اس کی گردن میں داخل کر دیا۔ میرے بازو کی یہ مخصوص گرفت غیر معمولی طور پر سخت تھی۔ جیسا کہ آپ اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں، کار میں جیسے غومند بد معاش بھی اس گرفت میں آکر چڑیا کی طرح پھڑپھڑاتے تھے۔ توڑی در پہلے میں نے مشتاق کو اپنے اسی داؤ میں پورے پانچ منٹ تک بے بس کیے رکھا تھا۔ یہ کوئی معمولی داؤ نہیں تھا۔ ایک مرتبہ بازو اپنی جگہ جتا تھا تو حریف کے ہر عضو بدن کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں آجاتی تھی۔ حرکات و سکنات سے لے کر بصارت سماعت اور گویائی تک سب کچھ میرے بازو کے تابع ہو جاتا تھا۔ اس موقع پر "مقبوضہ" شخص کو بے ہوش یا رانی عدم کرنا میرے لیے چنداں مشکل نہیں ہوتا تھا۔ گرفتاری سے پہلے اپنی مار دھاڑ سے بھر پور زندگی میں میں نے بیسیوں مرتبہ داؤ استعمال کیا اور شاید یہ کبھی ناکامی ہوئی ہو۔ ہاں چند بار برس ضرور ہوا کہ جس شخص کو میں نے بے ہوش کرنا چاہا وہ دھڑکنے کے لیے بے ہوش ہو گیا۔ ایک ایسا ہی سنگین لیکن دلچسپ واقعہ میں آگے چل کر آپ کو سناؤں گا۔

ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا مشتاق کا۔ میرے ہتھے چمکنے کے بعد اس شخص نے زبان سے جو پہلا قہوہ ادا کیا تھا اس نے اس کی موت پر ہر تصدیق ثبت کردی تھی۔ یہی وہ اقرار کر چکا تھا کہ وہ قادر زمان کا کارندہ ہے اور قادر زمان کا تعلق کس درندے سے ہے۔ یہ میں ابھی توڑی در پہلے جان گیا تھا۔ اس حوالے سے اب مشتاق کے لیے میرے دل میں رحم کی کوئی رقی نہیں تھی۔ میں نے اس کی گردن میں اپنے بازو کو مخصوص حرکت دی۔ بڑی ٹوٹنے کی مانوس آواز آئی اور چند جھٹکوں کے ساتھ مشتاق وجود سے عدم وجود میں چلا گیا۔ یہ عمل بے حد خوفناک ہونے کے باوجود میرے لیے یا نہیں تھا۔ میں نے گردن جھکا کر دیکھا۔ کار کے چتر چلنے حصوں کی روشنی میں مشتاق کی آنکھیں خوف سے کشادہ نظر آتی تھیں۔ غالباً اسے آخری وقت میں ہی احساس ہو سکا تھا کہ اس پر کیا گزری ہے۔

سخت سردی کے باوجود میرا جسم پوری طرح گرم تھا۔ ہر عضو میں بے نام توانائی کی برق کو نہ رہی تھی۔ میں نے تیزی

سے اپنے شکار کی جیسے ٹولیس۔ شراب کا پورا پر آمد کیا۔ اس میں سے ابھی ایک دو گھنٹہ ہی لیے گئے تھے۔ میں نے ذکر میں دانتوں سے ٹھہر کر بوتل کا منہ کھولا اور مشقی کے لباس پر آم الخاف کا چمڑا کا سا کر دیا۔ بقیہ شراب دوبارہ جیب میں رکھ دی۔ پھر اسے کھینٹ کر سٹکتی ہوئی کار کے قریب ڈال دیا۔ میرے ساتھ دھکا مشقی کے دوران مشقی اوندھے منہ کرنا تھا۔ اس کے چہرے پر خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ اب وہ جس طرح کار کے قریب پڑا تھا، دیکھ کر پہلا خیال ہی آتا تھا کہ وہ کار کے حادثے میں جاں بحق ہوا ہے، حواس کے وقت وہ اچھل کر کار سے دور جا کر اے اور یوں چلنے سے بچ گیا ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، مشقی کے گلے میں مفلر تھا لہذا میرے گردن توڑ داؤ کا شاید یہ تک اس کی جلد پر محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اسے کار کے قریب ایسے رخ سے ڈالا تھا کہ وہ ذرا نیچے سیٹ سے لڑھکا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ صورت حال تفتیش کرنے والوں کے لیے اور بھی گمراہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ چونکہ مشاق نشے میں تھا لہذا سوچا جاسکتا تھا کہ بدستی کے سبب وہ پر خطر راستے پر کار کو قابو میں نہیں رکھ سکا اور اپنے ہر ایسی سیٹ لٹھا ابل میں گیا۔

موقع پر ضروری انتظامات کرنے کے بعد میں نے وہاں ایک بیل بھی ٹھہرا مناسب نہیں سمجھا۔ ڈھلوان طے کر کے میں سڑک پر آیا اور اس اسکوڑیا موز سائیکل کی تلاش میں نکلیں وہاں لگا جس پر مشقی میاں پہنچا تھا۔ میری تلاش رائیگاں نہیں گئی۔ جلد ہی مجھے کچھ قاصد پر ایک اسکوڑیا کا پہلا دکھائی دے گیا۔ یہ اسکوڑی موز سے کوئی سو گز دور ایک بوڑے چمڑی اوٹ میں کھڑا ہوا تھا۔ قاصد نظروں سے اورد گرد کا جائزہ لیتا میں اسکوڑی تک پہنچا۔ اسکوڑی کا پینڈل قفل سے آزاد تھا۔ مشقی کے دستانے اب میری جیب میں تھے۔ میں نے دستانے پٹنے لگ لگائی اور موٹے سے روانہ ہو گیا۔ اپنی کار تک پہنچنے میں مجھے دس منٹ سے زائد نہیں لگے۔ یہاں میں نے اسکوڑی کھڈ کے کنارے چڑ کے خشک پردوں میں چھپایا۔ جیب سے دو مال نکال کر مختلف جگہوں سے اٹکیوں کے نشانات صاف کیے اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ آیا۔



قریباً پندرہ منٹ بعد میری گاڑی طرفانی رفتار سے القروں کے مین گیٹ میں داخل ہوئی۔ میرے ذہن میں آدھریاں ہی چل رہی تھیں۔ لگتا تھا، اگر جلدی میں نے اپنا سینہ کسی کے سامنے کھول دیا تو وہ پھٹ جائے گا لیکن کس

کے سامنے کھول میں اپنا سینہ؟ میاں کوئی میری سننے والا نہیں تھا۔ اور سنجائی تو کیا سمجھتا؟ اسے کیا معلوم ہوتا؟ سن جس ورنہ ہے جو ان خوب صورت کو سادوں میں گھومتا پایا گیا ہے۔ میں نے گاڑی پارکنگ لائٹ میں روکی اور بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا۔ میری پہلی دستک پر انجم نے دوبارہ کھول دیا۔ شاید وہ دوبارہ اسے پاس ہی موجود تھی۔ اس کا چوٹیکوٹ کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ میں اس سے کہہ کر گیا تھا کہ نیچے ڈاکٹر سے ملنے جا رہا ہوں اور اب پورے دو گھنٹے بعد واپس آیا تھا۔ ان دو گھنٹوں میں میں دو آدمی ٹھکانے لگا چکا تھا۔ ایک گاڑی میرے ہاتھوں تیار ہو چکی تھی اور ایک ایلے ٹھکانے کی دیو میری آنکھوں کا قرار لوٹ چکی تھی جو جرائم کی دنیا کا بنا ہوا آفت زاہد تھا۔

”کچھ کہاں گئے تھے آپ؟“
انجم کے لیے میں بے پناہ ناراضگی اور بے چینی جھٹک رہی تھی۔ لگتا تھا، میری گمشدگی کی پریشانی نے اس کے لیے دو دھن گلیوں کا کام کیا ہے۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نہیں تھے صرف میرے انتظار کا کرب تھا۔ میں نے اپنے پیچھے جلدی سے دوبارہ بند کیا اور اسے شانوں سے تمام کر موندے پر لے آیا۔ وہ انسانی نگاہ میں بند چڑیا کی طرح لرز رہی تھی۔ بال مشتر اور لباس بے ترتیب تھا۔

میں نے کہا ”آئی ایم سوری انجم! میں تمہاری دوا لینے نصاب کی چلا گیا تھا۔ راستے میں گاڑی خراب ہو گئی۔ میں فون کرنا چاہتا تھا لیکن پتا نہیں لائوں میں کیا خرابی تھی۔ کوشش کے باوجود رابطہ نہیں ہو سکا۔ آئی ایم سوری ٹیڑھ۔“
انجم کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ میں نے بڑھ اس کا شانہ تھپتھپایا۔ وہ ناک سے سوس سوس کی آواز نکالتے ہوئے بولی ”آپ کو اندازہ نہیں؟ یہ دو دھانی گھنٹے میں نے کبے گزارے ہیں۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا آپ کو۔“

میں نے انجم کی دوا نکالنے کے لیے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اسی وقت مجھے یاد آیا کہ دوا تو میں نے ہی لی تھی۔ میں میڈیکل اسٹور میں داخل ہی ہوا تھا کہ شیطان کی صورت نظر چلی گئی اور پھر کچھ بھی مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ میں سٹاپ کر رہ گیا لیکن اس سے پہلے کہ میرا ذہن کوئی بہانہ تراشنا انجم نے خود ہی میری مشکل آسان کر دی ”بھئی“ نہیں۔ ابھی دوا رہے۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ ضرورت پڑی تو لے لوں گی۔“

اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ میں اس کے لیے دوا لینے گیا تھا اور اپنے لیے درد لے آیا ہوں۔ ایسا بے کراں درد

جو گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ بڑھتا اور پھیلنا جا رہا ہے۔ اب رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ انجم کے پاس میں دو نیند آور گولیوں موجود تھیں۔ میں نے اصرار کر کے اسے ایک گولی کھلا دی اور سونے کے لیے بستر پر لٹا دیا۔ وہ گائے گائے غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ شاید غفلت کو سونے والی مخصوص نوازی جس اس کے اندر بھی جاگ چکی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی ”آپ کچھ اکڑے اکڑے ہیں۔“
”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں“ میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

”کیس کیسی سے جھڑا وغیرہ تو نہیں ہوا؟“
”یہ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“
”آپ کی جیکٹ پیچھے سے خراب ہو رہی ہے۔ لگتا ہے“

”کیس کرے ہیں آپ؟“
مجھے فوراً مشقی کے ساتھ ہونے والی دھکا مشقی یاد آئی لیکن فوراً ہی جواب بھی سوچ گیا۔ میں نے کہا ”جیسے بتایا تو ہے گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ اس وقت کینک نے کہاں ملتا تھا۔ خود ہی نیچے ٹھس کر ٹھوکا تھا کی کرنی پڑی۔ یہ دیکھو ہاتھ بھی چل گیا ہے۔“

”اوسکے گزراٹ“ اس نے کہا اور کوٹ بدل کر لپٹ گئی۔ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ میرے جواب سے اس کی تسلی نہیں ہوئی۔

انجم کی خاطر مجھے قریباً ایک گھنٹہ اور انتظار کرنا پڑا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کمری نیند سو گئی ہے اور اب دو تھیں گئے تک کوٹ نہیں بدلے کی تو میں نے لباس بدلا اور دوبارہ مشق کر کے باہر نکل آیا۔ یہ نصف شب کا عمل تھا۔ گزری کی سوئیاں باد کے بندے سے پر گلے لٹنے کے لیے قریب تر ہو رہی تھیں۔ بالکونی میں نکلنے سے میرا ہوا کے مجھکوں نے استقبال کیا۔ اس وقت گرم کرے سے باہر نکلتا اور اپنی طرح کی دوسرے کو بے آرام کرنا طبعی نامناسب تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ جو نامناسب تھا وہی میں مناسبت ہو گیا تھا۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے ان آنکھوں کی دھجی بجا آتا تھا جو مجھ پر گھراں تھیں۔ اب سہاوی صاحب سے ملاقات کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ میں نے سب قدموں سے سہاوی صاحب کے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھا اور دوبارہ اسے دستک دی۔ میری تیزی یا جو بھی دستک پر اندر سے کسی کی خواہش کو توڑا ابھی۔ یقیناً یہ سہاوی صاحب تھے ”کون ہے؟“ چند لمحے

بعد دوبارہ اسے کے بالکل قریب سے ان کی آواز آئی۔
”دوبارہ کھولے سر“ آپ کے لیے ٹیلی گرام ہے“ میں نے بیٹر کے لب و لہجے میں جواب دیا۔
”جتنی نے حرکت کی اور دوبارہ مکمل کیا۔ میں اعشاریہ پچیس کا ریو اور پہلے ہی ہاتھ میں لے چکا تھا۔ جب سہاوی صاحب نے مجھ پر نگاہ ڈالی، ریو اور کی سوال ان کی پیشانی کو چوم چکی تھی۔ ان کی آنکھیں پٹی نہ کھیں۔ میں تیزی سے انہیں دھکیل کر اندر داخل ہوا اور اپنے عقب میں دوبارہ بند کر دیا۔

کمرے میں نیکیوں بلب جل رہا تھا۔ بلب کی روشنی میں سہاوی صاحب نے بنور میرا جائزہ لیا۔ وہ جیسے مجھے پچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے ان کی آنکھوں سے ان کے ذہن کی نقل و حرکت نظر آ رہی تھی۔ ان کے ہنر رفتار ذہن نے بڑی سرعت سے ماہر سال کا قاصد لے کیا اور لاہور جیل میں پہنچ گیا۔ پھر ذرا سی دیر میں وہ مجھے پچان گئے۔ ان کی کشادہ آنکھیں کچھ اور کشادہ ہو گئیں۔ شادیت کی انہی میرے چہرے کی طرف اٹھی اور کراڑا ہونٹوں سے کانتی آواز برآمد ہوئی ”تمہیں تم تو شاہ جاں ہو“ تم تو بیل میں تھے۔“
”بالکل صحیح پچاننا ہے آپ نے“ میں نے سرگوشی کی۔
”کسی قریبی کمرے سے سہاوی کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی ”کون ہے گی؟“

میں نے سہاوی صاحب کی پیشانی پر ریو اور کا دباؤ بڑھا دیا۔ میری آنکھوں کی خاموش روایت پر سہاوی صاحب نے فوراً عمل کیا۔ وہ اپنی عرقش آواز کو حتی الامکان قابو میں رکھتے ہوئے بولے ”کوئی نہیں ڈیڑھا سو جاوے۔“

میں نے ریو اور پیشانی سے ہٹا کر سہاوی صاحب کی کمر سے لگا دیا۔ یہ سب کچھ کرنے کے لیے مجھے خود بہت جبر کرنا پڑا تھا ”اس ساتھ والے کمرے میں کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میری بیٹی“ سہاوی صاحب نے جواب دیا۔
”اور پچھلے کمرے میں؟“
”بچے لازم کے ساتھ سو رہے ہیں۔“
”کس کمرے میں جانا پسند کریں گے آپ؟“ میں نے پوچھا۔
”تم چاہے کیا ہو؟“ سہاوی صاحب پہلی مرتبہ غرائے ”یہ آپ کو اکھیناں سے بیٹھ کر تاؤں گا۔“
”اس ریو اور کو جیب میں رکھ لو“ وہ حکم سے بولے ”جب تک تم اس پھٹتے ہو“ میں تمہارے خلاف کوئی

ایکشن میں لوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔
میں نے کہا "مجھے آپ کے وعدے پر سوچنا سے اعتبار ہے لیکن آپ کے اہل خانہ نے تو کوئی وعدہ نہیں کیا۔ ممکن ہے آپ کا ملازم یا آپ کے لڑکوں میں سے کوئی فون کے ڈائل میں انگلی تھام دے۔"

"میں ہو گا ایسا۔ میں گارنٹی دیتا ہوں۔"
میں نے ایک لفٹ کے بغیر ریو اور جب میں رکھ لیا۔ مجھے سہی صاحب کے قول پر پورا اعتبار تھا۔ سہی صاحب نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دوسری دستک پر اندر روشنی ہوئی، چمرو داؤد کھلا اور ایک قیامت چمکت پر نظر آئی۔ وہ ایک حسین اور نورخیز لڑکی تھی۔ شب خرابی کے لہاوے میں لمبوس اور سر تا پائید کے خنار میں چور کوئی کیرا اسے اپنی آنکھ میں محفوظ کر لیتا تو خوابیدہ حسن کے مٹوان سے ایک شاہکار فوٹو گراف وجود میں آسکتا تھا۔ اس نے ایک نگاہ غلط انداز میں چمرو داؤد پر ڈالی پھر جھجک کر ایک بانو موزا اور بیٹے پر رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی سواہی نظریں سہی صاحب کی طرف اٹھ گئیں۔

"بنیا! مسمان آگئے ہیں۔ آپ ذرا اما کے کمرے میں چلے جائیے۔"
دو تیزو کے خربے پر ناگوار کی حسیں ابھر کر غائب ہو گئی "اوکے بابا" وہ لہجے میں لامحنت سمیٹ کر بولی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ سوچ بھرتی اس کی نگاہیں پلٹیں اور ایک بار پھر میرے چہرے پر جم گئیں۔ میں یہ جان کر حیران ہوا کہ وہ میری شہادت میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے بخیر نور دیکھنے کے بعد اس نے ایک بار پھر سہی صاحب کی طرف دیکھا۔ اس بار بھی اس کا انداز سواہی تھا۔ مجھے سہی صاحب کی آنکھوں میں جگہ سی سراسیمگی نظر آئی۔ کوئی بات تھی جو خاموشی کی زبان میں باپ جی کے درمیان ہوئی تھی۔ پھر یہ بات جی کے ہونٹوں پر بھی آگئی۔ وہ حیرت آمیز نظریں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"پاپا! یہ وہی تو میں۔ میرا مطلب ہے شاہ جہاں صاحب۔ جولا ہو جیل میں۔"
"نہیں نہیں" رجال سہی صاحب نے تیزی سے جی کی بات کاٹی "یہ وہ نہیں ہیں" ایک پرانے واقف کار ہیں "اپنے کسی کام سے آئے ہیں۔"

"اوہ! لڑکی کے ہونٹوں سے نکلا۔ وہ ابھی ہوئی نظریں سے مجھے دیکھتی واپس کمرے میں گئی۔ غالباً بیڈ شیٹ درست کرنے لگی تھی۔ چند لمبے بعد وہ واپس آئی۔ اس کے ہاتھوں

میں ٹینس شوز تھے ایک ترجیحی نظر مجھ پر ڈالتی ہوئی، دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ہم کمرے کے اندر آگئے۔ یہ کمرہ خوب آرام تھا۔ فضا میں بھیجی سی نسوانی مہر رہتی بسی تھی۔ ہم دونوں آنے سانسے صوفوں پر بیٹھ گئے سہی صاحب بھی سلیڈنگ سوٹ میں تھے۔ وہ اب اپنے اعصاب پر عمل قابو پا چکے تھے اور کمری نظریں سے ہم جانزہ لے رہے تھے۔

ایک سگریٹ سلگا کر بولے "عالم! تم نے بال رستے ہو۔ ہیں اور آنکھوں کا رنگ بھی تبدیل کر رکھا ہے۔"
"آپ کا اندازہ درست ہے" میں نے جواب دیا۔
دو ڈھائی ماہ پہلے تھمارے فراری خبر میری نظریں۔ مگر وہ تھی لیکن یہ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم سے ام طرح ملاقات ہوگی۔"
"میرے وہم و گمان میں بھی بہت کچھ نہیں تھا سنا صاحب" لیکن وہ سب کچھ ہوا ہے میں جو بڑی خاموشی۔ ایک جیل میں اپنی سزا کے دن رہا تھا اچانک پھر طوطا کے دھارے پر بیٹھ لگا ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ اچانک مجھ پر کیا جیتی ہے۔"

سہی صاحب نے کہا "شاید تم مجھے کوئی کمائی سناؤم رہے ہو لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"
"میرے پاس آپ سے بھی کم وقت ہے سہی صاحب میں نے ترت جواب دیا "معلوم نہیں" کس گھڑی کیا آؤں فوٹ پڑے۔ ابھی تو موزی دیر پہلے میں نے ایک ایسے شخص یہاں دیکھا ہے کہ آپ سب کے تو فی راتوں تک آپ ہم چمن کی بند سے محروم رہیں گے۔"

"پہیلیاں مت بھجواؤ" وہ غرائے میں نے ایک کمری سانس لے کر سہی صاحب کے آنکھوں میں جھانکا اور کہا "جناب! اب سے تقریباً چار گھنٹے پہلے تھنیا گلی کے مین بازار میں" میں نے شکر شکر کا ایک میڈیکل اسٹور سے نکلے دیکھا ہے۔"

اپنا فقرہ ادا کر کے میں سہی صاحب کے۔ رات دیکھ میں مصروف ہو گیا۔ میری اطلاع نے انہیں بڑی طرح چونک پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ غاصے حیران ہوئے لیکن یہ جراتی میرا توقعات سے کم تھی۔ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ سہی صاحب پہلے سے اس بارے میں کچھ جانتے ہیں۔

وہ بولے "تکس تم نے دھوکا تو نہیں کھایا۔"
"نہیں جناب۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے بہت قریب سے اسے دیکھا ہے۔ اس کا چہرہ مایا ہے اور تھنیا گلی کا

بھول حلیوں میں اسے کھویا ہے۔"
سہی صاحب کی فراخ چشتی پر شکلیں نمودار ہوئیں۔ میرے سینے پر گرے ہوئے کو حیران کا کچھ ہو چکا ہے اچانک سہی صاحب کے سینے پر خنجر ہو گیا تھا۔ وہ کسی کمرے کو نہیں سے آتی ہوئی آواز میں بولے "اگر واقعی ایسا ہے تو بہت تشویش ناک ہے۔"

چند ہی لمحوں میں وہ ریو اور ہم دونوں کے درمیان سے بہت گیا تھا جس نے تو موزی دیر پہلے سہی صاحب کی پیشانی کو چھوا تھا۔ ایک غم مشترک نے ہم دونوں کو مغرور اور جلیجری نشستوں سے اٹھا کر ایک ہی خادوار مسند پر برابر برابری لا ڈھایا تھا۔ میرے خیال میں اعتبار کی وہ فضا جو میں بعد کوشش بھی چم نہ کر سکتا اس ایک نام نے پلک جھپکنے میں قائم کر دی تھی۔ بہر حال سہی صاحب کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ میرے فراری دوداد شروع سے سنا چاہتے ہیں۔ میں تو خود یہ سب کچھ بتانے کو بے تاب تھا۔ ان کا مذعازبان پر آتے ہی میں نے حقیقت حال کی کتاب ان کے سامنے کھول دی۔ میں نے ایک جیل میں خود پر ہونے والے حلوں کے تذکرے بے اثر لایا اور قارئین کی "مسمان نوازی" سے لے کر اپنی بہن کی بے بسی تک اور خود پر تھوپے گئے مشن سے لے کر شکر شکر کے وہ ایک سب کچھ سہی صاحب کے گوش گزار کر دیا۔ ان سے کچھ چھپانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میری زندگی۔۔۔ کا ایک ایک ورق ان کا پڑھا ہوا تھا۔ یہ نئے ورق بھی ان کی نظریں آہی جاتے تھے "میں نے پڑھتا تو وہ خود پڑھ لیتے۔ صرف میں نے ایک بات ان سے چھپائی تھی اور وہ یہ کہ میں جس شخص کو قتل کرنے جنگ سے نکلا ہوا ہوں وہ خود سہی صاحب ہیں۔ میری پوری کھانسنے کے بعد انہوں نے ایک کمری آہ بھری اور ہاتھ پٹت پر بانڈھ کر کمرے میں چلے گئے۔ ان کا چہرہ اب اضطراب کی آنا بگاہ تھا۔ وہ بڑی تیزی سے حالات پر غور کر رہے تھے کتنے گئے "تھماری باتوں سے شکر شکر اور قارئین کا تعلق ثابت ہوتا ہے۔"

"ہائل" میں نے جواب دیا "قارئین اس شخص کو راستے سے ہٹانا چاہتا ہے جو شکر شکر کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"
وہ بولے "تھماری اطلاع کے لیے تیار ہوں کہ اعلیٰ حکام شکر کی آمد سے دو ہفتے قبل آگاہ ہو چکے ہیں۔ میں ذاتی طور اس کی گرفتاری میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ یہ پورا نہیں ہو گیا تھا میں ہے میری نظریں تو کوئی ایسا شخص یا پارٹی نہیں ہے جو پولیس کے علاوہ شکر کی آمد سے آگاہ ہو اور اسے



اسباب، خوف، دہشت اور اسرار میں
ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
اسباب، ایک سرگرمی بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور اب
تک جاری ہے گی۔

قیمت: ۲۰ روپے

میرا دہشت گرد کا بیٹا

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون: ۲۲۳۸۵۳

اسٹاکٹ: علی بکسٹال
نسبت: دو، چوک میوہ ہسپتال، لاہور۔
فون: ۲۲۳۸۵۳

اپنے اہل قریبی بکسٹال بکسٹال

دروازے کو کندھے کی گھر رسید کی۔ ان دروازوں کی چٹناں میری دیکھی بھائی تھیں۔ مجھے یقین کامل تھا کہ یہ فکر کارگر ثابت ہوگی۔ مجھے اپنے تئیں پر فرشتہ نہیں ہونا پڑا۔ کندھے کی ضرب سے جتنی ٹوٹ گئی۔ میں بگولے کی طرح اندر گھسا۔

میں ناٹ بلب روشن تھا۔ وسیع بیڑ پر ایک ”جوڑا“ پہنی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں نے ایک ہی کھل کر یوں مضبوطی سے تھام رکھا تھا جیسے وہ ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا تو متاع حیات ان سے چھن جائے گی۔ میں ریو اور بدست ان کی طرف پڑھا تو لڑکی نے ایک سرسلی جھج کے ساتھ ”متاع حیات“ کو ہاتھ سے گرایا اور متاع جسم وہاں کو سمیٹ کر ہاتھ دوم کی طرف بھاگی۔ بیڑے ہاتھ دوم کے دروازے تک جیسے ایک روشن ٹیکری بگ بگ گئی۔ لڑکی کا سامنی کھل سمیت ایک کونے میں دبک گیا اور ”ڈیڑر ڈیڑر“ چلانے لگا۔ میں سڑک کی طرف کھلے والی ٹیکری پر جھپٹا پٹ کھولے اور بلا درنگ باہر کود گیا۔ میرے پاؤں چند فٹ نیچے ہو کر جھجے پر آئے۔ جھپٹا سڑک سے قریب چند فٹ بلند تھا۔ میں لٹک کر بہ آسانی نیچے کو سٹکا تھا لیکن جس جگہ مجھے کودنا تھا میں وہیں بلیس کی ایک پڑولنگ گاڑی کھڑی تھی اور اس میں موجود سٹج جو ان میرے استقبال کے لیے پوری طرح تیار تھے جتنی بات بھی کی عمارت کے اندر ہونے والے پہلے فائر نے ان کو چاروں سمت چوس کر رکھا تھا۔

”خزوار اے“ ایک حوالدار نما شخص کے حلق سے خطرناک آواز نکلی ”اپنی جگہ کھڑے رہو“ نہیں تو گولی پٹا دوں گا۔“

اس کے ہاتھ میں ریو اور صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جب کے پاس کھڑے ایک بیڑے کا ٹیبل نے بھی راتل کی ٹال میری طرف سیدھی گئی تھی۔ میری انگلی ریو اور کے زکیر پر چلی لیکن مجھے معلوم تھا گولی پٹانا بہت مزگ سوا ہے۔ کھڑکی سے سادہ پوش کوڈ کوڑکے جیسے پرہیزگاروں نے شین اطراف سے مجھے دیکھ لیا۔

○☆☆○

نیم تاریک لاک اپ میں ٹھنڈے غار فرش پر بیٹھا میں آتش فشاں کی طرح اٹھ رہا تھا۔ ساسی صاحب کا میری نگاہوں میں ایک مقام تھا بلکہ اگر میں کھوں کہ میری زندگی کے تند تیز ریلے کو ایک دھیمی ہوا رندی کا روپ دینے میں میری ہن گھٹنے کے بعد ساسی صاحب کا سب سے زیادہ رول تھا تو یہ جانے ہو گا لیکن ساسی صاحب نے آج مجھ سے جو سلوک کیا تھا وہ کسی طور ان کے شایان شان نہ تھا۔ میری

جگہ ”مجھے تم کوئی دیر کے لیے غیبر کے ساتھ جانا ہے۔ تم اپنے روم میں واپس جاؤ۔ میں ابھی ایک گھنٹے میں تم سے پھر رابطہ کرنا ہوں۔“

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور ان کے ساتھ ہی باہر راہ داری میں آیا۔

جوئی میں راہ داری میں پہنچا ایک سایہ سارے ساتوں کی اوٹ سے نکلا اور غریبت کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ یہ ایک غنمہ شخص تھا۔ اس نے عقب سے مجھے یوں بکڑا کہ میرے دونوں بازو اس کے پیچھے میں آگئے ایک سفید پوش شخص مانے سے پرآہ ہوا۔ اسے دیکھنے میں میں جان گیا کہ وہ سادہ لباس میں پولیس والا ہے۔ ہاتھ تھما کر ایک طوفانی مٹکا اس نے میرے جڑے پر رسید کیا۔ میں نے بھٹکا سر کے پچھلے حصے کی ضرب بھجھا مارنے والے کی ناک پر رسید کی۔ گرفت زرا ڈھکی ہوئی تو میں تیزی سے اٹنے پاؤں پیچھے ہٹا اور اسے ایک دیوار سے گرا دیا۔ اس نے گرا کر مجھے اپنے بازوؤں سے آزاد کیا۔ مٹکا مارنے والا سادہ پوش پھر میری طرف بھٹ رہا تھا۔ میں نے سیدھی ناک اس کے سینے پر رسید کی اور وہاں میں اچھل کر ساسی صاحب کے قدموں میں گرا۔ راہ داری میں ایک دم ہی ختم دھاڑ چمکی تھی۔ وہ سادہ پوشوں کو پسا کر کے میں پوری قوت سے سیزھوں کی طرف بھاگا۔ ذہن میں یہی خیال تھا کہ ساسی صاحب نے مجھ سے دھمکا کیا ہے انہوں نے اپنا وعدہ اس طرح نبھایا ہے کہ بھائی دے رہا ہے اور توڑ بھی رہا ہے۔ اپنی چمت تلتے انہوں نے مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالا لیکن جوئی راہ داری میں نکلا مجھ پر سادہ پوش بھڑوڑے ہیں۔ سرخ قالین سے ڈھکی ہوئی سیزھیاں تھ سے قریب پچاس فٹ کے فاصلے پر تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ ان سیزھوں تک پہنچ گیا تو سادہ پوش میری گردن میں نہ پاسکیں گے لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ابھی میں نے سیزھوں کی طرف صاف فاصلے ہی طے کیا تھا کہ عقب سے کسی نے چلا کر مجھے رکے کی وارننگ دی۔ اس کے ساتھ ہی فائر ہوا۔ معلوم میں یہ ہوائی فائر تھا یا سیدھا ہیرا مال گولی مجھے گئی نہیں۔ فائر دلتے ہی سیزھوں سے دو اور ہوائی نمودار ہوئے ایک کے تھم چھٹی ٹال کی کٹا شکوف بھی۔ چند ہی لمحوں میں میں تریں صورت حال کا شکار ہو چکا تھا۔ بھاگے بھاگے میں نے لوٹ کی جب سے ریو اور نکال لیا تھا لیکن دونوں طرف سے گھر جانے کے بعد یہ ریو اور چلانا اپنی بدقسمتی پر ہر تقدیر سے بے گناہ تھا۔ راہ داری کے عین وسط میں پہنچ کر میں نے رخ ہیرا اور چند قدم بھاگ کر پوری قوت سے ایک بلی

اور کیوں اب تنگ وہاں ہے؟ ساسی صاحب: ”اب مجھے ا طرح جانتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں کیسی آگ سے چھپائے ہوئے ہوں۔ میں نے اسے لایا اور جیل میں اس کو آپ نے اپنی باتوں سے مدھم کیا تھا۔ اب یہ آگ پھرا بن کر مجھے چاٹ رہی ہے۔ میں بچ کر رہا ہوں ساسی صاحب اس وفد بہت جگہ جل جائے گا۔“ میرا لہجہ بدترن کرکشا تند ہو رہا تھا۔

اچانک بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ ہماری منتظر سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ساسی صاحب نے اٹھ کر دروازہ کو دوسری طرف القرووس کا بھجرا تھا۔ میں نے اسے اس کی آ سے پچایا۔ وہ خاصا گھبرا ہوا تھا۔ میرے کان دروازے دوسری جانب سے آنے والی آوازوں پر لگ گئے غیبر حاد سے کاڈ کر رہا تھا۔ منتگھوں میں دو تین بار کار کا ڈکر آیا تو پوری توجہ دینے پر مجبور ہو گیا۔ چند قدم چل کر میں کھڑکی طرف آیا۔ یہاں سے راہ داری میں ہونے والی منتگھ واضح طور پر سنائی دینے لگی۔ غیبر ساسی صاحب کو بتا رہا تو القرووس میں ٹھہرا ہوا مظار نامی ایک شخص کار کے حاد میں جاں بحق ہو گیا ہے اس کے ساتھ ایک اور شخص ہلاک ہوا ہے۔ دونوں کی لاشیں اور تباہ شدہ کار ابھی تھو دیر پہلے تھیا گئی جانے والی سڑک کے کنارے لی ہے۔ پور کی طرف سے غیبر حسین شاہ کو بلایا آیا تھا اور وہ صاحب سے درخواست کرتے آدھکا تھا کہ وہ متعلقہ اشیا ایک کال کریں تاکہ معاملہ اچھنے نہ پائے اس کی منتگھ اندازہ ہوتا تھا کہ حادثے میں تباہ ہونے والی کار ”القرووس“ کی ملکیت تھی۔ غیبر حسین شاہ صرف ساسی صاحب کو تھا بلکہ ان سے قریبی مراسم بھی رکھتا تھا۔ ساسی صاحب اس سے متعلقہ تھانے کا فون نمبر لیا اور کال کا وعدہ کر رخصت کر دیا۔ ساسی صاحب کے لوٹنے سے پہلے میں صوفے پر آ بیٹھا۔

وہ آئے تو میں سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ بولے ”ایک حادثہ ہو گیا ہے میں روڈ پر۔“ مارے گئے ہیں۔ شاید ڈرائیور نے بے ہوشی میں تھا۔“ پھر وہ ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھے اور متعلقہ ف کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔ تین چار مرتبہ ڈائل کرنے باوجود کالی ہوئی۔ اس دوران غیبر حسین پھر دروازے آدھکا۔ لگتا تھا متعلقہ پولیس آفیسر نے اس کی کوئی بات ہے جس کے سبب وہ تباہ پولیس اسٹیشن جاتے کسراہ ہا مختصر منتگھ کے بعد ساسی کرے میں واپس آئے مجھ سے

مار گرانے کی فکر میں ہو۔“ میں نے جواب دیا ”جناب! میں نے کب کہا ہے کہ میں جس شخص کو قتل کرنے نکلا ہوں وہ غیر سرکاری آدمی ہے یا پولیس سے اس کا تعلق نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ ساسی صاحب نے کہا ”پھر اچانک ان کے چہرے پر ڈر کے ابتدائی آثار نمودار ہوئے ان کی کشادہ آنکھیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ وہ عرض آواز میں بولے ”تم کتنا چاہ رہے ہو؟“

”وہی جو آپ سمجھ چکے ہیں“ میں نے جواب دیا ”میں ایک پولیس آفیسر کی جان لینے کے مشن پر ہوں اور القرووس میں میری موجودگی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔“

ساسی صاحب کی حیرت میں کچھ اور اضافہ ہوا اور وہ عجیب لہجے میں بولے ”جو کتنا چاہتے ہو مکمل کرکو۔“ میں نے سہا لہجے میں کہا ”میں آپ ہی کے قتل پر مامور ہوں جناب۔“ پچھلے تین روز سے ایک لڑکی کے ساتھ یہاں موجود ہوں اور آپ سے ملنے کا موقع تلاش کر رہا ہوں۔“

میرے الفاظ کسی دھماکے سے کم نہیں تھے۔ ساسی صاحب کے ہونٹ سکڑ گئے اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ رنگ کر ریو اور سے قریب تر ہو گیا۔ میں ساسی صاحب کا پرستار تھا اور وہ میرے قدر دان تھے لیکن یہ موت اور زندگی کا معاملہ تھا اور اس سے میری بہن کی جان اور آہو بھی تھی تھ۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اگر ساسی صاحب مجھ پر قابو پالیتے تو میں یہ بازی ہار جاتا اور نتیجے میں زمانے بھر کی سختیاں میری بھول جیسی بہن پر چڑھ دوڑتیں۔ میں یہاں خود کو ساسی صاحب کے حوالے کرنے نہیں آیا تھا ان سے ایک ڈیل کرنے آیا تھا اور اس ڈیل کے دوران ہر حال مجھے واپسی کا راستہ کھلا رکھنا تھا۔ بے شک ساسی صاحب مجھے اس چمت تلتے امان دے چکے تھے لیکن خود کو سونی صمد ان کے رحم و کرم پر چھوڑنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

”باس ساسی صاحب“ میں نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا ”میں آپ ہی کے قتل پر مامور ہوں اور یہ بھی آپ جان چکے ہیں کہ یہ ذمہ داری اٹھانے پر کیوں مجبور ہوا ہوں۔ اب بتائیے مجھے کیا کرنا ہے اور میرا جو گناہ ہے وہ بھی مجھے تادیب دیجئے اگر اپنے جرائم کی سزا میں جیل کاٹنا میری ذمہ داری تھی تو کیا جیل سے باہر میری آہو کی حفاظت قانون کی ذمہ داری نہیں تھی؟ اگر کسی تو پھر میری بہن کیوں اغوا ہوئی۔ کیوں اس حرمانی قادر ذہن کے مشرت کدے میں پہنچی

پوری چاس کر بھی ان کے دل میں میرے لیے رحم کی رقت پیدا نہیں ہوئی تھی اور یہ جان کر بھی کہ قادر زماں اور شکر خرا جیسے لوگ میرے گرد منڈلا رہے ہیں انہوں نے مجھے احماد میں لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ موقع ملے ہی انہوں نے مجھے بے دست دیا کیا تھا اور اس نازک حالات میں پہنچا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جب وہ پہلی مرتبہ فیجر حسین سے ملنے کمرے سے نکلے تھے تو اسے کوئی اشارہ ہونے آئے تھے۔ نتیجے میں پولیس موقع پر پہنچ گئی اور جب میں کمرے سے نکلا تو دھڑلایا گیا لیکن اب ایک بات مجھے الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔ کمرے کے باہر مجھے دو بچے والے ساتھ پوش مقامی نہیں تھے۔ وہ سب کے سب میانوالی کی طرف گئے اونچے لمبے "دھول پائی" تھے اور بوتھ مگر قاری انہوں نے مجھے جن گالیوں سے نوازا تھا وہ بھی غیر مقامی لب و لہجے میں تھیں (کر قاری کے وقت اور پھر گاڑی میں میرے ساتھ کافی مامیت بھی کی گئی تھی۔ میرا گریبان اوڑھ کر تھا اور چہرے پر گہرے نکل تھے)

میں اس نازک لاک اپ میں قریب دو گھنٹے بند رہا۔ اس دوران کوئی انسانی صورت دکھائی دی نہ کوئی "ہتھ آواز" کاٹوں سے بھرائی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے غالباً تھیلا گلی کی کوئی مضائقہ والی چوٹی تھی۔ اجازت بیاپان اور منشی دو درجہ حرارت پر ہر فغانہ بنی ہوئی۔ مگر قاری کے وقت لباس اور جوتوں کے سوا ہر چیز میرے جسم سے علیحدہ کر لی گئی تھی۔ اس میں دستی گھڑی بھی شامل تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ نو ساڑھے نو کا وقت ہے لیکن دن کی روشنی بھی لاک اپ سے اتنی ہی دور تھی جتنی میرے جسم سے زندگی کی حرارت۔ مجھے یقین تھا کہ اس بجست بدبو دار لاک اپ میں حوالاتی ہو کر کوئی تشدد نہ کیا جائے تو بھی وہ ایک دو روز میں سب کچھ مارتا تو دل کر لیتا ہو گا۔

مجھے بڑے زور کا پیشاب لگ رہا تھا۔ کچھ دیر تو میں نے برداشت کیا پھر اندھی آواز میں "کوئی ہے۔ کوئی ہے" کی آوازیں لگنے لگے۔ تین چار منٹ کی مسلسل آواز دہکا کے بعد ایک انسانی چوہا دیکھا نصیب ہوا۔ اوپر کا اسی ہوئی نوکدار مونچھوں والا یہ ایک مرل سا سنتری تھا۔ وہ اپنی کرک دار آوازیں بولا تو میں لاک کو لٹے میں سے بائیں بھر پائی نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

"کون مر گیا ہے کیوں بین کر رہے ہو؟" اس نے گرج کے کہا۔

میں نے جواب دیا "بھئی تو کوئی نہیں مرا لیکن مر جائے گا۔" وہ بولا "یہ حالات ہے لالہ" یہاں بہت کچھ بھٹتا ہے ایک ہمارا اٹھانہ بٹھ جاسی تے کون ی قیامت آجاسی۔" "میرے لیے تو قیامت آجاسی" میں نے گرا کر کہا "دیکھو" میں تم سے دل لگی نہیں کر رہا۔ میں بہت تکلیف میں ہوں۔

"کیا دے سکتے ہو تکلیف رفع کرانے کا؟"

"ادنی سہلت دے سکتا ہوں" میں نے فراخ دلا۔

کہا "مطلب!" سنتری نے پوچھا۔

"نی الحال تو دعا میں دے سکتا ہوں" میں نے بات بد "ضمانت ہوگئی تو جو کو کمرے دے دوں گا۔" ایسے بڑا تڑپا حالات میں اکثر میری جس مزاج جاگ اٹھتی تھی۔

"دیکھو! یہاں رست مقرر ہیں" وہ سنجیدگی سے بولا "اپنے کے دور روپے" پیشاب پانچ روپے" بڑا پیشاب ایک بار مفت پھر ہر بار دس روپے لیے جاتے ہیں۔ خالی سرگرم (مگرٹ) آٹھ آنے" بھرا ہوا چار روپے لیکن یہ سارے رست نقد ہیں۔ ادھار بھی چلتا ہے لیکن بندہ اعتباری! چاہیے اور رست بھی ڈبل ہو۔"

"میں ڈبل رست دینے کو تیار ہوں اور اعتبار ابھی ثبوت کے کرنا ہو گا کیونکہ میری گاڑی چھوٹنے والی ہے۔" وہ شیطانی انداز میں مسکرایا۔ مجھ سے ایک قسم کی کسی نذر حسین کو آوازیں دینے لگا، کہیں قریب سے قدم کی ٹھک ٹھک ابھری اور ایک ہٹا کٹا ہڈ کا ٹیشیل راتہ بدوش آن پہنچا۔ اس کی آمد پر مرل سنتری نے ایک قز گھوٹنی سے چابیوں کا کچھا اتارا اور لاک اپ کا آٹا کھو۔

لگا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ انگلیوں کی پوہوں میں سنہاہٹ جاگ اٹھی جو مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیتی تھی۔ سنتری نے اپنے دستاویز ہاتھوں سے آٹا کھولا۔

کندی کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس وقت ایک گرج، آواز نے ہم تینوں کو گرہ بڑھایا۔

میں نے سراٹھار دیکھا، میرے سامنے ایک بڑے ساڑھے چھ فٹ جیلر عادل خاں کھڑا تھا۔ یہ وہی تھوڑا شخص تھا جس نے جیل میں نور محمد کی موت کے بعد مجھے کالو جانی کو بے طرح جینا تھا۔ بیشک کی طرح اس وقت بھی کی آنکھوں میں قہر اتر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک سنتری اور چند دوسرے پولیس والے تھے۔ وہ تیزی سے بڑھا اور مرل سنتری کو اپنے ہاتھ سے دھکیل کر دروازہ

"ہائل کے بچے ہو تم" وہ سنتری پر دھاوا "کس نے کہا تھا نہیں آٹا کھولنے کو" پھر وہ سنتری کی طرف گھوما بھینکا کر رہا تھا "تمہارا یہ سنتری؟ جانتے ہو کون ہے جسے باہر نکال رہے ہو تم؟"

سنتری نے قہر آلود نظروں سے اپنے سنتری کو گھورا۔ اس نے پہلے تو ایک لڑکا اپنا سیلیوٹ کیا پھر بھلا کر بولا "کہہ رہا تھا۔ بڑے زور کا۔" پیشاب لگا ہے۔

"اور تم اسے پیشاب کرانے کے لیے باہر نکال رہے تھے؟" عادل خاں نے طنز سے لمبے بات مکمل کی۔

"بچہ جی ہاں۔"

"یہ حرامی" تم سب کو اپنے پیشاب میں بہا کے بھاگ جانا" عادل خاں نے دانت پکپکائے۔

پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے دروازے کو دوبارہ آٹا لگایا اور کچھ دیر مجھے ارٹے مینے کے مانند گھومنے کے بعد سنتری کی طرف متوجہ ہوا۔ سنتری نے ایک رجسٹر عادل خاں کی طرف بڑھا دیا۔

جیلر عادل خاں نے کوئی تحریر پڑھنے کے بعد اس پر دستخط کیے اور نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھے خوف ناک ترین دھمکیاں دینے کے بعد باہر نکل گیا۔

میرا ذہن گھڑو دو کا میدان بنا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میری مگر قاری کیسے عمل میں آئی ہے اگر یہ سب سہا صاحب کا کیا دھڑا تھا تو پھر یہ جیلر عادل خاں آٹا ٹاٹا ایک نیل سے یہاں کیسے آن نکلا تھا اور وہ میانوالی کے ساہو کار۔ یہ معاملہ کچھ الجھا ہوا لگتا تھا۔ میں اس سردی

مارے لاک اپ میں دوسریک بیٹھا رہا اور خود کو بدترین حالات کے لیے تیار کر رہا۔ کسی قہری کمرے سے جو دم ختم آوازیں آ رہی تھیں ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ چند افراد میں کراہی بٹھ ہو رہی ہے۔ آوازیں میں عادل خاں کی آواز نمایاں ٹھک ٹھک گاہے گاہے وہ بھڑک کر زور سے بولنے لگتا تھا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ اس بحث میں ایک جیل کا ایک اور افسر بھی شریک ہے۔ ایک وفد کی شخص نے ٹرک کال کرتے ہوئے زور زور سے باتیں بھی کیں۔ اسی گفتگو میں میرا نام اور کسی اتھارٹی لیٹر کا ذکر آیا۔ دوسرے کے فوراً بعد حالات نے

پاک پک پک لگایا اور میں ایک بار پھر شہرہ رو گیا۔ ہماری قہقہوں کا باپ سنائی دی۔ مٹا چھ پولیس انسپکٹر سمیت تین چار افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں سہا صاحب بھی تھے۔ وہ اس وقت پینٹ کوٹ میں لمبوس تھے۔ ان کی نگاہوں میں مجھے اپنے لیے بڑی اچانیت محسوس ہوئی۔ لاغر سنتری نے لپک کر

میرے قفس کا دروازہ کھولا اور میں پر پھر پھڑا کر باہر آ گیا۔ میری سوالیہ نظریں سہا صاحب کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ "آؤ" انہوں نے ہور دی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ میں ان کے ساتھ چلا ہوا پولیس اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ یہاں تاریک شیشوں والی ایک بندوبست کھڑی تھی۔ میں سہا صاحب کے ساتھ اس اسٹیشن دین میں سوار ہو گیا۔ ٹھیک بندہ منٹ بعد یہ اسٹیشن دین ایک جنگل میں داخل ہو رہی تھی۔

○☆☆○

یہ نہایت خوب صورتی سے آراستہ ایک کانچ نما جگہ تھی۔ نشست گاہ کے شیشوں سے دور تک دادی کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ اس دادی کی ایک طرف تھیلا گلی اور دوسری جانب مری کی چوٹی نظر آ رہی تھی۔ دادی میں دور نیچے چلتی چھتوں والے لاکھڑا دکھاتے تھے اور ان کے درمیان ہرانی اور راستے کی بساط بھی ہوئی تھی۔ نشست گاہ میں الیکٹرک بیئر لگے تھے اور ان کی خوشگوار حرارت میں مجھے اپنی جسمانی چوٹیوں کی شدت کم محسوس ہونے لگی۔

سہا صاحب نے گالی کی چسکی لیتے ہوئے کہا "میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ابار منٹ سے نکلے ہی نہیں دو بج لیا جائے گا۔ یہ لوگ دراصل جنگ سے ہی تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ پہلے تمہیں جنگ کے اس ہول میں گرفتار کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا کہ تم نے سامنے لڑنے کے ساتھ ناشتا کیا تھا لیکن پھر تمہارے تعاقب کو طول دیا گیا۔ مری اور تھیلا گلی کے راستے میں کہیں پولیس پائی نہیں کھو بیٹھی۔ دراصل ان کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ بہر حال وہ مسلسل تمہاری تلاش میں رہے اور کل رات الفردوس میں انہوں نے تمہارا کھوج لگایا۔ ایک جیل کے جیلر عادل خاں ان تمام حالات سے باخبر تھے۔ رات الفردوس میں چھاپے کی عمرانی بھی انہوں نے خود کی۔"

میں سہا صاحب کی گفتگو کا بل اطمینان سے سنتا رہا۔ میری باری آئی تو میں نے صرف ایک فقرہ کہا "اب میرے لیے کیا حکم ہے جناب؟"

وہ بولے "حکم نہیں دیتا" ایک نہایت اہم مشورہ کرنا ہے تم سے۔

"قانون کے محافظ کا مشورہ مجرم سے! یہ کیسی بات کر رہے ہیں آپ؟"

وہ بولے "تم مجرم ہوئے تو اس وقت یہاں نظر نہ آتے۔ اسی حالات میں اسرار اور مگر زور سے ہوتے ہیں۔ اجماع ضمانت

پہنچیں یہاں لایا ہوں تو اس کا کوئی جواز ہے۔
 آپ کا یہ جواز بہت سے لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا جناب۔ آپ کو کس سے لیں گے؟
 یہ میرا معاملہ ہے، تم مجھ پر مجبور نہ ہو۔ بلکہ میرا خیال ہے ابھی ایک آدھ روز تک تم مکمل آرام کرو، کچھ دین سکون ہو تو پھر تسلی سے بات کریں گے۔
 وہی سکون اور تسلی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب۔ میری معصوم بہن اس درد کے کچل میں ہے۔ کاش آپ میری جگہ کھڑے ہو کر سوچ سکتے۔ کاش!۔
 سوچ رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں۔ جس کا معلوم میں کیا سوچ رہا ہوں۔ تسلی رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔
 سہی صاحب کے لیے میں یقین کی ایسی جھلک تھی کہ لمحوں میں مرجھانے والی کٹی میں جان دوڑ گئی۔ یقیناً وہ کوئی ایسی بات جانتے تھے جو میں نہیں جانتا تھا یا پھر وہ حالات کا وہ پولو دیکھ رہے تھے جو میری نگاہ سے اوجھل تھا۔ مجھے اپنی طرف سے مکمل سکون آرام فراہم کرنے اور ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ واپس چلے گئے۔ انہوں نے کہا کہ اب کل صبح ملاقات ہوگی۔ جاتے جاتے انہوں نے یہ بھی بتایا کہ انجم چوڑی ویر میں الفردوس سے یہاں میرے پاس پہنچ جائے گی۔

میں حالات کی اس تبدیلی پر حیرت تھا۔ یہ بات تو اب میرے ذہن میں صاف ہو گئی تھی کہ میری اچانک گرفتاری میں سہی صاحب کا کوئی ہاتھ نہیں تھا لیکن ابھی تک یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں واقعی دوبارہ چھوٹ گیا ہوں، میں کوئی معمولی حوالاتی نہیں تھا۔ میں ایک کوڑی عرب، شیخ راشد بن راشد کا قاتل تھا اور اس جرم میں طویل سزا بھگت رہا تھا۔ اب پھر میں نے "جیل توڑی" تھی اور باہر نکل کر دو بندے مزہ دانا بندھ کر لیے تھے (یہ اور بات ہے کہ میری اس کارروائی کا ابھی تک کسی کو علم نہیں تھا) اس کے علاوہ فراہم کے بعد وہ بندہ کاشییل حضرات کو زخمی کرنے کا الزام بھی میرے سر آچکا تھا۔ ایسی جارحیت کے ہوتے ہوئے سہی صاحب مجھے یوں پولیس اسٹیشن سے اٹھالائے تھے جیسے بارش کے آثار دیکھ کر باپ، بیٹے کو اسکول سے چھٹی کر لانا ہے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تھا تو پھر یقیناً ان کے سامنے کوئی نہایت اہم معاملہ تھا اور اس معاملے میں انہیں دیگر اعلیٰ افسران کی تائید و حمایت بھی حاصل تھی اس "مکو آپریشن" کے بغیر یہ

اس لائن پر سوچتے ہوئے میرا ذہن خود بخود شکر شکر طرف جانے لگا۔ کہیں۔ کہیں سہی صاحب مجھے اس شیطان کے مقابل تو نہیں لانا چاہتے۔ شکر شکر اچھے دھڑکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا کسی عام شخص کے بس کا دلو نہیں تھا۔ ماضی میں جن محدودے چند افراد نے اس کے سامنے خم ٹھونکنے کی جرات کی تھی اور اب تک حیات نے ان میں سے ایک ہاتھ میں بھی تھا۔ شاید میرے اسی ناچار تجربے سے فائدہ اٹھانے کے لیے مجھے اس برقاب لاک اپ سے نکال کر فرحت بخش حراست میں پہنچایا گیا تھا۔ حراست کے باوجود میری ریزہ کی ہڈی میں تنہا کٹی کی تمام خشکی لہریں دوڑ گئی۔ مہیا مجھے ایک مرتبہ پھر شکر شکر سے آنکھیں دکھاتا ہوں گی؟ یہ خیال سولہاں روح تھا۔
 ایک لمحے اپنے خیالات سے چونکنا چاہا۔ کانچ و دوازہ پر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ دوازہ ہونے کسی نے چوکیدار سے چند الفاظ کا تبادلہ کیا پھر حراست قدموں سے نفست کا وہ کی طرف آیا۔ قدموں کی چاپ ہاتھ تھی کہ یہ کوئی لڑکی ہے میں نے گھڑی دیکھی۔ سہی صاحب کو گئے ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ یقیناً یہ انجم ہی تھی۔ مہیا کے استقبال کے لیے تیار ہو گیا اور ذہن میں وہ الفاظ تازہ دینے لگا جو مجھے محضرت میں اس سے کہنے تھے۔
 دوازہ پر نازک سی دستک ہوئی۔ "نہم ان"۔

کہا۔
 دوازہ کھلا تو میں شدید رو گیا۔ انجم کے بجائے حور شام کی پری بیکر سامنے کھڑی تھی جس سے رات صاحب کے اپارٹمنٹ میں ملاقات ہوئی تھی۔ کچلے لباس میں وہ سرسبز و رنگین تھی۔ اس نے بیکی سر آستینیں چھرا رکھی تھیں۔ پاس میں جو کر تھے انہیں انٹراکٹر "السلام علیکم" کہا اور اندر آگئی۔
 "آپ یہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
 "جی ہاں" وہ بغور میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
 "میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آپ تو خود خدمت کے قابل نظر آ رہے ہیں۔ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ اس کی نگاہیں چہرے کے نیچوں اعضاء پر جمی ہوئی تھیں۔
 "میں سمجھتا ہوں" میں نے انجان بے ہوش ہوئے ہوئے "گلتا ہے" انہوں نے کافی مارا ہے آپ کو کاش کچھ نہ ہوا ہو نا۔"

وقت یہاں آگیا ہے تھا۔ کیا آپ نے ڈیڑی بے اجازت لی ہے؟
 "یہ میرا اور ڈیڑی کا معاملہ ہے۔ آپ صرف یہ بتائیں کہ آپ ہیں کون؟" لڑکی کے لیے میں میں ایجوکریٹو مخصوص شوخی اور خود سری تھی۔
 "میں آپ کے ڈیڑی کا ایک دیرینہ شاہناہ ہوں۔ میرا نام احسان الہی ہے اور مجرات سے آیا ہوں۔"
 وہ بولی "یہ تو وہ کوائف ہیں جو الفردوس کے رجسٹر میں درج ہیں۔ میں آپ سے اصل تعارف حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

"خالی آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہیں۔" اس نے پیڈ بیگ کھول کر اندر سے اخبار کے پندرہ انچ کے ٹکڑے ان تراشوں کو بڑی احتیاط سے کر کے رکھا گیا تھا۔ میں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ ان تراشوں میں میری تصویریں تھیں اور عرب شیخ کے کٹل کی تفصیلات تھیں۔ یہ سب کچھ قریب سات برس پہلے شائع ہوا تھا۔ لڑکی نے ایک تراشا کھول کر تصویر سامنے کی اور اس کا منوازہ میرے چہرے سے کرتے لگی۔ پھر تصویر میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی "دیکھئے۔ کس کی تصویر ہے؟"
 "آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟" میں نے سر دھری سے پوچھا۔

وہ ایک دم میرے قریب آگئی۔ اتنا قریب کہ اس کے کنارے بدن کی منک میرے منتھوں میں ٹھنسنے لگی اور مائوس کی حدت گردن سے ٹکرانے لگی۔ اس کا جسم چند انچ مزید پیش قدمی کرتا تو فاصلے کا تصور ختم ہو جاتا۔ وہ عجیب سے بالی سے میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے سر پھیرا اور بڑے اطمینان سے چلتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ کی آنکھوں پر رنگ دار لینس ہیں۔ اور بال بھی ڈائی کیے ہوئے ہیں" بڑے اعتماد سے اس نے اعلان کیا۔ میں نے اس صوفے پر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ مسکراتے لگی۔ ایسے میں اس کے دانت گھائی ہونٹوں کے درمیان انکار سے مارنے لگے۔ وہ تراشیدہ بالوں کو پیشانی سے جھٹک کر بولی "میرا خیال ہے" اب آپ کو مان لینا چاہیے کہ آپ ہی شاہ جہاں ہیں۔"
 میں نے دھڑائی سے کہا "میں کہہ چکا ہوں" آپ غلط فہمی کا شکار ہیں۔"
 وہ بولی "یعنی آپ نے طے کر لیا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے

ہاں میں نے نہیں۔ چلیں ایسے ہی سی۔ اگر آپ خود کو قریب دینا چاہتے ہیں تو دیکھ رہیں۔ ہاتھوں میں کیا رکھا ہے۔ میں آپ کو احسان الہی کہہ لوں گی" اپنے شوخ لہجے پر وہ خود ہی ہنسنے لگی۔

میں نے کہا "اگر آپ ڈیڑی سے پوچھتے بغیر آئی ہیں۔ تو میرے خیال میں" اب آپ کو رکنا نہیں چاہیے۔"
 "کیوں۔ مجھے آپ سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟" وہ بات کا رخ خواہ مخواہ دوسری طرف موڑ لے گئی "جناب احسان صاحب! خطرہ اس سے ہوتا ہے جو اجنبی ہو۔ دیکھا بھلا نہ ہو۔ میں تو آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ اودھ سو رہی" میرا مطلب ہے شاہ جہاں صاحب کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ شاید شاہ جہاں بھی اپنے بارے میں اتنا نہیں جانتے ہوں گے۔ میرے گھر میں اکثر ان کی باتیں ہوتی ہیں۔ ان کی کمائیاں سنائی گئی ہیں۔ ان کی بھادری، پناہ اور شرافت کے تذکرے ہوتے ہیں۔ میں چاہوں تو ان سے پوچھتے بغیر ان کی باریو گرائی لکھ سکتی ہوں۔"

تو میں نے کہا "لیکن یہ باتیں آپ مجھ سے کیوں کہہ رہی ہیں؟"
 "یوں ہی" وہ غمزوئی کو ہاتھوں کے بیالے میں ٹکا کر بولی "جو اچھا لگے اس کا تذکرہ کرنا بھی اچھا لگتا ہے۔ سچ پوچھئے احسان صاحب تو میں بہت امپریس ہوں شاہ جہاں صاحب سے۔ پتا نہیں کیوں وہ میرا آئیڈل بن چکے ہیں۔ بہت سوچتی ہوں ان کے بارے میں۔ دل چاہتا ہے کہ میں ان سے ملاقات ہو۔ گھنٹوں ان کے پاس بیٹھوں، پھر ان سے باتیں کروں۔ ان کے حالات سنوں ان کے تجربات سے "کین" کروں۔"
 میں دل ہی دل میں لاٹ مارنے لگا۔ بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت لگے پڑ گئی تھی۔ وہ کچی عمر کی نادان لڑکی تھی اور سہی صاحب کی بیٹی تھی۔ اس کے بارے میں ایسے ویسے خیال کا گزر بھی میرے دل میں نہیں ہو سکتا لیکن وہ اتنی بے باک اور صاف گو تھی کہ ان کی باتوں سے ڈر گئے گا تھا۔

میں نے ات اس کی عمر کا احساس دلانے کے لیے انداز خواہ کر بولا "تو کیوں بی" میں اگر اس کا کچھ میں ہوں تو اس کی کوئی وجہ ہے۔ سہی صاحب میری یہاں مزہ دہی کو چھپانا چاہتے ہیں، تمہارا یہاں آنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں تھا۔ اب یہاں اپنا وقت ضائع کر کے تمہاری غلطی کر رہی ہو۔"
 اس نے ناک پر ناک چڑھائی اور مزید تسلی سے بیٹھ گئی "جناب احسان صاحب! آپ مجھے اندر اسٹیٹ کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کا قصور نہیں شاید میری شکل ہی ایسی ہے۔

آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں کافی حد تک ذہین اور باخبر واقع ہوں۔ اس نے بڑی ادا سے گردن تائی۔
 باخبری کا دعویٰ سن کر میں نے بھی ہنستا بدلا "مثلاً کیا اطلاع ہے کہیں؟"

وہ مسکرائی "بہت اطلاعات ہیں بلکہ آپ اس وقت مجھے وزیر اطلاعات بھی کہہ سکتے ہیں لیکن منت سمجھئے کہ میں شہنشاہی میں آکر آپ کو کچھ بتا دوں گی۔ اوں ہوں۔ ناممکن میں بتا چکی ہوں آپ کو کہ باخبر ہونے کے علاوہ میں۔ ذہین بھی ہوں۔"

میرے تاثرات پھر گہری سنجیدگی میں داخل گئے لیکن اس سے پہلے کہ میں کوئی نکتہ فقہ اس کی طرف اچھا لایا خود ہی صوفے سے اچھل کر باہر نکل جاتا وہ تیزی سے بولی "نہیں۔ نہیں۔ اتنی باپوسی صورت مت بنائیے میں آپ کو اپنی معلومات سے آگاہ کرتی ہوں۔ دیکھئے مجھے پتا ہے کہ

آپ۔ اوہ سوری شاہ جہاں صاحب ایک نہایت۔ نہایت خطرناک "فائنڈر" ہیں۔ چار پانچ آدمیوں سے بیک وقت لڑنا اور ان کے ہاتھ پاؤں توڑ کر ایک طرف رکھ دینا شاہ جہاں صاحب کے بامیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ آپ نے امارت کے ایک شہزادے کو قتل کیا تھا۔ اس قتل کے بعد آپ کا بی عرصے روپوش رہے تھے یہ ہاتھ پاؤں توڑنے کا فن اسی عرصے روپوشی میں ہی آپ نے آپس سے سیکھا تھا اور پھر واپس آکر خاص دعام میں دھومیں مچائی تھیں۔ آپ کو عام لوگ استاؤ جہانی کے نام سے یاد کرتے تھے یہاں تک کہ۔۔۔

"کیا تم خاموش نہیں رہ سکتیں؟" میں نے سخت لہجے میں کہا "اس نے سینے کی ایکٹنگ کی اور قالین کے بیل بوٹوں کو گھورنے لگی۔"

وہ جان بوجھ کر گفتگو کا رخ اپنے من چاہے موضوع کی طرف موڑ دی گئی۔ چند لمحے خاموش رہ کر بولی "عجب بات ہے۔ آپ خود ہی سوال پوچھتے ہیں اور جب جواب دیا جاتا ہے تو بکرجاتے ہیں۔ آخر چاہتے کیا ہیں آپ؟"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اس جہت سے متا چھوڑ دیں" میں نے بڑی واضح بے رخی سے کہا۔

"ارے" آپ تو جیج ناراض ہو گئے "وہ چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولی "اچھا یہ ٹھیک ہے۔ اب ہم سنجیدہ گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن جناب! یہ باتیں ہم دونوں کے درمیان رہنی چاہئیں قطعی طور پر۔"

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بیل کر صوفے سے اٹھی اور کمال دلیری سے کمرے کا دروازہ

بند کر کے اندر سے کندی چڑھا دی پھر بند کر دیوں پر ایک نظر ڈالا۔ کرے تھکی سے میرے سامنے آئی۔

"شاہ جہاں صاحب۔ ارور احسان صاحب! اپنی باخبریاں آپ کو کونوالی گئی تو آپ شہنشاہ کرہ جائیں گے۔" بولی "فی الحال یہ جان جائے کہ بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ میں آقا قادر زباں، شکستہ عرف شہنشاہ اندرین ایجنٹ شکر شکر اور آپ کی ساسھی انجم و فدیہ کے بارے میں پیچہ چیدہ اور ضروری ضروری ساری باتیں جان چکی ہوں۔ پورے کے پورے حالات میرے سامنے ہیں، آنے والے واقعات کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھینچا ہوا ہے۔ جی ہاں میں بتا چکی ہوں بڑی خراش لڑی ہوں میں۔ پتا نہیں کیسے کیسے میری چھٹی جس مجھے بہت سی باتوں کا پتا دے دیتی ہے۔"

میں جیج حیران ہو گیا اور تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے یوں آہنی پائنی ماری کہ جوتوں کے ٹکڑے صوفے اور اس کی شلوار سے دور رہے۔ بڑی لگ تھی اس کے خونخیز منتوں میں۔ واہنی کسنی واہنی ران پر رکھ کر اس نے ٹھوڑی پھیل کر لٹائی اور بولی "پاپا مجھ سے ہر معاملے میں گفتگو کرتے ہیں۔ چند روز پہلے انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ خلق جنگ کے دو تین بڑے زمینداروں کے خلاف ایکشن ہونے والا ہے۔ اس سلسلے میں اوپر کی سطح پر تیاری ہو رہی ہے اور جلد ہی چھاپے پڑیں گے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ یہ زمیندار اپنے اپنے علاقے میں بہت بااثر اور خود سر ہیں۔ ان کے خلاف انتظامیہ کو مسلسل رپورٹ مل رہی ہیں۔ اب میں نے اندازہ لگایا ہے کہ ہونے ہوا ان زمینداروں میں قادر زباں بھی شامل ہے۔" اس نے رک کر میرے تاثرات کا جائزہ لیا اور بولی "بلکہ۔ میرا خیال ہے میں آپ کو بتاؤں دوں کہ ان میں قادر زباں بھی شامل ہے۔ قطعی انتظامیہ ان زمینداروں پر بڑا بڑا ہاتھ ڈالنا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں پچھلے کئی ماہ سے ہوم ورک جاری تھا۔"

میرے دل میں اندیشہ کی کوئل پھونٹنے لگی۔ شاید میں بتانا بھول گیا، ساسی صاحب کی صاحب زادی کا نام فریال تھا۔ فریال کی باتوں میں وزن تھا اور لہجے سے دانائی بھٹک رہی تھی۔ اس گہری وہ مجھے واقعی بہت باخبر، ردا نشوہ لگی۔ اپنی سوچنی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ کر بولی "یہ اپنے شاہ جہاں صاحب گرفتار بلا ہونے کے باوجود کافی قہم غموس ہوتے ہیں، میرا خیال ہے ہو کام وہ سخت عذاب بھیل کر بھی نہ کر سکتے وہ یوں پنکھوں میں ہونے والا ہے۔ جب زباں

صاحب کا تختہ ہی الٹ جائے گا تو نہ قید خانہ رہے گا اور نہ قیدی۔ شاہ جہاں صاحب کی بسن اور ہماری باقی یوں حویلی سے نکلے گی جسے گھن میں سے وہ کیا نکل آتا ہے؟۔ ہاں بل۔ بل۔ بل۔۔۔" وہ بچہ کھٹے کھٹے چپ ہو گئی۔

"کیوں کیا؟" میں نے پوچھا۔
 وہ ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی "ایک تو معینیت یہ ہے کہ میں ذہین بہت ہوں۔ میرا دماغ ہر وقت درودور کی خبریں لاتا رہتا ہے۔ پتا نہیں آپ سمجھیں گے کہ میں میری بات؟"

"ہاں۔ ہاں سمجھاؤ۔ میں سمجھنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ بولی "آپ تعین کریں، ذہین ہونا ایک بہت بڑی معینیت ہے۔ ذہانت تو رہی ایک طرف، نری یادداشت ہی تیز ہو تو بہت بھاری ہو جاتا ہے۔ وہ شعر تو آپ نے سنا ہوگا کہ یاد باطنی عذاب ہے یا رعب۔ پچھن لے مجھ سے حافظہ میرا میرا بھی کچھ کی حال ہے۔ اب یہ جا کر اور قادر زباں والا معاملہ ہی دیکھیں۔ مجھے نہ جانے کیوں دوسرے گھبر رہے ہیں۔ لگتا ہے یہ بیل "وہ" نہیں چڑھے گی۔ آپ سمجھ رہے ہیں نامیری بات؟"

میرا ذہل سر پینے کو چاہ رہا تھا۔ معلوم نہیں کس قاتل کی لڑی تھی۔ کبھی لگتا تھا پاگل ہے۔ کبھی پاگلوں کی ڈاکٹر لگتی تھی۔ اچانک ہی وہ چونک کر "پاپا ارے میں" اس نے گھبراہٹ بولی "آواز میں سرگوشی کی۔ میں نے بھی کان لگا کر بیلے تو کوئی آواز نہیں آئی پھر کافی فاصلے پر انہی کی مدھم ٹھٹھاہٹ سنائی دی۔

"اوہ مائی گاڈ۔ وہ تو میری چینی کویں گے" وہ صوفے سے اٹھ کر کمرے میں ناچ گئی۔ پھر دانتوں میں انگلی دب کر بولی "شاہ جہاں صاحب۔ سوری احسان صاحب! میں ہاتھ روم میں گھس جاتی ہوں۔ میرا خیال ہے، وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہریں گے شاید کمرے کمرے ہی چلے جائیں۔ آپ بالکل خاموش رہیں میرے بارے میں۔ اوکے؟" اس نے لپک کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ ساسی صاحب کی سرخ گاڑی اب بین گیت میں داخل ہو رہی تھی۔ پردہ چھوڑ کر وہ تیزی سے ہاتھ روم کی طرف گئی۔ پھر اپنا رک رک پریشانی پینے لگی "اوہ مائی گاڈ۔ اوہ مائی گاڈ۔ نری چند ہوں میں۔ گاڑی تو میری باہر کھڑی ہے، چھپنے سے فائدہ ڈرانا ہے آپ چھپنے سے کیا فائدہ؟"

اس طوفانی لڑکی نے گھوم میں مجھے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ ٹھوڑی دیر وہ سانس کھڑی رہی۔ اس کی بلوری آنکھیں عطلوں میں تیزی سے گردش کر رہی تھیں، پھر جلدی سے مجھ پر چلی۔ اس کی ایک ذہنی لٹ میرے رخساروں کو چھو گئی

"کیسے! میری آپ سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ مجھے پتا ہی نہیں تھا، آپ یہاں ہیں۔ میں یہاں ایک ٹرک کال کرنے آئی تھی۔ بس۔ کچھ آپ یہ میگزین پڑھئے میں یہاں بیٹھ کر فون کرتی ہوں۔ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟" مجھے میگزین سمجھا کر وہ جلدی سے فون کے سامنے جا بیٹھی۔ دوتین ہندے ڈاکل کیے پھر ٹوک کر ہاتھ پینے لگی "اوہ گاڈ۔ اوہ مائی گاڈ۔ دیکھی آپ نے میری عقل؟ دروازے کی چٹنی گرائی ہی نہیں مہا سلوک ڈراما کر رہی ہوں۔"

بھاگ کر اس نے چٹنی گرائی اور دوبارہ فون کے سامنے آ بیٹھی۔ اس دوران ساسی صاحب گاڑی سے باہر آچکے تھے۔ چوکیدار سے باتیں کرتے ہوئے وہ کمرے کی طرف پڑھے دروازہ کھولا اور ان کی نگاہیں فریال پر جم گئیں۔ بڑے کمال کی ریکڑیں دھڑکتے ہوئے انہماک سے فون پر جگا رہی تھی کہ شائبہ اعظمی بھی دیکھتی تو چکر جاتی لیکن جو انداز آیا تھا وہ بھی اس کا باپ تھا۔ ساسی صاحب ہانک اور منہ سے سرگیت کا دھواں چھوٹے ہوئے چند لمحے بنوڑ پٹی کا جائزہ لیتے رہے۔ ان کے چہرے پر مصنوعی سنجیدگی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ فریال نے باپ کی طرف دیکھا تو ڈاکل سے انگلی نکال کر کھڑی ہو گئی۔

"وہ میں فون کرنے آئی تھی پاپا۔ نوٹیشن کی رتھ ڈے تھی نا آج۔ سوچا۔ چلو۔"

ساسی صاحب بھاری آواز میں بولے "مجھے تو نے نی صد تعین تھا کہ آج کسی وقت تم یہاں ضرور آؤ گی۔ کسی نوٹیشن کو فون کرنے کسی شائستہ کو بیلو بیلو کئے یا کسی آہنی کی خیریت پوچھنے۔"

"جی۔ جی۔" وہ ہٹکائی۔

"چلو پھر اب کھک جاؤ یہاں سے ورنہ پٹ جاؤ گی۔"

"پہلے آپ دروازہ تو چھوڑیے پاپا۔"

"یہ لو چھوڑنا" وہ ایک طرف ہٹ گئے۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر دروازے تک پہنچی پھر ایک دم لپک کر باہر نکل گئی۔ ساسی صاحب کی گھٹی موچھوں تلے غیر محسوس مسکراہٹ کھیل گئی۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے بولے "اس نے ہمیں زیادہ تک تو نہیں کیا؟"

"جی نہیں۔ میرا مطلب ہے، کچھ اتنا زیادہ نہیں۔"

"بہت ذہین لڑکی ہے۔ کل رات ہمیں ایک نظردیکھ کر پہچان گئی تھی۔ نوٹوائٹ کی طرح حافظہ ہے اس کا۔ اور بھی بہت خوبیاں ہیں لیکن ایک غامی نے سب کا ستارہاں کر رکھا ہے۔ غیر سنجیدہ بہت ہے۔ بندے کا ناک میں دم گرتی ہے۔"

ہم تو خیر عادی ہیں لیکن باہر کا فضا ہو کھلا افسانہ ہے۔
 "لیکن میرے ساتھ تو افسانے سے ہی پیش آئی ہیں۔"
 "ہاں۔۔۔" وہ کچھ چونک کر کہے "تمہاری بات اور
 ہے تم سے عاتقانہ بہت متاثر ہے وہ۔ اور اس کی وجہ۔
 شاید میں خود ہی ہوں۔"
 "میں کچھ سمجھا نہیں۔"

سای صاحب کا چہرہ ایک عجیب سی دھند میں چھب گیا۔
 کھوئے کھوئے لہجے میں بولے "اسے تمہاری ساری کہانی
 معلوم ہے اکثر مجھ سے سوال ہو جیتی رہتی ہے اگر میں غلط
 نہیں سمجھ رہا تو تم اس کا آئینہ مل لو لیکن میری اس بات کا
 کوئی دوسرا مطلب ہرگز نہیں۔ میں ہنس کے ذہنی رویوں سے
 پوری طرح آگاہ ہوں۔ وہ اندر سے بے حد معصوم اور سادہ
 ہے۔ چند برس پہلے اس نے میری زبانی تمہاری کہانی سنی
 تھی۔ یہ کہانی اس کے ذہن میں بیست ہو گئی۔ اور اب تک
 بیست ہے۔ وہ اکثر تشاؤ کرتی تھی کہ وہ گفتگو اور شاہ جہاں
 سے ملنا چاہتی ہے۔ میں کبھی تھا کہ اگر کوئی موقع آیا تو ضرور
 ملواؤں گا۔ کل وہ موقع آیا لیکن اس طرح کہ میں تمہارا
 تعارف اس سے کرانے کی بہت نہ کر سکا۔ تم مجھ پر دیوالیہ
 تان کر میرے اپارٹمنٹ میں محسوس تھے اور مجھے کچھ معلوم
 نہیں تھا۔ کس ارادے سے آئے ہو۔ اس کے ذہن میں
 تمہارا جو ایجنڈا بنا ہوا ہے وہ میں براد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے
 اسی وقت سے یقین تھا کہ اب وہ بچی نہیں بیٹھے گی اور تمہارا
 حدود اربعہ جاننے کی کوشش ضرور کرنے کی۔ دیکھ لو تم اس
 کی ہوشیاری۔ اس کا بیج میں وہ اس سے پہلے صرف دو مرتبہ
 آئی ہے اور وہ بھی رات کے وقت۔ اب وہ تمہاری تلاش
 میں نکلی ہے تو سیدھی یہاں پہنچی ہے اور مجھے سو فی صد یقین
 ہے کہ میں تمہیں کہیں بھی رکھتا۔ وہ ایک دو روز میں تم تک
 پہنچ جاتی۔"

میں حیرانی سے ساسی صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ کہاں
 میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاید ساسی صاحب مجھے نہ پہچان سکیں
 اور کہاں ان کی دختر نیک اکثر مجھے پہلی نگاہ میں پہچان چکی
 تھی۔ ساسی صاحب کچھ دیر فریال کی باتیں کرتے رہے۔ ان
 کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ محروم بیڑ میں پڑتی ہے۔ انٹرمیڈیٹ
 کے امتحان میں اس نے شلے میں چلی اور صوبے میں دو مری
 پوزیشن حاصل کی تھی ریاضی اور الجبرا وغیرہ کے مضامین میں
 اسے جران کن و سٹرس حاصل ہے۔ اس کے علاوہ وہ کالج کی
 ہاکی ٹیم کی کپتان ہے اور قومی سطح کے کئی مقابلوں میں حصہ
 لے چکی ہے۔

فریال کے مختصر تعارف کے بعد ساسی صاحب اس
 موضوع پر آگئے انہوں نے جاگیردار کا دور زماں کا ذکر کیا
 مجھے رازداری کا پابند کر کے دی باتیں تھیں جو اس سے پرا
 فریال بتا چکی تھی۔ انہوں نے جاوید درانی نامی ایک اہل
 پولیس افسر کا ذکر بھی کیا اور بتایا کہ یہ نوجوان افسر حال ہی
 میں انگلینڈ سے ٹرننگ لے کر واپس آیا ہے۔ اس کے عرائض بہت
 بلند ہیں اور وہ پنجاب کے دیکی علاقوں کو برہمن کے جرائم
 پاک کرنے کا عزم کیے ہوئے ہے۔ وہ غلطی سے بڑا جڑو حرکت کرنے
 کے بجائے سرکردہ لوگوں پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے اور اس سلسلے
 میں اس نے بہت اچھی طرح ہوم ورک بھی کیا ہے۔ ساسی
 صاحب اس کارروائی کو میری خوش قسمتی پر معمول کر رہے تھے
 اور انہیں یقین تھا کہ گفتگو کو اس جاگیردار کے جنگل سے بغیر
 کسی دشواری کے نکالا جائے گا۔

میں نے دونوں الفاظ میں کہا "ساسی صاحب" میں پہلے
 بھی کہہ چکا ہوں گفتگو سے بڑھ کر مجھے اس دنیا میں کوئی عزیز
 نہیں۔ اسے کچھ ہو گیا تو خدا گواہ ہے میں بھی نہیں رہوں
 گا۔ مجھے سب سے معلوم پولیس کا دور زماں کے خلاف کس قسم کی
 کارروائی کرنا چاہتی ہے لیکن جہاں تک میں نے اندازہ لگایا
 ہے اس پر کیا ہاتھ ڈالنا پولیس اور انتظامیہ کے لیے بے حد
 نقصان دہ ثابت ہوگا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے میں پورے
 تین ہفتے اس حوالی میں رہا ہوں۔ وہاں کے بہت سے خوب
 و فراز میں نے دیکھے ہیں۔ اگر آپ کسی طرح مجھے جاوید درانی
 صاحب سے ملا سکیں تو ممکن ہے میں انہیں کوئی کام کی بات
 بتاؤں۔"

ساسی صاحب نے کہا "ابھی تمہاری دیر پہلے ٹیلی فون پر
 میری ایس بی جاوید سے بات ہوئی ہے۔ وہ اس وقت اسلام
 آباد میں ہے۔ میں نے اس سے تمہارا ذکر کیا ہے اس کا بھی
 یہی خیال ہے کہ تم سے ملا جائے کل دوسرے میں مری جاوا
 ہوں۔ میرا خیال ہے تم بھی میرے ساتھ چلو۔ مری سے
 اسلام آباد ایک گھنٹے کا راستہ ہے۔ ہم جاوید کے پاس ایک
 مگنا بیٹہ رکھیں تو بچے تک واپس آجائیں گے۔"

میں نے ان کی باتوں میں ہاں ملائی۔ بیٹے میں عجیب الجھل
 سی محسوس ہوئی تھی۔ ساسی صاحب کے پاس آتے ہوئے میں نے

نہیں کیا تھا کہ قادر زماں کے بارے میں کسی ایسی
 تصور بھی نہ تھا۔ میں اسے امداد نہیں ہی قرار دے سکتا تھا۔
 بات کا پتہ چلے گا۔ میں اسے امداد نہیں ہی قرار دے سکتا تھا۔
 "فصل جو اپنے اثر و رسوخ میں پڑا تھا ایک ہونچال کی زد
 میں آئے والا تھا۔ وہ اب تک بے کس لوگوں کی زندگیوں
 سہارہ کرتا رہا تھا لیکن یہ سب کچھ کیسے ہو سکے گا؟ مجھے یقین
 ہر قسم کا نہیں تھا۔ اس رات میرے دل کی کیفیت
 کچھ عجیب سی رہی۔ دل چاہ رہا تھا کہ کسی اعلیٰ و ارفع ذات
 سے اظہار تشکر کروں۔ اپنے رشتہ داروں کو آنسوؤں سے
 جگہوں اور اپنے آلام سے چھٹکارے کے لیے کسی کے
 سامنے دست دعا پھیلاؤں۔

میں دیر تک جاگتا رہا اور گھنٹوں میں سو رہے بیٹھا رہا۔
 نہ جانے کس وقت نیند آگئی۔ نیند کے دوران میں کسی وقت
 جاگا تو پتا چلا کہ انجم بھی آچکی ہے۔ وہ میرے قریب ہی
 صوفے پر خاف اوڑھے سو رہی تھی۔ میں نے اسے جگانا
 مناسب نہیں سمجھا اور دوبارہ گہری نیند سو گیا۔ اس دھند سوا
 تو بھر خوش رویا۔ دن چڑھے ملازم ذوالفرین ناشتے کے لیے
 جگانے آیا لیکن میں نے کہا ہے کہ نیند کو تیرج دی۔ دوسرے کو خود
 بخود آگے چل گئی۔ دیوار گیر کمرہ گزروں کی دوسری جانب منظر لا
 ہوا تھا۔ کل شام سہری دھوپ چمک رہی تھی اور پتلیوں
 سبیل تک دواں اور پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ اب چند
 گز دور کے منظر بھی دھندلے نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف
 دھواں دھواں بادل تھے اور ہرف کی باریک ہموار گردہ
 تھی۔ پہاڑوں کے موسم ایسے ہی میلانی ہوتے ہیں۔ پانی نیم
 گرم تھا بلکہ ٹھنڈا ہی تھا۔ جی کڑا کر کے شل کیا۔ ہاتھ روم
 سے نکلا تو سیر کر کر کر کہاں اور کالی کے برتن چنے تھے
 قریب ہی انجم بظلمت میں ہاتھ دیے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس
 نے فرکا کھالی کوٹ پہن رکھا تھا۔ کوٹ کی رنگت نے
 رشتہ داروں پر ہنس بھرا ہے شلے رخ کر دیا تھا۔ اس کے
 چہرے کی طمانیت ظاہر کرتی تھی کہ اب وہ درد کے شلے سے
 آزاد ہے۔ میز پر بچے ہوئے برتنوں سے پتا چلا کہ انجم کے
 علاوہ بھی کوئی کھانے میں شریک ہوگا۔ یہ میرا فحش کون
 ہو سکتا تھا؟ یقیناً ساسی صاحب۔

میرا قیادہ درست نکلا۔ چند لمحوں بعد ساسی صاحب
 دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے بغلی دروازے سے برآمد
 ہوئے میں نے انہیں سلام کیا۔ وہ سر کے اشارے سے
 جواب دے دیے۔ کھانے کی میز پر آئے۔ بڑی جلدی میں
 نظر آتے تھے۔
 کھانا کھاتے ہوئے انہوں نے کہا "ہمیں دو بجے تک

روانہ ہو جانا چاہیے۔ موسم خراب ہے۔ مری بیٹے میں کافی
 وقت لگے گا۔ وہاں بھی ایک آدھ گھنٹے کا کام ہے۔ میرا چاہتا
 ہوں کہ بجے تک ہم اسلام آباد پہنچ جائیں۔ جاوید درانی
 وقت کا بہت پابند ہے۔ ان دنوں تو وہ مصروف بھی بہت ہے۔
 بڑی مشکل سے وقت نکالا ہے اس نے۔"

کھانے کو "برنج" کتنا زیادہ مناسب تھا۔ اس میں ناشتے
 اور لچ کی مشترکہ خصوصیات تھیں۔ غالباً یہ اہتمام میرے
 لیے ہی کیا گیا تھا۔ جو اس اور انڈے کے علاوہ چکن پلاؤ، مٹاؤ
 اور قورمہ بھی موجود تھا۔ بھوک چکی ہوئی تھی۔ میں نے
 جلدی جلدی لیکن میرا ہور کھایا۔ میز سے اٹھتے ہی ہم جانے
 کے لیے تیار ہو گئے۔ پوسٹ میں رنگ دار شیشوں والی اسٹیشن
 دین تیار کھڑی تھی۔
 میں نے انجم کو قتل تفتی دی اور جلد ہی آنے کا کہہ کر
 بڑے سبیل و دلی دین میں آہٹا۔ ذرا سیر کرنے پہلے ہی سے بیڑ
 آن کر گیا تھا۔ دروازہ پر ملتی فضا میں آتے ہی ہماری نقلی جم
 جاتی۔ قریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے دن ایک دوسرے
 عمارت کے سامنے رکی۔ اوور کوٹ میں لمبوس ایک اور
 صاحب ٹاک سے دھواں اڑاتے اور ہونٹوں سے "سی سی"
 کی آوازیں نکالتے دین کی طرف لپکے۔ ایک ملازم نے ان
 کے سر پر چھاتے کا سایہ کر رکھا تھا۔ یہ صاحب مجھے صورت
 سے ہی پولیس آفیسر نظر آ رہے تھے۔ اگلے چند منٹوں میں یہ
 اندازہ صوفید درست ثابت ہوا۔ ان کا نام غالباً غلام
 عباس قسم کا تھا۔ عمدے کے لحاظ سے یہ ایس بی تھے اور ان
 کا تعلق بھی ساسی صاحب کی طرح گلہ نیش خانہ جات سے
 تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی اسلام آباد جا رہے تھے۔ دونوں
 آفیسروں کی آپس میں بے تعلقی تھی۔ حوالیہ ذیروہ اور دوسرے
 کی باتیں کرتے رہتے۔ پھر ساسی صاحب نے انکشاف کیا کہ گوجر
 خان میں آج کوئی ملازم فوت ہو گیا ہے۔ ملازم کی اصطلاح
 ساسی صاحب نے سرکاری افسر کے لیے استعمال کی تھی۔
 غلام عباس صاحب چونک گئے "کون فوت ہوا؟"
 "یہ پتا نہیں چل سکا لیکن ہوا ضرور ہے۔ مجھے کیا راج
 کر چپاس منٹ پر اسلام آباد سے کال آئی تھی۔ بیڑ کو وارڈ
 سے رمضان پراچہ بول رہا تھا۔ موسم خراب ہے۔ آواز
 صاف نہیں آ رہی تھی۔ پہلے وہ اپنی پدموشن کی بات کرتا رہا
 پھر "فونکی" کا ذکر کیا تھا کہ لائن کٹ گئی۔ میں نے بعد میں
 پندرہ میں منٹ کوشش کی لیکن رابطہ نہیں ہوا۔ لائنیں ڈیڈ
 پڑی ہیں۔"
 "اوہ۔ پتا نہیں کس کا بلاوا آیا ہے؟" غلام عباس صاحب

نے اٹھارہ افسوس کیا، پھر ذرا چونک کر بولے "لیکن بھی یوں تو ہمارا پروگرام بھی درہم برہم ہو جائے گا کوئی اہم لازم ہے تو یقیناً جاوید درانی بھی گرج خان گیا ہوگا۔"

سای صاحب نے کہا "ہاں اس بات کا خدشہ تو ہے لیکن جاوید مقررہ وقت پر اسلام آباد پہنچنے کی پوری کوشش کرے گا۔ اگر بندہ رات کو فوت ہوا ہے تو یقیناً طرک جنازہ ہو جائے گا۔"

غلام عباس صاحب اس صورت حال سے مطمئن نظر نہیں آتے تھے بولے "یار! میرا تو خیال ہے اس خراب موسم میں نہ ہی جائیں۔ فون ہو جاتا تو یہی بات تھی۔ اب معلوم نہیں وہاں کیا صورت حال ہے۔"

سای صاحب اپنے سامع کی رائے سے ہرگز متفق نہیں تھے انہیں یقین تھا کہ جاوید درانی نے جو وقت دیا ہے اس پر ضرور ملے گا چاہے اسے اپنے دس پروگرام کیسٹل کرنا پڑیں۔

ایک رات راستے میں سای صاحب اور غلام عباس صاحب میں مسلسل اس معاملے پر بحث ہوتی رہی۔ سای صاحب 'جاوید درانی کو وعدے کا پابند ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے جبکہ غلام عباس صاحب اس کی مخالفت میں بول رہے تھے۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ جاوید درانی اپنی طاقت سے ادنیٰ پرواز کرنے کی کوشش کر رہا ہے وہ قاتل ضرور ہے لیکن اپنی قابلیت کو بے کار سمجھتی میں صرف کر رہا ہے۔

غلام عباس اور سای صاحب میں ہونے والی گفتگو کے سبب مجھے جاوید درانی کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں۔ وہ پاک تین شریف کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ حافظ قرآن بھی تھا۔ چند برس پہلے اس کا چھوٹا بھائی جو زبان سے معذرت تھا، کم ہو گیا تھا۔ بہت تلاش کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ پولیس کا خیال تھا کہ وہ خود ہی کسی طرف نکل گیا ہے جبکہ اہل خانہ اس گمشدگی کی وجہ دشمنی قرار دے رہے تھے مخالف پارٹی زور آور تھی۔ انہوں نے جاوید درانی اور اس کے اہل خانہ پر جو ای بے کرنا دے۔

یعنی مکی لڑم بن گئے۔ جاوید درانی کے بھائی کا سراغ ملنا تو رہا ایک طرف 'انہیں اپنی جان چھڑانا مشکل ہو گئی۔ جاوید درانی کے بڑے بھائی کو نیل جانا پڑا اور جاوید کی بیویوں کے رشتے ایک ساتھ ٹوٹ گئے۔ انہی حالات میں جاوید کو ماں جیسی شفقت ہستی سے بھی محروم ہونا پڑا۔ ان ضمن حالات نے جہاں جاوید درانی سے بہت کچھ چھینا وہاں آگے بڑھنے کا عزم بھی لیا۔ اس نے پولیس آفیسر بننے کی غمائی اور آخر اس خواب کو

حقیقت کا دوپ دینے میں کامیاب رہا۔ نہ صرف وہ پولیس آفیسر بلکہ اعلیٰ تربیت کے لیے بیرون ملک بھی گیا اور اب اپنے گھنے میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔

مری پتختہ پر ہمیں معلوم ہوا کہ یہاں شدید برف بار ہوئی ہے اور سنی چٹیک سے آگے راستہ بند ہے۔ اس مطلب تھا کہ اگر ہم مری جانا چاہتے ہیں تو گاڑی سے اتر کر پیڈل مارچ کریں۔ اس لامحدود سڑکی اور محدود وقت میں ہمارے لیے یہ ممکن نہیں تھا لہذا فیصلہ ہوا کہ مری کا پروگرام منسوخ کیا جائے اور سیدھے اسلام آباد کا رخ کیا جائے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہماری گاڑی اسلام آباد میں داخل ہوئی اور چند کشادہ سڑکوں سے گزر کر ایک لمبائی آبادی میں چکی گئی۔ ایک جگہ گاڑیوں کی چھوٹی سی قطار میں اسٹیشن دین رکی۔ سای صاحب اتر کر ایک طرف بڑھ گئے۔ ایک جاوید درانی کی رہائش گاہ تھی۔ سای صاحب مجھے اندر لے جانے سے پہلے صورت حال کا جائزہ لینے گئے تھے ان کی دایہی ہر خاطر خواہ تاخیر ہوئی۔ ہم شدت سے انتظار کر رہے تھے قریب دس منٹ بعد وہ واپس آئے وہ اسٹیشن دین میں داخل ہوئے تو ہم ان کا چہرہ دیکھ کر چونک گئے وہ دور سے تھے۔

"کیا ہوا سائی؟" غلام عباس صاحب چلا کر بولے "ذرا نیور بھی ہکا بکا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔"

"تم ٹھیک کر رہے تھے عباس" سای صاحب نے روتے ہوئے کہا "ہمارا آٹا بے کار گیا۔ جاوید درانی ہمیں نہیں مل سکے گا وعدے کا جھوٹا نکلا۔"

میرے دل پر ایک گھومنا سا لگا۔ آگے کی بات میں سای صاحب کے کے بغیر سمجھ رہا تھا۔ جاوید درانی اب اس دنیا میں نہیں تھا۔ یہ خیال برقی کی طرح میرے ذہن میں کونہ گیا کہ یہ کب وہ شخص ہے جس کی موت کی ادھوری اطلاع آج صبح ملی۔ ذہن پر سنی گئی تھی۔ غلام عباس اور سای صاحب انرا تقری کے عالم میں دین سے نکلے اور اس سفید گھٹ والے مکان کی طرف بڑھ گئے جس کے سامنے کاروں کی ایک طویل قطار لگی نظر آ رہی تھی۔ ان کے پیچھے ہی پیچھے ذرا نیور بھی باہر نکل گیا۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ آٹا فنا یہ کیسی کایا پلٹ ہوئی تھی۔ وہ جو ان پولیس آفیسر جس کا دل خدمت کے جذبے سے سرشار تھا جو جرائم کے بڑے بڑے بت توڑنا چاہتا تھا اور طویل منصوبوں سے یس ہو کر میدان میں آیا تھا، آٹا جگ سے پہلے ہی چٹکا چور ہو کر ڈھیر کیا تھا۔ میرا سینہ غم سے لبرزد ہو گیا۔ نہ جانے کہاں دل کے کسی گوشے سے آواز آنے لگی "اس شخص کو مرنا ہی تھا آج نہ مرنا تو کل مرنا۔ اس نے خود اپنے لیے موت کا راستہ چنا تھا۔ خیالات کا کارہا کچھ اور گہرائی میں چلا گیا۔ ذہن میں یہ سوچ ابھرنے لگی۔ کہیں وہ کسی سازش کا شکار تو نہیں ہوا۔ یہ بات بظاہر ناممکن تھی لیکن ایسا ناممکن بھی نہیں تھی۔ جرم و سزا کی دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ انہوں نے ہونیاں بن جاتی ہیں۔ یہ حادثہ بھی درست قاتل کا شاخسانہ ہو سکتا تھا۔ اچانک میری ساعت میں فزائل کا کہا ہوا ایک فقرہ گونجنے لگا۔ کل کتنی آسانی اور روانی سے اس نے ایک پیش گوئی کر دی تھی۔ اس 2. کہا تھا "قادر زماں اور دیگر ریلوں کے خلاف کارروائی کی جارہی ہے لیکن لگتا نہیں کہ یہ نیل منڈھے چڑھے گی۔ اگر یہ پھنسی جس تھی تو حیرت ناک تھی۔ اس کلنڈر دہائی لڑکی نے یہ فہم و فراست، یہ بصیرت کہاں سے پائی تھی۔ اس چھوٹی سی عمر میں وہ سیاست اور قانون جیسے دو محمل موضوعات پر روانی سے بولتی تھی اور سننے والے کو قاتل کر دیتی تھی۔"

میرا اسٹیشن دین سے لگنا مناسب نہیں تھا لہذا وہیں دوپکا بیٹا رہا اور خیالوں میں رہا۔ سای صاحب نے مرحوم آفیسر کی آخری رسومات میں شرکت کی اور تھکے ہار، ہنڈی حال رات گزار دی۔ واپس آئے۔ ان کی آنکھیں محروم اور چہرہ انگارہ کی طرح دھبہ رہا تھا۔ میں ان کے اس موڈ کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ان کے اندر کا سخت گیر قانون پسند شخص باہر نکل آیا تھا اور مجرم اور جرم کے خلاف جو الامحسوس بنا ہوا تھا۔

مری تک راستے میں انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ بے حد خراب موسم کی وجہ سے آگے جانا ممکن نہیں تھا لہذا سنی بیگ کے ہی ایک ایسے ہوٹل میں شب گزارنے کا فیصلہ ہوا۔ ہوٹل کے رخ بستہ کمرے کی سڑکی میں آتش دان کا شعلہ شعلہ محسوس ہوتا تھا۔ نیند ہماری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں نے جوں مرگ ایس بی کو دیکھا تک نہیں تھا۔ نہ ہی چوہیں گھنے پہلے میں اس کے خصلت کچھ جانتا تھا لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا کہ دیرینہ شناسا چمڑ گیا ہے۔ پتھیں گھنے کے اندر اندر وہ شخص میرے ذہن میں "میرا"

ہوا تھا جو ان ہوا تھا، اپنے منصوبوں اور عزم کے ساتھ میری سوچوں میں دند نایا تھا اور پھر مر گیا تھا۔ کیا ملنا اور کیا چھڑنا تھا۔ آتش دان کے سامنے آرام کر رہی رہیں بیٹھے میں زندگی کے طوفانی روٹیوں پر غور کرنے لگا۔ اچانک سائی صاحب کی بھاری آواز نے مجھے چونکا دیا۔

وہ بولے "جاوید مرا نہیں۔ اسے قتل کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ ٹرک ذرا نیور مفور ہے۔ وہ پڑا جائے تو ابھی اسی وقت مجرموں کو پھانسی لگ سکتی ہے۔"

میں نے سائی صاحب کی تائید کی "آپ ٹھیک کر رہے ہیں۔ جن حالات میں یہ سانحہ ہوا ہے ذہن کوئی اور بات ماننا ہی نہیں۔"

وہ بولے "جاوید کے سامان میں سے ایک اہم بریف کیس بھی غائب ہے۔ اس بریف کیس میں پولیس آپریشن کے حوالے سے نہایت اہم کاغذات تھے۔ حادثے کے بعد یہ بریف کیس گاڑی سے نکالا گیا ہے۔"

میں نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے؟ پولیس کی کارروائی پروگرام کے مطابق ہوگی۔" "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" سائی صاحب مایوسی سے بولے "جاوید درانی اسی آپریشن کا کرنا دھرتا تھا۔ سب کچھ اسی کا ارج کیا ہوا تھا۔ اب بات کم از کم دو ڈھائی ماہ آگے جا پڑی ہے۔"

"لیکن اس دوران تو مجرم اپنے دفاع میں بہت کچھ کرچکے ہوں گے ہو سکتا ہے، منظر سے ہی غائب ہو جائیں۔"

"یہ خدشات تو اپنی جگہ موجود ہیں۔ بہر حال یہ بات بھی اعلیٰ افسران میں طے ہے کہ اب مرحوم کے مشن کو ادھورا نہیں چھوڑا جائے گا" میں نے آج ایک کمپنی تشکیل دینے کا مطالبہ کیا ہے جو اس سطح میں فوری اقدامات کرے گی۔"

گو سائی صاحب کی باتیں حوصلہ افزا تھیں لیکن ان میں مایوسی کی آمیزش بھی صاف محسوس کی جاسکتی تھی "مثلاً مجھے یہ مایوسی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ میں چوہیں گھنے پہلے تک بہت پُر امید تھا لیکن اب امید بھرنا امید کی تدریک غار میں اترتی جا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا "قادر زماں کے خلاف میدان جنگ میں میری بہن اور میں پھر تھارہ گئے ہیں۔ فرعون صفت جاگیردار کا خوف ایک بار پھر میرے اعصاب کو چھینچھوڑنے لگا تھا۔ کچھ دہی کیفیت ہو رہی تھی جو حویلی سے نکلے ہوئے انجم پر طاری تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی

کہ جاگیردار قرب و جوار میں کہیں موجود نہیں وہ اس سے نسبت زدہ تھی۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ جاگیردار کی آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں۔ آج یہ آنکھیں مجھے خود پر مرکوز محسوس ہو رہی تھیں۔ جاگیردار کے دو آدمی میرے ہاتھوں جنم واصل ہو چکے تھے۔ بظاہر یہ ایک حادثہ تھا اور ابھی تک پولیس بھی اس حادثے کی نہ تک نہیں پہنچی تھی۔ تاہم ضروری نہیں تھا کہ واقعے کی اصلیت تادیب چھپی رہے۔ گاڑی میں دھماکا ہونے سے پہلے میں نے گھبراہٹ پر ایک فائر کیا تھا اور گاڑی ڈرائیونگ سیٹ میں دھنسن گئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی چھوٹی شادیں موقع پر موجود رہ گئی ہوں گی۔ ان شادوں کی موجودگی میں کبھی بھی وقت تقبلی کا رخ مٹ سکتا تھا۔ جہاں تک قادر زمانہ کا تعلق ہے، مجھے یقین تھا کہ وہ حادثے کی خبر سننے ہی میری طرف سے شک میں مبتلا ہو گیا ہوگا اور اب گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ شک تقویت پکڑ رہا ہوگا۔ میں جاگیردار کی حویلی سے صرف آٹھ روز کی مسافت لے کر نکلا تھا اور یہ مسافت اب ختم ہونے کے قریب تھی۔ اس مسافت میں اٹانے کا انحصار صرف اس بات پر تھا کہ جاگیردار میری طرف سے کس حد تک مطمئن ہے۔ ان حالات میں صرف ایک بات میرے حق میں جاتی تھی اور وہ یہ کہ تین روز پہلے القروس سے میں درجنوں افراد کی موجودگی میں گرفتار ہوا تھا۔ یقیناً ان درجنوں افراد میں وہ لڑکی بھی شامل تھی جو بطور عکرم گزار بمیڈ کے ساتھ القروس میں مقیم تھی۔ اس کے توسط سے قادر زمانہ کو پتا چل سکتا تھا کہ میں گرفتار ہوا ہوں۔

○☆☆○

چار روز بعد کی بات ہے۔ میں لچ کے بعد سو رہا تھا۔ اچانک بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے فریال بیٹھی تھی۔ یہ اسی کالج کا ایک کمرہ تھا جہاں میں برفاب لاک اپ سے رہائی پا کر فکس ہوا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں انجم مقیم تھی۔ اس کے علاوہ ایک ملازم اور گرن مین بھی اس کالج کے کیمنوں میں شامل تھے۔ میں یقیناً فریال کی آواز سے جاگھا۔ وہ بڑے فزیش موڈ میں تھی۔ آج اس نے نئی جینز پر کلی آئینوں والا سفید سوئٹرز پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں حسب معمول نیش شوز تھے۔ لگتا تھا جو گنگ کرنی چلی آئی ہے۔ اس کے کمرے ہونے کے انداز میں عجیب بے باکی تھی۔ لگتا تھا اپنے خطر خیزب و فراز کا اسے رتی بھرا حساس نہیں۔ "چلو، کیسے ہیں آپ؟" وہ بولی۔ پھر خود ہی جواب دیا "ویری سو ری" میں نے آپ کو شرب کیا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں دوپہر کو میرا منٹ سے ڈائم نہیں سوتا۔"

"دراصل" ایک بڑی اہم بات کرنی تھی آپ۔ میرا بچپن تین چار روز سے مونیج ڈیوٹی پر ہی لگیں پاپا نے ہی نہیں تھے۔ آج بہت کمرے آئی گئی کیونکہ آج نہ آئی تو ملاقات کا پانس بالکل ہی "ڈم" ہو جاتا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"ہائے اللہ! آپ کو کچھ بتائیں۔ جناب! ہم واپس لاہور جا رہے ہیں۔ کل یا شاید پر سول۔"

"یعنی آپ کی ٹیلی واپس جا رہی ہے؟"

"ہماری ٹیلی ہی نہیں آپ بھی واپس جا رہے ہیں" اس نے شوخ لہجے میں تصحیح کی۔

"یہ آپ کے پاپا کا پروگرام ہے؟" میں نے وضاحت چاہی۔

اس نے اقرار میں جواب دیا پھر ماہوں کو پیشانی سے جھٹک کر ٹھوڑی ہاتھوں کے پالے میں نکالی۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ وہ موضوع بدل رہی ہے۔ کچھ دیر لگاوت سے میرا چہرہ دھکتی رہی پھر بولی "شاہ جہاں صاحب۔ سوری۔ سوری احسان صاحب" میرا جی پاتا ہے کہ شاہ جہاں صاحب کے لیے کچھ کروں۔ سچ میں بہت پسند کرتی ہوں ان کو۔ اے آپ ایسے مجھے کیوں گھور رہے ہیں؟ میں آپ کی نہیں شاہ جہاں صاحب کی بات کر رہی ہوں۔ جی ہاں۔ میں نے کل پاپا سے بات کی تھی۔ وہ ہمیشہ میری بات مانتے ہیں۔ امید ہے اس مرتبہ بھی بایں گے۔ پتا ہے میں نے انہیں کیا مشورہ دیا ہے؟"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے انہیں گماہ کے وہ گفت بات کی جاگیردار کے جیسے جاسے نکالنے کے لیے عملی قدم اٹھائیں۔"

"کیا مطلب؟ ملاقات استہلال کریں؟"

"نہیں۔ نہیں" فریال نے کہا "اس سے ذیل کی جائے کسی ہم مصرعہ بردی کے ذریعے اس سے رابطہ کیا جائے اور گفت و شنید کے ذریعے گفت باتی کو رہائی دلوایا جائے۔ اس سلسلے میں فیصل آباد کا ایک زمیندار میاں سہو بہت کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ بااثر سیاسی شخصیت ہے پاپا سے اس کے مراسم ہیں اور وہ پہلے ہی پولیس سے تعاون کر رہا ہے۔"

"نہیں فریال" میں نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا "میں یہاں بیٹھ کر بات کر رہی ہوں جبکہ میں اس جہم سے گزر کر تپا

ہوں۔ اس غیبت غصے کی خفاش میرے لیے کھلی کتاب کے بند ہے۔ میں اپنی بہن کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ تم نہیں چاہتیں؟ وہ کس قماش کا شخص ہے اور کیا کر سکتا ہے؟"

"تو پھر کیا کریں گے؟ کیا یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے؟" فریال نے کہا۔

"میں سوچنے کے لیے وقت چاہتا ہوں، ممکن ہے کوئی بہر صورت سامنے آجائے۔"

"شاہد آپ پولیس آپریشن کا انتظار کرنا چاہتے ہیں لیکن میں نہیں سمجھتی یہ انتظار مختصر ثابت ہوگا۔ ایسے آپریشن کا ٹیم ایک مرتبہ نوٹ جائے تو بحال ہوتے مدت لگ جاتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ سب معلوم ہے۔ پلیز تم فی الحال اس موضوع پر کوئی بات نہ کرو۔"

"لیکن کیوں؟" وہ تنک کر بولی۔

"اس لیے کہ یہ سب کچھ ناقابل عمل ہے۔"

"شکر ہے" آپ نے یہ بات تسلیم کی "اس نے فوراً پینز لایا۔ ہونٹوں پر شرمیلی سرکراہٹ تھی۔

"کہتا ہے چاہتی ہوں کہ آپ ابھی میری ذہانت کا اعتراف کریں گے۔ یہ تجویز جو میں نے آپ کو اٹھی دی ہے، میری نہیں پاپا جانی کی تھی بلکہ اب بھی ہے۔ اگر پاپا جانی آپ کو خود اپنے پروگرام سے آگاہ کرتے تو میں ممکن تھا آپ ان کی افسری کے رعب میں آجاتے اور اس پروگرام میں دوش پہلو تلاش کر لیتے۔ جو کہ سراسر غلط ہوتا۔ اب آپ نے اس پروگرام کو غیر جانبداری سے دیکھا ہے اور ناپسند کیا ہے اس کا مطلب ہے۔ واقعی ناقابل عمل ہے۔"

"میں جھگڑا کر میری سبج میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ مخاطب کو ہلکا کر رکھ دیتی تھی۔ بات کرتے کرتے اچانک پڑی سے اتر جاتی تھی اور کوئی دو سڑاؤ پھیر دیتی تھی۔ اب بھی اس نے یہی کیا۔ صوفے سے اٹھ کر اچانک میرے قریب آئی۔ اتنا قریب کہ اس کا گردن کندھانیرے بازو سے جھونے لگا۔ خوشبو کے ایک جھونکے نے مجھے حصار میں لے لیا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے زہم ہاتھوں میں لے لیا اور مجھے اصل نام سے مخاطب کرتے ہوئے بے باکی سے بولی۔

"آپ میرے آئیڈل ہیں شاہ جہاں صاحب۔ میں نے بھی آپ کو چاہتی تھی لیکن آپ سے مل کر اور آپ کو پرکھ کر یہ چاہت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔ آئی لو۔ یہ آئی لو" اس نے اپنی خوب صورت ٹھوڑی میرے کندھے میں

دھنسا دی "اس کے ریشمی بالوں کی آواز وہ نہیں غایت ہے تکلفی سے میرے شانے پر استراحت کر رہی تھیں۔ میں نے ہلکا کر دیا۔ معلوم نہیں یہ کیسی بے باکی تھی۔ اس ساری بے باکی کے بعد اب اٹکا قدم تو یہی تھا کہ وہ مجھ سے پہلے گھر ہو جاتی۔ میں نے دیکھا "اس کے ہاتھ میں ایک جھوٹا سا الہم تھا۔ یہ الہم اس نے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"دیکھئے یہ کس کی تصویر ہیں؟"

میں نے تھوڑا سا ہنسنے کو کھینکے ہوئے الہم کھولا۔ پہلی تصویر ہی میری تھی۔ یہ کالج کے زمانے کی تھی۔ اپنے چند دوستوں کے ساتھ میں ایران گیا تھا۔ تھران کے ایک بازار میں میں گزری تھی۔ روٹی ہاتھ میں لے کر تھا۔ دوسری تصویر بھی میری ہی تھی۔ میں اپنی بہن گفت کے ساتھ کھرے ہاتھ میں کھڑا تھا۔ ہمارے چاروں طرف خوش رنگ پھول منگ رہے تھے۔ تیسری چوتھی تصویر بھی میری تھی۔ یہ پورا الہم میری تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں میرے بچپن سے لے کر جیل جانے تک کی تصویریں موجود تھیں۔ معلوم نہیں فریال نے یہ تصویریں کہاں سے اور کیونکر اصل کی تھیں۔ اکثر تصویروں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اصل سے کاپی کرائی گئی ہیں۔ کی تصویریں اطلاع بھی کرائی گئی تھیں۔ ان میں ایک تصویر بہت خوب صورت تھی۔ یہ بھی کالج کے زمانے کی تھی۔ ان دنوں مجھے باڈی بلڈنگ کا شوق چرایا ہوا تھا۔ میں تن سازوں کے انداز میں مسل ابھارے ساڈ پوز دے رہا تھا۔ قریب ہی گفت بیٹھی شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ میرے ساتھ ساتھ فریال بھی الہم پر جھکی ہوئی تھی اور وہ مجھ سے تصویریں دیکھ رہی تھی۔ گاہے گاہے وہ کس تصویر پر تیرہ بھی کرتے لگتی تھی۔ وہ میرے اس قدر قریب تھی کہ اس کے گردن جسمانی خطوط مجھ پر وضاحت سے عیاں ہو رہے تھے لیکن وہ قطعی بے خبر تھی۔ وہ جو بہت ہوشیار اور باخبر ہونے کا دعویٰ کرتی تھی اپنے بارے میں واقعی بہت بے خبر تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی دلکش ہے اور اس کی تہجان خیز جسمانی ساخت منصف مخالف پر کیا غصہ ڈھاسکتی ہے۔ وہ اپنی طرف سے اس درجہ بے پروا تھی کہ شبہ ہونے لگتا تھا کہ پوز کر رہی ہے۔ سہی صاحب نے شک ہی کیا تھا کہ اس کی خود فراموشی کی بھی شخص کو غلط فہمی میں مبتلا کر سکتی تھی۔ الہم میں ایک تصویر میرے بچپن کی تھی۔ اس میں میری داندہ کا صرف ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے مجھے کندھے سے تھاما ہوا تھا اور میں نظری لباس میں ڈانگیں چوڑی کیے کھڑا تھا۔ یہ تصویر سامنے آئی تو فریال دونوں

ہاتھوں سے منہ دبا کر پھینک لی۔ میں نے جلدی سے مٹھ لپٹ لیا۔ وہ اور شدت سے جھنکے۔ اس کا پورا جسم ہنسی کی چمک چمک رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ ہنسی ہوئی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”وہ بولی“ لگتا ہے بچپن میں آپ کے طور اطوار کچھ ٹھیک نہیں تھے۔ آپ کی والدہ نے یہ تصویر آپ کو قابو میں رکھنے کے لیے اتاری ہوگی۔“

میں نے اہم بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ ”یہ تصویریں جہیں ملیں کہاں سے؟“ میں نے پوچھا۔

”دھوڑنے والے کو تو خدا انجی ملتا ہے جی“ وہ بڑی ادا سے بولی۔

”کیا سہا صاحب کو ان تصویروں کا پتا ہے؟“

”کیوں پتا نہ ہوتا۔ میں انہیں خود یہ اہم دکھا چکی ہوں۔“

میں نے ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ سلگایا اور دھواں چھوڑ کر گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ”مجھے یہ بتاؤ فریال کیا کسی غیر محو کی تصویریں اکٹھی کرنا اور یوں اہم میں سجا کر رکھنا اچھی بات ہے؟“

”تو اس میں میری کون سی بات ہے؟“ وہ پورے اعتماد سے بولی ”موتو اپنے پسندیدہ کھلاڑیوں، ادا کاروں اور ہیروز کی تصویریں اپنے پاس رکھتے ہیں کون ہے جس کے پاس ایسی تصویریں نہیں ہوتیں؟“

”لیکن میں غیر عباس ہوں نہ اچھا بچہ نہ کوئی سیاسی ہیرو۔ ایک قاتل اور مفروز ہوں۔ جیل میں مجھے سچے سچے نام سے پکارا جاتا ہے۔ سچے ہوائی جاتی ہے اور روٹی دینے کے لیے ننگے پاؤں قطار میں گھڑا کیا جاتا ہے۔ ماں بہن کی گالیاں میرا مقدر ہیں اور میرا حال دماغی ان گالیوں سے لتھرا ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے تصویروں کے یہ بدناما وجہ اپنی زندگی کے صاف شفاف اہم سے کیوں چپکا رکھے ہیں۔“

”بس جناب اب زیادہ باتیں نہ بتائیں۔ کوئی بھی اپنے آئیڈل کے بارے میں ایسی باتیں سن کر چپ نہیں رہ سکتا۔ جی ہاں!“

”کی تو پوچھ رہا ہوں کیوں بنا رکھا ہے تم نے مجھے اپنا آئیڈل؟“

”اگر آپ میری تقریضیں سننے کے خواہش مند ہیں تو جناب میں سارا دن اور ساری رات آپ کے اس سوال کا جواب دے سکتی ہوں۔ اور اگر مجھے دینے کرنے کے سوا میں

کے لیے کیا خطرات پیدا ہو جائیں گے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟“

”بالکل سمجھ رہا ہوں“ میں نے پیشانی قلم کر کہا۔

”اور ہاں یاد آئے۔ جانے کے لیے تیار رہے“ میرا خیال ہے کل ہم کو یہاں سے روانہ ہونا ہے۔“

”اوکے۔ اوکے۔“

”اور میرے آنے کا ذکر پایا ہے نہ کیجئے گا ورنہ وہ میرے خلاف پیشانی اسٹوک دے دیں گے۔“

”اوکے۔“

”انجیم بائی تو شاید سو رہی ہیں“ انہیں سلام کئے گا۔“

”اوکے۔“

”اے اہم تو میں بھول ہی گئی۔“ وہ دروازے سے نکل لکلی پھر چپا ک سے اندر آگئی۔ مجھے یقین تھا اب دوبارہ نکلنے میں دوسرے منٹ اور لے گی۔

○☆☆○

سہا صاحب اس روز تو قس آئے لیکن اگلے روز صبح سویرے کا سچ بچہ گئے۔ انہوں نے وہی باتیں کیں جو اس سے پہلے فریال میرے گوش گزار کر چکی تھی۔ وہ گفتگو کے لیے میری ہی طرح پریشان نظر آتے تھے اور اسے جلد از جلد قادر زماں کے جنگل سے نکالنا چاہتے تھے۔ پھر ایک اور بات بھی تھی۔ اگر میرا اندازہ درست تھا اور وہ اپنے طور پر مجھے فکر شرا کے مقابل لانے کا ارادہ کر چکے تھے تو اس کے لیے بھی میرے پاؤں سے گفتگو کی زنجیر توڑنا ضروری تھا۔ یہ تو وہی نہیں سکتا تھا کہ میری جوان بہن بھی جاگیردار کی دسڑیں میں رہے اور میں شکر خرا سے دو دھاتھ بھی کرتا رہوں لیکن جیسا کہ میں بتا چکا ہوں مجھے دو فیصد امید بھی نہیں تھی کہ بات چیت کی صورت میں میری بہن کا کوئی بھلا ہوگا۔ قادر زماں متشعل ہو کر کوئی بھی اقدام کر سکتا تھا۔ گفتگو کی حیثیت اس منوس حولی میں وہی تھی جو درندوں سے بھرے ہوئے جنگل میں ایک تنہا بھٹی کی ہوتی ہے۔ جنگل کے بادشاہ کی ہوس ناک نگاہ ہر گھڑی اس پر مرکوز تھی۔ وہ جب چاہے اسے روکھ سکتا تھا۔ اسے زندگی کے بدترین مذاہب سے دوچار کر سکتا تھا۔ اس کی شہ رگ کو جھٹک کر خون کا آخری قطرہ تک اسے جسمی جیت میں اتار سکتا تھا۔ میں اس معصوم زندگی کے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا لہذا نہایت عاجزی کے ساتھ میں نے سہا صاحب کی اس تجویز سے اختلاف کیا اور ان سے کہا کہ فی الحال وہ اس معاملے کو چل کر اتار رہے ہیں۔ سہا صاحب نے بڑے لمبے ذہن

سے میری گزارشات کو سنا اور وعدہ کیا کہ میرے مشورے کے بغیر وہ اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔

سہا صاحب نے مجھے بتایا کہ کل علی الصبح وہ راستہ سڑک لاہور روانہ ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اور انجیم کو اسی ہذا اسٹیشن دین میں لے جایا جائے گا۔ لاہور میں ہماری رہائش کا بندوبست بھی ہو چکا تھا۔ اگلے روز ہم صبح بچے ہمیں تنہا گلی سے روانہ ہونا تھا لیکن عین وقت پر اسٹیشن دین خراب ہو گئی۔ ہم نے ڈیڑھ دو گھنٹے اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کیا۔ آخر سہا صاحب کو فون کیا گیا کہ وہ ابھی تنہا گلی میں ہی تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم فلائنگ کوچ کے ذریعے لاہور چلے جائیں۔

یہ کوچ بارہ بجے چلی اڑا۔ راستہ ایٹ آباد لاہور روانہ ہو گئی۔ پنڈی تک تو ہمارا سفر بالکل خیریت سے گزرا لیکن پنڈی سے چند اداش توخون کوچ میں سوار ہوئے اور پھیل سیٹوں پر بیٹھ کر ہلا گئے۔ لگے ان کی تعداد اچانک تھی۔ چری جلیکٹیں کاؤڈرائے کی پتلونیں اور پاؤں میں عجیب عجیب قسم کے جوتے۔ یہ سب کھاتے پیتے گھرانوں کے بکرے ہوئے شہزادے تھے۔ لو فر انڈین گانے الٹے اور ایک دوسرے کو فحش مذاق کرنے کے سوا انہیں اور کوئی کام نہیں تھا۔ باتیں تک رہتی تو جی گواری کی جاکتی تھی لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے اشدائوں کنایوں میں انجیم کو جھینڑنا شروع کر دیا۔ اس کی گھائی چادر پر تبصرہ کیا اس کے گھونٹ کو تنقید کا نشان بنایا پھر اس کے بیٹھے کے انداز پر گفتگو کرنے لگے۔ میں نے سب کچھ ستارہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے زبان بکھری تو خباثت بڑھ جائے گی۔ دل ہی دل میں دعا کرتا رہا کہ انہیں قلوں کے معصومی ہیرو کی اگلی اسٹاپ پر کوچ سے اتار جائیں لیکن نہ تو وہ اتارے اور نہ اپنی حرکات سے باز آئے۔ مجبوراً مجھے زبان کھولنا پڑی۔ کوچ میں موجود دو تین معارفرو نے بھی میرا ساتھ دیا اور ان لڑکوں کو سمجھایا کہ وہ انسانوں کی طرح سڑکیں۔ انہوں نے ہنسنے پر پندرہ منٹ شرافت سے کانے اور ایک بار پھر اپنی حرکات پر اتار آئے ان میں سے دو لڑکے تو خاص طور پر بت خفراک اور مجھے ہوئے بد معاش لگتے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک لڑکے کی بات پر غور کیا تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک مسافر سے کہہ رہا تھا۔

”چوہدری جی“ آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ یہ اس بازار کا حال ہے۔ نہیں تو پوچھ کر دیکھ لیں۔“

ایک دوسرا توخون بولا ”پوچھنے کی کیا ضرورت ہے

سو گھم کر دیکھ لیں اصل جو باروں والی مکہ ہے۔
سب سے پہلے نشست پر بیٹھے ہوئے دو لڑکے کھڑکی پر
بلبلہ ہجاء کر گانے لگے "تیرے جھلکے بدن کی خوشبو سے لہریں
بھی ہوئی مستانی۔"

انجم کا بڑا حال تھا۔ میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی وہ بڑی
طرح لرز رہی تھی۔ اس کا لرزنا اور ڈرنا سمجھ میں آتا تھا۔ وہ
جانتی تھی کہ اس پر لگایا جانے والا الزام درست ہے۔ ان
ادبائش نوجوانوں میں سے یقیناً کوئی اسے بازارِ حسن میں دیکھ
چکا تھا۔ جیسے جیسے ہم نے کونجر خان تک کا سفر کیا۔ یہاں
فلائنگ کوچ ایک ریسٹورنٹ پر رکی۔ مسافر چائے وغیرہ پینے
کے لیے ریسٹورنٹ میں آگئے۔ میں اور انجم بھی ایک میز پر
جا بیٹھے۔ انجم سرگوشی میں بولی "میرا خیال ہے گاڑی بدل
لیں۔ یہیں سے کسی دوسری کوچ میں بیٹھ جائیں گے۔"

میں خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بد مزگی پیدا ہو۔ کوچ
بدن زیادہ مشکل نہیں تھا۔ ہمارے پاس کون سا سامان تھا۔
میں نے جاکر کنڈیکٹر سے کہہ دیا کہ میری عزیزہ کی طبیعت
خراب ہے لہذا ہم آگے نہیں جاسیں گے۔ نو عمر کنڈیکٹر
ساری بات سمجھ رہا تھا۔ اس نے ہونٹوں میں مسکراہٹ دبا کر
اقرار میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ انجم ہاتھ روم کی طرف
چلی گئی۔ میں واپس آکر میز پر بیٹھ گیا۔ مسندوں کی ٹولی چند گز
دور ایک دوسری میز کے گرد بیٹھی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں
انہوں نے نوٹ کیا ہوا تھا یا کیا بات تھی کہ مسلسل بول رہے
تھے اور ہونٹ کر رہے تھے۔ انجم ہاتھ روم سے نکل کر میز کی
طرف آئی تو وہ کورس میں گانے لگے "تو یہ ستوئی چال"
جھک جائے پھولوں کی ڈال "انجم اب رووینے کے قریب
ہی۔ بات تھی بھی رونے والی۔ فلائنگ کوچ روانہ ہو چکی
تھی اور یہ مسندوں ہمارے ساتھ ہی ریسٹورنٹ میں رو گئے
تھے۔ اب اس امر میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ
بات بڑھ کر رہے گی۔

میں نے ریسٹورنٹ میں نگاہ دوڑائی۔ ہال کمرے میں چند
ٹلازمین کے علاوہ دو تین گاہک بھی تھے۔ اس کے علاوہ کاؤنٹر
کے پیچھے ایک نیچر نما شخص تھا اور ایک بادری کا کاشییل
دووازے کے پاس کھڑا انہوں میں خیال کر رہا تھا۔ ان میں
مجھے ایک بھی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو آگے بڑھ کر میری مدد
کر سکے۔ وہ رسمی صورت حال سے آگاہ تھے لیکن اپنی اپنی
بڑولی کے خول میں چھپے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ کا کاشییل بھی
نظر آنے کے کھٹکے کی فکر میں تھا۔ یہ منظر میرے لیے نا پسند
تھا۔ میں نے ایسے بہت سے مناظر دیکھے ہیں جب کسی تما

مظلوم کو ظالموں کے چنگل میں دیکھ کر شرفا کے غلوں کی
کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں اور دکھانوں کے شرکراے جاتے
ہیں۔ مسندوں کی ٹولی کا سرخندہ ایک نیم خیم نوجوان تھا۔ کسی
اعلیٰ افسر کا ٹھنڈا دکھائی دیتا تھا۔ وہ مجھ سے ڈرنے کی ایک ننگ
کرتے ہوئے بولا "تیا رو! اس بندے کے سرگرمی چہ وہی
ہے کہیں اٹھا کر کچھ دے نہ مارے۔"

اس کا سامی بولا "آخر بھائی ہے اس کی بہن پر۔
م میرا مطلب ہے اس کی دم پر پاؤں رکھو گے تو کاٹے گا
نہیں۔"

ایک کوچیک ناز کا بولا "خود ہی پینے والے بھائی کاٹے
نہیں ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے پھنسا ہوا ہے بے چارہ۔ تیر لہڑا
شکار ہے۔ مجبور ہے آپ اللہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔"

وہ سب گیدڑوں کی طرح ہم آواز ہو کر چلنے لگے
"مجبور ہے آپ اللہ۔ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ مجبور ہے آپ
اللہ۔"

میرے رگ پچھے اگڑتے جا رہے تھے۔ اٹھویں
دوڑتی ہوئی حرارت شعلہ بننے والی تھی۔ انجم نے میر
کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے لرزنا ہاتھ سے میر
کمنی تمام ل۔

"دع کر۔" وہ خوف زدہ انداز میں بولی "خود
بھوک کر چلے جائیں گے۔"

میں نے بڑے بڑے جگدڑوں کو نیچا دکھایا ہے اور ان کی زبان
سے اپنے لیے "استاد جانی" کے الفاظ نہ سنے ہیں۔ میرے کی
بات یہ ہے کہ مجھے استاد کتنے والوں میں جہاں میرے ہم عمر
نوجوان تھے وہاں گھاگ قسم کے جہادیدہ افراد بھی تھے۔ ان
میں سے ایک شخص کا لوجانی کا ذکر میں شروع میں کر چکا ہوں
بات دوسری جانب نکل رہی ہے۔ میں ذکر کر رہا تھا کونجر خان
کے لب سرگرم ریسٹورنٹ کا اور باج عدد لوٹروں کا۔ مجھے
اپنے سامنے کھڑا پارکرو بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے
کھڑے ہونے کا انداز بہت ڈھیلا ڈھالا اور تباہ دلانے والا
تھا۔ ان کے نیم خیم سرخندہ کے منہ میں تیز نظم یا الا پچی
دغیرہ تھی اور جیڑا مشین کی طرح چل رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے
ہوئے پوچھا۔

"کی الال تو کوئی نہیں" وہ اطمینان سے بولا "اگر
بناؤ گے تو بن جائے گی۔"

"لڑنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ میرے انداز پر ڈرا سا لڑ بڑایا پھر فوراً ہی اس کے
سرخ و سفید چہرے پر خون کی یورش ہوئی۔ خطرناک لمحے میں
بولا "ہم ایسی غلطی کیسے کر سکتے ہیں ہمارا صاحب۔"
میں نے کہا "تمہاری ماں نہیں پیدا کر نے کی غلطی
کر سکتی ہے تو تم بھی ایسی غلطی کر سکتے ہو۔"

یہ فقرو اس کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ خوفناک انداز
میں مجھ پر جھپٹا دیا ان مکالمے پناہ قوت سے اس نے میرے
چہرے پر رسید کرنا چاہا۔ لیکن اس کے سامنے کوئی عام شخص
نہیں تھا۔ استاد جانی تھا اور استاد جانی پر دار کرنا اتنا مسل
نہیں تھا۔ میں نے تیزی سے یہ مکالمہ بنایا جو سنی وہ اپنے زور
میں ترجمہ ہوا میری مجبور ٹانگ اس کی پسیلوں پر پڑی۔ وہ
اچھل کر کرسیوں پر گر کر اور لڑکھ کر کاؤنٹر سے جا کر آیا۔
انجم کی چیخ میرے کانوں میں گونجی۔ میں نے نیچر کا دھواں
دھواں چہو دیکھا۔ دیکھنے کی حالت میں کھڑا تھا۔ دو لڑکے
عقب سے بڑے اور ایک ساتھ مجھ سے لپٹ گئے۔ میں اس
اقدام کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں نے پہلے آگے کو زور
لگا کر ان کا توازن خراب کیا اور پھر تیزی سے اٹلے پاؤں پیچھے
ہٹا اور ان دونوں کو دیوار سے ٹکرایا۔ ایک کے سر پر نہایت
شدید چوٹ آئی اور اس نے پہلی فرصت میں میری کمر چھوڑ
دی۔ دوسرے کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ میں نے اس
کی رانوں میں ٹھنڈا رسید کیا اور ایک طرفانی ٹکے سے اسے کئی
لفٹ دور پھینک دیا۔

سرخندہ پہلی ضرب سے سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس
نے ایک بھاری بھر کم کرسی اٹھائی اور چند دم بھاگ کر پوزی
قوت سے مجھ پر دے ماری۔ میں نے تیزی سے جبکہ کر خود کو
بچایا۔ کرسی میرے اوپر سے اڑتی ہوئی عقب میں اٹھ کر گئی۔
وہ چیخ کر ایک بڑے گھٹان پر گری اور اسے توڑی ہوئی فرش
پر ڈھیر ہو گئی۔ اس منظر نے میرے ذہن میں چنگاریاں
بھجھ دیں۔ جو سنی سرخندہ میرے قریب پہنچا میں نے ایک
خوفناک جھکرا اس کی ناک پر رسید کر دی۔ وہ جھپ کر میز پر گرا
اور لوٹ بوٹ ہونے لگا۔ اس کمرے میرے حریفوں میں
دشمن دو ڈاڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب کوچیک نما شخص نے مجھ
پر جوبانی دیا کہ تو اس میں ہر کھلاہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔ اس
نے کرسی کے نوٹے ہونے سے میرے سر کو نشانہ بنانا چاہا
تھا۔ لیکن یہ بہت اس کے سامنے کی جھانپ پر لگا۔ کوچیک نما
شخص اپنا توازن کھو چکا تھا۔ میں نے اس ایک لمحے سے فائدہ
اٹھاتے ہوئے اس کی رانوں میں ہاتھ دبا دھرا ہاتھ اس کے
گرہن پر آیا اور وہ پھول کی طرح میرے ہاتھوں میں اٹھنا
پہلا گیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں یہ سارا توازن اور ٹانگ
کا کھیل ہوتا ہے۔ میں نے کوچیک نما شخص کو کھٹک پختہ فرش
پر دے مارا اور پھر اس پر ٹھوکوں کی بارش کر دی۔ اب میں
نے دیکھا کہ ایک اور شخص بھی میری طرف سے اس لڑائی
میں شریک ہو گیا ہے۔ یہ وہی کا کاشییل تھا جو تھوڑی دیر پہلے
بھگی بی بی بھٹکے کے چکر میں تھا۔ اس نے میرے باج حریفوں
میں سے سب شے "ٹاشے" خریف کو چھاپ لیا تھا اور اب وہ
دونوں فرش پر ہتھم تھا ہو رہے تھے۔ میرے سامنے اب
صرف دو غنڈے تھے۔ انجم کی کراہوں نے میرے سر میں
انگاری دے دے کار کئے تھے۔ میں نے ان بکرے نہیں زادوں کو
تھیں سینڈ کے اندر اندر روٹی کی طرح ڈھنک دیا۔ ان کی
انگش میڈیم گالیاں دیکھتے ہی دیکھتے چیخ دیکار میں بدل گئیں۔
جیکبسن پھٹ گئیں۔ پتلونیں اڑھو گئیں اور چہرے لولہاں
ہو گئے۔ سرخندہ اور اس کے دوسرا بھی ہال سے بھاگ نک
تھے۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ہالیاں "ڈنڈے" اور اسلحہ وغیرہ لینے
گئے ہوں لیکن میں جانتا تھا نہ مجھ پر بھی انتظار کروں تو وہ نہیں
لوٹیں گے۔ باقی جو وہ گئے تھے ان میں سے ایک تو بالکل بے
ہوش پڑا تھا۔ دوسرے کی کلائی ٹوٹ گئی تھی اور وہ فرش پر
بیٹھا مجھ سے رحم کی بھگ۔ مانگ رہا تھا۔ میں اسے مرنے بھی
بنا دیتا تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

کا کاشییل کا نام کھیل مح تھا۔ وہ میری حمایت میں بڑا
مرگرم نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا "بادشاہو! میں تھانے اطلاع دیتے

ہوں نہ ان سب پر دفع ۳۲۰ لگاؤں تو نام نہیں۔ آپ بالکل بے فکر رہیں گی۔ سارا معاملہ میں خود سنبھالو گے۔ ہرمانہ مرمانہ سب کچھ یہی دین گے۔ وہاں خدا کی ہمارے حقانے میں ایسی دیدہ دلبری۔ یہ تو اب اپنی نسلوں کو بھی نصیحت کریں گے کہ گوجر خان کی حد میں کوئی جرم نہ کرنا۔

میں نے انجم کو سنبھالا۔ اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ اب ہم جتنی جلدی یہاں سے نکل جاتے بہتر تھا۔ میں نے انجم کے کان میں سرگوشی کی "ہم اسپتال کے بساتے یہاں سے نکلیں گے۔ تم اپنی آنکھیں بند رکھو" وہ بری بات سمجھ گئی۔ یوں ظاہر کرنے لگی کہ نیم بے ہوش ہے۔ مکمل ٹھہرنے اس کی گلابی چادر اٹھا کر سر پر ڈالی۔ میں نے اس کا منہ سر پادہ میں لپیٹا۔ وہ مسلسل کراہ رہی تھی۔ اب ریسٹورنٹ میں غاسا جمعہ لگ چکا تھا۔ ایک ادیز مرخص ہوا "اگر انہیں اسپتال لے جانا ہے تو کار حاضر ہے۔"

یہ پیش کش ہماری ضرورت کے عین مطابق تھی۔ میں نے انجم کو بازوؤں میں اٹھایا اور باہر کھڑی ٹیوٹا کو ملا میں لے آیا۔ اسے پچھلی نشست پر لیٹا کر میں نے سپرائی گود میں رکھ لیا۔ اس کی کتنی پرکری خراش آئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ میں نے وہاں اپنا رومال باندھ دیا۔ گاڑی ہمیں لے کر تیزی سے روڈ پر آئی اور تیزی سے جنوب کی سمت بڑھنے لگی۔ ہم اسپتال جانے کا خدوہ مول نہیں لے سکتے تھے وہاں جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ راستے میں ایک بس اڑے کے قریب مجھے کافی تعداد میں ٹیکسیاں کھڑی نظر آئیں۔ میں نے کار والے کو کہنے کا کہا۔ انجم بھی اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے اپنے خیر خواہ کو سمجھایا کہ میری ساتھی کو ہوش آگیا ہے اور میں اسپتال جا کر خواہ مخواہ معاملے کو طویل دیتا نہیں چاہتا۔ وہ میری بات سمجھ گیا تاہم انجم کے اتنی جلد ہوش میں آجانے پر وہ چران بھی تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور انجم کو لے کر ٹیکسی اسٹینڈ پر آگیا۔ ایک اچھی حالت کی ٹیکسی کا ڈرائیور ہمیں تین سو روپے میں لاہور لائے پر رضامند ہو گیا۔ ہم نے پچھلی نشست سنبھالی اور لاہور روانہ ہو گئے۔

انجم خاصی مضبوط اور ہر اسان نظر آ رہی تھی۔ ریسٹورنٹ کے واقعات کو دو گھنٹے گزرنے کے باوجود اس کے جسم کی لرزش بے قرار تھی۔ اس کے علاوہ وہ تکلیف بھی محسوس کر رہی تھی۔ کرسی لگنے اور گرنے سے اس کی ٹانگ پر چوٹ آئی تھی اور ہینڈل کا دروازہ پھر جاگ اٹھا تھا۔

گوجر انوال تک تو وہ جیسے تیسے برداشت کیے بیٹھی رہی لیکن پھر دیرے دیرے اس کے ہونٹوں سے کراہیں نکلنے

لگیں۔ میں نے کامو کی کے ایک میڈیکل اسٹور سے چن کر لے کر اسے کھائیں تاہم افادہ نہیں ہوا۔ لاہور پہنچتے پہنچتے در سے ترپنے لگی۔

لاہور میں ہماری رہائش کا انتظام شادمان کالونی کے ایک مختصر لیکن صاف سحرے مکان میں کیا گیا تھا۔ سہی صاحب کا ایک باغیچہ گولہ ملازم یہاں پہلے سے موجود تھا۔ اسٹیشن دین کے ذریعہ ڈرائیور کو بھی ہمارے ساتھ ہی رہنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آرام کرنے اور دو کھانے سے انجم کی تکلیف کم ہو جائے گی لیکن صورت حال برعکس نکلی۔ رات نو بجے تک وہ درد سے بے حال ہو گئی۔ جب سائیکس تھا اس کا زخم اور سے مندل ہو چکا تھا۔ ہینڈل قریب صاف و خشاف نظر آتی تھی لیکن جب درد افراط تھا تو پوری ٹانگ پھوڑا ہوا جاتی تھی۔ یہ میرا ہی لگایا ہوا زخم تھا۔ جب وہ درد سے زخمی تھی۔ غیر شعوری طور پر میں خود کو بچھڑنے لگا تھا۔ وہ میرے پاس مندر کی امانت تھی اس کی حفاظت اور دیکھ بھال ہر طرح میری ذمہ داری تھی۔ میں سخت پریشانی کے عالم میں تھا جب کوئی کے گیت پر کار کا ہارن سنا دیا۔ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ فریال ہے۔ وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ کار میں لاہور پہنچی تھی اور شاید پہنچتے ہی میری طرف چلی آئی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ ڈرائیور بعد وہ اپنے جوتنگ شوز پر بے آواز چلتی اندر آگئی "ہیلو" وہ بڑی آواز سے مسکرائی۔

میں نے کہا "فریال! تم بار بار غلطی کر رہی ہو۔ سہی صاحب مجھے خود سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔"

"آپ بے فکر رہیں شاہ جہاں صاحب" وہ بولی "میں بے حد احتیاط سے آپ کے پاس آئی ہوں۔ کوئی میرا پیچھا کرتے ہوئے آپ تک پہنچ جائے تو اپنے ہاتھوں سے سرکٹ کر آپ کے قدموں میں رکھ دوں گی" پھر اس کی نظر انجم پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ جلدی سے اس کے سرہانے پہنچی "یہ کیا ہوا ہے انہیں؟"

"شہیدہ درد ہو رہا ہے" میں نے مختصر جواب دیا۔

"اے اللہ" وہ بے قرار ہو گئی۔ "یہ کراس نے انجم کا چوہا اپنی گود میں رکھ لیا اور کھلی دینے لگی۔ کچھ دیر بعد بولی "شاہ جہاں صاحب! انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔"

"میں تو مسئلہ ہے، ہم ڈاکٹر کے پاس نہیں جاسکتے۔"

"آپ یوں کہیں کہ ہم ہر ڈاکٹر کے پاس نہیں جاسکتے۔ جس ڈاکٹر کے پاس میں آپ کو لے جاؤں گی وہاں جانے میں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔"

"لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔"

"آپ مجھ پر اتماد کریں شاہ جہاں صاحب" وہ عجب غیبتی سے بولی "میری ذات سے آپ کو نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"بہتر ہے کہ سہی صاحب سے مشورہ کر لیں۔"

"اس وقت آپ مجھے ہی سہی صاحب سمجھ لیں" وہ تیزی سے بولی پھر کھڑکی کھول کر ڈرائیور کو آواز میں دینے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ہم انجم کو سوزی دین میں ڈالے گھبرگ کی طرف جارہے تھے۔ انجم درد سے بے ہوش ہونے والی تھی۔ فریال نے اس کا سر گود میں رکھا ہوا تھا اور مسلسل لاسادے رہی تھی۔ میں منٹ بعد ہم ایک کلینک کے سامنے رسک انجم نے سر پر چادر ڈال کر گھومتے سا نکال لیا۔ وہ مکمل چیخ رہا تھا کہ اسے کلینک میں پہنچا گیا۔ یہ ایک لہزی سرجن تھیں۔ صرف خواتین کا معائنہ کرتی تھیں۔ میں باہر حوائی میں بیٹھ گیا اور فریال "انجم کو لے کر خواتین والے حصے میں چلی گئی۔ لگتا تھا کلینک میں اس کی کافی جان بچان ہے۔ جلد ہی انجم کو اندر بلا لیا گیا۔ قریب ایک گھنٹے بعد لاہور میں فارغ ہوئیں۔ انجم اپنے پاؤں پر چل کر آ رہی تھی۔ چہرے کی گلابی رنگت بھی کافی حد تک بحال ہو گئی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ہم دین میں آہستہ فریال نے بتایا کہ ڈاکٹر نے دوا دی ہے۔ نس میں انجکشن بھی لگایا ہے۔ انکسے سے پتا چلا ہے کہ اندر زخم میں "ہیں" ہے تاہم فکر کی کوئی بات نہیں۔ کئی انہوں نے اسپتال میں بلایا ہے۔

سہی صاحب آ رہیں ہو گا اور زخم صاف کر دیا جائے گا۔

انجم خود بھی کافی مطمئن نظر آ رہی تھی۔ بولی "بڑی اچھی ڈاکٹر ہے۔ بہت ہموار اور خوش اخلاق۔"

فریال نے مجھ سے کہا "آپ ملیں گے ڈاکٹر سے؟"

پھر خود ہی بولی "آپ شکر ہے ادا کر آتے ہیں۔"

میں نے کہا "شکر ہے ادا کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔"

وہ مجھے ساتھ لے کر دین سے اتر آئی۔ ہم دوبارہ کلینک میں داخل ہوئے۔ راجداری سے گزر کر ایک بند دروازے کے سامنے پہنچے۔ خادمہ نے فریال کا پیغام اندر پہنچایا اور تھوڑی دیر بعد خادمہ ہمیں اندر لے گئی۔ میری آنکھیں پھٹی

"میں نے کہا" فریال نے کہا "آپ ملیں گے ڈاکٹر سے؟"

پھر خود ہی بولی "آپ شکر ہے ادا کر آتے ہیں۔"

میں نے کہا "شکر ہے ادا کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔"

وہ مجھے ساتھ لے کر دین سے اتر آئی۔ ہم دوبارہ کلینک میں داخل ہوئے۔ راجداری سے گزر کر ایک بند دروازے کے سامنے پہنچے۔ خادمہ نے فریال کا پیغام اندر پہنچایا اور تھوڑی دیر بعد خادمہ ہمیں اندر لے گئی۔ میری آنکھیں پھٹی

"میں نے کہا" فریال نے کہا "آپ ملیں گے ڈاکٹر سے؟"

پھر خود ہی بولی "آپ شکر ہے ادا کر آتے ہیں۔"

میں نے کہا "شکر ہے ادا کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔"

وہ مجھے ساتھ لے کر دین سے اتر آئی۔ ہم دوبارہ کلینک میں داخل ہوئے۔ راجداری سے گزر کر ایک بند دروازے کے سامنے پہنچے۔ خادمہ نے فریال کا پیغام اندر پہنچایا اور تھوڑی دیر بعد خادمہ ہمیں اندر لے گئی۔ میری آنکھیں پھٹی

بھی چلا رہی ہے اور میں جس سجا کے پاس انجم کو لایا ہوں وہ ہی قابل ہوش و خرد غزالہ ہے۔ اس سے میری آخری ملاقات دو بیٹھے پہلے لاہور ہی کے ایک ہوٹل میں ہوئی تھی۔ میں نے اس کے حسین ہونٹوں کی ہوش مریا التجاؤں کو ٹھکرایا تھا اور اسے اپنے قریب سے دھکیل کر قاتلین پر پیچک دیا تھا۔ اس کے بعد میں شعلہ جولا بنا ہوش سے چپک آؤٹ کر گیا تھا اور مری جا کر دم لیا تھا۔ اب پھر وہی غزالہ میرے دو ہونٹوں کی تھی۔ ایک ہونٹوں کی گین نامور سرجن "ایک امریکا پلٹ حسین اور ذہین دو بیٹرو۔ لوگ اس کے دروازے کے سامنے قطار بناتے تھے" اس سے ملنے کے لیے ہفتوں پہلے وقت لینا پڑتا تھا اور وہ میرے سامنے سر تپا بخرد و انکسار پنی کھڑی تھی۔ میں نے دیکھا "اس کے ہاتھ لرز رہے ہیں اور ہونٹ سفید پڑے ہیں۔"

"پلیز بیٹھے" وہ جھجکی جھجکی نظروں سے بولی۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ تم ہو۔ ورنہ اس کلینک پر تو کتنا بھی نہیں" میرے ہونٹوں سے زہریلی پھٹکار نکلی۔

"پلیز میری بات سن لیجئے" اس نے اپنی انگلی بار انگلیں اٹھائیں۔

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ آؤت جاں فریال مجھے کمرے میں تھا پھر ذکر جاچکی ہے اور میری پشت پر دردناک بند ہے "میں معافی چاہتا ہوں" میں نے بے انتہا کھجے میں کہا "تم نے میرے مریض کو دیکھا ہے؟ یہ لو اس کا معاوضہ" میں نے جب سے پانچ سو کے دو نوٹ نکال کر اس کی وسیع میز پر پیچک دیے۔

"شاہ جہاں" اس نے کراہ کر میرا بازو تھام لیا۔ اس کی فریادی انگلیاں میرے گوشت میں پست ہو رہی تھیں۔ میں نے جھٹک کر بازو پھڑپھا اور دردناک کھول کر بارہا ہلک کر کیا۔

فرش کو پاؤں سے کوٹا ہوا میں دین میں پہنچا تو احساس ہوا کہ میرے انداز نے کلینک میں موجود ہر دونوں کو حیر کر دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فریال غزالہ کے بارے میں کیوں گھرا دے کیسے جان سکی ہے؟

دین میں فریال پہلے سے موجود تھی۔ میرے اتنی جلد لوٹ آنے پر وہ مایوس نظر آئی تھی۔ میں نے اسے خوشگین نظروں سے گھورا اور انجم کے پاس بیٹھ گیا۔ شاید میں راستہ بھر کسی سے کوئی بات نہ کر سکا لیکن دین کے اشارت ہو رہی تھی اپنی زبان کو کوئی بڑی۔ پارنگ میں کھڑی ایک گاڑی نے مجھے بڑی طرح چونکا دیا تھا۔ یہ ایک نفاق سنی تھی "اس پر جھٹک کی تیرلیٹ تھی اور کمریوں پر پردے تھے۔ یہ گاڑی

میں قادر زمان کی گاڑیوں میں دیکھ چکا تھا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اس گاڑی میں یہاں کون آیا تھا؟ اگر کوئی عورت تھی تو کون تھی؟ کہیں اس نے انجم کو دیکھ لیا تو نہیں لیا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ عورت اکلی نہیں آئی ہوگی اس کے ساتھ کوئی مرد ہوگا۔ وہ مرد، مردانہ انتظار گاہ میں موجود تھا۔ کیا میں بھی پہچان جا چکا تھا؟ یہ خیال زہر میں بجھے تیری طرح میرے ذہن میں پیوست ہو گیا۔ فریال اور انجم حیرت سے میرا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

"ہاں ہوا آپ کو؟" انجم نے میرا بازو ہلکا کر پوچھا۔
"تمہیں اندر حویلی کی کوئی عورت تو نظر نہیں آئی؟"

میں نے پوچھا۔
"نہیں۔" انجم نے فوراً جواب دیا "اگر ہے بھی تو میں نے نہیں دیکھی۔ کیوں کیا بات ہے؟"

میں نے سامنے کھڑی گاڑی کی طرف اشارہ کیا "وہ دیکھو یہ حویلی کی گاڑی ہے۔"
انجم کے چہرے پر بھی تاریک سائے لڑ گئے۔ اسے ہراساں دیکھ کر مجھے اپنے حواس پر قابو پانا پڑا۔ ساتھ ہی غلطی کا احساس بھی ہوا کہ مجھے اس سے بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اطمینان کی صرف ایک ہی بات تھی مرد و عورت میں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگر کلینک میں حویلی کا کوئی بندہ موجود تھا اور وہ ہماری طرف سے مشکوک ہو چکا تھا تو ضروری تھا کہ وہ ہمارا چہرہ کرتا لیکن ایسے کوئی آجیاد نظر نہیں آئے۔ جزد تصدیق سفر کے دوران کی جاسکتی تھی۔ میں نے ڈرائیور ٹار کو گاڑی رخصانے کی ہدایت کی۔ ٹرکی طرف جانے کے بجائے میں نے ٹار کو جیل روڈ پر ڈالا پھر لارنس روڈ کے قریب دوجا میں کھوم پھر کر اطمینان کر لیا کہ ہمارا قاتل نہیں کیا جا رہا۔ اس کے بعد میں نے ٹار کو شادمان چلنے کو کہا۔

راستے میں انجم اور فریال سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہیں تاہم ڈرائیور کی موجودگی میں وہ اس نازک مسئلے کو چھیڑنے سے باز رہیں۔ کمرے میں پہنچتے ہی فریال نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اس نے اپنی عیادت سے سوالات کا جال بچایا کہ میں اسے غزالہ کے خوالے سے داخلہ قبول ہی کیا۔ میرا ذہن مکمل طور پر نسان سنی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے فریال کو ساتھ والے کمرے میں لے جا کر کہا "دیکھو فریال! مجھے اس گاڑی کے بارے میں معلومات چاہئیں۔ اس میں کوئی یہاں آیا تھا۔ کس فرش سے آیا تھا؟"

"کہوں نہیں" وہ غم ٹھوٹک کر بولی۔
"لیکن احتیاط بہت ضروری ہے۔"
"آپ یہ بات نہ کہتے تو آپ کے الفاظ بچ جاتے۔"
"کیا میں تمہارا انتظار کروں؟" میں نے پوچھا۔
"کتنا پیارا لگا ہے یہ لفظ آپ کے منہ سے" وہ اٹھا کر بولی۔
"کون سا لفظ؟"

"انتظار کا" اس کے لیے میں خوشی تھی پھر مجھ نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی وہ باہر چلی گئی۔

خیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن پر خیال کی یورش تھی۔ بار بار کچھ صورتیں تصور کے پردے پر ابھرتی تھیں۔ ان میں سب سے نمایاں صورت خطرناک تھی۔ یہ صورت تصور میں ابھرتی تھی تو کاتوں میں دھماکے ہونے لگتے تھے اور نفا میں بازو کی بو محسوس ہوتی تھی۔ مگر تعلق تھا غموت کا اس صورت سے۔ یہ شخص میرے ارد گرد موجود تھا۔ دور تھا یا نزدیک۔ وہ ان نظروں میں سانس لے رہا تھا۔

مات ایک بچے فون کی تھمتی تھی۔ دوسری طرف فریال تھی "ہیلو" اس کی ریلی آواز ابھری۔
"ہاں" میں احسان بول رہا ہوں۔

"آپ کے لیے میں اتنی اداسی ہے کہ گلتا ہے دس گ سے بچا بارے ہوتے ہیں۔"
"کام کی بات کرو فریال۔"
"آپ کا کام ہو گیا ہے۔"
"ہاں گھو۔"

"گاڑی میں ترم نام کی صاحبہ جھنگ سے آئی تھی۔ ان کے ساتھ ایک گھنٹہ میں ایک ڈرائیور تھا۔ جس نے ہم کلینک پہنچے گھنٹہ میں کام سے گیا ہوا تھا۔ ڈرائیور کا غالباً اسد ہے۔ ترم صاحبہ کا پورا نام مسز ترم زماں ہے۔ خیال ہے، آپ سمجھ گئے ہوں گے۔"

فریال کی اطلاعات مستی خیز تھیں۔ خاص طور پر ان تقریب اس نے خاتون کا نام ترم زماں بتایا تھا۔ یعنی وہ زماں کی بیوی تھی۔ میری اطلاع کے مطابق قادر زماں کی بیوی ان تھیں۔ ان میں سے کچھ حیات تھیں اور کچھ داغ بہارت دے چکی تھیں۔ اب معلوم نہیں زندہ شکار حیات میں سے وہ کون سی شریک حیات تھی۔ فریال کی اطلاع میں تسلی کا پہلو یہ تھا کہ جس وقت ہم کلینک پہنچے صرف ڈرائیور ہلاک موجود تھا۔ اور یہ کچھ ضروری نہیں تھا۔

مجھے بہانا ہو۔ جہاں تک مسز ترم زماں کا تعلق تھا تو یقیناً وہ انجم کو نہیں پہچانتی ہوگی۔ حویلی میں انجم عیاشی کا سامان بھی اور ایسے سازو سامان کو "ٹیک بیسوں" کی نگاہ سے دور رکھا جاتا ہے۔

وہ رات میں نے بستر کرکٹ میں بدلنے گزار دی اور اگلے روز فریال کو فون پر صاف بتا دیا کہ آئندہ وہ اس قسم کی ادھی دھرت نہ کرے۔ وہ جس عورت کے پاس مجھے لے گئی تھی اس کے لیے میرے دل میں کوئی جگہ ہے نہ آنکھ میں۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ انجم کے آپریشن کے لیے وہ کوئی اور ڈاکٹر تلاش کرے اور اگر نہیں کر سکتی تو میں خود انتظام کر لوں گی۔

فریال نے میرے تلخ ترش لیے کو بڑے افسوس سے سا اور اپنے چہرے لیے میرے شعلوں پر چھیننے دینے کی کوشش کی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ انجم کے آپریشن کے لیے کسی دوسرے ڈاکٹر کو رائج کرتی ہے۔ اگلے روز شام تک اس نے تمام انتظام کر لیا۔ ایک قابل بھروسہ ڈاکٹر کے پرائیویٹ کلینک میں انجم کی ہینڈل کا چھوٹا سا آپریشن ہوا اور ضروری ٹریٹ منٹ کے بعد وہ دس بارہ گھنٹوں میں گھرواپس آگئی۔

انجم کے کامیاب آپریشن نے میرے ذہن سے ایک بھاری بوجھ اتار دیا تھا۔ میں خود کو ہلکا چھکا محسوس کرنے لگا۔ کئی روز کے بعد پہلی مرتبہ میں نے شیونائی، غسل کیا اور لباس بدلا۔ موسم بھی خوش گوار تھا۔ دو روزہ بونہ اباندی کے بعد دھوپ نکلی ہوئی تھی اور کوٹھی کے چھوٹے سے لان میں سدا بہار پھول مک رہے تھے۔ جی چاہا، اپنے حالات سے تمام ذہنی راپٹے منقطع کر کے اس ماحول میں گم ہو جاؤں۔

قوی دیر کے لیے سی سی باؤ موسوم کے بجائے نازہ ہوا کو سینے میں اتار دوں تصور میں رقصاں غوغاں ہوتوں کے بجائے حقیقی مناظر پر نگاہ ڈالوں۔ میں نے کمرے سے باہر لان میں کرسی ڈال کر ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ نفا میں بدستور زہریلی ہوا کی آغوش رہی۔ سینکے پھولوں پر بدستور سائے رقصاں رہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور درد کی لہر دھم کرنے کی روکش کرنے لگا۔ میں نے اس گھر کا تصور کیا جہاں میں اور شہت پھولوں کے درمیان پھولوں کی طرح مسکراتے تھے۔ ہمیں سر پہلان پر دوڑانے کے لیے مضبوط بائیں ساراوتی تھیں۔ ہمارے ختماتے رخساروں پر پاں پاپ کے پوسے ستاروں کی طرح چمکتے تھے۔ صبح دشام تھکے حسین ہوا کرتے

تھے۔ میں اپنے تصور کو دھکیل دھکیل کر اس دنیا میں لے گیا۔ خوابوں کے جھولے میں جھولنے لگا اور تنگیوں نفا میں اڑنے لگا۔

ایک یاد میں کی چاب نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے دیکھا، تیس شوز میں لمبی کی چال چلنے والی خیر فریال سامنے کھڑی تھی۔ اس کے رخسار شہری دھوپ میں ختم ہاں تھے۔

"ہیلو" وہ عجیب سے لیے میں بولی۔
"ہیلو" میں نے زبردستی مسکرا کر جواب دیا "ہینو۔"
وہ بولی "ایلی کیسے ہینو" میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔

"کون ہے؟"
"ڈاکٹر غزالہ" اس نے میری ساعت میں دھماکا کیا۔ میں کرسی پر تن کر بیٹھ گیا۔ غضب کی ایک لہر سینے سے بلند ہوئی اور کپٹانیاں جل اٹھیں۔ میں غرایا "فریال" میں نے تم سے کہا تھا کہ اب اس عورت کا ذکر میرے سامنے نہ کرنا۔ تم اسے یہاں اس چار دیواری میں لے آئی ہو۔ میرا خیال ہے، مجھے تمہارے پاپا کی دی ہوئی یہ پناہ گاہ اب چھوڑنی پڑے گی۔ میں ابھی فون کرنا ہوں سہی صاحب کو" مجھے میں ٹھونکا ہوا میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے لپک کر میرا بازو تھام لیا۔

"ارے بابا" یہ غضب نہ کریں، پہلے دیکھ تو لیں ڈاکٹر غزالہ یہاں کیوں آئی ہیں اور ان کے ساتھ کون ہے؟" مجھے متحیر چھوڑ کر اس نے دروازے کی طرف رخ پھیرا اور بولی "غزالہ بائی، آج میں۔"

چند لمحوں کے وقف سے دروازے میں جنبش ہوئی اور غزالہ اندر آگئی "غزالہ کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی" میں نے لڑکی کو دیکھا اور مہم رہ گیا۔ یوں لگا ایک دھماکے سے کائنات میں ان گنت پتلیاں جھوٹ گئی ہیں۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھر رہے تھے۔ یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ یہ حالت خواب ہے یا بے داری۔ میں نے آنکھوں کو دھڑ سے جھپکا، میرے سامنے شہت کھڑی تھی۔ قادر زماں کی حویلی میں پھنسی ہوئی وہ وحشی ہوتی جس پر ہزاروں شکاریوں کی نگاہیں تھیں۔ وہ سب زنجیروں کو پھنکا کر اور سارے حصار توڑ کر میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں جیسے ہوا میں اڑتا ہوا آگے بڑھا۔ جھنگ نے اپنے بازو کھولے اور ہم ایک دوسرے میں ساگے ایک جان دو بدن کی طرح دھوپ اور حدت کی طرح چاندنی اور ٹھنڈک کی طرح دن اور روشنی کی طرح

وہ میرے سینے میں دھنسی گئی اور میں اس کے بالوں میں چھپ گیا "شفتا شفتا" میں اسے بار بار پکار رہا تھا۔ وہ میری پریکار کے جواب میں بھیا کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز جیسے کہیں بہت دور۔ دور سے مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

"شفتا تو ٹھیک تو ہے نہ۔ مجھے کوئی دکھ تو نہیں رہا کیا۔" بتا تو ٹھیک ہے نہ۔"

میں بار بار اس کا سر جوم رہا تھا "اسے بازوؤں میں بھینچ رہا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت اسی عالم خود فراموشی میں گزارا۔ میرے رخسار انگوں سے تر تھے اور وہ بھی دور ہی تھی۔ آج قریب ساڑھے تین برس بعد میں نے اسے چھوا تھا "اس کی آواز سنی تھی اور یہ وہی شفتا تھی جس سے چند گھنٹے جدا رہنا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

جب ہم بی بھر کر ایک دوسرے کو دیکھ چکے اور دل کی بجز اس انگوں کے راستے نکال چکے تو فریال نے شفتا کو غزالہ کے پاس بیٹہ دم میں چھوڑا اور مجھے لے کر نشست گاہ میں آگئی۔ میں حیران پریشان اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُن مکت سوالات ہونٹوں تک آنے کے لیے بے تاب تھے۔ میں نے فریال سے کہا "تج بتاؤ فریال! میری بہن کو کون لایا ہے یہاں؟"

"میں آپ کو بتا چکی ہوں" اسے لانے والی ڈاکٹر غزالہ ہیں۔"

"لیکن کیسے۔ کیسے ہوا یہ سب کچھ؟"

"آپ میری بات پر یقین نہیں کریں گے؟" وہ ٹھہرے ہوئے لیے میں بولی۔

"ہاں کروں گا۔ بتاؤ تم۔"

وہ بولی "کل صبح ڈاکٹر غزالہ خود جنگ مٹی تھیں۔ شگفتہ باقی کو لانے کے لیے انہوں نے قادر زمان سے ملاقات کی اور اسے مجبور کیا کہ وہ شگفتہ باقی کو چھوڑ دے۔"

"کیسے مجبور ہو گیا وہ؟ کیا مجبوری تھی اسے؟"

"بہت بڑی مجبوری تھی۔ قادر زمان کا تمام اثر و رسوخ اس کی ساری دولت اور طاقت اس مجبوری کے سامنے بچ گئی۔ اسے ڈاکٹر غزالہ کی بات ماننا پڑی اور وہ سب کچھ کرنا پڑا جو ڈاکٹر غزالہ نے کہا۔"

"میں تمہاری پہلیاں سمجھنے سے قاصر ہوں فریال۔ مجھے صاف انگوں میں بتاؤ میری بہن یہاں کیونکر پہنچ سکی؟"

فریال نے پیشانی سے بال پیچھے ہٹائے اور سنجیدہ لیے میں بولی "قادر زمان کے پاس دنیا کی ہر نعمت ہے لیکن اولاد نہیں ہے۔ اس لیے ڈاکٹر غزالہ نے اس کی مدد کی۔"

کے جدید ترین اسپتالوں میں علاج کرایا لیکن اولاد سے محروم رہا۔ اب اس کی عمر بہ سال سے اوپر ہے اور اس کے کارڈ نے پہلی بار بار پینے کی خوشخبری دی ہے۔ مس ترنم سے ام کی شادی دو برس قبل ہوئی تھی۔ شادی کے تین ماہ بعد ڈاکٹر غزالہ کے حلقہ میں زخمی ہوئی اور اسے شدید اندرونی زخمیہ ہو گئی۔ وہ کئی ماہ ڈاکٹر غزالہ کے زیر علاج رہی۔ ڈاکٹر غزالہ نے اسی وقت میاں پیو کو بتا دیا تھا کہ ترنم کا اندرونی نظام متاثر ہوا ہے اور اگر وہ امید ہے ہوئی تو اس کی زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ تاہم چند ماہ بعد وہی ہوا جس کا خلا تھا۔ قادر زمان کی کئی بیویاں اولاد کی نعمت سے محروم رہی تھیں لیکن ترنم کے لیے صورت حال مختلف نکلی۔ شادی سے ڈیڑھ برس بعد وہ امید سے ہو گئی۔ قادر زمان اسے لے کر ڈاکٹر غزالہ کے پاس آیا تو ڈاکٹر غزالہ حیران رہ گئیں۔ انہیں سخت افسوس ہوا کہ میاں پیو نے ان کی ایڈوائس کو نظر انداز کیا ہے۔ اس معاملے پر بحث کے دوران ڈاکٹر غزالہ اور قادر زمان میں بحث کا بھی ہو گئی۔ ڈاکٹر غزالہ نے مس ترنم زمان کا کیس لینے سے صاف انکار کر دیا۔ جواب میں قادر زمان نے جاگیر دارانہ لہجے میں ڈاکٹر غزالہ کو برا بھلا کہا اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں۔ وہ مس ترنم کو یہ کہنے ہوئے کلینک سے لے گیا کہ دنیا میں ڈاکٹروں کی کمی نہیں لیکن یہاں صورت حال نے ایک نئی کوٹ لی۔ حادثے کے بعد مس ترنم کا کئی عرصے ڈاکٹر غزالہ کے زیر علاج رہی تھی۔ ڈاکٹر غزالہ پر بے پناہ مجبور سازگاری تھی۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر ڈاکٹر غزالہ کے علاوہ کسی اور نے اس کا کیس کیا تو وہ زندہ نہیں بچ سکے گی۔ قادر زمان اسے امر کیا کہ وہ اب تک لے کر گیا لیکن وہ اس بات پر متحیر رہی کہ اس کی زندگی بچانے کی کوشش ڈاکٹر غزالہ کے ہاتھوں ہو۔ آنے والے لمحات کا خوف اسے اندر ہی اندر دھمک کی طرح چاٹ رہا تھا اور وہ دو دن بے روز گذر رہی تھی۔ یوں زچہ اور بچہ کی زندگی کے لیے خطرہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ مجبور ہو کر قادر زمان نے ایک بار پھر ڈاکٹر غزالہ کے کلینک کا رخ کیا۔ پہلے دن تک مجھے میں بات چیت کی، پھر خوشامد اور لاچ کے تجویز، آواز لے لیکن ڈاکٹر غزالہ اس سے مس نہیں ہوئیں۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ یہ کیس نہیں کریں گی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ چھپلے ایک ماہ سے مس ترنم زمان لاہور ہی میں مقیم تھی اور کسی طرح ڈاکٹر غزالہ کا دل صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بیٹے کے روز بڑھ رہا تھا اپنی اسی ضرورت

کا چ چلانے کے لیے کہا تو میں سیدھی ڈاکٹر غزالہ کے پاس گئی۔ اب جناب آپ نہ پوچھئے گا کہ میں ڈاکٹر غزالہ کو کیسے جانتی ہوں۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں "میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں اور شاید وہ بھی جو آپ بھی نہیں جانتے۔ جی ہاں! ڈاکٹر غزالہ کی اور آپ کی ساری کہانی مجھے معلوم ہے۔ وہ آپ کی بچاؤ ہیں۔ آپ کا بچپن اسٹے کرڈا ہے۔ میں جانتی ہوں "آپ پچھڑے پچھڑے کیسے لے تھے اور ملتے ملتے کیسے پچھڑے ہیں۔ جی ہاں! سب کچھ معلوم ہے مجھے۔ وہ تصویریں جو آپ نے میرے ایلم میں دیکھی تھیں "ڈاکٹر غزالہ کے ہی کمرے میں ہیں مجھے۔" بولتے بولتے وہ اچانک چپ ہو گئی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ موضوع سے ہٹ گئی ہے۔ بال جھٹک کر بولی "ہاں۔ میں مس ترنم کی بات کر رہی تھی۔ اس رات میں ڈاکٹر غزالہ کے پاس پہنچی اور جنگ کی سرپرست دلی گاڑی کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر غزالہ نے مجھے ترنم کے بارے میں بتایا۔ اس رات ہم دونوں میں دیر تک گفتگو ہوئی بلکہ میں ڈاکٹر غزالہ کے ساتھ ان کے کمرے چلی گئی تھی۔ رات ایک بجے جب میں نے آپ کو فون کیا تھا تو ڈاکٹر غزالہ میرے پاس ہی کھڑی تھیں۔ میں انہیں شگفتہ باقی کی مصیبت کے بارے میں سب کچھ بتا چکی تھی۔ اگلے روز مجھے بتائے بغیر ڈاکٹر غزالہ خود جنگ پچھڑیں اور قادر زمان سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کا علم مس ترنم کو بھی نہیں ہے۔ وہ جنگ سے شام کو واپس آئیں اور کل صبح سویرے پھر چلی گئیں۔ قادر زمان سے ان کی تفصیلی بات چیت ہوئی۔ اس مرتبہ وہ جنگ سے لوٹیں تو شگفتہ باقی ان کے ساتھ تھیں۔"

میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن "یہ دروداؤں رہا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ تقدیر مجھ پر اتنی مہربان ہو سکتی ہے۔ کیسے بھی ہوا تھا لیکن یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ شگفتہ اس حوالے سے نکل چکی تھی۔ قادر زمان نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی حاصل کرنے کے لیے اپنی مرنی ہوئی بیوی کی بجائے اپنی بیوی زچہ اور اس سے بھی قیمتی بیٹے کو بچانے کے لیے اس نے زندان کا دروازہ کھول دیا تھا۔ قدرت کے کھیل زمانے ہوتے ہیں۔ میں سیکڑوں مرتبہ دست بھیجی کی یہ کرشمہ سازیاں دیکھ چکا ہوں۔ انسان کو وہاں سے خوشی اور غم مل جاتے ہیں جہاں سے ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اچانک فریال کی آواز نے مجھے خیالوں سے جھٹکا دیا۔ وہ بڑی آواز سے آگے کو بھگی ہوئی میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ آپ کو مارا اور سراسر محبوب کیسا لگا؟"

"کس کی بات کر رہی ہو؟"

"غزالہ جی کی" وہ خوشی سے بولی "آپ کی طرح غزالہ جی بھی میری محبوب ہیں۔ میں بچی آپ دونوں کے عشق میں گرفتار ہوں۔ دونوں پر مہرئی ہوں نہ کسی پر کم نہ زیادہ۔ میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کیا ہے؟" میں خاموش رہا تو وہ اٹھ کر بے پاکی سے میرے پاس آئی "مجھے حساب سابق اپنی ٹھوڑی میرے شانے پر گاڑ کر بولی "میں آپ دونوں کو ایک دیکھنا چاہتی ہوں۔ بالکل ایک۔ ایک ذرا سا ذرا سا قاصر بھی نہ ہو آپ دونوں میں" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

غزالہ کے ذکر نے ایک دم میرے سینے میں سرد لر دوڑا دی۔ مسرت کی دھوپ کو غم کے دبیز پادل ڈھانپنے لگے۔ مجھے لگا کہ میرا پورا جسم ایک آہنی گھٹنے میں کسایا ہے۔ یہ گھٹنے مختلف اطراف میں زور لگا رہا ہے اور میں دو حصوں میں تقسیم ہو رہا ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اذیت اتنا کہ پہنچ گئی۔ قرب و جوار کی آوازیں ٹوٹ کر بکھر گئیں اور ان کے ٹکڑوں سے ایک نئی صدا وجود میں آگئی۔ بھولی بھری سی کھوئی کھوئی سی۔ "یہ زندگی کے میلے۔ یہ زندگی کے لیے دنیا میں کم نہ ہوں گے" افسوس ہم نہ ہوں گے۔"

مجھے احساس ہوا کہ میری پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو رہی ہیں اور پہلو میں بھی فریال حیرت سے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ خود فراموشی کی یہ کیفیت تیزی سے مجھ پر حاوی ہو رہی تھی "میں نے خود کو فوری طور پر سنبھال دینے کی کوشش کی اور سر جھٹک کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ معلوم نہیں فریال نے مجھ سے کیا کہا اور کچھ کہا بھی یا نہیں۔ میری ساعت مطلق ہو رہی تھی۔ تیزی سے قدم اٹھاتا میں اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ذہن میں ایک آرزو اچھڑوں کی طرح تلک رہی تھی "کاش یہ سب کچھ غزالہ کے ہاتھوں نہ ہوا ہوتا، کاش میری ذات پر یہ احسان عظیم کرتے دانی تپا بیٹیں احمد کی بیٹی نہ ہوتی۔ کاش۔ آتش زہر باقی طرف میں گھرے میں پکڑ لے گا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا "غزالہ کا سامنا کیسے کروں۔ دل چاہ رہا تھا شفتا کو اس کمرے میں بلاؤں اور اسے ساتھ لے کر غصی ٹھوڑی سے نکل جاؤں۔ یہ گھر یہ شہر اور ہرے تو ملک ہی چھوڑ جاؤں۔ ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں کبھی غزالہ اور اس کے احسان کا سامنا نہ

ہے جہاں میں پکرا رہا ہوں اور یہ سب کچھ سوچ رہا ہوں۔ وہ ہاتھ دوم میں رکھی تھی جب میں نے اندر آکر دروازہ بند کر لیا تھا۔ پانی گرنے کی مدھم آواز سن کر میں چونکا، پھر اس سے پہلے کہ میں صورت حال کی یہ تک پہنچا ہاتھ دوم کا دروازہ کھلا اور غزال اپنے لیے کھنٹے بال جوڑے کی صورت میں ہوتی باہر نکلی۔ اس نے منہ ہاتھ دھوا تھا۔ چو سفید گلاب کے مانند عطر ہوا تھا۔ وہ اکبرے بدن کی لیکن کشادہ شانوں والی تھی۔ جلد چمکیلی اور تخی ہوتی رخساروں کی بڑیاں ذرا سی ابھری ہوئیں اور پیشانی تابندہ تر۔ کمرے کی مدھم روشنی میں میں نے اسے دیکھا اور دیکھنا رو گیا۔ وہ دل موہ لینے والے حسن کی ہر تعریف پر پوری اترتی تھی۔ اس نے اپنی جمیل سی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں اشکوں کے موتی چمکے شاید وہ کچھ کنا چاہتی تھی لیکن پھر اس نے ارادہ ترک کیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ میری ہڈیاں اس کے بازوؤں کے حصار میں تھیں اور اس کا چہرہ میرے گھٹنوں سے چھو رہا تھا۔ اس نے اپنی خاموشی کو زبان بنایا اور سسکیوں کے لیے میں ہر وہ بات کہہ گئی جو وہ ہونٹوں سے کہہ سکتی تھی۔ اس سے پہلے میری بے غشی اور طرح نکلائی نے مجھے اس قسم کی صورت حال سے نکال لیا تھا لیکن آج یہ ہتھیار بھی کند تھے۔ گھٹنہ کی ”ویدہ“ میری زبان کو متقل کر چکی تھی۔ میں اندر سے کتنا بھی ٹوٹا ہوا تھا، کتنا بھی دوکھی تھا لیکن اس وقت غزال کو خود سے دور جھٹکنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں اپنا تمام غضب اور ساری شعلہ فشاں اپنے اندر چھپانے خاموش کھڑا رہا۔ کوئی ایسا درمیانی راستہ ڈھونڈنا تھا کہ غزال کی آنکھوں سے خون کے آنسو بھی نہ نکلیں اور میں اس سے چھٹکارا بھی پاؤں۔

میری ہڈیاں غزال کی گرفت میں تھیں اور میں خاموش کھڑا تھا۔ اس دریا کے اترنے کا انتظار کر رہا تھا جو تھوڑی دیر پہلے اس کی آنکھوں میں پوری طغیانی پر نظر آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کی ”کیاں“ مدھم پڑیں تو میں نے یہ آہستہ اس کے ہاتھوں کی گرفت ختم کی اور ایک دم ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی ناک اور وہ ہونٹ دونوں ہاتھوں میں چھپائے کھڑی ہو گئی۔ سوہ سرنگوں تھی اور مسلسل رو رہی تھی۔ مجھے دیکھنے کے بعد وہ جوڑا باندھنے کا عمل مکمل نہیں کر سکی تھی اور یہ ڈھیلا ڈھالا جوڑا اس کے شانے پر ریشم کے تھان کے مانند کھل چکا تھا۔

میں نے اپنی آواز میں حتی الامکان نری سینتے ہوئے کہا

”غزال! میں تمہارا احسان مند ہوں۔ اس احسان کی جو قیمت تم چاہو مجھ سے وصول کر سکتی ہو۔ ایک زر خرید غلام سمجھ کر مجھے لے جاؤ اور جس بازار میں چاہو فروخت کر دو لیکن جو امر میرے اختیار میں نہیں وہ تمہارے بھی علم میں ہے۔ مجھے اس کے لیے مجبور نہ کرنا۔“

وہ روتے ہوئے بولی ”میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ خدا کی قسم میں نے کچھ بھی نہیں کیا، مجھے کوئی دعویٰ نہیں ہے آپ پر۔ میں بغیر کسی شرط کے آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔“

”نہیں غزال! اس وقت میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔ اگر بخش سکتی ہو تو یہ احسان مجھے بخش دو۔ میں جب تک زندہ رہوں گا اس احسان کو یاد رکھوں گا۔“

”شاہ جہاں!“ وہ ہلک بڑی۔

اس کی بے بسی ناقابل بیان تھی لیکن میں خود بھی بے بس تھا۔ رخ پھیر کر میں دروازے کی طرف بڑھا۔ جتنی کھول کر باہر نکلتا چاہا لیکن دروازہ باہر سے بند تھا۔ یہ خیال برقی کی طرح ذہن میں گوندا کہ یہ کام فریال کے سوا کسی اور کا نہیں ”فریال! دروازہ کھولو۔“ میں نے چلائے کہا ”اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے جھنجھلا کر دروازے پر ہانپے برسائے لگا ”دروازہ کھولو فریال! دروازہ کھولو“ میری آواز میری توقع سے زیادہ بلند تھی۔ فریال نے گھبرا کر دروازہ کھول دیا۔

”کیا ہوا؟“ وہ تھجھکاؤ خوف زدہ تھی۔

میں نے اسے جھنجکے سے ایک طرف بنایا اور لمبے دم بھرنا گھر سے باہر نکل گیا۔

رات قریب نو بجے تک میں یونی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا اور سگریٹ چھونکتا رہا۔ شفت سے دوبارہ لٹنے کی خوشی اور غزال سے دوبارہ لٹنے کی نئی یوں ایک دوسرے میں گذر ہوئی تھیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل تھا۔ میں جلد از جلد گھر واپس لوٹنا چاہتا تھا لیکن یہ بھی ذرا تھا کہ غزال ابھی وہاں موجود نہ ہو۔ اس کا سامنا کرنا اور اس کی لا چاری دیکھنا میرے بس میں نہیں تھا۔

رات نو بجے میں گھر لوٹا تو حسب توقع فریال، گھٹنہ کے پاس موجود تھی۔ دونوں شدت سے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ فریال کی آنکھوں میں ناراضگی کی جھلک تھی لیکن چہرے کی شاشت بھی اپنی جگہ پر قرار تھی۔ مجھے گھور کر کہنے کی ”بڑے نکمور ہیں آپ۔ اگر سنگدل کا مقابلہ ہو تو دنیا بھر کے مردوں میں آپ اول رہیں۔ غضب خدا کا“ غزال جی کے سبب آپ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آئے اور آپ کی وجہ سے ان

کی آنکھوں نے خون کے آنسو بہائے ہیں۔ میں نے خیر رہنے دیجئے اس وقت اس نے ترجمی نظروں سے گھنٹہ کی طرف دیکھا ”اس وقت گھنٹہ باجی موجود ہیں“ کیلے میں آپ کی خبروں کی۔ بڑی اچھی طرح پوچھوں گی آپ سے۔“

کچھ دیر بعد وہ ہم سے رخصت ہو کر واپس چلی گئی۔ انجم نند کی کوئی کھا کر اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ اب میں اور گھنٹہ اس چار دیواری میں تنہا تھے برسوں کے چھڑے ہوئے تھے۔ اپنی چاہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے چلے جائیں۔ گاہوں کو گویا دس دس اور لہس کی سرگوشیاں سنیں۔ میں نے اپنی ہن کو دیکھا، وہ میری ہی طرح تھوڑی تھی، اونچی لمبی وحر یک کی طرح کھلے ہاتھ پاؤں والی، ذرا دیر کے لیے دھوپ میں بیٹھی تھی تو رخساروں سے لونگے لگتا تھا۔ اس کے چہرے کی سب سے خوب صورت چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ بے حد سیاہ اور سچے موتیوں کی طرح چمکتی ہوئی لیکن اس وقت وہ کھلائے ہوئے پھول کی طرح نظر آتی تھی۔ چو اترا ہوا، ہونٹ خشک اور گردن سے نیچے فٹلی کی بڑیاں ابھری ہوئی۔ اس کی ہر چمڑگی دیکھ کر میں پوری جان سے ترپ گیا۔ وہ بھی آنکھوں میں آنسو بھراؤں۔ میں نے اس کے کالج سے نازک اور شفاف ہاتھ تمام لیے ”گھبراؤ مت شفت! میں تم سے کوئی سوال نہیں پوچھوں گا۔ جب تمہارے حواس بحال ہوں تو تسلی سے مجھے بتاؤ۔ اور اگر۔ اگر تم نہیں بتانا چاہیں تو بے شک نہ بتاؤ۔ میں تمہارے زخم گریہ نہیں چاہتا۔“

”آپ اور میں دو نہیں بھیا“ وہ سننائی ”میں آپ سے کیا چھپاؤں گی۔ میں آپ سے کیا چھپا سکتی ہوں؟“

میں نے اسے گلے لگایا۔ وہ ایک ننھی گریزا کی طرح میری ہاتھوں میں سمٹ گئی۔ دونوں جہاں کی دولت میرے بازوؤں کے حصار میں تھی۔ میں نے اس کے ملائم بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ اسے کندھے سے لگائے لگائے میں انھوں کی طرف بڑھا اور چھت پر آگیا۔ درمیانی راتوں کا چاند سیاہ آسمان پر تاروں کے جھرمٹ میں براجمان تھا جیسے وہ کوئی داستان گو ہو اور کشادوں کے درمیان جینا کوئی دلچسپ کہانی سنا رہا ہو، دلچسپ اور حیرت ناک جس سے سن کر ستارے آنکھیں جھپک رہے ہوں اور ہوا چلتا بھول گئی ہو۔ چھت پر ننھی گئی۔ میں نے اپنی گرم چادر کی ہلک کھولی اور شفت کو بھی اس میں چھپایا۔ برساتی کے بجائے بید بچوں سے بنا ہوا ایک کرسی نما جھولا تھا۔ ہم اس جھولے میں بیٹھ گئے۔ جھولے میں بیٹھے ہی مجھے بچپن کا ایک جھولا یاد آگیا۔ یقیناً

گھنٹہ کو بھی یاد آگیا ہوگا۔ وہ جھولا چارپائی کی اداس سے تیار کیا جاتا تھا۔ برآمدے کی دھواں دھواں بھت پر چڑکی کڑیوں میں سے رتی گزاری جاتی تھی اور جھولے کی نشست بنانے کے لیے نکڑی کی چوکی رکھ دی جاتی تھی۔ ہماری والدہ ہم دونوں کو ساتھ ساتھ بٹھا جیتی تھیں۔ پھر بڑے لاڈ سے جھولا جھلاتی تھیں اور گاتی تھیں ”جوئے مایاں۔ پینگ چڑھائیاں“ آسمان پر تار یک بادل اُٹھ آتے تھے اور چند اہم سے آنکھ جھپکی کھلتا تھا۔ آج بھی وہی چاند تھا، وہی جھولا تھا، وہی شفت تھی اور میں تھا لیکن کچھ چہرے ساتھ جھوڑ چکے تھے اور انہیں بھی واپس نہیں آتا تھا۔ ”بہنے مایاں“ کار سیلا گیت بھی ان چہروں کے ساتھ ہی فنا کے گھاٹ اتر چکا تھا۔

میں نے کہا ”شفت! میں نے تو تمہیں رکھ پور میں ہاں سرور اور اور پھر پھر شریف کی حفاظت میں چھوڑا تھا۔ تم وہاں سے بھٹ کسے بچ گئیں۔“

وہ بولی ”مجھے کچھ معلوم نہیں بھیا یہ سب کیسے ہوا“ میں کچھ نہیں جانتی۔“

میں نے کہا ”جنت بھی جانتی ہو بتاؤ۔“

وہ بولی ”آخری بار آپ سے لاہور جیل میں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ نے مجھے پابند کیا تھا کہ اب بھی آپ سے ملنے نہ آؤں۔ آپ کی ہدایت کے مطابق میں رکھ پور میں پھر پھر شریف کے گھر اس طرح دن گزار رہی تھی کہ جھولے سے گاؤں میں بھی کئی لوگوں کو میرا پتا نہیں تھا۔ ان چار برسوں میں میں نے گاؤں سے باہر قدم نہیں نکالا۔ گھر سے بھی سخت ضرورت کے تحت نکلتی تھی۔ رکھ پور کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے ماں باپ حال ہی میں سیلاب کی نذر ہوئے ہیں اور میں ان کی جدائی میں کم مہم رہتی ہوں۔ یہ شب برات سے ایک دن پہلے کی بات ہے، پھر پھر شریف گاؤں کے دائرے میں گیا اور وہاں سے بڑا گھرایا ہوا واپس آیا۔ مجھے کمرے میں لے جا کر کہنے لگا ”گھنٹہ پڑا شرف سے بڑی خبر آئی ہے۔ جیل میں لڑائی میں شاہ جہاں زخمی ہو کر حسن ابدال کے کسی اسپتال میں پڑا ہے اس کے دو دوست اطلاع دینے آئے ہیں۔ میری آنکھوں نے اندھیرا بنایا۔ پھر پھر شریف کے ساتھ نئے سرگلی میں آئی۔ یہاں ایک سفید جپ کھڑی تھی۔ جپ میں دو آدمی تھے۔ میں ان میں سے ایک کو پہچانتی تھی اس کا نام سید جان سے اور وہ لاہور جیل میں آپ کے ساتھ ہی قید کاٹ رہا تھا۔ اس نے گھوگر آواز میں بتایا کہ اسپتال میں آپ کی حالت نازک ہے۔ مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ پھر پھر شریف نے مجھے سہارا دے کر جپ میں سوار کرا

قیمت ۱۰/- روپے

ڈاکٹر نسیم ۲۰/- روپے

عالمی مسابقتی کتب

کھیل اس پر سمجھنا اور آپریشن والی ٹانگ کو نرمی سے اٹھا کر دوبارہ کدے کا سہارا دے دیا۔ وہ ایک بار پھر گرمی نیند سو گئی۔

برقوں کا وہ بے فکر رہیں۔



اگلے روز علی انصباح گفتگو سے رخصت ہو کر میں عازر جنگ ہو گیا۔ مجھے لاری اڑے تک پہنچانے کے لیے ساتی صاحب نے اسٹیشن دین بھیجی تھی۔ میں نے اسٹیشن دین کے اندر ہی اپنا ٹکٹ اپ تبدیل کیا۔ ہالوں کے معنوی رنگ اور آئی لینس سے میں رات ہی چمکا کر پا چکا تھا۔ خالص رسائی قسم کے لباس کا انتظام بھی رات ہی ہو گیا تھا۔ یہ ساتی صاحب کے ایک سائیکلو ملازم کا لباس تھا۔ سیلا جیلا نیا تھیں۔ پانچین کی خاکی قمیض، بوسیدہ سی سفید چوڑی اور اسی رنگ کا ڈسٹ سماکس۔ میں نے یہ سب کچھ زیب تن کر لیا۔ میرا تجربہ ہے کہ سردیوں کے موسم میں دیکھنے والے کا ہاتھ بڑی آسانی سے اپنا آب چھٹا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں کھس کھل یا ٹولی سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان میں نہ سرپینٹ کر اس طرح بھل ماری جاتی ہے کہ بس آٹھ کھس ہی آٹھ کھس نظر آتی ہیں۔ اگر لارہور کے مال دوز پر کوئی ایسا شخص گھومتا نظر آجائے تو یقیناً لوگ اسے پکڑ کر تھانے میں جٹا کر ادیں۔

بادای باغ سے مجھے جنگ کی ٹان اسٹاپ بس مل گئی۔ ساڑھے دس بجے کے قریب میں جنگ پہنچا اور وہاں سے دوسری بس پکڑ کر بھکر دو انہ ہو گیا۔ اس سے آگے تانے کا سفر تھا۔ کسی "تاپ چڑھے" ہوئے رسائی کی طرح نہ سرپینٹ میں آسانی سے سفر کرتا رہا اور مصر کی اذانوں کے بعد "بھوک خامس" کے نواح میں پہنچ گیا۔ جاکر دروازہ زان اس کی حویلی اور حویلی میں تباہ و برباد دیکھیں دنیا میں سے زیادہ دور نہیں تھی، میں چاہتا تو کسی پیلے پر چڑھ کر حویلی کے حویلی میں دیکھ سکتا تھا لیکن میں اس وقت کسی اور کام سے آیا تھا۔ کچھ دیر میں کھیتوں میں بے مقصد گھومتا رہا۔ جو کئی شام بڑی اور اندھیرا گھرا ہوا تھا۔ میں نے شامت کے گاؤں کا رخ کیا۔ شامت کا گھر زعفران نے میں قطعی و شوری نہیں ہوئی۔ دواڑے پر دستک دی تو شامت ہی باہر آیا۔ جیساکہیں پر آگے کو جھکا ہوا اس کا چہرہ مجھے پہچاننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کھس کا پلچہرے سے سر کیا۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور ایک دم چونک گیا۔ اس کے چہرے پر مسرت کی یلغار ہوئی۔

"بھئی" میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی "مندر کماں ہے؟" "مندر سرگوشی میں" میں نے پوچھا۔

"اندھ ہے۔ بر آٹھ کے ساتھ والے کمرے میں۔"

"ہاں اور مفران کماں ہیں؟"

"دو بار بچی خانے میں ہیں بلکڑاں ان کو؟" شامت نے سرگوشی کی۔

"نہیں۔ پہلے میں مفران سے مل لوں۔"

میں شامت کے ہمراہ خاموشی سے اندر داخل ہوا۔

کچھ من میں بہت تھوڑی روشنی تھی۔ چند مفران گھوم رہی تھیں۔ ایک طرف چار پائی کے پاس گوبھی کے کٹے ہوئے

داخل پڑے تھے۔ انگلی پر ہم خشک پکڑے مچھل رہے تھے۔

میں مفران کے بار کمرے پر آٹھ کے ساتھ والے کمرے میں

داخل ہوا۔ لالین کی روشنی میں مفران اٹھ کھڑی دھکائے

خاموش بیٹھا تھا۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ کسی بہت

گرمی سوچ میں گم تھا۔ یوں لگتا تھا، بیٹھے بیٹھے سو گیا ہے۔ میں

آہستگی اس کی طرف بڑھا۔ ارادہ یہی تھا کہ بالکل قریب

جا کر اسے السلام علیکم کہوں گا اور وہ اچھل پڑے گا لیکن

السلام علیکم کہنے کی نوبت نہیں آئی۔ ابھی میں اس سے پانچ

چو قدم دور ہی تھا کہ اس کے حواس کاٹوں نے میرے چور

نہوں کی آہٹ سن لی۔ بے انتہا پھرتی سے اس کا ہاتھ قریب

رکھی ہوئی رانٹل پر آیا اور اس نے تڑپ کر سرخ میری طرف

بھیر لیا۔ بلاشبہ وہ ایک چوکس آدمی تھا۔ اگر میں واقعی کسی

بڑی نیت سے اس کی طرف جارہا ہوتا تو یادگار طریقے سے

پچھتاؤ۔ جو منی اس نے مجھے پچھتاؤ میں بغل گیر ہو گئے

"کماں رہ گئے تھے تم؟" اس نے بے تابی سے پوچھا

"میں تو آج نکلے والا تھا تمہاری تلاش میں۔ میں سوچ بھی

نہیں سکتا تھا کہ اتنی دیر لگا دے تم؟"

"ہوئی جو تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا" میں نے

مسکرا کر کہا۔

"مطلب؟"

"ایک خوش خبری ہے تمہارے لیے" اس کے چہرے پر

ایک چمک اٹھ گیا۔ غائب ہو گئی جیسے خوشی کی آس لگانا بھی وہ کماں

کھتا ہو۔

پہلی مسکراہٹ ہونٹوں پر سما کر بولا "کیوں مذاق کرتے

ہو یا راخوش خبری اور میرے لیے؟"

"ہاں تمہارے لیے اور خوشخبری یہی ایسی کہ جس کے

بعد کچھ سننے کی خواہش نہ رہے" وہ فحش میں اس کے مضبوط

اعصاب پچھتاؤ پر ہو گئے "اس کے وجہ چہرے نے رنگ بدلا

اور وہ نہ کھولے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ٹھہرے

ہوئے لیے میں کماں "انجم آزاد ہو گئی ہے مفران۔ وہ بالکل

خیریت سے ہے اور "شادمان" لاہور کی ایک کوٹھی میں تھمارا انتظار کر رہی ہے"

مفران کے چہرے پر شادی مرگ کے آثار نمودار

ہوئے وہ حیرت سے میرا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر لڑاں آواز میں

بولا "ج کد رہے ہو یا؟" اگر جمعیت ہے تو ابھی بتاؤ۔ میں

یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکتا گا۔

میں نے کہا "میرا خیال ہے" تمہیں ایسے یقین نہیں

آئے گا۔ چلو اٹھو ابھی چلو لاہور۔ آخری بس ابھی نکلی

نہیں ہوگی۔

"کس کی بات ہو رہی ہے کون جا رہا ہے لاہور؟"

شامت کی والدہ کی آواز آئی۔ پھر حرام سے دواڑہ کھلا اور

وہ اندر آگئی۔ آنکھوں پر ہاتھ کا چھبچھاتا کر اس نے غور سے

میری طرف دیکھا۔

"میں احسان ہوں ماں جی" میں نے اس کی مشکل

آسانی کی۔

"احسان پتر" اس نے چونک کر کہا پھر تیزی سے پاس

آئی اور مجھ سے پلٹ گئی۔ اس کی بانوں میں ایک ہاں کے

جسم کی گرمی تھی۔ وہ بار بار میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور

شان چوسنے لگی۔ بڑی متاثر ہوئی عورت تھی وہ مجھے اندھے

پراٹھے اور دودھ کا دھماکا کرنا یاد آ گیا جو چند ہفتے پہلے

میں نے اسی کمرے میں کیا تھا۔ ناشتے کی مہک ابھی تک

میرے سانسوں میں رہی ہوئی تھی۔ آواز میں سن کر شامت،

کی بہن مفران بھی کمرے میں آگئی۔

"بھائی سلام" اس نے سر ہونٹا کر بڑے ادب سے

سلام کیا۔

میرا ہاتھ بے اختیار اس کے سر کی طرف اٹھ گیا۔

تھوڑی سی دیر میں ہم سب محل مل کر ایک کمرے کے افروزی

طرح باتیں کرنے لگے۔ جلد ہی شامت دیکھ کر پتہ چل گیا کہ

وہ لڑکی قادر زان کے چنگل سے نکل آئی ہے جس کے لیے

مفران زہر دے رہا تھا۔ اس اطلاع نے سب کے چہرے

کھلا دیے۔ مفران پر تو جیسے کتے کی کیفیت طاری تھی۔ اسے

یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ مجھے احساس

تھا کہ انجم کو دیکھتے بغیر اس کے لیے یہ شب گزرا نا اب نہایت

سکھن کام ہے۔ میں نے اس بات کا انتظار نہیں کیا کہ وہ خود

مجھ سے لاہور ملنے کا مطالبہ کرے بلکہ اسے شانوں سے

پکڑ کر اٹھایا اور کہا "چلو بھئی لاہور۔ وہاں تمہارا انتظار

ہو رہا ہے"

مفران جلدی جلدی اس کے کپڑے ہلاتے ہوئے گئی۔

ہم دونوں خاموشی سے باہر نکل آئے "یہ مفران کون ہے؟" گفتگو نے پوچھا۔

میں جوان بہن کو اس کا کیا جواب دیتا۔ "ہے ایک عزیز"

میں نے بات بتاتے ہوئے کہا۔

ذہن ایک دم ہی اس گاؤں کی طرف چلا گیا تھا جہاں

شامت کے گھر میں مفران میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے اس سے

رخصت ہوئے اب کوئی تین بیٹے ہوئے تو آئے تھے اس دوران ہم ایک، دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جان سکے

تھے۔ میری نگاہوں میں مفران کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ لہجہ یاد آنے

لگا جس میں اس نے انجم کی باتیں کی تھیں اور وہ آنکھیں یاد

آنے لگیں جن میں اس کو بھوکہ بھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔

مجھے رخصت کرتے وقت مفران کے مکان میں بھی نہ ہو گا کہ

میں اتنی جلدی اسے اتنی بڑی خوش خبری سناؤں گا۔ اس

سے بڑھ کر خوش خبری اس کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی کہ انجم

اس حویلی سے آزادی حاصل کر چکی تھی اور کئی سفارح

ہاتھوں میں رہنے کے باوجود اب تک اس کی آہ کا آئینہ

نہنے سے بخود ظاہر تھا۔ میرا دل چاہا ابھی اور اسی وقت از

کر مفران کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے بتاؤں کہ کبھی واپس نہ

آنے والا وقت اس کے لیے واپس آیا ہے۔ شب دودھ کی

آندھیاں انجم کو دین چھوڑ گئی ہیں جہاں سے اڑانے لگی

تھیں۔ وہ ہر طرح سلامت ہے اور اس کی راہ تک رہی ہے۔

خوش خبری کا یہ امرت مفران کے کانوں میں پکانے کے لیے

میں بے تاب ہو گیا۔ میں نے اسی وقت ساتی صاحب کو فون

کیا۔ ساتی صاحب کو گفتگو کی واپسی کی اطلاع مل چکی تھی۔

وہ فون پر مکمل کر گفتگو نہیں کر سکتے تھے پھر بھی انہوں نے مجھے

موجودہ مبارک باد دی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ایک روز

کے لیے جنگ جانا چاہتا ہوں "اس دوران انجم اور گفتگو کی

حفاظت کے لیے ایک کھن میں درکار ہے۔

انہوں نے کہا "میں ابھی دو گن من بھیجتا ہوں لیکن

مسئلہ کیا ہے؟"

میں نے انہیں بتایا کہ انجم کے بارے میں مفران کو آگاہ

کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مفران کے سامنے قہر سے آگاہ تھے

میری بات سمجھ گئے تاہم انہیں میرا جنگ جانا کچھ پسند نہیں

آیا۔ ان کا خیال تھا کہ مفران کو پیغام دے کر یہاں لایا

جائے میں نے انہیں قہر دی اور کہا کہ میں پوری احتیاط

اتنے میں دو اوزے پر دستک ہوئی۔ شامت نے باہر جا کر دیکھا۔ چند لمحوں بعد وہ ہاتھ میں شدہ کاغذ پکڑے اندر داخل ہوا۔ مجھ سے کہنے لگا "ایک لڑکائیہ پر چارے گیا ہے آپ کے لیے۔"

"کون لڑکا؟" میں بڑی طرح چونک گیا۔

"سوچی خوشے کا بیٹا تھا کہہ رہا تھا ایک آدمی دے گیا ہے۔"

میرے لیے پرچا؟ اور اس جگہ؟ ذہن میں خطرے کی لاتعداد گھنٹیاں بج اٹھیں۔ میں نے جلدی سے کاغذ کھولا۔ کافی ساڑھے لائٹ وار ورق پر بال پوائنٹ کی تحریر تھی۔ سب سے اوپر میرا نام احسان الہی اور بریکٹ میں شاہ جہاں لکھا تھا۔ نیچے درج تھا۔

"بڑے بھولے ہو تم۔ بڑے بھولے ہو۔ قادر زباں کے تو کپڑوں سے کوئی خوش بو نہیں چرا سکتا۔ تم اس کی حوصلی سے دو لڑکیاں نکال لائے ہو اور سمجھ رہے ہو کہ وہ چکا بیٹھا رہے گا۔ بے وقوف ہو تم۔ تمہیں کچھ پتا نہیں، تمہاری بہن شگفتہ اور انجم اب بھی اس حوصلی میں ہیں۔ قادر زباں جب چاہے گا وہ کچھ دماغ سے بندھ کر اس کے پاس چلی جائیں گی۔ اب وہ اس کے لیے گھڑنے کی پھیلیاں ہیں۔ تم کو کیا معلوم، قادر زباں کیا ہے؟ میں تمہاری خیر خواہی میں صرف یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ ان لڑکیوں کو لے کر کہیں بہت دور نکل جاؤ۔ بس بغیر کسی اکڑفوں کے ہماگ نظر۔ اتنے فاصلے پر چلے جاؤ کہ جموں کے خاصین کے جاکیر ادوں کی سوچ بھی وہاں تک نہ پہنچ سکے تاہم ایسا کرنے کے بعد بھی تم کوئی گارنٹی حاصل نہیں کرو گے۔ صرف امید رکھ سکو گے کہ لڑکیاں بچ جائیں گی۔"

تمہارا خیر خواہ۔

پرچا میرے ہاتھوں میں کانپ گیا۔ سینے میں دھبے ہوئے اندیشے نازہ قبریں.... پھاڑ کر نکلے اور حفیظ کی طرح میرے گرد پکڑنے لگے۔ دل کے اندر کیس بہت گہرائی سے آواز آئی۔ یہ پرچا صداقت سے خالی نہیں۔ جاکیر دار کے زنداں کی دیواریں ایسی کمزور نہیں تھیں کہ انجم اور شگفتہ اپنی آسانی سے باہر آجائیں۔

صنوبر نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا "کیا بات ہے یا راجا لکھا ہے؟"

اچانک مجھے آہٹ سنائی دی۔ میری نگاہ صنوبر کے عقب میں دو اوزے کی طرف اٹھی۔ اور اٹھی رہ گئی۔

وہاں یادو کھڑا تھا۔ اس کے مندی رنگے بال لائین کی روشنی میں دک رہے تھے۔ وہ حسب معمول تینہ تھیں۔ قہار۔ اس کے ہاتھوں میں دو بڑے لفافے تھے۔ ایک میں سیل کیٹو دیکھا تھا۔ دوسرے میں کوئی مضامی قسم کی چیز تھی۔ کمرے کی دلیز پر قدم رکھتے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ غصہ کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ خوف بھی تھا۔ صنوبر یادو نے کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر دوستانہ انداز میں بولا۔

"آجوا یادو آجوا۔ کوئی غیر نہیں ہے یہاں۔ وی اپنا احسان ادا کر رہا ہے۔ یادو بڑی طرح گھوڑا ہوا تھا۔ بہر حال اس نے اندر آتے ہی ہی بہتری سمجھی۔ صنوبر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "تمہارے بعد یادو میں چار دھند یہاں حاضری دے چکا ہے۔ بے چارہ تم سے ملنے کے لیے تڑپ رہا تھا کچھ خاص اٹس ہو گیا ہے اسے تم سے۔ جب بھی آتا ہے تمہارا نام لے لے کر آہیں بھر آتا ہے۔"

صنوبر کے بہتر نے یادو کی شرمندگی میں اضافہ کر دیا۔ وہ لڑکھاتے لہجے میں بولا "جیون جو گیا" اب اور شرمندہ نہ کر میں بڑا بچھڑا رہا ہوں اپنے کیے پر۔"

صنوبر نے کہا "ہر معقول بندے کو اپنے گناہوں پر بچھڑانا چاہیے۔" پھر مجھ سے بولا "وہیے یادو کے بچھڑانے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ نیک پرہیزیوں کی طرح یادو نے زندگی میں بھی تصویر نہیں اتروائی تھی۔ تم نے نہ صرف اس کی تصویر انارکلی بلکہ اپنے پاس بھی رکھ لی۔ اب شب و روز اسے یہ فکر کاتی ہے کہ تمہیں یہ تصویر کسی ایرے غیرے کے ہاتھ میں چلی گئی تو وہ بدنام ہو جائے گا۔" بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یادو کو اپنی ان تصویروں کا غم کھائے جا رہا تھا جو چند ہفتے پہلے اس نے مجھ سے اتروائی تھیں۔ ان تصویروں میں یادو کے کانوں میں جھمکے تھے۔ سر پر دوپٹا تھا اور ہونٹوں پر لالی تھی۔ جس کمرے سے یہ تصویریں انارکلی گئی تھیں اس میں غم نہیں تھی لیکن یادو کو اس بات کا کیا پتا تھا۔ اب وہ صنوبر اور شامت وغیرہ کی چالوئی کر رہا تھا کہ کسی طرح تصویریں اسے واپس مل سکیں۔

شامت کی والدہ نے کہا "پتر احسان" اب غصہ جانے دو۔ اب تو یادو صاحب نے صنوبر کو چھوٹی بہن کہہ دیا ہے۔ ان کی جو تصویریں تمہارے پاس ہیں وہ وہاں کدو۔ ان کا بچی فقیری کا کام ہے۔ ایسے کام والے بندے کی بدنامی ہو جائے تو بڑی ٹھوٹھو ہوتی ہے۔ روزگار ٹھپ ہو جاتا ہے۔"

عورت کی سادہ لوحی پر قربان جانے کو بھی چاہ رہا تھا۔ اتنا ہنسنے کو بھی وہ یادو کے یادو صاحب کہنے پر مضرت تھی۔ یہ احترام کا جذبہ نہیں تھا۔ خوف تھا جو بیویوں فقیروں کے حوالے سے اس کی طبیعت میں بڑا ہوا تھا۔ میں نے کہا "ماں جی! یہ بڑی فقیری نہیں فرماؤ۔ ایسی موزی بندی ہو جائے تو اچھا ہوتا ہے۔ میں دوسروں کی تصویریں چاہے واپس کدوں مگر اس کی نہیں کروں گا۔ میں تو آیا ہی اس لیے ہوں کہ اس کے جھوٹ کا بل کھول سکوں۔"

یادو کی بڑی حالت تھی۔ وہ رحم طلب نظروں سے کبھی صنوبر کو اور کبھی مجھے دیکھتا تھا۔ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ جس کے در پر چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے وہ خود چڑھاوے لے لے کر مریدوں کے گھر کے چکر لگا رہا تھا۔ وہ قادر زباں کا بچھڑا تھا مگر میرے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا، تصویریں منظر عام پر آئیں گی تو قادر زباں بھی اسے بے عزت ہونے سے نہ بچا سکے گا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں یادو کی بے بسی سے لطف اٹھاتا لیکن تھوڑی دیر پہلے ہوموں ہونے والے رشتے نے میرے دماغ کی چولیس ہار کھی تھیں۔ میں صنوبر کو لے کر جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ میں نے صنوبر کو ساتھ والے کمرے میں لے جا کر بتا کر تھارہا یہاں سے فوراً روانہ ہونا ضروری ہے۔ صنوبر بھی نازیدہ خدشات کی بو سونگھ چکا تھا۔ وہ میرے ساتھ ملنے کو تیار ہو گیا۔ رخصت ہونے وقت صنوبر نے یادو کو ایک طرف لے جا کر تسلی بخشی اور وہ "میں السطو" میں اسے لایا دھکا لایا بھی کہ اگر وہ نیک چلتی پر قائم نہ رہا تو اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ شامت کی والدہ ہماری روانگی پر آدھ تھیں۔ انہوں نے ہمیں ڈھیر ساری دعاؤں اور دودھ عدد امام خاصین کے ساتھ رخصت کیا۔ آخر کار اہل خانہ کو الوداع کہہ کر ہم گاؤں کی تاریک گلیوں میں داخل ہو گئے۔

دور فاصلے پر جموں کے خاصین کی روٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ بلند و بالا حوصلی کی روشن گزریاں اپنے اندر ان گنت بچہ بچائے سمیت گھڑی تھیں۔ ہم جموں کے خاصین اور وہاں کی روشن گزریوں سے پہلو بچاتے ہوئے نیم پختہ راستے پر آگے چار سوا نہر چلا رہا تھا۔ راستے پر آمدورفت نہ ہونے کے برابر ہو گئی تھی۔ ہم نے ایک ریڑھے والے کو ہمیں روپے کی بخشش کر کے پختہ سڑک تک جانے پر راضی کر لیا۔ آٹھ بجے کے قریب ہم بس پر بیٹھے اور لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔

تمام راستے میرا دماغ گتھم گتھم کے پیغام میں الجھا رہا۔ صنوبر نے ایک دو مرتبہ اس بارے میں پوچھا لیکن میں

ٹال گیا۔ وہ انجم سے ملنے کی خوشی میں سرشار تھا اور میں اس کی خوشی و انداز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ گاہے گاہے میں کن آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھ لیتا تھا۔ جوں جوں لاہور قریب آ رہا تھا، صنوبر کی آنکھوں میں چمک نمایاں ہو رہی تھی۔ چار گھنٹے کے طویل سفر کے بعد ہم نصف شب کے وقت لاہور پہنچے اور یادو باغ کے بس اڈے سے شادمان کالونی کا رخ کیا۔

گھر پہنچے تو سہا صاحب کے پیچھے ہوئے مسلح محافظوں نے استقبال کیا۔ وہ اب تک پوری چوکی سے پرا دیتے رہے تھے۔ اندر انجم اور شگفتہ بھیجی دی دی دیکھ رہی تھیں۔ انجم نے صنوبر کو اور صنوبر نے انجم کو دیکھا۔ دونوں مسرت رہ گئے۔ ان کی ملاقات کا منظر دیدنی تھا۔ چند لمحوں کے لیے انہوں نے ارد گرد کے ماحول کو قطعی فراموش کر دیا۔ جذبات کے دھارے میں یوں بہ گئے کہ ان کی طرف دیکھتے رہتا تا ممکن ہو گیا۔ شگفتہ تو آثار دیکھ کر ہی وہاں سے ٹھک گئی تھی۔ میں بھی گرمی گرمی جذبات محسوس کر کے باہر نکل آیا۔ یہ وہی انجم تھی جو چند روز پہلے صنوبر سے ملنے کے خیال سے ہی خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اب خود کو محفوظ چار دیواری میں پا کر اور محبوب کو سامنے دیکھ کر وہ سارے اندیشے بھول گئی تھی۔

دس پندرہ منٹ بعد صنوبر کمرے سے باہر آیا تو اس کا رکتش چہرہ ششمن میں نمائے پھول کا منظر پیش کر رہا تھا۔ آنکھیں اس بات کی گواہ تھیں کہ پچھلے محبوب سے مل کر وہ آسودگی کے سمندر میں ڈھکیا کھا رہا ہے۔ اس کے آثارات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وصل کے یہ لمحات بہت تند و تیز تھے اور وہ ان لمحات میں محبت کے سوا اور کچھ نہیں کر لیا۔ انجم نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ جاکیر دار کی حوصلی سے کب اور کیونکر رہائی پا سکی۔ اب یہ ساری روداد وہ مجھ سے پوچھنا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ میں ان سوالوں کے جواب دے سکتا تھا اور دیتا بھی چاہتا تھا مگر بھر صورت حال دوسرا رخ اختیار کر گئی۔ فون کی قنقن جی اور شگفتہ نے آکر مجھے بتایا کہ سہا صاحب کی کال ہے۔ میں نے کال ریسیو کی۔ سہا صاحب کی آواز میں جوش آمیز غلیظ تھی۔ کہنے لگے "شاہ جہاں! میں تمہارے لیے گاڑی بھیج رہا ہوں۔ فوراً ہیڈ کوارٹر چلے آؤ۔"

"لیکن جناب! میں یہی خود۔"

وہ میری بات کاٹنے سے بولے "سوال دراب نہیں ہو میں کہہ رہا ہوں کہ۔" میان تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ تمہاری کدو۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے فون بند کر دیا۔ ٹھیک

منٹ بعد پولیس کی گاڑی دروازے پر آن لڑی۔ مجھے لائے کے لیے ایک انسپٹر کو بھیجا گیا تھا۔ وہ بڑے احترام سے چل آیا اور غیر متوقع شائستگی کے ساتھ مجھے اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ میری یون روٹنگی نے شتا کو ایک دم پریشان کر دیا تھا تاہم میرے سمجھانے پر وہ سمجھ گئی اور آٹو اس کی خوب صورت آنکھوں میں چمکنے چمکنے رہ گئے۔ پولیس کار نے چار میل کا فاصلہ صرف پانچ چھ منٹ میں طے کر لیا۔ کار کا ہور مسلسل بج رہا تھا اور میں ایک مدبرانہ شان سے پچھلی نشست پر براجمان تھا۔ ایک میل کا قیدی نمبر ۳۳۳ اپنے جوتوں سے اُٹے ہوئے کھیل میں لیٹا شاید کوئی اونکا خواب دیکھ رہا تھا۔ گاڑی ایک بہت بڑے عمارتی دروازے پر رکی۔ میں انسپٹر اور دو سپاہیوں کی معیت میں آڑا اور پٹائی دروازے آراستہ ایک کانفرنس روم میں پہنچ گیا۔ یہاں مستطیل میز کے گرد تقریباً چھ عدد اعلیٰ پولیس افسران موجود تھے۔ ان میں سے دو تین کو میں چروں سے بھی پہچانتا تھا۔ شاہ چروں میں ڈی آئی جی مستقیم شاہ کا چہرہ بھی شامل تھا۔ وہ بالی قوم کے پورٹ کے مین پیچھے بیٹھے تھے۔ ٹوپی آٹار کو میز پر رکھی ہوئی تھی اور اپنی نیم سفید کینٹنی کو شات کی انگلی سے مسلسل کھج رہے تھے۔ فرش پر دبیز قالین عمارت اور الیکٹریک بیڑوں کی وجہ سے کانفرنس روم میں خوشگوار حرارت موجود تھی۔ مجھے ایک خالی نشست پر بٹھار دیا گیا۔ ڈی آئی جی صاحب نے ہمیں نہیں جھ سے سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا۔ اس گفتگو کی حیثیت انٹرویو کی سی تھی۔ مجھ سے شکر عرف شکر شکر کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا۔ اس سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی؟ ہم دونوں کی چپقلش کا آغاز کیسے ہوا؟ حقیقی طور پر کتنی مرتبہ خیر اور شکر کا آتنا سامنا ہوا؟ کپور قتلہ اور جالندھر میں میں کتنا عرصہ رہا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان سوالوں کے جواب پوری احتیاط سے دیے۔ میں جانتا تھا پولیس افسران پہلے سے بہت کچھ جانتے ہیں اور ان سے غلط بیانی کا مطلب شلوک و شبہات کی فضا پیدا کرنا ہے۔ شکر سے میری پہلی ملاقات اپنی گرفتاری سے دو برس پہلے کھستو میں ہوئی تھی۔ پچھری زندگی کا بے حد آشوب دور تھا۔ اپنی بہن کے مجرم رج راشدی اربخہ کو جہنم واصل کرنے کے بعد میں ایک بکولے کی طرح بکرا تاہم پھر آٹو اور پولیس اس بکولے کو مٹھی میں بند کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ کھستو میں مسلم کش فسادات ہوئے تھے۔ شکر اور اس کے تربیت یافتہ غنڈوں نے مسلمانوں کا ایک پورا قلعہ بردار کر دیا تھا۔ پھر شکر ایک نوجوان لیڈی ڈاکٹر کو اٹھ کر شاہ تاج ہوٹل میں لے گیا

تھا۔ وہ ایک بند کمرے میں چاقو کی نوک پر بے بس لڑی عزت لوٹ رہا تھا اور اس کے ہر کارے کمرے سے باہر کے روٹے پلٹتے داروں کو ٹھوکریں رسید کر رہے تھے۔ نے... آٹو تار لباس کے ساتھ ایک مڑھیا کو ایک غنڈے کے ہاتھوں میں لوٹنے اور اتھائیں کرستے دیکھا۔ میں ایک سفید ریش بوزے کو چھوٹے بچوں کی طرح روٹے بنا سنا تھا۔ میں نے اس کو عمر بچے کا کرب محسوس کیا تھا جو مصیبت زدہ بہن کو اپنی آپنی کہہ کر پکار رہا تھا۔ آٹو پھر سے بے پردہ ہو کر میں اس بند دروازے سے جا نکرا تھا۔ کی دوسری طرف شیطانی بہنہ رقص کر رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری آنکھوں کے سامنے دھندلی چٹائی تھی اور میں اپنی پوری جسمانی قوت سے اس درندہ پر بڑا تھا جس نے ایک دو تین سو کے خون سے بچے بچے تھے۔ شاہ تاج ہوٹل کے دوسرے فلور پر گرا نمبر ۳۳۳ میرے اور شکر کے درمیان ایک خون ریز لڑائی ہوئی تھی مجھے اچھی طرح یاد ہے جب نیچے سرک پر پولیس کاروں۔ سائرن سنائی دیے تو شکر شکر میرے پیچھے تھا۔ بھاگنے پہلے میں نے اس کے منہ پر ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں نے جس شخص کو گرایا ہے وہ اب تک ایک خلقت کے لیے ناقابل تفسیر رہا ہے، وہ شکر ہے جس کے سامنے سے بھی لوگ بدکتے ہیں اور جس کی سفاکی شیطانی کا شہو درد نزدیک ہے۔ مجھے کئی دن بعد معلوم ہوا تھا کہ میں نے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ میری وجہ سے نہ صرف مسلمان بڑی شکر کے ہاتھوں قتل ہوئے نہ وہ مٹی تھی بلکہ وہ زخمی بھی ہوا تھا اور اس کے کئی ساتھیوں کے ہاتھوں گرفتار بھی ہوئے تھے۔ اس رات میں نے شکر کو جو زخم دیا تھا وہ ابھی تک اس کے ہاتھوں رخصت ہو رہا تھا۔ یہ اس گرفتاری و چاقو کاٹھا تھا جس کی نوک پر شکر نے لڑی کو بے بس کر رکھا تھا۔ یہ چاقو شکر کے رخصت کارندہ تک گیا تھا اور میں نے زخمی شکر کی سفید چربی کے نیچے سے اُٹے ہوئے خون کا دھنسل نکال دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد میرے اور شکر کے درمیان ختم ہو گئی تھی۔ میرا گردہ شکر کی لمبا بت پڑا نہیں تھا۔ مٹی بھر سامنے تھی لیکن جتنے بھی تھے بھان ٹار تھے۔ سب نے خوب کچھ میرا ساتھ دیا تھا۔ کھستو اور جالندھر اور کپور قتلہ میں کسی جگہ ہم نے شکر کے سامنے کھٹے نہیں کیے تھے۔ کانفرنس روم میں مجھ سے ان واقعات کے بارے میں

پوچھا جاتا رہا، میں بتا رہا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد یہ نشست بخت ہو گئی اور ساسی صاحب مجھے ساتھ لے کر ایک چھوٹے کمرے میں آئیے۔ اُس کمرے میں مکمل خالی تھی۔ ساسی صاحب نے میرے لیے چائے اور بکٹ نکوائے ایک طرح سے یہ چمکی ٹاشٹا تھا (کیونکہ اب صبح ہونے والی تھی) گہنا گرم چائے سے شب بے داری کے اثرات زائل ہونے لگے۔ ساسی صاحب نے اٹھ کر ایک کونے سے پردے ہٹا دیے۔ صبح کا منگیا اُجالا کمرے میں جمائے لگا۔ ساسی صاحب کے چہرے پر جوش نظر آ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں چمکاک کرکٹے لگے "شاہ جہاں! تمہیں کچھ کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا" میں تیس ایک نہایت اہم ذمے داری سونپنا چاہتا ہوں۔ اس ذمے داری کا تعلق شکر سے ہے۔ تمہیں اس کی گرفتاری میں پولیس کی مدد کرنا ہے" میں نے کہا "ساسی صاحب! حیرت کی بات ہے پولیس ایک قیدی سے مدد طلب کر رہی ہے" وہ بولے "قیدی تو تم ہو" اور اس بات سے تمہیں خود بھی انکار نہیں ہوگا۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ قانون کی مدد کر کے تم اپنے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کر لو گے۔ میں کہتا ہوں کہ اس شخص کی حیثیت سے تمہاری سزا پر بھی نظر ثانی کی جائے" میں ساسی صاحب کی باتوں کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور یہ بھی جان رہا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ وہ ایک تحقیقی ذہن کے مالک انسان تھے۔ متعدد نے حصول کے لیے انہوں نے بیٹھنت نئے راستے اختیار کیے تھے اور کامیاب ہوئے تھے۔ مجھے شکر کے سامنے لانے کا منصوبہ بھی یقیناً اپنی کا تیار کر دیا تھا۔ یہاں اتفاقاً صورت حال کچھ عجیب رنگ اختیار کر گئی تھی۔ جاگیردار قادر زان نے مجھے ساسی صاحب کو ٹھکانے لگانے کے لیے بھیجا تھا اور ساسی صاحب نے مجھے بھی اس "مکناہ" میں شامل کر لیا تھا جس کی پاداش میں ان کو قتل کرنے کی سازشیں ہو رہی تھیں۔ لیکن شکر شکر کی تلاش۔ ساسی صاحب نے اپنی سوچنی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور عجیب سے لہجے میں بولے "شاہ جہاں! میں آٹو روز سے تم پر بھروسہ کرتا آیا ہوں۔ آٹو روز سے میری کاروائیوں سے جب میں نے تمہیں لاہور ٹیل کے احاطے میں دیکھا تھا۔ بعد میں گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اعتماد اور محبت کی یہ کیفیت میرے اندر مضکم ہوئی ہے۔ میں بغیر کسی چٹائی کے کچھ سکھوں کہ میں تمہاری قدر کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم میرے اعتماد پر پورے اُترو گے" اس کے بعد وہی باتیں ہوئیں جو پہلے سے میرے ذہن

مقبول عام مصنف ایم۔ اے راحت کے سدا بہار قلم سے شاہکار نکل

سامون

مستقبل کو فہم کرنے کے ارادے سے نکلنے والے نوجوان کا حوال

☆

وہ شاہد ارمائی سے منہ موڑ کے آگ اور خون کے راستے پر چل نکلا۔

سامون

نہایت منفرد پر اسرار سلسلہ

☆

مکمل تین حصوں میں شائع ہو گیا ہے
فی حصہ ۲۰/- روپے

20- عزیز ناریٹ اردو بازار لاہور - 7247414

اسٹاکس:- علی بک سٹل

لبست روڈ چوک میو ہسپتال لاہور - 7223853

لہو کا سلسلہ

محمود احمد مودی

قیمت ۱۵۰/- ڈاک خرچ ۲۰/-

علی میاں سبلی کمیشن عزیز ناریٹ اردو بازار لاہور

سوار تھا جبکہ شکر ایک سرخ رنگ کی ڈانسن پر جا رہا تھا۔ ادا علی نے کچھ دور تک شکر کا پیچھا کیا لیکن پھر ایک چوراہے پر اسے کھو بیٹھا۔ ادا علی محض پولیس کالک قابل اعتبار نہیں تھا۔ اس کی اطلاع کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہی وہ جیسے حساس علاقے میں شکر جیسے مجرم کی موجودگی نے ہر طرف خطرے کی گھنٹیاں بجا دیں۔ تین چار دن زور شور سے کارروائی ہوئی لیکن شکر کی موجودگی کو کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہاں تک کہ شکر قتل کرنے والے افکار معضلہ پر گئے اور افسران یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ انسپکٹر ادا علی کو دھوکا ہوا ہے۔ وہ دہشت پسند ایک بڑے سرکاری عہدیدار نے شکر کو لاہور انٹرپورٹ پر دیکھا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ اسے ٹھیک طرح پہچان سکتا، وہ لوگوں کے جھوم میں کم ہو گیا۔ اس سرکاری عہدیدار کی کوئی گواہی کے بعد پولیس کو پختہ یقین ہو گیا کہ بدنام زمانہ شکر شہر ملک میں موجود ہے اور کسی خطا کار ارادے سے یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ سہا صاحب شکر کے بارے میں گراں قدر معلومات رکھتے تھے۔ انہیں اس لیے میں اسلام آباد طلب کیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ وہ شکر کو گرفتاری میں متعلقہ پولیس کی مدد کریں۔ سہا صاحب اپنی نگرانی میں کئی مقامات پر چھاپے پڑوائے مشکوک افراد کی پکڑ وھڑکی، انٹرپول سے رابطہ کیا لیکن ایک بھی نئی یا معلوم نہیں ہو سکی۔ اس طرح وہ ماہ گزر گئے۔ باخبر حلقوں میں سراسیمگی تو برقرار رہی لیکن تلاش کی سرگرمی ماند پڑ گئی۔ یہاں تک کہ چند روز پہلے میرے بیان نے ایک بار ادا علی کے سامنے معاملے میں جان دوڑا دی۔ میں نے شکر کو ہتھی کر کے میڈیکل اسٹور سے نکلے دیکھا تھا اور بہت قریب دیکھا تھا۔ سہا صاحب بھی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے میں شکر کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ میری اطلاع واہمہ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ مجھے تو خبر ہی نہیں تھی شکر کو اس سے پہلے پاکستان میں دیکھا گیا ہے۔ یوں ہی اطلاع کے فوراً بعد پولیس ایک بار پھر پوری حد تک متحرک ہوئی تھی۔ رہی سہی کسر ایس بی جیادیہ کے قتل پوری کردی تھی۔ اس قتل کے واقعے میں شکر گرفتاری سے متعلقہ دکان سے دے رہے تھے۔

میں اپنی سوچوں میں خفاں نہ رہا تھا۔ جب کار بارن نے چونکا دیا۔ یہ فریال کی گاڑی تھی۔ بارن ایک با تو پھر جیسی چلا گیا۔ اب اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ گاڑی میں خود فریال ہی ہے۔ میں نے

میں تھیں۔ سہا صاحب نے مجھے آگاہ کیا کہ انہوں نے فریال سے داری پر مجھے رہائی ملائی ہے اور افسران کو اس امر کی ضمانت دی ہے کہ شکر کا مسئلہ حل ہوتے ہی میں پھر خود کو نہیں دکھانے کے پھر کردوں گا۔

میں نے اس سلسلے میں سوچنے کے لیے سہا صاحب سے خود اداقت مانگا۔ وہ زیرک انسان تھے۔ جان چکے تھے کہ میری سوچ بچار ان کے حق میں ہی جائے گی۔ انہوں نے بلا جھجھکت مجھے صلت دے دی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ سہا صاحب کی طرف سے ادا جگہ کی طرف سے پریشان ہونے کی گنجائش اب قطعی ضرورت نہیں۔ وہ دونوں ان کے ساتھ ان کی کوئی بھی نہیں ہیں کی اور ان کی طرف سے ایک لمحے کی غفلت بھی نہیں برتی جائے گی۔ میں خود بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس وقت انجم اور شکر کے لیے سہا صاحب کی کوئی بھی بستر ٹھکانا اور کوئی نہیں۔ سہا صاحب کی محفوظ محل وقوع والی کوئی بھی ہر طرح مناسب تھی۔ ویسے بھی جب سے سہا صاحب کے قتل کی سازش کا انکشاف ہوا تھا، سرکاری طور پر وہاں پولیس گارڈز تھیں۔ کوئی بھی نئی اور اب وہاں چڑھا بھی نہیں جا سکتی تھی۔ سہا صاحب نے شکر کو پناہ دینے کا اعلان کر دیا تو میری ایک بڑی الجھن رفع ہوئی اور میں وہی طور پر شکر سے نبھنا آنا ہونے کے لیے تقریباً آمادہ ہو گیا۔

○●○

رات کے گیارہ بجے تھے۔ صفدر ڈرائنگ روم میں صوفے پر سو رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں انجم اور شکر جو خواب تھیں۔ اصولاً اس وقت مجھے بھی سو جانا چاہیے تھا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں نے سگریٹ نکال کر ادا پر ہر آدمے میں گشت کرنے لگا۔ جسم میں عجیب سی حرارت جاگنی ہوئی تھی۔ لہذا جیست ہوائے مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہیں کیا۔ میرے ذہن کے افق پر شکر کی شخصیت صورت ایک غبار کی طرح چھانے لگی۔ اس شخص سے کچھ آگاہ ہو کر اسے کبھی کرنا ایک پہچانا میرا ایک دیرینہ خواب تھا۔ تاہم گرفتاری پیش کرنے کے بعد میں نے بھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس خواب کی تعبیر مل سکے گی۔ اب آگاہانہ حالات نے پتا دکھایا تھا اور میں خود کو اپنے اس دیرینہ حریف کے رو بہ بار رہا تھا۔ مجھے اب تک جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق شکر کو تین ماہ پیشتر جیل مرتبہ اسلام آباد کے سیکڑ ۳۳ میں رکھا گیا تھا۔ اسے شناخت کرنے والا

کرنے آتی تھی؟ ممکن میں نے بھاگ کر گیت کھولا اور فریال کی گاڑی ایک فزائے سے اندر آگئی۔ انجی بند کر کے وہ بڑے ادا انداز میں نیچے آگئی۔ سفید شلوار قمیض پر اس نے سرخ رنگ کا ڈھیلا ڈھالا سوٹر پہن رکھا تھا۔ مجھے بالوں کی پونی تیل کندھوں پر بچھ کر رہی تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے بھی وہ صبح کو کی طرح تروتازہ نظر آ رہی تھی۔

”ہائے اللہ“ آپ جاگ رہے ہیں؟“ وہ مخصوص انداز میں آنکھیں نکھار کر بولی۔ مجھے یقین تھا پورا یقین تھا۔ فریال جی کو دیکھی کرتے آپ بھی چین سے نہیں سو سکیں گے۔ بندہ پوچھے، کس حکیم نے مشورہ دیا تھا آپ کو کہ فریال جیسی مردان سے ایسا رویہ اختیار کریں۔ تو بے اللہ۔ تو بے اللہ۔ بے فوجی اور سردمہری کی بھی حد ہوتی ہے۔ میں ہوتی فریال جی کی جگہ تو جی آپ کو منافق نہ کرتی۔ زندگی بھر صورت نہ دکھائی آپ کو۔ بہر حال، غوال جی کا دل بڑا نرم ہے۔ مجھے یقین ہے، آپ صدیق دل سے کو شش کریں تو وہ ہر سچ جانیں گی۔ کچھ غبار میں بھی کوسوں کی آپ کی کچھ شہتا بھی کرے گی۔ بلکہ بلکہ میرا خیال ہے آپ تو رہے ہی دیں ہم دونوں خود ہی منائیں گے۔ فریال جی کو آپ تو آواز ہی ہیں۔ کام سنو اس کے گے تو اور بگڑ جائے گا۔ بس آپ چپکے رہیں، ہم خود سنبھال لیں گی دونوں۔“ وہ بولی تو ان اشاپ بولی ہی چلی گئی۔

میں نے اس کی بات کافی ”آپ غلط فہمی دور فرمائیے نہیں کسی پچھتاوے میں یہاں نہیں ٹھہر رہا۔ نہ ہی میرے ذہن میں آپ کی فریال جی کا خیال ہے۔ کچھ اور مسائل ہیں میرے لیکن باقی دی وے آپ نصف شب کے بعد یہاں ایسے نمودار ہو رہی ہیں؟“

”وہ ناک سمجھو کر بولی“ جب آپ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ میں اوٹ پانگ لڑکی ہوں اور میری کوئی کل سیدھی نہیں تو پھر یہ سوال کر کے آپ خود کو اوٹ پانگ کیوں ثابت کر رہے ہیں؟“

میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ”فریال! تمہارے پایا کو معلوم ہو کہ تم اس وقت یہاں ہو تو وہ کیا سوچیں گے؟“

وہ بولی ”دیکھیں شاہ جہاں صاحب! میں کئی بار عرض کر چکی ہوں کہ آپ میری فکر میں ڈپلے نہ ہوں۔ میرے پایا مجھے کچھ نہیں کہتے، ہاں اگر آپ خواہ خواہ میرے پایا سے خوف کھاتے ہیں تو یہ اور بات ہے۔ یعنی خوف کی گیند میری ڈی میں نہیں، آپ کی ڈی میں ہے۔ اگر کبھی کر سکتے ہیں تو کر سکتے ہیں۔“

میں گہری سانس لے کر ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا ”کیا میں اس وقت آنے کا مقصد پوچھ سکتا ہوں؟“

”بالکل پوچھ سکتے ہیں۔“ وہ بڑے طے سے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کھنکھن“ میں نے عاجزی سے کہا۔

وہ بولی ”آج میں بہت خوش ہوں لیکن ساتھ ساتھ ڈر بھی رہی ہوں۔ بالکل وہی حالت ہے جو کوئی اہم سچ شروع ہوتے وقت ہوتی ہے۔ سچی بات ہے۔ شاہ جہاں صاحب! میں آپ کو ایک بار پھر انکسٹن میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اسی جہاں اسٹار کے روپ میں جو ہر خطرے میں بلا جھجھک کود پڑتا تھا جو لڑتا پھرتا تھا، چلتا چھٹتا تھا، بنگاہہ فزائی کرتا تھا اور جس مقام سے گزرتا تھا ایک کمانی چھوڑ جاتا تھا لیکن اس بات کا اندیشہ بھی ہے کہ آپ کے سامنے شکر جیسا خطرناک شخص ہے۔ میں نے پایا کی انماری میں اس کی فائل دیکھی ہے۔ بہت ڈر لگا ہے مجھے یہ فائل پڑھ کر۔ یوں محسوس ہوتا ہے اس فائل میں کئی انسان کا نہیں، درندے کا تھک رہا ہے۔“

”پھر اب کیا کروں میں؟“ میں نے بے زاری سے پوچھا۔

”آپ کو ہماری خاطر بہت احتیاط کرنا ہوگی۔“

”مشائخ کن کی خاطر؟“

”میری خاطر، شکر کی خاطر اور۔۔۔ سب سے بڑھ کر فریال جی کی خاطر۔“

عجب اول جلول لڑکی تھی۔ یوں بات کر رہی تھی جیسے واقعی کوئی سچ ہونے والا ہے۔ میں پینڈ باندھے بے بازی کے لیے تیار بیٹھا ہوں اور وہ ایک پرستار کی حیثیت سے مجھے سنبھل کر کھیلنے کا مشورہ دے رہی ہے۔ میں نے سگریٹ کا سمرکس لے کر کہا ”تمہارے ذہن میں یہ خیال کیسے آیا کہ میں واقعی اس کام کے لیے تیار ہوں۔“

”کس کام کے لیے؟“

”جی، شکر کی گرفتاری میں مدد دینے کے لیے۔“

”مجھے ایک سو سو فیصد یقین ہے کہ آپ یہ کام کریں گے اور ضرور کریں گے۔ جناب! اتنی کوڑھ منتر نہیں ہوں میں۔ سو میٹر سے گھلاڑی کو دیکھ کر اس کا ارادہ بھانپ لیتی ہوں۔ آپ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہنا۔ کیا آپ اس کام کے لیے آمادہ نہیں ہو چکے۔ کچھ اپنے دل پر ہاتھ۔“

اس نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑ لایا۔ میرے سینے پر رکھ دیا۔ اس نکتہ میں وہ ایک بار پھر میرے بہت قریب آگئی تھی۔

اتنی قریب کہ مجھے اس سے ڈر لگنے لگا۔ میں نے اسے دھکیل کر دور بناتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے میں مانتا ہوں" سب کچھ مانتا ہوں۔"

وہ بولی "اتنی آسانی کے ساتھ نہیں جاؤں گی یہاں سے آپ کو تفصیل بتانا پڑے گی۔"

"کیسی تفصیل؟"

"اف! اف!" اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا "عجب بے ذہنکے آدمی ہیں۔ اگر آپ یہ بات مانتے ہیں کہ آپ نے شکر کی تلاش میں پولیس سے تعاون کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو یقیناً آپ کے ذہن میں کوئی پلان بھی ہوگا۔ لیکن آپ کیسے تعاون کریں گے۔ بدون شک انہیں کراٹھ نکل کر پھرتے ہوں گے یا کسی لاش اٹھانے والے کو بھی ساتھ لے جائیں گے؟ کم۔ میرا مطلب ہے شکر کی لاش۔ پھر یہ کہ علی الاطلاق میدان میں کود پڑیں گے یا رازداری سے اس کا زیر میں حصہ لیں گے؟ جسمانی جہاد کریں گے یا اخلاقی نصیحت فرمائیں گے؟"

فریال کا سوال واقعی اہم تھا۔ اس نے جس نقطہ پر انگلی رکھی تھی اس میں پچھلے ایک گھنٹے سے اسی پر سوچ بچار کر رہا تھا۔ سہی صاحب نے مجھ سے بے شمار توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ ان توقعات پر پورا اترنے کے لیے ضروری تھا کہ میں اپنی تمام تر توانائی بروئے کار لاؤں۔ میں نے نیا سکرپٹ منگا کر کرکری کی پشت سے نیک لگائی اور فریال کی حسین آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "لیں لی برکت کو جاتی ہو؟"

"کیوں نہیں۔ برکت صاحب ہی شکر کا کیس پنڈل کر رہے ہیں۔ پچھلے ہفتے وہ ایک چھاپا مار پارٹی کے ساتھ تھتیا چلی گئے ہوئے تھے۔"

"بالکل وہی برکت صاحب" میں نے تصدیق کی "میرا خیال ہے کہ سہی صاحب مجھے عام الہکار کی حیثیت سے برکت صاحب کی ٹیم میں شامل کریں۔ میرا مطلب ہے کانٹیشیل یا بیڈ کانٹیشیل کے طور پر۔ یوں میں برکت صاحب کے قریب رہ کر ان کا طریقہ کار دیکھ لوں گا اور جہاں میرے تعاون کی ضرورت ہوگی وہاں تعاون بھی کرپوں گا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ شکر میری موجودگی سے اطمینان کرے گا۔"

فریال نے ماہر سراغ رساں کی طرح کٹپٹی پر انگلی رکھی۔ اس کا یہ انداز بالکل سہی صاحب سے متا تھا۔ پھر سچ نیچے میں بولی "آپ کا فیصلہ مناسب ہے۔ آپ کی جگہ میں دوتی تو جانتا اسی نتیجے پر پہنچتی لیکن اس کام میں ایک دشواری ہے۔ کیا آپ اس سے پہلے برکت صاحب سے ملے ہیں؟"

"نہیں" بالشت فو ملاقات تو نہیں ہوئی۔ محل سہی

صاحب نے بیڈ کو اور زمین ذکر کیا تھا۔"

"اوہ اچھا" اس نے ہونٹ سکڑے پھر حسب عادت ایک دم پھڑکی سے آخری۔ سو سڑکی آستینیں چڑھا کر ٹینس شوز کے کسے حوصلے لگی۔

"کیا کر رہی ہو؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"آج شام ٹیم کے بعد نمائی نہیں ہونے کے کوئی چاہ رہا ہے۔"

"کیا! میں جیت سے تقریباً چھپ چلا۔"

"ہاں" نمائے کو جی چاہ رہا ہے۔ مستکی سی چھائی ہوئی ہے۔ آپ کے ہاتھ میں ایک شاوہ ملے کر ابھی نکل آئی ہوں۔"

میں سٹنا کر رہ گیا۔ رات کے بارہ بجے میرے کمرے میں اور پھر میرے ہاتھ روم میں شاور کوئی دیکھ لیتا تو کیا سوچتا... عجب آفت لڑکی تھی۔ میں نے کہا "تمہارا داغ تو ٹھیک ہے۔ اس وقت نمائے کو" اتنی سروی میں! یہاں کیگز وغیرہ نہیں ہے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی ہے۔ اندر رہی بڑی ہڈی جاتی۔"

وہ بولی "سب فکر رہیں آپ مجھے کچھ نہیں ہوگا ٹھنڈے پانی سے۔ بڑی حرارت ہے میرے اندر۔" حرارت کا لفظ اس نے بے اتہا مصروفیت سے استعمال کیا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا وہ مذاق کر رہی ہے لیکن وہ سنجیدہ تھی۔ سچ سچ نمائے پر آمادہ نظر آتی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں میری چھوٹی بہن سو رہی تھی۔ میں بیکار کر رہ گیا۔ بہتر یہی سمجھا کہ اونچی آواز میں تکرار کرنے کے بجائے اس مصیبت کو اٹھا کر گاڑی میں پیچنک آؤں۔ غالباً وہ میرا ارادہ بھانپ گئی تھی۔ تیزی سے آگے بڑھی اور دروازہ منتقل کر کے چالی گرماں میں پہنچادی "جی نہیں" آپ بیس رہتے کوئی ضرورت نہیں ہے ٹھنڈے کی۔"

اب میرا بیڈ صبر لیریز ہو چکا تھا۔ میں نے سر دلیہ میں کہا "اچھا کل مت بوفریل۔ اپنی عزت کا نہیں تو کسی دوسرے کی عزت کا خیال کرو۔"

وہ چپک کر بولی "میرے شاور لینے سے آپ کی عزت کو کون سا مرض لاحق ہو جائے گا۔ آخر میں ملے۔ دماغ میں اپنی سیدھی سوجیں آ رہی ہیں۔ ذہن صاف ہو تو یوں خبرائیں آپ میرے شاور لینے سے۔"

"فریال! چالی مجھے دے دو۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"نہیں دوں گی" وہ ترکی بہ ترکی بولی "اب تو میں یہ ہاتھ روم استعمال کر کے رہوں گی۔"

میں اس کے روئے پر حیران ہو رہا تھا۔ کچھ میں نہیں آ رہا تھا، سہی صاحب کی اس بے سرو پا بچی کو کیسے پنڈل کروں۔ کیا کہ وہ کلکلا کر جس دی۔ چالی میرے حوالے کرتے ہوئے بولی "دیکھا ہو کھلا گئے۔۔۔۔۔ مجھے خدشہ ہے" آپ برکت صاحب کے ساتھ چل نہیں سکیں گے۔"

کیا تک مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میرے ساتھ کوئی ڈراما کر رہی تھی۔ اپنے چکراتے ذہن کو سنبھالا دے کر میں نے پوچھا "کیا تمنا چاہ رہی ہو؟"

وہ صوفے پر پھیل گئی "تمنا یہ چاہ رہی ہوں جناب کہ برکت صاحب کے ساتھ رہنا آسان کام نہیں ہے۔ اپنی طرز کے عجب گھر رکھ دھندے ہیں موصوف۔ اب دیکھیں میں نے اتنی غلط بات کی۔ رات کے بارہ بجے ٹھنڈے خوار پانی سے نمائے کا ارادہ کیا، وہ بھی آپ کے کمرے میں اور پھر آپ کو کمرے سے نکلنے بھی نہیں دیا۔ ان تمام احتیاجات باتوں کے باوجود میں نے آپ کو ڈانٹا بھی۔ بس سمجھ لیں یہ ایک مثال ہے برکت صاحب کے روئے کی۔ وہ بھی ایسی ہی خرافات انجام دیں گے اور پھر آپ کو ڈانٹ بھی پلا میں گئے وہ عمارہ ہے۔۔۔۔۔ زبردست کا ٹھیکہ گا۔ پتا نہیں کس پر بس وہی حال ہے برکت صاحب کا۔ ان کے ساتھ رہنے کے لیے آپ کو لوہے کے اعصاب کی ضرورت ہوگی۔"

میں نے دل میں سوچا "اے قہقہہ پرور لڑکی! جو شخص تجربے ساتھ ایک گھنٹہ گزار سکتا ہے وہ ہزار قسمی و سادی آفت کا مقابلہ کر سکتا ہے۔" شاید یہی بات میں زبان سے بھی کہہ دیتا لیکن اچانک مجھے خاموش ہونا پڑا۔ قریب رکھے فون کی تھنکی بجا رہی تھی۔

میں نے ریسور اٹھایا، دوسری طرف سہی صاحب تھے ان کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک بستر سے دور ہیں۔ کہنے لگے "شاہ جہاں! میں نے کل تم سے ایس پی برکت کا ذکر کیا تھا۔ برکت آن علی الصلاح ایک اہم شخص ہے۔ پوچھ چمک کر نے شیخ پورہ جا رہا ہے۔ اگر تم ساتھ جانا چاہو تو تھپ جاؤ" ہو سکتا ہے کوئی ڈاکٹر کی بات معلوم ہو جائے۔"

میرے پوچھنے پر سہی صاحب نے بتایا کہ اس شخص کا نام مالک محمد ہے۔ کئی عرصے قبل کالی علاقے میں رہا ہے۔ اب یہاں شیخ پورہ میں اس نے ایک بڑی کوٹھی بنائی ہوئی ہے اور بہر اپنی کا کام کرتا ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ جراثیم پیشہ لوگوں سے مالک محمد کے تعلقات ہیں۔ اس پر قادر زمان سے مل کر مل رکھنے کا شہرہ بھی کیا جا رہا ہے۔

میں نے کہا "جناب! اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو میں

چلا جاتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنی اصل حیثیت میں مانتے نہ آؤں بلکہ برکت صاحب بھی میری اصلیت سے بے خبری رہیں تو بہتر ہے میرا خیال ہے آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔ اگر مجھے ایک عام ایس الہکار کی حیثیت سے برکت صاحب کے ساتھ لڑی کرنا جائے تو مناسب ہے۔"

سہی صاحب جلد ہی میرا مدعا سمجھ گئے انہوں نے کہا کہ وہ ابھی ٹھوڑی دیر میں مجھے پھر رنگ کرتے ہیں یا ہو سکتا ہے خود ہی آجائیں۔ فون بند کر کے میں نے فریال کو مڑوا دیا۔ کہ اس کے پایا جانی خود یہاں تشریف لارہے ہیں۔ اس کا رد عمل میری ہمتا کے عین مطابق تھا۔ وہ گھر آکر جلد ہی جلدی جوتے پہنتے گئی اور گھنٹوں کی مصروفیت منٹوں میں سمیٹ کر وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئی۔ رات دن جیسے اس کے لیے ایک برابر تھے سہی صاحب نے دوسری مرتبہ رات دو بجے رنگ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ تمام انتظام ہو گیا ہے۔ میں مرکزی تھانے کے بیڈ کانٹیشیل احسان الہی کی حیثیت سے برکت صاحب کے ساتھ جاؤں گا۔ انہوں نے مجھے ایک شناختی نمبر بھی دیا۔ اس کے علاوہ یہ بتایا کہ میری سرکاری رات نقل اور سفید شلوار کیس وہ ڈرائیور غار کے ہاتھ مجھے سمجھ رہے ہیں۔

اس روز علی الصباح چار بجے ہم دو کاروں پر سوار لاہور سے شیخ پورہ روانہ ہوئے۔ اس پولیس پارٹی میں ایس پی برکت اور انسپکٹر باجوہ کے علاوہ سات الہکار تھے۔ انھوں میں تھا جو الہکار تھا بھی اور نہیں بھی۔ دیگر تین کانٹیشیل حضرات کی طرح میرے پاس بھی بارہ بور کی آئوٹنگ رات نقل تھی۔ دو کانٹیشیل وردی میں تھے اور دو بغیر وردی کے جن میں ایک میں تھا۔ جناب برکت صاحب کا مزاج ویسیا ہی تند و تیز پایا جیسا سنا تھا۔ وہ دیکھنے مٹانے سے تعلق رکھنے والے ایک چودہری ٹائپ آفیسر تھے۔ قد تقریباً چھ فٹ، توند ٹھوڑی سی لگی ہوئی۔ پورے جسم اور کاٹوں پر بے تحاشا بال۔ بات کرتے تھے توند سے پھر تھرتے تھے۔ بہر حال وہ ایس پی تھے اور اگر ایس پی تھے تو کوئی وجہ تھی۔ سہی صاحب ان سے میرا نام بتا کر تعارف کرا چکے تھے اس تعارف کے مطابق میں پولیس کا ایک ہونزار اور نذر رات نقل میں تھا۔ اتنی پولیس مقابلوں میں حصہ لے چکا تھا اور ہر وقت جان بچھلی پر لیے پھرتا تھا۔ اس مٹا کر کن تعارف کے باوجود ایس پی صاحب نے مجھے آغا ز ہی میں "اوئے کیو" کہہ کر مخاطب کیا۔ پھر طرز خطاب بتدریج رنج کر لیتا اور کیسا ہوتا گیا۔ یہاں تک

کہ شیخ پورہ کے نواح میں پہنچے پہنچے وہ دھڑلے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی روائی سے "بھوتی را" کہنے لگے۔ بھوتی را ان کا تکیہ کلام بھی تھا۔ ہر دو تین قہقروں کے بعد "بھوتی را" ان کی گفتگو میں در آتا تھا۔ مثلاً تراست بھوتی را ایسا ہی ہوتا جا چکا ہے۔ وہ دیکھو اس بھوتی دے بس والے کو کیسے ماں کو بچوں سے چلا رہا ہے۔ اوسے شوکے "بھوتی دے اپنی طرف والی کھڑی بند کر" وغیرہ وغیرہ اس کے علاوہ بھی چند ایک گالیاں تھیں جو وہ روائی سے ڈہرا رہے تھے۔ ایس بی برکت اور اسپیکر باجوہ کے درمیان گاہے گاہے جو گفتگو ہوتی تھی اس سے پتا چلا کہ مالک محمد پر بڑا بڑا ہاتھ ڈالا جا رہا ہے لیکن یہ ہاتھ اس طرح ڈالا جا رہا ہے کہ مالک محمد کی گرفتاری کو قادر زمان والے معاملے سے مخفی نہ کیا جاسکے۔ مالک محمد کو ایک ڈیڑھ برس پرانے کیس کے سلسلے میں گرفتار کیا جا رہا تھا۔ اس کیس میں مالک محمد پر ایک اہم مجرم کو اغوا کرنے، جسے بیجا میں رکھنے اور شدید جسمانی ضرر پہنچانے کے الزامات تھے۔ امام مسجد کو دونوں ٹائیکس نوٹ گئی تھیں اور پانچ چوہاہ بعد زخم خراب ہونے کے سبب وہ چل رہا تھا۔ ہماری منزل شیخ پورہ سے تقریباً سات میل شمال کی طرف تھی۔ درختوں میں گھرا ہوا یہ ایک نیم پختہ قصبہ تھا۔ یہاں تک پہنچنے والا راستہ بھی نیم پختہ ہی تھا۔ ہماری گاڑیاں دھول اڑاتی اور ہچکلے کھاتی سات بجے کے قریب ایک شاندار کوٹھی کے سامنے جا کر کھیں۔ یہ کوٹھی قصبے کے ٹاٹ میں "محل کا بیوند" نظر آتی تھی۔ اندرونی عمارت کے سامنے کافی کھڑا گراسی لان تھا۔ اس لان میں بیت ناک صورت والا ایک کتا بندھا تھا اور خوب صورت رنگوں والے دو مورسل رہے تھے۔ میں نے دیکھا "وہ ملازم صورت افراد کو ٹھی کی بیوی دیوار پر سفیدی پھیر رہے تھے۔ یہ سفیدی آرائش کے لیے نہیں تھی بلکہ اس کے نیچے کچھ عربیے بچھائے جا رہے تھے۔ غالب رات کے اندر میرے میں کوئی کوٹھی کی دیوار پر کچھ لکھ گیا تھا۔ کوٹھی کے گمران میں صرف ایک سوزوکی دین کھڑی تھی جسے دیکھ کر اسپیکر باجوہ نے شب بظاہر کیا کہ "مخلوبہ" شخص گھر میں نہیں ہے۔ گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے پولیس کی آمد کو حیرت اور خوف کے لحاظ سے ساتھ دیکھا۔ فوراً اندر اطلاع پہنچائی گئی۔ سفید بالوں اور گول منہ مالک والا ایک اوجڑ عمر شخص سلیر پہنے برآمد ہوا۔ اس نے اپنا نام رمضان بتایا اور کہا کہ وہ شیتھ نویس سے اور پرانی کے کام میں مالک محمد کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مالک محمد کا ملازم خاص ہے۔ اس نے انکشاف کیا کہ

مالک صاحب علی الصباح لاہور چلے گئے تھے۔ ان کی رہائی دس بجے تک ہوئی۔ ایس بی برکت نے کوٹھی کا مین روم کھلوا دیا اور کار اندر پارک کر دی۔ پھر اسپیکر باجوہ کو برایت کی کہ وہ اسپیکر باجوہ کے ساتھ فوراً قصبے کے باکے پر چلا جائے اور یہی مالک محمد واپس پہنچے "اسے ساتھ لے کر یہاں آجائے" اسپیکر باجوہ نے حکم کی تعمیل کی۔ ہم ایس بی برکت کے ساتھ کوٹھی میں آگئے۔ یہاں برآمدے میں ایک اوجڑ عمر عورت تین بچوں کو لے کر کھڑی تھی۔ تینوں لڑکے تھے۔ وہ سب پریشان نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک بچے کی عمر سات سال کے قریب تھی، پتھلا انداز چار سال کا اور چھوٹا دو سال کا تھا۔ چھوٹے دونوں بچوں کا رنگ گندمی اور بال گھونٹے والے تھے۔ جبکہ بڑا بچہ بت گورا چٹا اور تھیکے نقوش والا تھا۔ اس کی آنکھوں کا رنگ بھی بادامی تھا۔ مالک محمد کے ملازم خاص رمضان نے ہمیں ڈرائنگ روم میں پھیلایا۔ وسیع ڈرائنگ روم کی آرائش سے جہاں دولت مندی کا اظہار ہوتا تھا وہاں یہ بھی پتا چلتا تھا کہ اس سجاوٹ میں کسی باؤڈق خانوں کا ہاتھ ہے۔ ایس بی برکت نے رمضان سے چند سوالات کرنے کے بعد اسے باہر بھیج دیا اور اس اوجڑ عمر خادمہ کو بلایا جو برآمدے میں بچوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ عورت کا نام بشیراں تھا۔ وہ عام سی رستمن نظر آتی تھی "اپنی معاشی مجبوریوں کے سبب زمینداروں اور چور دیروں کے گھروں میں کام کرنے والی" بچے بھلانے والی "برتن مانجنے والی اور بچا کھانا پکائی چادر کے پلو سے زخاں کرکھ لے جانے والی۔ پولیس کی آمد سے وہ بہت خوف زدہ تھی۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بتایا کہ اس گھر میں خدمت انجام دینے کے بارے میں اس کی معلومات بہت کم ہیں۔ ایس بی نے ڈانٹتے ہوئے کہا "میں بھوتی را جو کچھ اس کر رہا ہوں وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ جتنا بھی جانتی ہو بتاؤ۔ جتنا بھی جانتی ہو۔" بشیراں نامی یہ ملازمہ اور سہم گئی۔ وہ رو دینے کے قریب تھی۔ پولیس سے تو ذریعہ رہی تھی "اپنے مالک سے بھی خوف زدہ تھی کہ معلوم نہیں وہ بعد میں اس سے کیا سلوک کرے۔ میں اسے سختی دے بغیر نہ رہ سکا۔" کچھ اڑنا ماسی۔ ہمارے ہوتے کوئی تمہارا بال بکا نہیں کر سکتا۔ جو بھی جانتی ہو بھگ کر بتاؤ۔"

میرا فقرہ نشانہ پر لگا۔ عورت قدرے ہر سکون نظر آنے لگی لیکن ایس بی صاحب کو میری یہ دخل در معطلات پسند نہیں آئی۔ انہوں نے جلتی نظروں سے مجھے گھورا جیسے بہ زبان خاموشی فرما رہے ہوں "کا کا ملی اتوینہ کا شیل ہے" اپنی اوقات میں رہہ ورنہ میں بھوتی را بڑا خردشاں ہوں۔ عورت نے ایس بی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ مالک محمد کی بیوی گھر میں نہیں ہے۔ اسے گئے ہوئے پانچ چوہاہ ہوئے ہیں۔ غالب وہ روٹھ کر گئی ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں مالک محمد کو بچے سنبھالنے میں بہت دشواری تھی۔ اس نے بچوں کے لیے دو تین آیا دیے ہیں "اب پچھلے ایک ماہ سے وہ یہاں کام کر رہی ہے۔ ایس بی برکت نے تینوں بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ بچے مالک محمد کے ہیں؟" "جی جی حضور" عورت نے ہکا کر کہا۔ پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی "مم" مجھے تو یقین ہے۔" "کیا مطلب! اس میں شک والی کون سی بات ہے؟" "یہ۔ بڑا لڑکا۔ شاید بی بی کے پہلے خاوند سے ہے لیکن مالک اسے اپنا ہی کہتا ہے۔" میں نے چونک کر بڑے لڑکے کو دیکھا۔ چلی نگاہی میں وہ مجھے دوسرے دونوں بچوں سے مختلف نظر آیا تھا۔ اب بشیراں کی بات سے اس خیال کی تصدیق ہو گئی تھی۔ ایس بی نے گورے بچے لڑکے کو گھور کر دیکھا، وہ کچھ اور سہم گیا "ادھر آؤ میرے پاس" ایس بی برکت نے انگلی سے اشارہ کیا۔ لڑکا لڑکھانا ہوا قریب آگیا "کیا نام ہے تمہارا؟" ایس بی نے پوچھا۔ وہ آنسو پھری نظروں سے بشیراں کی طرف دیکھنے لگا۔ بشیراں نے کہا "یہ بول نہیں سکتا۔ جانب۔ نماز کرو گونا گونا ہے۔" "کیا نام ہے اس کا؟" ایس بی نے بشیراں سے پوچھا۔ "مالک اسے یوسف کہتا ہے۔" "یہ شروع سے مالک کے ساتھ ہے؟" "نہیں جی، کوئی چار مہینے ہوئے ہیں اسے یہاں۔ بی بی کے جانے کے دو ماہ بعد یہاں آیا تھا۔ میں ملازم ہوئی تو مالک نے مجھ سے کہا تھا "یہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ اس کا خیال دوسرے دونوں بچوں کی طرح رکھنا۔" "قصبے کے لوگوں کا کیا خیال ہے؟" ایس بی نے پوچھا۔ "وہ تو کئی طرح کی باتیں بناتے ہیں جی۔ ان کا خیال ہے کہ یہ مالک کا نہیں بی بی کا بچہ ہے اور مالک اسے سوچتے ہیں۔"

ست جو محبت کر رہا ہے وہ دکھاوے کی ہے۔ ورنہ یہاں بیوی میں جھگڑے کی وجہ سے لڑکا ہے۔ مالک کو بی بی کی پہلی شادی کا پتا نہیں تھا۔ جب پتا چلا تو دونوں میں ٹھن کی اور وہ کچھ چھوڑ کر چلی گئی۔ کچھ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ۔۔۔ بشیراں بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔ "بات مکمل کرو" ایس بی برکت نے اسے جھڑا۔ "وہ جی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ۔۔۔ بی بی کی۔۔۔ ناجائز اولاد ہے۔" میں حیران ہو رہا تھا کہ مالک محمد جیسے با اثر اور بکے دار شخص پر لوگ اتنی آسانی سے الزام تراشی کر رہے ہیں۔ ایس بی نے بشیراں سے پوچھا "کیا بی بی بہت خوب صورت ہے؟" یہ سوال غیر ضروری تھا۔ ابھی بشیراں بتا چکی تھی کہ وہ بی بی کی گھر چھوڑنے کے بعد یہاں آئی تھی۔ ویسے بھی بچوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ان کی ماں خوش شکل رہی ہوگی۔ بشیراں بولی "میں نے تو بی بی کو نہیں دیکھا جی۔ ہاں لوگ کہتے ہیں کہ بی بی بہت خوب صورت ہے، بالکل کشمیرن لگتی ہے۔" یہ ایک بالکل غیر متعلقہ موضوع چھڑ گیا تھا۔ ہم یہاں مالک محمد کو ایک فوجداری کیس میں گرفتار کرنے آئے تھے۔ اس کے خاکی معاملات میں جھانکنے نہیں۔ بہر حال رقت گزارانے کے لیے یہ مصوفیت ٹھیک تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں مالک محمد کے تین ملازمین سے مالک کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ تینوں ملازمین میں سے کوئی بھی وثوق کے ساتھ نہیں بتا سکا کہ یوسف مالک کا بچہ ہے "بی بی کا" یا دونوں گا۔ ہاں مالک کا دعویٰ یہی تھا کہ یوسف چھوٹے دونوں بچوں کا سگا بھائی ہے اور اس کی پیدائش کوہاٹ میں ہوئی تھی جہاں وہ اپنی مانی کے پاس رہتا تھا۔ مالک محمد کے بارے میں پتا چلا کہ بیوی کے جانے کے بعد ست وہ خاصا اب سیٹ ہے۔ کاروبار میں دھیان بہت کم ہو گیا ہے۔ کوٹھی کے مردان خانے میں جا ہونے والی رقص و سہرو کی محفلیں ختم ہو چکی ہیں اور مشتبہ لوگوں کی آمد و رفت بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ خاص طور پر پچھلے تین چار ماہ سے وہ بہت بدلا نظر آتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مغربیہ وہ یہ مکان بچ کر گئیں اور شفت ہو رہا ہے۔ اس وقت ڈرائنگ روم کا وال کھاکا تو بج رہا تھا جب قصبے کے باہر سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ ایس بی کے

ساتھ ہم سب اچھل پڑے۔ فائرنگ پیلے رُک رُک کر ہوئی پھر ایک دم شدت اختیار کر گئی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ انسپٹر باجوہ اور اس کے ساتھیوں کی کسی سے ڈھمکے ہوئی ہے۔ غالب امکان یہی تھا کہ مخالف فریق مالک محمد سے وہ قریب جوار کے علاقے میں سب سے دھڑلے دار شخص تھا۔ چار پانچ مسلح کارندے ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔ پولیس پارٹی کا شروع لے لین تھا کہ وہ اتنی آسانی سے گئے گرفتاری پیش نہیں کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ چھاپا مار پارٹی پوری تیار سے آئی تھی۔ ایس بی کا اشارہ پاتے ہی ہم کاری کی طرف دوڑے ڈرائیور پیلے سے گاڑی میں موجود تھا۔ یونٹ لے کر کار مکان سے نکلے تھری طرح قصبے کے بیرونی راستے کی طرف بڑھی۔ قصبے کی گلیوں میں لوگوں کے چوڑے پر اس نظر آ رہا تھا۔ یہ تو وہ علی الصبح ہی جان چکے تھے کہ قصبے میں پولیس موجود ہے اور اب وہ "چور سبائی" والی دوڑ بھی دیکھ رہے تھے۔ جو سنی ہماری کار قصبے سے باہر نکلی دو سری پولیس کار نظر آ گئی۔ ایک تنگ راستے پر موڑ کاتے ہوئے وہ جوڑ میں گھس گئی تھی۔ بائیں طرف کے دونوں پہیے کچڑ میں دھسے ہوئے تھے اور ڈرائیور باہر نکلنے کے لیے جتنا زور لگا رہا تھا گاڑی گھوم گھوم کر اتنی ہی پستی جاری تھی۔ ہم قریب پہنچے تو پستوں کے اڑانے ہوئے کچڑے ہماری کاری دھڑا کر سن کر بھی تھرم گئی۔ کچھ گلاکایاں ایس بی صاحب اور ڈرائیور کے کپڑوں پر بھی ہوئیں۔ انسپٹر باجوہ ہنسایا ہوا گاڑی سے باہر نکلا۔ اس نے وایاں کندھا بائیں ہاتھ سے تھام رکھا تھا اور اٹھکیوں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اسے گولی لگی تھی۔ وہ چلا کر ایس بی برکت سے بولا "خودری صاحب! اچھا کریں وہ جا رہا ہے۔" اس نے اٹھکی سے ٹکرا اور ہائی کے کٹنے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ابھی تک کسی گاڑی کی آڑائی ہوئی دھول معلق تھی۔

ایس بی کے اشارے پر ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھائی۔ ڈیوٹا کوٹا چاول کے بکے ہوئے کیت میں دو دھٹ آچکی درختوں کی طرف لپک۔ جو سنی ہم پتہ راستے پر پہنچے آگے جانے والی گاڑی کی تنگ نظر آئی۔ یہ دو برس پرانے مال کی پجارد تھی۔ اپنے عقب میں دھول کے مرغولے چھوڑتی وہ برق رفتاری سے نہری کی طرف جاری تھی۔ اب اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ پولیس پارٹی پر فائرنگ کر کے بھاگنے والا مالک محمد ہی ہے۔ پیلے رنگ کی یہ پجارد اس کی ملکیت تھی۔ پجارد کی تنگ دیکھ کر ایس بی صاحب کے جوش و خروش میں زبردست اضافہ

ہو گیا۔ ہم نے راتھیں سونت لیں۔ راستہ ناموار تھا لہذا جب کو کار پر برتری حاصل تھی۔ یوں بھی ہمیں گردوغبار کی وجہ سے دشواری پیش آ رہی تھی۔ کوشش کے باوجود ہمارا ڈرائیور جب سے درمیانی فاصلہ کم نہیں کیا رہا تھا۔ یہ فاصلہ تقریباً ۲۰۰ میٹر تھا اور اتنی دوری سے جب پر فائرنگ کرنا لا حاصل تھا۔

تقریباً تین میل آگے اگر جب اجاگ زوایہ قائم ہو گھوم گئی۔ یہ ایک نیم پتہ راستہ تھا جو نیچے راستے کو قطع کرنا ہوا سر کے بل تک پہنچا تھا۔ ہماری کار ہچکولے کمانی اس نیم پتہ راستے پر چنچنی تو جب ایک بار پھر نظر آنے لگی۔ اس دفعہ مجھے جب کی نمبر پلٹ بھی صاف نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ جب سے ہمارا فاصلہ اتنا نہیں جتنا ہونا چاہیے۔ غالباً ہماری نظر سے اوچل ہو کر جب چند لمحوں کے لیے ٹھہر گئی تھی آہستہ ہوئی تھی۔ میرے خیال میں ایس بی سمیت ٹھہرے کے کسی فرد نے یہ بات نوٹ نہیں کی۔ ایس بی صاحب کو صرف یہ مسرت تھی کہ درمیانی فاصلہ کم ہو گیا ہے۔ نیم پتہ راستے پر آتے ہی جب کی برتری ختم ہوئی۔ پولیس کار نے تیزی سے فرار لے کر بھرے اور آٹا ناٹا جب کو جالیایا۔ کار کو نزدیک پہنچتے دیکھ کر جب سے راتھل کا فائر ہونے لگا۔ ہم نے بھی جواباً تازہ برکت کرنے کی کوشش کی۔ چلتی گاڑیوں میں ایسی کوشش شاذ و نادر ہی کامیاب ہوتی ہے۔ یہاں بھی صورت حال یہی رہی۔ تاہم کچھ آگے جا کر پجارد ایک گڑھے میں اچھلنے کے بعد ایک درخت سے جا ٹکرائی اور گھومتی ہوئی بجائیں میں گھس گئی۔ اس سے پہلے کہ جب کے دو دائرے کھلنے اور اندر موجود افراد فرار ہونے کی کوشش کرتے ہم سر پر پہنچ گئے۔ جب پجارد کا اٹکا دروازہ کھلا اور ڈرائیور نے نکل بھاگنے کے لیے اپنی ٹانگ باہر نکالی۔ میری گولی اس کے سر سے سناتی ہوئی گزری۔ اس نے گھبرا کر پجارد دروازہ بند کر لیا۔ اس دوران ایک ہیڈ کانسٹیبل کی گولی نے جب کا پچھلا شیشہ چکنا چور کر دیا۔ ہم بھاگتے ہوئے موڑ پر پہنچے اور اندر موجود افراد کو لگا کر بے بس کر دیا۔ یہ کل چار افراد تھے ان میں سے ڈرائیور خاصا ذہنی ہوا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون ابل ابل کر سفید قیاس کو انداز کر رہا تھا۔ ڈرائیور کی طرح باقی تین افراد بھی چھپے ہوئے بد محاش نظر آتے تھے ان میں سے دو کے پاس ریلو اور ایک کے پاس ایم جی راتھل تھی۔ اگر وہ حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے تو ہمیں کافی دیر پجارد سے دور رکھ سکتے تھے مگر پجارد کے کھرا جانے سے وہ یوں گھبرائے تھے کہ نکل

بھاگنے کے سرا اور کچھ سوچ ہی نہیں سکے تھے۔ ان افراد کو دیکھ کر ایس بی برکت کا چہرہ مایوسی کی آماجگاہ بن گیا اور مجھے یہ جاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ مالک محمد ان چار افراد میں موجود نہیں ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل نذیر اور ایمان اللہ نے آگے بڑھ کر لمحوں کے ہتھیار لے لیے۔ ایس بی برکت نے اپنے ۳۸ بورر اور کی ٹال ایک فرفر شخص کی گردن میں دھنساتے ہوئے پوچھا "کہاں ہے وہ تمہارا باپ مالک محمد؟"

"وہ ہمارے ساتھ نہیں تھا۔" فرفر شخص نے اپنے ہاتھ کے زخمی پنجے کو سلاتے ہوئے کہا۔

"تم نے پولیس پارٹی پر فائرنگ کیوں کی؟"

"مگر وہ واقعی پولیس والے تھے تو ہمیں براہ انفرس ہے۔ ان میں سے صرف ایک نے دروی پن رکھی تھی اور ہمارا خیال تھا کہ اس نے بہو پ بھرا ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ ہمارے ساتھ آیا ہو چکا ہے۔ چلی پولیس والوں نے ہماری بیپ روک کر ایک بندے کو پھنسا دیا تھا۔"

ایس بی برکت نے اپنے مخصوص قنایاں نہ لے کر "مصلحتی نقل کی پچان تو اب بڑے گھر میں نہیں اچھی طرح کرانی جائے گی۔ ویسے اس وقت تم آگاہ سے رہے ہو؟"

"فیصل آباد سے۔ وہاں ایک دوست کی شادی تھی۔"

گاڑی میں دو ہتھیاریاں موجود تھیں۔ ان کی مدد سے چاروں لمزموں کے ہاتھ جکڑ دیے گئے۔ اس کے بعد جب کی ملاشی لی گئی۔ نشستوں کے نیچے سے شرابی کی ایک خالی بوتل اور کچھ گولیاں برآمد ہوئیں۔ جب کا انجی مٹس ہو چکا تھا۔ گاڑی کے کاغذات ایس بی برکت نے قبضے میں لے لیے۔ اب ایس بی کو واپس قصبے میں پہنچنے کی جلدی تھی۔ اصل لمز ہاتھ نہیں آیا تھا اور اس کے ہاتھ آٹکے تھے۔ یہ "چھاپا" طبعی ناکام تھا۔ چاروں لمزموں کو پولیس کار میں ٹھونس دیا گیا۔ کار میں جگہ نہ ہونے کے سبب مجھے اور ہیڈ کانسٹیبل نذیر کو پیدل مارچ کا حکم ہوا۔ کار دھول آڑائی قصبے کی طرف روانہ ہوئی تو ہیڈ کانسٹیبل نذیر نے ایس بی برکت کو غائبانہ کوسنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے افسر اعلیٰ سے خاصا ناخوش دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اپنے تمام توجہات کو ایک قہرے میں سیٹھتے ہوئے کہا کہ ایس بی برکت کے نیچے کام کرنے سے بہتر ہے آدمی کسی روڈ روڑے کے نیچے مگر کام تمام کرالے۔

دہلی راتھیں اور ایمو نیشن اٹھاراب ہمیں تقریباً چار میل پیدل مارچ کرنا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نذیر کو تھوڑی بہت

کیکنی جانے کا دعویٰ تھا۔ کہنے لگا "کیوں نہ جب اشارت کرنے کی کوشش کی جائے۔" مجھے ہلاک کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا "مگر کے دیکھ لو" وہ بوٹ اٹھا کر مختلف جڑوں سے جھیز جھاز کرنے لگا۔ میرے ذہن میں بار بار دو فراتھک جھجے کا وہ سوز گھوم رہا تھا جہاں پہنچ کر جب کی رفتار اچانک کم ہو گئی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ مالک محمد جب میں موجود ہو اور اسے وہاں آ رہا دیکھا ہو۔ لمحہ بہ لمحہ یہ شبہ میرے اندر تقویت پکڑ رہا تھا۔ میں نے نذیر کو جب سے لپکتے چھوڑا اور خود دھجے قدموں سے اس اندھے موڑ کی طرف چل دیا۔ راتھل بدستور میرے کندھے سے جھول رہی تھی۔ یہ سارا علاقہ سرکنڈوں اور بجائیںوں سے اٹا ہوا تھا۔ آباد زمین دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ جس موڑ پر جب کی رفتار دھبی ہوئی تھی وہاں خامے اونچے سرکنڈے تھے۔ میں بجائے نظروں سے دایں بائیں دیکھ رہا تھا۔ چانک میری نظر ایک چیز پر جم کر رہ گئی۔ یہ سگرت کا ایک پیکٹ تھا۔ کرنے سے پیکٹ کاغذ کھل گیا تھا اور اس میں سے سگرت بھاگ رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ پیکٹ کسی کی جب سے گرا ہے یا ایک میرے رگ شے اگر گھٹے چار برس پہلے کا استاد جانی پوری توانائی سے میرے اندر بے دار ہونے لگا۔ میری چھٹی حس نے واشگاف اعلان کیا کہ اطراف کے سرکنڈوں میں کوئی موجود ہے۔ میں نے راتھل کندھے سے اٹاری۔ سنی بیج بنایا اور دے قدموں سرکنڈوں میں داخل ہو گیا۔ جب کو درخت سے گھراے ابھی پندرہ منٹ سے زائد نہیں ہوئے تھے۔ اگر چلتی جب سے واقعی کوئی اڑتا تھا تو میں ممکن تھا وہ ابھی انہی سرکنڈوں میں ہو۔ ذہن میں اٹھنے والے سوال کا جواب کبھی کبھی بندے کو اتنی سرعت سے ملتا ہے کہ وہ حیران رہ جاتا ہے۔ میں نے ابھی سرکنڈوں میں چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ زوردار دھماکا ہوا اور گولی میرے کندھے کو چھوئی ہوئی گزرنی لگی۔ تقدیر نے میرا ساتھ دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ دو سرا فائر ہوتا میں نے چلاٹنگ لگائی اور تیز دھار سرکنڈوں کو توڑا ہوا آٹھ دس فٹ بائیں جانب گرا۔ چلاٹنگ لگاتے ہوئے مجھے ایک شخص کا کندھا نظر آیا۔ اس نے براؤن سوئٹرز پہن رکھا تھا۔ دو سرا فائر خالی جاتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھا اور پوری طاقت سے اس براؤن سوئٹر کی طرف بڑھا۔ اس مرتبہ براؤن سوئٹر جھٹک مجھے دس بارہ گز دور خشب میں دکھائی دی۔ مجھ پر فائر کرنے والا فرار اختیار کر رہا تھا۔

"رنگ جاؤ" میں نے چلا کر کہا اور بھاگتے بھاگتے ایک ہوائی فائر کیا۔

مرکز سے میرے چاروں طرف شور مچا رہے تھے زمین ہموار تھی۔ مجھے مجھے ہمارے ہم دونوں میں سے کوئی بھی گر سکتا تھا۔ اچانک مجھے "منج" کی مخصوص آواز آئی۔ میرے آگے بھاگنے والے کا رپا اور خالی ہو چکا تھا۔ یہ بڑی قسطنطنیہ صودت حال تھی۔ میں نے اپنی رفتار تیزی اور تقریباً سو میٹر بھاگنے کے بعد اسے جالیا۔ ہم دونوں اور بچے ایک جوڑے کے تحت پانی میں گرے۔ میں نے براؤن سوئٹر والے کا چہرہ دیکھا۔ بلاشبہ وہ مالک محمد تھا۔ اس کے چہرے پر کینٹی کے قریب ایک پرانا زخم تھا۔ جڑے جڑے اور بھوس بھوس تھے۔ اس نے چھوٹی سی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ جوڑے میں گرتے ہی اس نے پلٹ کر مجھ پر حملہ کیا۔ رپا اور دالا بھاگ میری ٹھوڑی پر لگا اور داغ بھینچا کر رہ گیا۔ میں نے سنبھالنے کے لئے گرا کر اتھل کی بجی کٹی ضرب اس کی کینٹی پر رسید کی۔ کوئی عام شخص ہوتا تو کٹے درخت کی طرح پانی میں جا کر تان لیں وہ خاصا سخت جان تھا۔ ذرا سا لکڑا کر چھکا اور سر کی زوردار ٹکر میری ناف پہ مارا چاہی۔ اس کے ہتھکے ہی میں اس کی تیت پہچان گیا تھا۔ ایک قدم پیچھے ہٹ کر میں نے خود کو "پوزیشن" میں لیا اور گھٹنے کی بناؤ گئی ضرب اس کے ہتھکے ہوئے چہرے پر رسید کی۔ وہ کراہ کر پانی میں گر آیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی جیسے یقین نہ کیا ہوا کہ اس کا دار خالی کیا ہے۔ پانی میں گرتے ہی اس نے پھر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس دفعہ قدموں کے نیچے خوس زمین کے بجائے جوڑی کی پچھلی۔ میں نے ایک جست کے ساتھ اسے پھر دوچ لیا۔ اس کے ناک منہ سے خون چھوٹ رہا تھا اور مزاحمت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اسے گریبان سے پکھینچا ہوا جوڑے سے باہر لے آیا۔ رپا اور اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا اور پورا جسم جوڑے کے گدے پانی میں شرابور تھا۔ جوڑے سے باہر گر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بڑی طرح تنگڑا رہا ہے۔ جیسا کہ بعد میں بتا چلا کہ اس نے چلتی چب سے چھلانگ لگائی تھی۔ اس کو شش میں اس کا تختہ بڑی طرح مڑ گیا تھا۔ اچانک ساٹھ درختوں میں سرسراہٹ سنائی دی اور ایک شخص اوٹ سے نکل کر سامنے آیا۔ یہ دروازہ گیسوں اور خست لباس والا ایک ملنگ تھا۔ شخص تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ فائرنگ کی آواز اسے یہاں پہنچنے لائی ہے۔ وہ ابھی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ "کیا بات ہے؟" میں نے زانت کر پوچھا۔ "نک۔ کچھ نہیں" اس نے سہم کر کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ واپس جانے کے لیے مڑا۔ "نعمو" ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا۔ وہ جانتے

جاتے تھے کہ "کمال رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "پار" میں نے ایک جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "چلو" اور راتقل وغیرہ دیکھ کر ملک کو غالباً اندازہ ہو چکا تھا کہ میرا تعلق پولیس سے ہے۔ وہ بلا جوں چرا ساٹھ چل رہا۔ تقریباً ایک فرلانگ آگے ہنگ کے سمت سے دو دور کے درمیان آگے کوٹھے۔ ایک کچا کھانا نظر آ رہا تھا۔ بالکل سنان جگہ کے اندر مجبور کی چٹائی بچھی تھی۔ ایک جست سے نکلے کا سامان اور چند ٹوٹے پھوٹے برتن۔ یہ متاع تھی۔ ملک خود بھی ایک بے ضرر سا شخص تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا تعلق پولیس سے ہے۔ رشہ طرہ سے پوچھ مجھ کے لیے اس کی کینٹی استعمال کرنا چاہتا ہو گیا۔ میں نے اسے دعوے پر ایک دہریہ بھی تھی۔ غصہ ہی ہوا تو صبح سے چل رہی تھی۔ اب اس کی کینٹی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ بیکے کپڑوں کی وجہ سے ہمیں کچھ زیادہ سی سردی لگ رہی تھی۔ میں نے قریب رکھی انگلیش کی سنگی راہ کی دی اور اس میں کچھ خشک لکڑا کر رکھی۔ پھر قیص اٹار کر اور نمودر ایک طرف ڈال دی۔ بڑے بات شروع کرنے سے پہلے ہی مالک محمد بول پڑا "میرا خیال ہے تم اے ایس آئی ایس آئی ہو۔" میں نے اس کے خیال کی تردید ضروری نہیں سمجھی۔ میرے لیے اتنی ہی کافی تھا۔ وہ مجھے پولیس والا تسلیم کر رہا تھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب انجبات میں دیتے ہوئے کہا "ہاں۔ اے ایس آئی ہو۔"

وہ بونا "شادی شدہ ہو؟" میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ مالک محمد کے لیے میں خود اعتمادی تھی۔ لگتا تھا وہ ملازمت کے لیے آنے والے کسی نوجوان کا انڈیو رہا ہے۔ درحقیقت میرے دوست نے اسے نیچے میں ڈال دیا تھا۔ میں اسے بکڑ کر ملک کی گتیا میں لے آیا تھا اور وہ اس خوش فہمی میں جتا ہو گیا تھا کہ میں ملک کا کرنے کے پیکر میں ہوں۔ اس نے کہا "دیکھو میں تمہیں مناسب رقم دے سکتا ہوں لیکن فیملی میرے پاس ڈیڑھ دو ہزار روپے سے زیادہ نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "تمہاری جیب میں ڈیڑھ دو لاکھ بھی ہوتے تو مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ میں رشوت دینے اور لینے والے پر

نہ سمجھتا ہوں۔" وہ چونک گیا "لگتا ہے پولیس لائن میں سنے آئے ہو۔ ہر ایک سمجھا ہی اے ایس آئی بھرتی ہوا تھا تین سال پہلے۔ دو سال تک اس نے نہ رشوت کھائی اور نہ کوئی ناجائز کام کیا۔ اسے تین دفعہ لائن حاضر ہونا پڑا اور ایک دفعہ ڈکڑی جاتے جاتے تھے۔ اب وہ ایک سال میں ڈی ایس آئی کے عہدے تک پہنچ گیا ہے۔ ایک کوئی شیوہ پورہ میں بنا رہی ہے۔ دو مری سال کے ٹائم سے لاہور میں بنا رہا ہے۔ خود بن کر رہا ہے اور دو مریوں کو بھی کرنا ہے۔ یہ حکم ملک کی کان ہے۔ اس میں جو داخل ہوتا ہے اسے تنگ ہونا پڑتا ہے۔"

میں نے سناٹ لیے میں کہا "مالک محمد! تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ میں تمہیں یہاں رشوت کی وصولی کے لیے نہیں پوچھ رہا ہوں۔"

وہ غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے لگے چار پانچ منٹ میں اسے اس غیر یقینی کیفیت سے صاف نکال لیا۔ وہ یہ "انوکھی" حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ میں ایک ایمپلائر اور ایک کاروباروں اور اس سے صرف پوچھ رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی وہ بہت سنجیدہ بھی نظر آنے لگا۔ ایک گری سانس لے کر بولا "اے ایس آئی احسان! میں جانتا ہوں برکت مجھے کیوں گرفتار کرنا چاہتا ہے۔ امام مسجد ضیف والے کیس کا تو صرف بیان ہے اصل معاملہ کچھ اور ہے۔ برکت جانتا ہے کہ میرا تعلق قادر زماں سے رہا ہے اور قادر زماں پر ایک خاص قسم کا ننگ کیا جا رہا ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا "مالک محمد! تم کھل کر بات کر سکتے ہو۔ اگر تمہارا اشارہ شکر شرابی طرف ہے تو میں اس کے بارے میں بھی کچھ جانتا ہوں۔"

مالک محمد نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ ایک اے ایس آئی رینک کا باندہ عطر کے بارے میں سب کچھ جاننے کا دعویٰ کرے گا۔ وہ کھلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔ میں شکر شرابی بات ہی کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا "یعنی تم خود بھی تسلیم کر رہے ہو کہ شکر کے بارے میں تم سے اہم معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں؟"

"مجھے اس سے انکار نہیں۔" مالک محمد نے کہا "بلکہ میں کہتا ہوں اگر شکر کے بارے میں کوئی پولیس کو درست معلومات فراہم کر سکتا ہے تو وہ میں ہی ہوں۔" اس کے ہنس پر ایک رنگ سا انگر گڑ گیا جیسے بات کرتے کرتے

اچانک کوئی نیا خیال اس کے ذہن میں آیا ہو۔ اس نے سگریٹ نکالنے کے لیے قیص کی جیب نکلی۔ سگریٹ وہاں نہیں تھی۔ ہوتے ہی تو مالک محمد کی طرح شرابور ہو چکے ہوتے۔ میں نے اپنی چری جیکٹ کی جیب سے اس کا گنڈہ پکٹ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"یہ تمہارا ہی پکٹ ہے۔ راستے میں ملا تھا۔" میں نے اس کی حیرت دور کی۔

سگریٹ سٹیک کر اس نے چند طویل کش لیے۔ پھر دوستانہ لہجے میں بولا "اچھا بھئی اے ایس آئی! اچھے سے ایک سودا کرو۔ میں تمہیں شکر کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیتا ہوں جو مجھے معلوم ہے اور تم مجھے گرفتار کیے بغیر واپس چلے جاؤ۔"

میں نے کہا "میرے خیال میں تم اس وقت سوئے بازی کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ شکر کے بارے میں تمہیں سب کچھ بتانا ہی ہے۔ یہاں نہیں تو قہانے پہنچ کر تار دو گے۔"

"لیکن وہاں پہنچ کر بتایا تو تمہیں کیا حاصل ہوگا۔ سب کچھ ایس آئی برکت کے کھاتے میں لکھا جائے گا۔ اس کمانی میں تمہارا نام تک نہیں ہوگا۔ دیکھو! تم جو اس سال ہو تمہیں ترقی اور نیک نامی کی ضرورت ہے۔ ترقی اور نیک نامی پونہ پلٹ میں رکھی نہیں مل جاتی۔ اس کے لیے کچھ کر کے دکھانا پڑتا ہے۔ فائلوں میں اپنی کارکردگی درج کرنا ہوتی ہے۔ تم رشوت نہیں لیتے ہو؟ کچھ بات ہے لیکن اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے گرفتار کرنے کا کچھ صلہ تو تمہیں ملنا چاہیے۔ میں تمہیں ایسی اطلاع دے جاؤں گا کہ تم معمولی کوشش کے ساتھ شکر تک پہنچ جاؤ گے۔ تمہارا شکر تک پہنچایا اسے پکڑ لینا کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہوگا کہ اسے چھپایا جاسکے اور اگر تم نے یہ کارنامہ انجام دے دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک ہی جست میں تم انسپکٹر کے عہدے تک نہ پہنچ جاؤ۔"

شکر خود دام کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر سوچ کے آثار پیدا کر لیے۔ لوہا گر دیکھ کر مالک محمد نے ایک اور ضرب لگائی "اور دیکھو! اس میں کسی طرح کی بددیانتی بھی نہیں ہے۔ میری گرفتاری کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ پولیس مجھ سے شکر کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہے اور جب تم یہ سب کچھ معلوم کر لو گے تو پھر مجھے چھوڑنے میں نہ کوئی حرج ہوگا اور نہ یہ بددیانتی لگائے گی۔"

راتقل بدستور میری گود میں چھٹی اور میں اتنی باتی مارے مالک محمد سے کوئی پانچ فٹ دور بیٹھا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر

میں نے قمری کیسل کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ اٹھایا اور دو ٹوٹوں سے لگا کر بولا "لیکن اس بات کی گمانت ہے کہ تم جان چھڑانے کے لیے دوسرا ڈھکری نہیں ہاتھو گے اور میں واقعی صحیح معلومات حاصل کروں گا؟"

مالک محمد کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی نمودار آئی۔ اس نے کہا "تمہارا سوال اپنی جگہ درست ہے۔ میں جو کچھ بتاؤں گا اس کی تصدیق کرنے کا تمہارے پاس کوئی طریقہ نہیں ہوگا لیکن کبھی کبھی بندے کو بغیر تصدیق کے بھی یقین کرنا پڑتا ہے اور ہم اکثر کرتے بھی ہیں۔ پھر ایک خاص بات اور بھی ہے جس کا تمہیں پتا نہیں۔ میں خود بھی تمہیں شکر کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے پولیس مجھ تک نہ پہنچی تو میں خود کی ذریعے سے یہ ساری معلومات پولیس تک پہنچاتا۔"

میں نے کہا "تم اپنی باتوں سے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو کہ تمہیں شکر سے کوئی گزند پہنچا ہے اور اس کا بدلہ تم اس کے خلاف اطلاع دے کر چکا کرنا چاہتے ہو؟"

"نہیں" مجھے شکر سے کوئی گزند نہیں پہنچا اور نہ ہی میں نے کبھی اس کی صورت دیکھی ہے۔"

"پھر کیوں یہ خطرہ مول لے رہے ہو؟"

مالک محمد نے ایک طویل سانس لی "سب سے پہلے تو تم لوگ اپنی ہی غلط فہمی دور کرو کہ قادر زماں صاحب تمہیں شکر کے بارے میں کوئی اہم سراغ دے سکتے ہیں۔ میری طرح وہ بھی شکر کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ ابھی تک شاید ایک دفعہ ان کی ملاقات ہوئی ہے شکر سے۔ شکر کے بارے میں جو شخص پولیس کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے وہ صرف اور صرف عیسیٰ جان ہے۔ بارڈر پارے آنے والے لوگوں کے ساتھ عیسیٰ جان کے بڑے پرانے رابطے ہیں۔ خاص طور پر پچھلے چند سال سے اس کا ذرا بھاری بد معاشرہ کا گڑھ بنا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "یہ نام میں نے سنا ہوا تو ہے لیکن اب کچھ یاد نہیں پڑ رہا۔ یہ وہی عیسیٰ جان تو نہیں جو بنڈی سے تین اظہر ہو سسوں کو اغوا کر کے قبائلی علاقے میں لے گیا تھا؟"

مالک محمد نے اثبات میں سر ہلایا "یہ وہی ہے۔ خوب صورت عورت کی بھوک اس کی گھٹنی میں پیڑی ہوئی ہے۔ اس بات کو مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا۔ میں خود اس پولیس کو لے گیا ہوں۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں!"

اچانک مالک محمد کی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھوں میں نمی سی تھرکی۔ اپنی بھاری بھر کم موٹھوں اور سخت گیر چہرے کے

ساتھ یوں انک بار ہونا ہوا وہ مجھے عجیب سا لگا۔ جیسے کوئی پہلوان نزاکت سے اُٹھ کر کمر کر رہا تھا۔ زکھ لے لے میں نے نظر پھر کر مالک محمد کو دیکھا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر ایک قدیم سا خراب نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ ان دنوں نماز وغیرہ پڑھ رہا ہے۔ اس کی بول چال میں بھی اس کے خدو خال کے برعکس ایک طرح کی نرمی اور چمک پائی جاتی تھی۔ غالباً اس کے ملازمین نے ٹھیک سی کہا تھا کہ مالک محمد اندر سے بہت بدلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ بے حد سنجیدہ اور ذہین لگتا ہوا "تم نے وہ عمارت تو سنا ہوگا کہ برہنہ پھیلی چھوٹی پھیلی کھائی جاتی ہے۔ یہ عمارت مجھ پر بدلتی آتا ہے۔ میں نے ایک چھوٹی چھٹی کھائی تھا مجھ سے بڑی پھیلی نے مجھے نکل لیا ہے۔ جی چاہتا ہے اب تمہیں بتانے لگا ہوں تو۔ کچھ بھی نہ چھپاؤں۔ تم جانتا جاؤ گے کہ وہ چھوٹی پھیلی کون سی جگہ میں نے لگایا تھا۔ وہ نیلہ تھی۔ لاہور میں بہتی تھی۔ ایک انگلش میڈیم اسکول میں پڑھاتی تھی اور ایک نئے بچے کی ماں تھی۔ اس کی شادی سو لہویں سال ہی میں ہو گئی تھی۔ بہت خوب صورت تھی نا۔۔۔۔۔ اور خوب صورت عورت زیادہ دیر الکی نہیں رہ سکتی۔ اپنی رہے تو قیامت ہو جاتی ہے۔ اس لیے سمجھو اور اللہ دین اپنی خوب صورت بیٹی کو فوراً کسی تدر دان کے سپرد کر دیتے ہیں یا کہ وہ اپنی خوب صورتی اپنے بچوں میں بانٹنا شروع کر دے۔ آٹھ سال کی عمر میں نیلہ دو سالہ بچے کی ماں تھی۔ اس کا خاندان مشتاق محمد ایک بینک میں ملازم تھا۔ خوب گورا چٹا، بادامی آنکھوں والا تھا۔ نوکری تھی، چھوڑ کر تھی اور بچہ بھی۔ وہ خود کو بہت خوش قسمت خیال کرتا تھا لیکن بد قسمتی اس کے دروازے پر دنگ دے رہی تھی۔"

اپنی گھٹنی کم کرنے کے لیے مالک محمد نے اپنا ہچکا ہوا براؤن سوئٹا نار پھینکا اور انگلیٹھی سے کچھ اور قریب ٹھک آیا۔

میں نے چند مزید نشانیان انگلیٹھی میں جھونک دیں۔ وہ سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوٹے ہوئے بولا "یہ کوئی پانچ چھ برس پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں خون میں براہوش تھا۔ میرا ایک ساتھی "سوسہنا ڈیکٹ" تھا۔ گوجر نوالہ۔۔۔ کا رہنے والا تھا۔ آگے دو سالے میں اس کی بھی بڑی بدبخت تھی۔ ہم دونوں نے ٹی کر پولیس بے چاری کو آگے لگا رکھا تھا۔ ایک عید کے موقع پر میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک فلائنگ کوچ پر زاکا والا۔ اس کوچ میں نیلہ بھی اپنے بچے کے ساتھ سز کر رہی تھی۔ اس کا لشکارے مارا تھیں۔ مجھ پر قیامت ڈھا گیا۔ وہ جو لوگ "پہلی نظر لوی۔۔۔ بات کہتے ہیں شاید وہی ہو گئی تھی۔ میں نے ذہنی کی اس واردات میں اغوا

آجرم بھی شامل کر لیا اور نیلہ کو زہدوستی اپنے ساتھ لے گیا۔ اپنے خیر اور اپنے والی وارثوں سے بہت دور سرحد کی ایک آزاد آبپاشی کے ایک چھوٹے سے ڈیرے پر نیلہ میرے بستر کی جگہ بن گئی۔ میں نے ساری دنیا سے اس کا نام اتار کر اسے صرف اپنے لیے خاص کر لیا۔ یہاں تک کہ وہ میرے ایک بچے کی ماں بن گئی۔ دو سال بعد جب اس نے میرے دوسرے بچے کو بھی جنم دے دیا تو میں سمجھ گیا کہ اب میرا چلازا پلے خاندان پر بھاری ہو چکا ہے۔ اب میں اس کے دو بچوں کا باپ ہوں اور وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی اور واقعی یہی ہوا۔ دلپس شیخوہہ اگر بھی وہ بڑی خاموشی سے میرے گھر آتا تو یہی۔ پہلے بچے کا نام آہستہ آہستہ اس کے اندر دفن ہو چکا تھا۔ اب دوسرے بچے سے "اس" میں بہت دور تھیں۔ وہ گھر گھر ہستی کا چکر تھا۔ میں نے طاقت کے زور پر وہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا جو کسی بھی اور طریقے سے زندگی بھر حاصل نہ کر سکتا۔ یہاں تک کہ نیلہ کی محبت بھی مجھے حاصل ہو چکی تھی۔ یقین کرو۔۔۔ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔ میری ماری بڑائیوں کے ساتھ اس نے مجھے قبول کر لیا تھا۔ جیسے وہ میری ضرورت تھی۔ میں بھی اس کی ضرورت بن چکا تھا۔ ساتھ بھانے کے لیے کچھ میں نے اپنے آپ کو بدلا تھا۔ کچھ وہ خود بدل چکی تھی۔ دوسرے لفظوں میں چھوٹی پھیلی میرے بچہ میں ہنس ہو چکی تھی لیکن جب وہ ہنس ہو چکی تھی "ایک بڑی پھیلی مجھے کھانے کے لیے پہنچ گئی۔ عیسیٰ جان تھا۔ یہ کوئی سات مہینے پہلے کی بات ہے۔ پشاور پولیس عیسیٰ جان کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ وہ پولیس کو چکے دے کر کراچی آبپاشی میں قس جانا چاہتا تھا لیکن کوئی پیش نہیں دے رہی تھی۔ ایک رات وہ پناہ حاصل کرنے کے لیے میرے پاس شیخوہہ چلا آیا۔ میں عیسیٰ جیسے زہریلے سانپ کو اپنی چست نے پناہ دینا نہیں چاہتا تھا لیکن انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جرم کی دنیا میں ہر کبھی سے دشمنی مول لینا شاید کوئی پاگل بھی پسند نہ کرے۔ وہ میرے دروازے پر آیا تھا تو اب اسے پناہ دینا ضروری تھا۔ عیسیٰ تقریباً ایک ماہ میرے گھر کے حوالے میں ٹھہرا رہا۔ اس ایک مہینے کے تیس دنوں میں ایک شخصوں دن وہ بھی قاضی اس نے میری بیوی نیلہ کی جھٹک دیکھی اور اپنا عادت کے مطابق بدعتی کو دل میں جگہ دے لی۔ ایک بچہ ہو جب وہ میرے گھر سے رخصت ہوا تو مجھ سے مل کر کہہ گیا۔ نہ میری بیویانی کا شکر نہ ادا کیا اور نہ میری ان کوششوں کی تعریف کی جو میں نے پولیس کو اس سے دور رکھنے کے لیے کی تھیں۔ وہ یہ سب کچھ کرنا بھی کیسے؟ میری

بیوی اس کے ساتھ تھی۔ وہ اسے اغوا کر کے لے جا رہا تھا۔" مالک محمد کی آنکھوں میں پھر آنسو چمکنے لگے۔ نا سگریٹ ملکا کر بولا "میں اس روز تاج پور لا ہور گیا ہوا تھا۔ شام کو دلپس آیا تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ عیسیٰ جان غائب تھا اور اس کے ساتھ ساتھ نیلہ بھی۔ بچے دو روکر بلکان ہو رہے تھے۔ گھر کے ملازموں نے مجھے باورچی خانہ دکھایا۔ یہاں فرش پر دودھ پھیلا ہوا تھا۔ باورچی توڑے ہوئے تھے اور نیلہ کی ایک بڑی بڑی تھی۔ کسی کو یہ پہنچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی کہ اس گھر میں "اس" سے کچھ پہنچا ہوا ہے۔ عیسیٰ جان کا لکھا ہوا ایک خط موصول ہوا۔ اس نے لکھا تھا۔ تمہاری بیویانی کا بہت شکر ہے۔ اس کا بدلہ پھر کبھی چکا رہے گا۔ مہربان گانہیں کیونکہ میں بھول چکا نہیں۔ اس کا ثبوت یہ عورت ہے جو میں تمہارے ڈیرے سے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ پندرہ برس پہلے تمہاری ہی برادری کے حشمت علی لکھو نے ایک بندہ تل کر کے بھی رکھ کر کار میں پناہ لی تھی اور دلپس جاتے ہوئے ایک عورت کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس کا نام ارشاد تھا اور وہ رشتے میں میری پھوپھی تھی۔ میرے خیال میں اب اپنی گھروالی کا غم تمہیں زیادہ نہیں ستائے گا۔ ویسے بھی یہ خوب صورت عورتیں تو ہوتی ہی اغوا وغیرہ ہونے کے لیے ہیں۔ مرد بچے ایسی باتیں دل پر نہیں لگاتے۔ باقی تمہاری بیویانی کا ایک بار پھر بہت بہت شکر ہے۔ اگلے ایک ماہ میں میں نے نیلہ تک پہنچنے کے لیے کیا کیا کوششیں کیں لیکن ناکام رہا۔ عیسیٰ جان اسے لے کر قبائلی علاقے کی بھول بھلیوں میں گم ہو چکا تھا۔ عیسیٰ جان نے نیلہ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا یہ کوئی ذمگی چھپی بات نہیں تھی۔ وہ عورت سے محبت کرتا ہے لیکن یہ محبت عجیب و غریب ہوتی ہے۔ مجھے چاہتا ہے اسے ہوس کی زبان سے چاٹ کر ختم کر دیتا ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ چھ ماہ اس کے پاس رہنے والی تو جو ان لڑکی چالیس سال کی اوچیر عمر نظر آنے لگتی ہے۔ اس نے نیلہ کو بھی ختم کر دیا۔ ایک روز وہ اس کے پیچھے ہوس سے فرار ہونے کی کوشش میں ایک چترے کو دھکی اور سیکڑوں فٹ گھرے کھڑ میں جا کر۔ اس سانے کی اطلاع مجھے عیسیٰ جان کے ایک ساتھی نے ہی دی تھی۔ وہ نیلہ کے انجام سے اس قدر ڈھکی تھا کہ واقعہ بیان کرتے ہوئے رو پڑا۔ اس نے مجھے عیسیٰ جان کے ٹھکانے سے بھی آگاہ کر دیا۔ وہ کرم آبپاشی میں مل اور پارا چتر سے درمیان ایک ہماڑی علاقے میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے یہ پتا بھی چلا کہ سرحد پار کا بدنام قاتل جھگر "عیسیٰ

کی حرکت نہ ہرائی تھی۔ بڑی بے حاشی سے میرے پوی بچوں پر گند اچھال گیا۔ یوں لگتا ہے وہ لوگ مجھ پر واپسی کا ہر راستہ بند کرنا چاہتے ہیں لیکن میں نے تیرے کیا ہوا ہے کہ ان کے ہیکلے میں نہیں آؤں گا۔ پچھلے چارپانچ مہینوں میں عذاب سے نہ کچھ حاصل کیا ہے اسے گونا گویا میری زندگی کی سب سے بڑی حماقت ہوئی۔ میں نے بے گھر چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ بلکہ ایک دوسری جگہ رہائش کا انتظام بھی کر چکا ہوں۔ آج جو کچھ ہوا ہے نہ ہوتا تو شاید تین چار روز تک میں پولیس کے لیے ایک لاپتہ شخص ہوتا۔

مالک محمد کی کمائی اثر انگیز تھی۔ انسان بھی عجب گورکھ دھندا ہے۔ کوئی شخص برسوں میں نہیں بچتا جاتا اور کسی کے اندر جھانکنے کے لیے چنلے لگے کانی ہوتے ہیں۔ مجھے یوں لگا کہ مالک محمد کے ماتھے پر ابھرتا ہوا دم خراب ایک سوراخ ہے۔ میں اس سوراخ کے راستے مالک محمد کے آپار دیکھ سکتا ہوں۔ بالکل ایسے جیسے شیشے کے آپار دیکھا جاتا ہے۔ مالک محمد کی داستان غم کا بیشتر حصہ شیشے سے بالاتر نظر آتا تھا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا، خشکی اور تری کے شب و روز ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ دونوں جگہ بڑی پھل پھولتی پھلنے کو کھاتی ہے۔ بہر طور اس گفتگو کے دوران ہم اصل موضوع سے کانی ہٹ گئے تھے۔ یعنی شکر شکر کا ذکر خیریت پیچھے رہ گیا تھا۔ میں نے مالک محمد کو بے انتہائی واپس لائے پر چڑھاتے ہوئے کہا "تو تمہارا خیال ہے کہ تمہارے ششامی جانی سے ہمیں شکر کا سراغ مل سکتا ہے۔"

مالک محمد ہولا "میرا خیال نہیں حقیقت ہے شکر کے سلسلے میں اگر کوئی واقعی پولیس کو سراغ دے سکتا ہے تو وہ بھی جانی ہے۔ شاید تم مجھ کو میں اپنی دشمنی چکانے کے لیے پولیس کو بھی جانی کے پیچھے لگا رہا ہوں یا ممکن ہے تم اس سارے بیان کو ہی جھوٹ کا پلندہ سمجھو۔ میں اس کے سوا اور کچھ کما نہیں چاہتا کہ میں بچ بولی رہا ہوں۔ بھی جانی کیفر کو مار کو پینچا تو میرا کچھ ضرور ٹھنڈا ہو گا لیکن اپنا کلیا ٹھنڈا کرنا میرا اصل مقصد نہیں۔ میری زندگی کا رخ بدلا ہے تو بہت سی چیزیں جو پہلے نظر نہیں آتی تھیں اب نظر آنے لگی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ یہ بیتاقیاں یہ گلی کو بے مینی جان اور خطر جیسے مجرموں سے پاک ہوں تاکہ میرے بچوں کے ساتھ ساتھ ملک کے ہر بچے کا مستقبل محفوظ ہو سکے۔ میں شکر کے بارے میں تمہیں جو کچھ بتا رہا ہوں، پوری دانتہ اری سے بتا رہا ہوں۔ سرحد پار کرنے کے بعد شکر نے سب سے پہلے جس شخص سے رابطہ کیا وہ بھی جانی ہی تھا۔ اب تک وہ

جسے پردہ کا تاثر لے مالک محمد نے مجھ کی چٹائی پر لہو لہا اور اس کے ہونٹوں سے سسکاری نکل گئی۔ مجھے کی دفعہ غنڈی ہو کر تکلیف دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا دل جیسا تکلیف کے علاوہ روحانی رپ سے بھی لیا بل بھرا ہے۔ اب یہ جیتا نہ چمک رہا ہے اور نئی داستان غم خود بخود مالک محمد کے ہونٹوں سے پھسلتی چلی آ رہی ہے۔ وہ مسلسل بولنا چاہتا تھا اور بچنے کا ہرزخم میرے ہاتھ کھول دینا چاہتا تھا۔ کہنے لگا "یقیناً تم حیران ہو گے کہ یوں کو میرے خلاف باتیں بنانے کی جرات کیوں کر ہوئی اور یہ جیسا دور آور یا اثر شخص ہے سب کچھ سن کر بھی خاموش ہیں۔ ربا۔ اس نے آٹھ دس زبان درازوں کو کھنکے کر کے لے لیں نہیں کر لیا۔ بات پھر وہیں پر آ جاتی ہے دوست! میں نے راہ کو چھوڑ دیا ہوں اس پر دوبارہ قدم رکھنا نہیں چاہتا۔ درمجھے پہلی بار احساس ہوا ہے کہ ایک بد معاش کے لیے معاشی چھوڑنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ موت تو ایک ہی بار آتی ہے لیکن گردن اٹھا کر چلنے والے کو گردن جھکا کر چلنا پڑے تو وہ ان میں کی بار مرتا ہے۔ اوپر والے نے بڑے سے بڑے لٹاؤ کار کے لیے توبہ کا دوواڑہ کھلا رکھا ہے لیکن نیچے ایسے جسے ایک بار نکلوں سے گراتے ہیں پھر سنبھلنے کا دین نہیں دیتے" بالکل پھر ہوجاتے ہیں۔ آج کل نہ ایسے ناموں سے گھرا کر لوہاں ہو رہا ہوں۔ اب یہ مولوی نیف والا کیس دیکھ لو۔ جب تک میں بد معاش تھا، کسی میں نئی جرات نہیں تھی کہ مجھے اس نام نہاد کیس میں الجھاتا" لکھ لو کسی کیس تھا۔ میرے مخالفین نے مجھ سے سووے لڑا کرنے کے لیے بے شک کھڑا کیا تھا۔ خود علاؤ الدین چارون نے لٹا تھا کہ خواہ مخواہ پولیس کا وقت ضائع کیا جا رہا ہے۔ اب یہ بد معاشی کی دلیل سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہوں تو پولیس و سارے بھولے بھلے کے قانونی تھانے یاد آنے لگے ہیں۔ میں تو تری ایک طرف دو دو باشت کے بد معاش اور دو دوہ لٹاؤ والے غنڈے میرے منہ کو آتے ہیں۔ انہیں بے باقی بنانا اور بازوؤں میں بازو پھیلا کر چلنا آ گیا ہے۔ انہیں سے کچھ تو ایسے شہدے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو۔ ان کا ہاتھ مالک محمد جتنا جھٹکا ہے اسے جھٹکاتے چلے جاؤ۔ مالک محمد کے پاؤں تلے روند روند کر مٹی میں ملاؤ۔ چلے وہ بد معاش جتنے تھے اب باقاعدہ نعرے ہلائی شروع کر دی ہیں۔ جھٹکا اتوار رات کو کوئی میرے کمر کی دیواروں پر لگی آؤں گے۔ یہ میں نے ان پر سفیدی پھینکی ہوئی۔ پر سوں پھر

لاہور کی مضائقہ ہستی کروا گھٹ پینچا۔ مشتاق محمد سے آتا سامنا ہوا۔ مجھے سامنے پارکرو چٹا چٹا نہ مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی نہ میرا کریاں پکڑا بس خاموش لیٹا رہا۔ منوں مٹی کے نیچے وہ ایک قبرستان کا مکیں تھا۔ اسے مرے ہوئے تین سال ہونے کے آئے تھے۔ پوی کی چھائی کا زخم کھرا اس نے کثرت سے شراب نوشی شروع کر دی تھی۔ اس کے پیچھے چڑے خراب ہو گئے۔ یہاں تک کہ اسے گلاب دہوی اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ تو کسی دور کسی سب جھوٹ چکی تھی۔ قانون کا سامنا تھا۔ بچہ ایک خدا ترس محلے دار کے گھر میں بل رہا تھا۔ مشتاق جب قید میں جلا تھا۔ اسپتال کے وارڈ میں قیدی کی طرح رہتا تھا۔ بچے کو اس سے دور رکھا جاتا تھا اور بچے میں اس کی جان تھی۔ ایک رات جذباتی پوی نے جوش مارا۔ وہ سب رکاوٹیں توڑ کر بچے سے ملنے نکل کھڑا ہوا۔ اسپتال کے محلے نے اسے دوکنا چاہا۔ وہ ان سے الجھ پڑا۔ پھر زبردستی بھاگ کھڑا ہوا۔ اسپتال سے باہر سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ وہ اپنی نیم جان ٹانگوں سے سڑک پر آیا تو اس ٹریفک کی تیز رفتاری کا اندازہ نہ کر سکا۔ اس کی ٹھکری سبھی زندگی ایک گلی کی چوڑی کار کے نیچے آکر پڑ گئی۔ نیلہ کا پہلا بچہ یتیم ہو گیا اور یتیم کا اصل ٹھکانا تو یتیم خانہ ہی ہو گیا۔ پانچ سال کی عمر میں یوسف یتیم خانے پہنچ گیا۔ اب پچھلے دو برس سے وہ وہیں رہ رہا تھا۔ میں تلاش کرتا ہوا اس تک پہنچا اور اسے اپنے ساتھ یہاں شیخ پورہ لے آیا۔ اگر تم میرے گھر گئے ہو تو تم نے جیکے نقوش والے ایک گورے بچے کو لے کر دیکھا ہو گا۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ مالک محمد ہولا "وی یوسف ہے میں اسے اپنے ساتھ لے کر آیا تو سب کو یہ بتایا کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ کبھی کبھی جذبات میں انسان سے غلطی ہو جاتی ہے۔ یہاں شیخ پورہ میں کسی کو میرے آگے پیچھے کا پتا نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں دوسروں کو یقین دلانے میں کامیاب رہوں گا کہ یوسف میرا اور نیلہ کا خون ہے اور اس طرح میرے گھر میں اسے بیشہ ایک مقام حاصل رہے گا لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ تازے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں، میری بات کا بھرم بھی نہیں رہ سکا۔ لڑکے کا رنگ دھوپ دیکھ کر لوگوں نے کتنا شروع کر دیا کہ یہ میرا بیٹا نہیں۔ میں نے برسوں میں ہوتی آؤں بڑوں والوں نے اپنے شک کا سارالے کر میری پوی کی طرح طرح کے الزام لگانے شروع کر دیے۔ یہاں تک کہ مالک یوسف میرے گھر پر کسی گناہ کی نشانی ہے۔ یوں حالات نے وہ رخ اختیار کر لیا جس کے متعلق میں نے سوچا تک نہیں

جان کے ڈیرے پر آتا ہے میں اور میرا دوست سوہنا گو جراتوالہ اس وقت کہاٹ میں تھے ایک رات ہم سب ہو کر مینی جان کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئے لیکن مینی تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ راستے ہی میں ہماری ڈھبیز مینی جان کے آدمیوں سے ہوئی۔ کوئی ایک گھنٹے تک زبردست گولی چلی۔ دو آدمی ان کے مارے گئے اور دو ہمارے۔ میری ٹانگ میں بھی ماؤڈر کی گولی لگی۔ میں دو ہفتے پشاور کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں رہا پھر شیخ پورہ واپس آ گیا۔ گھر پہنچ کر میں نے خود کو کمرے میں بند کیا اور پورے آٹھ برس سوچ بچار میں مصروف رہا۔ میرے سامنے اب دو راستے تھے ایک انتقام کا اور دوسرا اپنے بچوں کی پرورش کا۔ پہلے راستے پر چلنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میری ساری زندگی ایسے ہی راستوں پر چلتے زبردستی تھی لیکن میں نے بھی جانتا تھا کہ وحشی اور انتقام کی اس آگ کو جتنا پھیلاؤں گا، پھیلنے جائے گی۔ میری زندگی بچوں کی زندگی، ان کا مستقبل سب کچھ واؤپر لگا رہے گا اور اس کے بدلے حاصل کچھ نہیں ہو گا۔ شاید مرنے والی میرے اندر ہر شرافت اور نیکی کا جو بچ ہوئی رہی تھی وہ چپکے چپکے بڑا ہو کر درخت بن گیا تھا۔ جو فیصلہ میں کرنا چاہتا تھا وہ بہت مشکل تھا لیکن میں نے کر لیا۔ میں نے اپنے دل کے ساتھ عند کیا کہ اب صرف اور صرف اپنے بچوں کی پرورش کروں گا۔ باقی سارے کام چھوڑ کر سارے کھاتے بند کر دوں گا۔ اس دن کے بعد میری زندگی نے ایک نیا موڑ لیا۔ میں نے خود کو آہستہ آہستہ بدلنے کے بجائے ایک دم بدلا۔ ایک ہی دن میں میں ہر وہ کام چھوڑ دیا جس سے مرنے والی منع کیا کرتی تھی اور وہ ساری ذمے داریاں سنبھالیں جس جو "بے آسرا بچوں کے باپ" کو سنبھالنی چاہیے تھیں۔ نیلہ کو کھونکر مجھے احساس ہوا کہ بن ماں کے بچوں اور بن پوی کے شوہر کا کیا حال ہوتا ہے۔ ایک مہینے میں میں نے وہ وہ عذاب سے جن کا تصور بھی نہ کیا تھا۔ دوڑتے چلتے بچے ماں کو بکارتے تھے تو میرے جسم کی بنیادیں مل جاتی تھیں۔ میں رات رات بھر افسوس لے کر کھوتا تھا اور اپنی قسمت کو دوتا تھا۔ اپنے گھر کی برادری کا مزہ چکھا تو ایک اور شخص کی تکلیف کا احساس بھی ہوا۔ وی شخص جسے میں نے پانچ برس قبل برباد کیا تھا۔ نیلہ کا پہلا شوہر مشتاق محمد۔ وہ بھی تو ایک بچے کا باپ تھا۔ نہ جانے اس پر اور اس بچے پر کیا جیتی تھی؟ یہ سوال تیرہن کر میرے ذہن میں پوسٹ ہو گیا۔ دل میں درد جاگا تو اور گردی دنیا بدل دی نظر آنے لگی۔ میں مشتاق اور اس کے بچے کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ سراغ لگاتے لگاتے آخر کار میں

بھئی جان کے ڈیرے پر ہی رہا ہے اور مدت لگن سے کہ اس وقت بھی جب ہم یہ باتیں کر رہے ہیں وہ بھئی جان کے کسی ڈیرے پر داخل ہو رہا ہو۔

میں بہت تیزی کے ساتھ ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے سرکاری رائل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے مالک محمد! مجھے تمہاری بات منظور ہے۔ تم شکر کی قربانی میں میری مدد کرو۔ میں تمہیں ساتھ لے کر بیٹھ چلا جاؤں گا۔"

وہ بولا "میں اس سلسلے میں جس طرح کی مدد کر سکتا ہوں تمہیں بتا چکا ہوں۔ بھئی جان کا نام تو تم نے سن لیا ہے اور یہ بھی بتا چکا ہوں کہ وہ کل سے آگے کرم انجینی کے علاقے میں دوپوش ہے۔ کوئی بڑا جرم کرنے کے بعد وہ اسی طرح دوپوش ہو جاتا ہے اور پھر مہینوں تک اپنے ڈیرے سے نہیں نکلتا۔ اب اس کے ڈیرے کی نشاندہی رہ جاتی ہے۔ نشاندہی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ میں کسی جگہ انگلی رکھ کر تمہیں بتا دوں گا کہ بھئی جان یہاں رہتا ہے۔ وہ علاقہ اس طرح کا ہے کہ انگلی رکھ کر نشاندہی کی ہی نہیں جاسکتی۔ تم وہاں جاؤ گے تو خود اندازہ کر لو گے۔ ہمارے پٹھانوں کی طرح کئی بچی بے آباد ہائیاں ہیں۔ بندہ اس علاقے کے پیٹ میں گھسٹا ہے تو چکر کر رہا جاتا ہے۔ میرے پاس ہاتھ سے تیار کیا ہوا ایک نقشہ ہے۔ اگر تم مجھ پر اعتماد کر سکو تو میں دو روز بعد یہ نقشہ تمہارے دیے ہوئے پتے پر پہنچا دوں گا۔ دوسری صورت میں میں یہیں زمین پر لیکرین بھیج کر تمہیں سمجھا سکتا ہوں لیکن یہ بتا دوں کہ اس کاغذ پر بنے خاکے سے تمہیں زیادہ مدد ملے گی۔"

میں نے کہا "مالک محمد! اب ایک بار اعتبار کر لیا تو پھر کر لیا۔ اب بے اعتمادی والی کوئی بات نہیں۔ جس طرح بہتر سمجھتے ہو کر لو۔"

اس کی پیشانی پر شکلیں نمودار ہوئیں "بولا "ٹھیک ہے۔ میں تمہیں یہاں بھی سمجھا دیتا ہوں بعد میں ڈاک سے خاکے بھی بھیج دوں گا۔"

دوبارہ کا سارا اے کر وہ سیدھا بیٹھ گیا۔ میں نے چرنی بیکٹ کی جیب سے بال چن نکالا۔ مالک محمد نے سرگت کا خالی بیکٹ چما کر اسے تلے کی شکل دے دی۔ وہ چند لمے تک بیکٹیں بند کر کے سوچا رہا پھر بیکٹ کی شکل کے تحت پر لیکرین کھینچنے لگا۔

○●○

میں سر پر کوئی تین بچے مالک محمد سے فارغ ہو کر وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اب وہاں مذہب محمد نہیں تھا۔ وہ اتنی دیر

انتظار کر رہی تھی کہ سکتا تھا۔ جتنی بات تھی کہ مجھ پر دو جڑ بھیج کر وہ واپس قصبے جا چکا تھا۔ میں بھی ایک نظر جھپکایا۔ لے کر واپس روانہ ہو گیا۔ دو دعائی کیل چلنے کے بعد مجھے ایک فخری لفت مل گئی۔ فخر والا میرے اسٹو اور چمی جیک سے کافی مرعوب نظر آتا تھا۔ اس نے بڑے ہی خوشامدی لہے میں مجھے فخریہ سواری کی دعوت دی۔ یوں لگا "وہ مجھے اپنے تمام کے تمام یعنی چاروں چھوٹوں پر ایک ساتھ سوار کرانا چاہے ہے۔ بہر طور مجھے ایک پر ہی بیٹھنا تھا اور میں بیٹھ گیا لیکن سواری باوجود ہماری زیادہ دیر میرے نصیب میں نہیں تھی۔ جلد ہی سامنے سے پولیس کار کی آواز آئی ہوئی دھول نظر آنے لگی۔ چند لمے بعد پولیس کار بھی آنکھوں کے سامنے آئی۔ اندر سے برکت صاحب کی سرخ آنکھیں پوری قربانی سے مجھے ٹھوہری تھیں۔ وہ کہہ رہے "وہ لہو! کہاں مر گیا تھا؟ تیرے باپ کے نوکر ہم دو گھنٹے سے ڈھونڈ رہے ہیں نہیں۔"

میں نے چہرے سے خالص ماتحتانہ شرمندگی ظاہر کی۔ اس موقع کے لیے ایک بھانہ میں پہلے سے گھڑ چکا تھا، پھر سے گود کر میں نے ٹھکانک سے سیلوٹ کیا اور کہا "وری سواری سر! میں جیب کے لیے میکینک ڈھونڈنے نکل گیا تھا۔"

برکت صاحب کا پارا ساتویں آسمان کو چھو گیا "دے دے بھوتی دے! یہاں جنگل میں تیرے کس مامے نے آنور کر کشاپ کھول رکھی ہے؟"

میں نے کہا "جناب! اور کشاپ تو نہیں! اور سر کنڈوں کے پار دوی نالے سے ٹیکسٹ زالی والے ریت نکالے آئے ہیں۔ ایک راہ گیر نے بتایا تھا کہ ان میں کئی ایک بڑے پیٹے ہوئے میکینک ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا، چلو قسمت آزمائی کرتے ہیں شاید کام بن جائے وہاں گیا تو چھوٹوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ واپسی پر ایک جگہ راستہ بھی بھول گیا۔ اس جگہ میں دیر ہو گئی۔"

ایس بی برکت نے دانت چپن کر کہا "میرا تو خیال ہے پولیس لائن میں بھی تو راستہ بھول کر ہی آیا ہے۔ چل خاں ذرا واپس! میں تیرا بھولن نکالتا ہوں اچھی طرح۔" اس فقرے میں چند شاندار گالیاں بھی مناسب جگہوں پر لگیں گی۔ طرح فٹ تھیں جنہیں میں یہاں کوٹ نہیں کر رہا۔ سسے کی ایکٹنگ کرنا تو میں پولیس کار میں بیٹھ گیا۔

چند روز منٹ میں ہم واپس قصبے میں پہنچ گئے سردیوں کی شام تیزی سے پر پھیلا رہی تھی۔ برکت صاحب نے مالک محمد کے گھر کو ہی عارضی قہارے کی شکل دے دی تھی۔ قصبے کے

تقریباً ایک درجن افراد تفتیش میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے چند ایک کی جھڑپوں بھی ہو چکی تھیں۔ بجادو جیب کے سوار ایک علیحدہ کمرے میں بند کیے گئے تھے۔ الیکٹرک باجواں سے مکمل پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ ان میں سے ذہنی ذرا نیور وٹیف احمد نے کافی بار کھائی تھی اور ایس بی برکت کو یہ زخم تھا کہ انہوں نے تو قصبے سے بہت کم بچا لیا تھا۔ تو قصبے کے قصبے کی تھا کہ آج علی الصبح مالک محمد کو اپنے ساتھ لے کر لاہور گیا تھا۔ باقی تینوں افراد بھی اس کے ساتھ تھے۔ مالک محمد کو لاہور میں کسی مکان کا کچھانہ دیا تھا۔ مالک محمد کے کہنے پر انہوں نے اسے رائل پارک میں آباد کیا تھا۔ اس وقت صبح کے پانچ بجے تھے۔ مالک محمد نے کہا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں آجائے گا۔ اگر نہ آیا تو وہ واپس چلے جائیں۔ ساڑھے سات تک انتظار کے باوجود مالک محمد نہیں آیا تو وہ واپس بیٹھ پورہ آگئے۔

میں جانتا تھا "ذرا نیور وٹیف کا یہ بیان جزوی طور پر درست ہے۔ مالک محمد ان کے ساتھ مکان کا کچھانہ دینے ہی گیا تھا اور وہیں ممکن ہے کہ وہ رائل پارک کی پینچا ہو لیکن وہاں سے اس کے محافظ نہ واپس نہیں آئے تھے۔ مالک محمد ان کے ساتھ تھا۔ بعد ازاں وہ پولیس کے تعاقب کے دوران جپ سے گودا تھا۔

ایس بی صاحب تو قصبے کے بیان پر بہت تکیہ کر رہے تھے۔ انہوں نے دائر لیس پر لاہور بیڈ کارڈز سے رابطہ کیا تھا اور مالک محمد کی تلاش کے احکام جاری کر دیے تھے۔ خود وہ قصبے میں رہ کر طرم کا انتظار کرتا چاہتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ وہ جہاں بھی ہے آئے گا تو گھر ہی۔ قصبے میں کرنڈو کی سی حالت تھی۔ کسی کو باہر سے اندر اور اندر سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ قصبے کے راستے میں مختلف مقامات پر ہماری ڈیوٹیاں لگادی گئیں اور رات بھر آنکھیں کھول کر ہیرا دینے کا حکم صادر ہوا۔ اس حکم پر عمل کرنا کم از کم میرے لیے تو ممکن نہیں تھا۔ قصبے سے باہر ایک ٹوب دہل سے ملحقہ کوٹھی میں "میں رات بھر خلاف اوڈھ کر چین سے سویا بلکہ اپنے سامنے مذہب محمد کی ڈیوٹی بھی میں نے دی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ سو جائے اور پھر خود بھی سو گیا۔ جب مالک محمد کو یہاں آتا ہی نہیں تھا تو اس کے انتظار سے کیا حاصل تھا۔ اگلے روز صبح آجھ بجے ہم اس "ناکام" چھاپے کے بعد لاہور واپس روانہ ہو گئے۔

اسی روز شام کو میں ایکل میں ساسی صاحب سے ملا اور انہیں اپنی کارڈ کی سے بگاڑ گیا۔ میری رپورٹ یقیناً اہم اور

چونکا دینے والی تھی۔ اسے خوش قسمتی ہی کہا جاسکتا ہے کہ اتنا ہی میں مجھے ایک نہایت اہم کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ جو سکتا ہے اس میں کچھ عمل دخل میرے لیے بڑے کامی ہو۔ تنصیاتی کے میڈیکل اسٹور میں شکر شکر کو دیکھنے کے بعد میرے اندر ایک طوفان جاگ اٹھا تھا۔ حالانکہ اس وقت میں بے حد غیر یقینی حالات سے گزر رہا تھا۔ ساسی صاحب سے رابطہ تو درکنار سانا تک نہیں ہوا تھا۔ انجم! انفرادوں کے کمرے میں بے یار و مددگار بیڑی تھی اور میری بہن "میری زندگی" کا جیکر دار کی صفی میں بھی لیکن چند لمحوں کے لیے میں سب کچھ بھول گیا تھا اور میرے دل میں صرف ایک ہی خواہش رہ گئی تھی "میں شکر کو جالوں اور جہاں پاؤں وہیں چل کر زمین میں گاڑ دوں۔ اس شیطان ابن شیطان کے لیے میرے دل میں نفرت کا سمندر دھلکے رہ گیا تھا۔ یہ وطن میرا گھر تھا اور اس گھر میں ایک انتہائی بھس جانور گھس آیا تھا۔ میں اس کا قصہ پاک کئے بغیر چین سے کیسے سو سکتا تھا۔ اسی جذبے کے تحت میں نے ساسی صاحب کی آواز پر کان دھوے تھے اور جب انہوں نے میری بہن اور انجم کو محفوظ قرار دیا تو میں ان کی آواز پر ایک کئے کو تیار ہو گیا تھا۔ ساسی صاحب نے نگار کا طویل کش لینے ہوئے کہا "پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

ہم شادمان کالونی والے مکان میں بیٹھے تھے۔ انجم اور شتا کے بعد اب میں اس بیٹلے کا تھما کھین تھا۔ میں نے کہا "ارادہ تو آپ کے ہوں گے مجھے تو صرف قہیل کرنا ہے۔"

وہ بولے "ہم سب قہیل کرنے والے ہیں۔"

"سو اے برکت صاحب کہ" میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ بولے "بندہ گرم مزاج کا ہے لیکن نااہل نہیں ہے۔ بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔ تم ساتھ رہو گے تو چلے گا۔"

میں نے کہا "دینے مجھے تو ابھی تک ان میں کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ جہاں تک گرم مزاجی کی بات ہے، میرا خیال ہے ایسے آئسراحتوں کو ہر وقت الٹ رکھتے ہیں۔"

میں نے مالک محمد سے جو خاکہ حاصل کیا تھا وہ ساسی صاحب کے سامنے میز پر رکھ دیا تھا۔ وہ بڑے غور سے دیکھتے رہے پھر بولے "نل اور پارا چٹار کے درمیان ہے یہ جگہ۔ کافی دیر ان علاقہ ہے۔ اونچی نیچی گھاٹیوں کا سلسلہ ہے۔ انجان شخص طوم کی تلاش میں خود کو ہم ہو سکتا ہے۔ میرے ذہن میں سدا کے ایک صوبے وار کا نام آ رہا ہے۔ کیا بھلا سا نام تھا اس کا۔ مرخان خان۔ اگر یہ شخص سدا میں ہی ہے تو

ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہو سکا ہے۔ اس آج ہی اس کا
چکر لگائیں۔

”ما“ ہمیں جلد از جلد روانہ ہونا ہوگا۔ ایک
مروج سے ہم واقعات کو حرکت دینے والی ذور کھینچ چکے ہیں۔
مالک محمد کی گرفتاری کے لیے مارا جانے والا چلیا ہمارے
متعلقہ افراد کو ہوشیار کر چکا ہوگا۔ ممکن ہے کرم انجمنی میں
عسلی جان بھی ٹھکانا تبدیل کر لے۔“

سای صاحب نے میری بات سے اتفاق کیا۔ انہوں نے
بہت کم وقت میں انتظام کر لیا۔ صرف تین روز بعد ہم مل
جانے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔ میری خواہش کے
مطابق سای صاحب نے یہ بات کسی پر نہیں کھلنے دی کہ مالک
محمد سے میری ملاقات ہو چکی ہے اور اسی کی نشاندہی پر اتنے
دشمن کے ساتھ چلیا مار پارٹی کرم انجمنی روانہ کی جارہی
ہے۔ مالک محمد کی رہائش گاہ سے پرہیز کیا گیا تھا اور مجھے نہیں
تھا کہ موقع ملنے ہی وہ اپنے بچوں کو وہاں سے نکال لے جائے
گا۔ وہ کہاں جائے گا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا اور نہ ہی میں
معلوم کرنا چاہتا تھا۔ وہ ڈاک کے ذریعے مجھے مطلوبہ پر چا
روانہ کر چکا تھا اور اب ہمیں ایک دوسرے سے کچھ لینا دینا
نہیں تھا۔ مالک محمد نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ڈاک کے ذریعے
اس نے جو بوسیدہ پر چا مجھے ارسال کیا وہ پہلے خاکے سے کہیں
زیادہ واضح اور تفصیلی تھا۔

مل روانگی سے چند گھنٹے پہلے میں شفتا سے ملنے سای
صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ شفتا تخت پریشان تھی۔ اسے یہ
بھگدڑ چکی تھی کہ میں پولیس کی چھاپا مار ٹیم کے ساتھ شکر کی
تلاش میں جا رہا ہوں۔ وہ شکر کے بارے میں سب کچھ جانتی
تھی۔ بس کی درندگی، شیطانت اور عیاری کچھ بھی شفتا سے
پوشیدہ نہیں تھا۔ بڑی ہی باخبر اور سیانی تھی میری بہن۔ جیسی
کی گود میں درویش پائی تھی ما۔۔۔ چار سال پہلے شفتا نے مجھے
گرفتاری پیش کرنے پر آمادہ کیا تھا تو اس کی ایک وجہ شکر بھی
تھا۔ وہ مجھے اس دشمن جاں سے دور کر دینا چاہتی تھی لیکن
آج ایک بار پھر میں انہی راستوں پر گھٹ بھاگنے کی تیاری
کر رہا تھا۔ دشمنی کی اسی ٹھک کی طرف لپک رہا تھا جس کی
حدت نے شب و روز شفتا کا لومسٹھا تھا۔ اس کی پریشانی مجھ
میں آتی تھی۔ وہ وہ بھی کوئی تھی جی کی طرح مجھ سے نکلیں
چرا اگر بیٹہ تھی۔ میں دیکھ نہیں رہا تھا لیکن جانتا تھا، آنسو اس
کے شفاف رخساروں پر پھیل رہے ہیں۔ میں دل میں آڑ
بانے والی ان معصوم آنکھوں کا راز اداں تھا۔ ان کی ہر
کیفیت بغیر دیکھے مجھ سکتا تھا۔ میں نے شفتا کے گلے میں بازو

جامل کر کے اسے سینے سے لگالیا۔ وہ سسکنے لگی۔ اہم کر
خوش قسم کے دو کرداروں کی طرح تھے بغیر کے سنے ایک
دوسرے کی بات سمجھتے تھے۔ مدعا بیان کرنے کے لیے زبان
حالت سے بے نیاز تھے۔۔۔ وہ بہ زبان خاموشی کہہ رہی تھی
”جیسا! اتنی طویل جدائی کے بعد ایسا مختصر ملاپ میں نے
بھی ٹھیک سے آپ کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ مت م
بتیائے مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ میں پھر کھو جاؤں۔“
میں اسی کی زبان میں جواب دے رہا تھا ”حوصلہ
میری بہن! جب تک تیرے لبوں پر اپنے بھتیجے کے لیے دعا
ہیں، کوئی اسے تجھ سے دور نہیں کر سکتا۔“
نجانے کتنی دیر ہم یوں ہی خاموش کھڑے رہے۔ پھر
نے رننا زبان کو زحمت کھام دی ”اچھا شفتا! میں چلتی ہوں۔“
وہ بولی ”کیوں جاتے ہو بھتیجا؟“

میں نے کہا ”جانا ضروری ہے۔ شکر کو کیر کر دیا
پہچانے کا اس سے بہتر موقع شاید کبھی نہ مل سکے۔“
یگھٹ اس کی آنکھوں میں ان محبت انجمنی آ
آئیں۔ یوں لگا، وہ مجھ سے پلٹ جانے کی اور ہزار کوشش
بادور جدائیں ہوگی لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود پر تار
پالیا۔ آنسو پونچھتے ہوئے نقطہ اتار بولی ”پنا خیال رکھنا بھتیجا۔“
میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا ”بہ فکر نہ ہو۔ میری
طرف سے بھی اور اپنی طرف سے بھی۔ یہاں تم اور اہم
اتھائی محفوظ رہاؤں میں ہوں۔ پھر صفحہ رہی تمہاری خبر گیری
کے لیے بیٹھیں۔ میں زیادہ دن لاہور سے باہر نہیں رہوں
گا۔ بہت دوا تو میں بندہ روز نکلیں گے۔“

میں جانے کے لیے مڑا تو اس نے آواز دے کر مجھے
روک لیا ”کل غزالہ باجی آئی تھیں۔“
میں ٹھٹھک کر رہ گیا ”کیا کتنی تھی؟“

”ایک تحریری پیغام دے گئی ہیں آپ کے لیے۔“ انہو
پوچھتی ہوئی وہ حسب عادت بھاگ کر اندر گئی اور الماری
سے ایک ہند لطف نکال لائی۔ میں نے خط نکالا۔ یہ غزالہ
کی تحریر تھی۔ میں ان الفاظ کے زاویے، توہیں اور خط
کے بھول ستا تھا۔ یوں لگتا تھا، لکھنے والی کے جسم کی سادہ
دکشی حروف میں دھل گئی ہے۔ کسی وقت یہ حروف مجھے
بڑے پیارے لگتے تھے۔ میرا دل انہیں چوسنے کو چاہتا تھا۔
خواہش ہوتی تھی ہر چیخ و دم پر دل نکال کر کہہ دوں لیکن
بہت پرانی بات تھی۔ اب تو اس تحریر کو دیکھ کر سینہ ٹھٹھک
تھا۔ غزالہ نے لکھا تھا۔

”میں جانتی ہوں آپ کے پاس میرے لیے معافی ہے

سوا اور سب کچھ ہے۔ میری مجبوری یہ ہے کہ میرے پاس
اتھائیں کے سوا اور کچھ نہیں۔ کبھی بھی تو سونے لگتی ہوں
کاش! میں مسلمان نہ ہوتی خدا رسول پر میرا ایمان نہ ہوتا۔
میں اپنے ہاتھوں اپنی جان لے کر آپ کو کتنا سکتی کہ میں آپ کو
کھو کر لگتا چھٹتا رہی ہوں۔ خدشہ ہے کہ اپنے بارے میں
زیادہ لکھوں گی تو آپ خط پڑھے بغیر پھاڑیں گے۔ اس لیے
آپ کے بارے میں لکھ رہی ہوں اور اپنی بہن شفتا کے
بارے میں لکھ رہی ہوں۔ شاید اسی ذکر کے طفیل آپ ان
چند جملوں پر نگاہ دوڑانا گوارا کر لیں۔ آج کل قادر زماں کی
یونی ٹرم میرے زیر علاج ہے۔ بیٹے میں ایک آدھ بار قادر
زماں سے ملنا بھی ہوتا ہے۔ اس شخص کی زندگی کی سب سے
بڑی خواہش اولاد ہے۔ یہ خواہش ٹرم کے ذریعے پوری
ہو رہی ہے۔ اس لیے وہ ان دنوں ٹرم پر ہزار جان سے نذا
ہے۔ اس نے ٹرم کو وہ رعایتیں بھی دے رکھی ہیں جو اس
سے پہلے اس کی کسی یونی کو حاصل نہیں تھیں۔ وہ انٹر اکی
میرے ٹیکٹ آجاتی ہے اور تنہائی میں مجھ سے کب کب کرنی
ہے۔ میرے ذریعے ٹرم کو آپ کے اور شفتا کے متعلق کافی
کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ ٹرم نے مجھ سے واشگاف الفاظ میں
کہا ہے کہ جاگیر وار دشمن کو معاف کرنے والا شخص نہیں۔
اس نے شفتا اور انجم کو صرف مطلب براری کے لیے رہا کیا
ہے۔ جو جسی مطلب نکل جائے گا وہ سراپا انتقام بن جائے گا۔
ٹرم بہت خوف زدہ ہے۔ وہ اندر سے بہت حساس بلکہ وہی
ہے۔ اب اسے یہ نیا دواہم لاحق ہو گیا ہے کہ بچے کی پیدائش
کے بعد قادر زماں نے آپ سے زیادتی کی تو اس زیادتی کا بوجھ
اس کے بچے پر پڑے گا۔ وہ جانتی ہے کہ بچے کی پیدائش سے
پہلے پہلے آپ شفتا اور انجم کو لے کر کہیں بہت دور نکل
جائیں۔ تین چار روز پہلے وہ اپنے اکاؤنٹ سے دو لاکھ روپیہ
نکلوا کر لے آئی۔ میرے سامنے ڈھیر کر کے کئے گئی۔ ڈاکو زماں
کی طرح شاہ جہاں اور دونوں لڑکیوں کو ملک سے باہر
بجواد۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ وہ
مسلک رو رہی تھی۔ میں نے اسے بہ شکل لٹی تھپی دی اور
ٹرم نوٹادی مگر وہ اس شرط پر واپس گئی کہ میں اس کے خیالات
سے آپ کو آگاہ کروں گی۔ میں آپ کو ٹیلی فون کرنا چاہتی تھی
لیکن جانتی تھی میری آواز سننے ہی آپ فون بند کر دیں گے
لہذا خط کا سارا لے رہی ہوں۔ خط پڑھ کر ضائع کر دیں۔
ضروری کا ایک ہے۔

نقطہ آپ کی غزالہ



سای صاحب، خدا دار فورم کے صوفیہ دارمجان

خان کا سرخ لگا چکے تھے۔ وہ ان دنوں مل سے کچھ فاصلے پر
سدہ میں تعینات تھا۔ مرجان صاحب سے ساسی صاحب کا
رابطہ ہو گیا تھا اور ساسی صاحب نے انہیں ہماری آمد سے
آگاہ کر دیا تھا۔ خضار فورس کا قتل پولیس ایجنٹ نے ہوتا
ہے۔ کرم انجمنی میں اب اس فورس کو کرم لیوی کا نام دے
دیا گیا ہے۔ اسی روز شب دس بجے ہم لاہور سے بذریعہ کار
مل کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ ایس بی صاحب کو بائی اثر
بیلے پشاور پہنچنا تھا اور وہاں سے مل کے لیے روانہ ہونا تھا۔
انسپکٹر باجوہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ ایک اے
ایس آئی شاہنواز اور دو ہیڈ کانسٹیبل تھے۔ پارٹی میں میری
شہرت پر برکت صاحب نے ایک بار پھر ناک بھوں چڑھائی
تھی لیکن ساسی صاحب کے سامنے ان کی پیش نہیں گئی تھی۔
میں نے اندازہ لگایا کہ برکت صاحب حاضر دماغ ہونے کے
باوجود کسی وقت کوئی بات یگھٹ فراموش کر دیتے ہیں۔ یوں
محسوس ہوتا تھا وہ واقعہ ”بات یا منظر ان کے ذہن سے حزب
غلا کی طرح مٹ چکا ہے۔ اس کا ثبوت مجھے اس وقت ملا
جب وہ ساسی صاحب کے سامنے میری شہرت کے سلسلے میں
ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ انہوں نے کئی ایک اعتراضات
کئے لیکن وہ سب سے بڑا اعتراض ان کے ذہن سے محو ہو چکا
تھا جو واقعی اعتراض تھا اور جس کے حوالے سے وہ مجھے خاصا
ڈرا دھکا بھی چکے تھے۔ یعنی پیچادو گاڑی کے دھواں دھار
تقاب کے بعد میرا اچانک غائب ہو جانا اور برکت صاحب کا
مع پارٹی میری تلاش میں دو گھنٹے دیر پر پھرنا۔ بہر حال ”یہ ان
کی یادداشت کا معاملہ تھا کہ انہیں یہ شکایت یاد نہیں آری
تھی۔ میں اس سلسلے میں ”شکر“ کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔

ایک طویل تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم رات دس
بجے مل پہنچے۔ یہ چھوٹا سا قصبہ ”کلاڑی منڈی“ بھی ہے۔
رات دس بجے قصبہ ”ہو“ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سب در
دووازے بند اور دروٹھیل گل تھیں۔ معلوم ہوا کہ آج کل
یہاں ڈاکو دنڈا نہ پے ہیں۔ لوگ سرشام ہی گھروں میں مورچا
بند ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم چونکہ سادہ لباس میں تھے لہذا
ہمیں بھی مشورہ دیا گیا کہ یوں رات کے اس پر آزادانہ مت
گھومیں۔ اسی قسم کی ہدایات ہمیں راستے میں بھی مل چکی
تھیں۔ ایک چیک پوسٹ پر ٹکڑی کا بڑا سا گیت بند تھا اور
ہمیں روک کر بتایا گیا تھا کہ آگے پہاڑی علاقے میں لوگ مار
کا خطرہ ہے۔ اپنی شناخت کروا کے ہم بہ شکل گیت خلوئے
میں کامیاب ہوئے تھے۔ اب اہل مل نے ہمیں ڈرا دھکا دیا

شروع کر دیا تھا۔ اس ڈرا دھکے میں تو ہم نہیں آئے۔ بہر حال

تھا کہ لے بڑا حال کر رکھا تھا۔ وہ رات ہم نے ٹل میں نکڑی کے ایک بیوی باری کے ڈیرے پر گزاری اور اگلے روز دوسرے پہلے سڑک پہنچ گئے۔

قبا کی علاقے میں کسی مجرم کو پکڑنے کے لیے پہلے پولیس ایجنٹ سے رابطہ کیا جاتا ہے۔ ساسی صاحب یہ رابطہ کر چکے تھے لہذا ہمیں سڑک میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ صوبے دار مرخان صاحب نے ہمارا استقبال کیا اور قصبے کے معززین سے تعارف کرایا۔ سڑی نے پورے علاقے کو پولیس میں لے کر رکھا تھا۔ کوہ سفید کی طرف سے آنے والی پہلی ہوا نے کڑکتے جاڑے کا سماں باندھ رکھا تھا۔ ہماری رہائش کا انتظام صوبے دار مرخان صاحب کے دفتر کے پاس ہی کیا گیا تھا۔ صوبے دار مرخان خود بھی مرجع درمناں شخصیت ثابت ہوئے ان کا لال لگائی چہرہ شکنوں سے بڑھا لگیں یہ مسکراہٹ کی گنتیں تھیں۔ ان شکنوں کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ بندہ ہر وقت مسکراتا رہتا ہے۔ ان شکنوں کے درمیان چہرے پر اتنی جگہ ہی نہیں تھی کہ وہاں غصے کی گنتیں نمودار ہو سکتیں۔ بالکل اسی طرح جیسے برکت صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کی شکنوں کے لیے جگہ نہیں تھی۔ وہ پشتو آمیز اردو روانی سے بولتے تھے دلچسپ باتوں کے دوران کام کی باتیں بھی اتنی آسانی سے کرتے جاتے تھے کہ طبیعت پر بوجھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً دو دلچسپ لطیفوں کے درمیان انہوں نے ہمیں یہ بات وضاحت سے سمجھادی کہ ہم جس علاقے میں گھسنا چاہتے ہیں اس کے بارے میں ان کی معلومات بہت زیادہ نہیں ہیں کیونکہ اس سے پہلے انہیں وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ہمارے لیے یہ اطلاع مایوس کن تھی لیکن ان کے انداز بیان نے ہمیں مایوسی کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ قبا کی لڑائی کا ایک دلچسپ واقعہ سناتے سناتے انہوں نے ہمیں یہ بھی سمجھا دیا کہ اس مخصوص علاقے میں گھسنے سے پہلے ہم سب کو اپنے وصیت نامے تیار کر لینے چاہئیں کیونکہ قانون کے اکثر محافظ وہاں پہنچ کر اچانک شہادت کا رُخ پا جاتے ہیں۔ یہ سچ حقیقت بھی انہوں نے ایسے شیریں انداز میں بیان کی کہ ہیکل کا نشیلا نذر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ پھر ایک نئی قسم کا تذکرہ کرتے کرتے انہوں نے اس میں سے کسی کیر علی شاہ کا ذکر نکال لیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ شخص خراجی کے معززین میں سے ہے۔ بہت پرانا شکاری ہے اور اکثر ان علاقوں میں گھومتا رہتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں ہماری بہت مدد کر سکتا ہے۔

افغان سرحد کے بالکل قریب خراجی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے یہ گاؤں بھی نکڑی کی مشہور منڈی ہے۔ خراجی پہنچ کر یہ کہ کیر علی شاہ خراجی کے قریب ہی ایک دوسرے گاؤں میں رہتا ہے اس گاؤں کا نام آپ ”ذول“ تصور کر لیں۔ ذول میں کیر علی شاہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ لال دیکتے چہرے کا ایک دلکش شخص تھا۔ اسے خوب صورت توہنیں لگایا گیا لیکن ایک انجانی مزاح کشش اس کے اندر موجود تھی۔ سید خاندان سے تھا اور گاؤں میں اسے پیر کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ آٹومیکر یا نقل کندھے سے لٹکے شایانہ انداز میں ہمیں گاؤں کی سیر کرانے لگا۔ لوگ مجھ تک کر آئے مار کرتے اور ہاتھ جوڑتے تھے یہ رات ہم نے کیر علی شاہ کے ڈیرے پر ہی گزار دی۔ کیر علی شاہ کا شانہ دور دورہ نزدیک مٹ تھا۔ اس کے مسمان خانے میں ہمیں مختلف اقسام کی چرائیں، راستیں اور پستول نظر آئے۔ صوبے دار مرخان خان۔ بتایا کہ ان علاقوں میں کتوں کے ذریعے شکار کا رواج یہ ہے۔ کیر علی شاہ وہ واحد شکاری ہے جس کے پاس بہت شکاری کتوں کا غول موجود ہے۔ رات کو کئی بار گھنے ان کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ ان میں کوئی بہت جیسیم ٹیمر بھی تھا۔ رات سونے سے پہلے اس کیچڑ باجوہ صوبے دار مرخان اور کیر علی شاہ در تک اس نقشہ پر جھگڑے۔ ہم نے ساسی صاحب کو فراہم کیا تھا۔ ساسی صاحب نے ایسی برکت کو اور انہوں نے اس کیچڑ باجوہ کو دیا تھا۔ بحث ہمارے بعد باجوہ صوبے دار مرخان اور کیر علی شاہ میں طے ہو کر چھاپا مار پائی اس علاقے میں شکاریوں کے جیسیم ٹیمر جانے کی لیکن جانے سے پہلے ایسی ہی برکت اور پولیس ایجنٹ صاحب کی حتمی منظوری کی جانے کی۔

اگلے روز ہم سڑک واپس آ گئے اب ایسی ہی برکت صاحب بھی یکم میں پہنچ چکے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ چھاپا مار پائی شکاریوں کے جیسیم ٹیمر جانے کی تو انہوں نے اس فیصلے پر پابندی کی کا اعلان کیا۔ تاہم صوبے دار صاحب کی مدد ملنے کے بعد انہیں قائل کر لیا۔

وہ ایک سرد لیکن چمکیلی صبح تھی۔ ہماری شکار پائی ہم جیسیم اور ایک پک اپ پر سوار علی زئی کی طرف روانہ ہوئی۔ اس پائی میں پنجاب پولیس کے صرف چار ارکان تھے باقی عہدہ خضدار فورس کا تھا۔ اس عملے میں صوبے دار مرخان خان کے علاوہ دو خوالدار اور آٹھ مسلح جوان تھے۔ سب شکاریوں کے جیسیم میں تھے اس کے علاوہ اصل شکاری کیر علی شاہ بھی اپنے تین خادموں اور دس عدد کتوں

کے ساتھ اس پائی میں شریک تھا۔ پک اپ کافی بڑی تھی اس میں نہ صرف کتے سامنے تھے بلکہ چھت پر پاؤں کا سامان بھی بار کر دیا گیا تھا۔ اس سامان میں تین نیچے پھنسلانے والے چوہے اور کھانے کے ضروری برتن شامل تھے۔ ہمارے اسٹیشن میں شکاری اور کتوں اور خنجروں وغیرہ کے علاوہ دس مشین گنز بھی شامل تھیں۔ تاہم ان کتوں کو ایک جیب کی پچھلی نشست تلے بڑی احتیاط سے چھپا دیا گیا تھا۔ ایک گھنٹے کے دشاوار سفر کے بعد جب ہماری گاڑیاں ویران پھاڑوں میں داخل ہوئیں تو مالک محمد کی بات یاد آئے تھی۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ علاقہ بہت حد تک بوغوبھار سے مشابہ تھا۔ زمین کٹی پٹی تھی۔ جگہ جگہ کھڈ اور وسیع خلیب نظر آتے تھے۔ ان نشیبی جگہوں میں بعض مقامات پر نیم پلے پلے ستونوں کے مانند کھڑے تھے پرتھک کھائیں کے درمیان پلے پلے چائیک۔ زمین ختم ہو جاتی تھی۔ آگے جھانکو تو خلیب میں عمودی زاویے سے کھڑی وادی نظر آ جاتی تھی۔ ایسی وادیوں کی عمودی دیواروں میں قدرتی شکاف اور دور اندر تک گھے ہوئے غار پائے جاتے تھے ان غاروں کے دیواروں پر جھاز جھکا کر کثرت سے نظر آتا تھا۔ اپنی طرز کا عجیب علاقہ تھا۔

صوبے دار مرخان صاحب اپنے مخصوص ٹیکے میں بیٹھ کر انداز میں اس علاقے کی گاڑی میں تاریخ ہمیں گھول گھول کر پلاتے جا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ علاقہ ذوے مشیت کا حصہ ہے یہاں کئی پہاڑی زمینوں پر آباد لوگوں کا تعلق لوتے زئی اور علی شیر زئی کے قبیلوں سے ہے۔ ان کی باتوں سے مزید پتا چلا کہ جنوب میں ہمزہ زمینیں ہیں مگر عرصہ دراز سے ان پر بخش لوگوں کا تسلط ہے۔ انہوں نے ایک حکایت بھی سنائی کہ کس طرح زمینوں کی ملکیت پر بخش اور اوتے زئی میں جھگڑا ہوا تھا۔ دونوں قبیلوں نے ایک دانشور خانی کو متصف کر دیا اور اس نے فیصلہ دیا کہ ”وادی دانی واد سے باقی سامہ دو بخش“ وغیرہ اوتے زئی۔ یعنی وادی نے فیصلہ دیا ہے کہ ہموار علاقے بخشوں کے اور غار پہاڑ اوتے زئی کے ہیں۔ خلیب و فراز سے گزرتے ہوئے ہمیں صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں شکار آسانی سے ملتا ہوگا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے راستہ دشاوار ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر گاڑیاں آگے لے جانا ناممکن ہو گیا۔ یہاں ایک خلیب میں بڑا سا تالاب موجود تھا۔ بغور دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ تالاب قدرتی نہیں بلکہ بنایا گیا ہے۔ ایسے تالاب ہم نے راستے میں بھی ایک دو جگہ دیکھے تھے۔ میرے پوچھنے پر کیر علی شاہ نے بتایا کہ شکاریوں نے مرغا بیوں اور کونجوں وغیرہ کو چھانسنے کے لیے یہ

جوہر تالاب بنا رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تالاب انسانوں اور مویشیوں کی پانی کی ضرورت بھی پوری کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں توں سے پتا چلا کہ جس ڈھکی نامی تالاب کے کنارے ہم آگے ہیں یہاں تک کوئی شانہ دشاوری پہنچتا ہے ایک تورا ستہ دشاوار گزار ہے۔ دوسرے ڈاکوؤں کے ہاتھوں تلے کا خطرو بھی شدید تر ہے۔ خطرے کے احساس نے تن بدن میں عجیب طرح کی سستی بھری۔ جیل کی بے کیف تہی کی میں زندگی کے چار سال جھونکنے کے بعد میں ایک بار پھر خود کو اپنے من چاہے داخل میں پارہا تھا۔ آزادی کی سبک نے خطرے کی بو سے بنگلیہ ہو کر ایک تیزی خشیو کو جنم دیا تھا اور یہ خوشبو میرے حواس کو معطر کر رہی تھی۔ بہت دنوں کے بعد میں نے اپنے سینے میں ایک کیف اور جوئی کی لہریں محسوس کیں اور پورے بازو کھول کر ایک بھر پور اعترافی لب۔ اس اعترافی کو اٹھیں لی برکت کی گرد آواز نے مکمل نہیں ہونے دیا۔ وہ مجھے اور کا نشیلا نذر کو ایک ساتھ مخاطب کر کے بولے ”تم دونوں کھڑے نہ کیا دیکھ رہے ہو۔ یہاں کوئی نوکر بھوتی دا نہیں آئے گا تمہارے کام سنوارنے چلو پک اپ سے سامان اُتار کراؤ۔“

ہیکل کا نشیلا نذر اور میں پک اپ کی طرف بڑھے۔ شیدار فورس کے جوان پہلے سے سامان اُتار رہے تھے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر انہوں نے بڑی چابک دستی سے تین نیچے کھڑے کر دیے۔ اس دوران ایک نیچے میں دسترخوان بچھایا جا چکا تھا۔ پہلے اعلیٰ افسران نے بیچ کیا پھر ہماری باری آئی۔ دشاوار سفر کے باعث سب کو تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی لیکن کیر علی شاہ یہ دستور ہشاش بشاش تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کتے بے چین ہیں۔ جب تک انہیں پک اپ سے اُتار کر ایک راؤنڈ نہیں گھولایا جائے گا وہ شہرے جاتے رہیں گے۔ کیر علی شاہ کے ارادے پر مرخان خان اور اس کیچڑ باجوہ بھی کتوں کو ایک چکر گھولانے پر تیار ہو گئے۔ کتوں کو پک اپ سے اُتار کر ایک ان میں دو ٹوٹی ٹیسی مل ٹیمر تھے۔ ٹیمر کو گیر اور پانی تازی تھے۔ ٹوٹی سب سے توانا تھے۔ وہ بڑی بھرتی کے ساتھ پک اپ سے اُترے اور زنجیریں جھڑا کر گھنٹے کی کوشش کرنے لگے۔ کیر علی شاہ کے اشارے پر اس کے خادموں نے سب کتوں کو آزاد چھوڑ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ خلیب و فراز میں گم ہو گئے اور ان کی آوازوں سے ویرانہ کو گونجنے لگا۔ شکاری کتوں کے پیچھے بیدل بھانگا جان جو کھوں کا کام ہے اور یہ کام کیر علی شاہ کرنا تھا۔ وہ ہمارے آگے آگے بڑی تیزی سے خلیب و فراز کو پھانگتا چلا جا رہا تھا۔ ہم سب پیچھے تھے اور

صوبہ داو مرجان صاحب ہمارا ساتھ دے رہے تھے۔ اسے میں ہمارے بالکل قریب سے ایک بولی فراتے بھرتا نمودار ہوا اور ایک کھوہ میں غائب ہو گیا۔ وہ کسی گھری یا خرگوش کے تعاقب میں تھا لیکن اس سے پہلے آڑی کتوں نے ایک جنگلی بیلے پر دانت آزادا لائے۔ خون کی بودودوں بولی کتوں کو آڑی کتوں کی طرف کھینچ لائی۔ اس موقع پر صوبہ دار مرجان اور ایک خادم نے لپک کر دونوں بولی کتوں کو سنہال لیا۔ صوبہ دار نے بتایا کہ یہ دونوں کتے بڑے جارحانہ مزاج تھے مالک ہیں۔ خاص طور پر شکار اور صنف مخالف کے معاملات میں یہ ضرور اپنی برتری جتاتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ کس طرح ایک گتیا پختی ملکیت ثابت کرتے کرتے ان دونوں نے چند ماہ پہلے ایک بوڑھے خادم کو جان سے مار ڈالا تھا۔

اگلے تین روز ہم نے اس علاقے میں گھومتے پھرتے اور شکار کرتے گزار دیے۔ یوں رہا تھا ڈاکوؤں وغیرہ کی صرف کمائیاں ہیں۔ ورنہ اس علاقے میں کہیں کسی بندے بش کا برا نہیں۔ ہمارے چاروں طرف چٹانیں تھیں غارتھے اور کمائیاں تھیں۔ شکار دار فخر اور نومس بھی شکار کا تھا۔ گھومنے پھرنے کا لطف آگیا۔ اور تو اور اس بی برکت صاحب بھی ان مصوفیات میں دلچسپی لینے لگے۔ انہوں نے ایک مرتالی شکار کی۔ مرتالی ٹھکڑے ہوئے پانی میں گری ظاہر ہے مرتالی کو نکالنے کے لیے مجھے بائیکاٹیشنل نذیر کو ہی تلاب میں گھسنا تھا۔ قریب قریب میرے نام نکلا۔ میں بخ بست پانی میں گھسا اور مرتالی پکڑ کر لڑنا کتا باہر نکلا۔ اب معلوم نہیں ایس لی صاحب کو مرتالی مار کر زیادہ مزہ آیا تھا مجھے تلاب میں غسل کرانے کے وہ اب صرف اور صرف مرتالی مارنا چاہتے تھے۔ مرتالیوں پر وہ اس قدر فریضہ ہو چکے تھے کہ ایک روز ایک مرغ ذریں بڑے اشتیاق سے ان کا نشانہ بنے ان کی رائفل کے عین سامنے آ بیٹھا لیکن ان کا ٹارگٹ دور بھی ہوئی ایک مرتالی بھی۔ انہوں نے مرغ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ نتیجتاً دونوں پرندے بہ عافیت اپنے آشیانوں تک پہنچ گئے۔ ان تین دنوں میں صرف ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ دوسرے روز علی الصبح جب ہم شکاری کتوں کے ساتھ جنوب کے رخ پر جا رہے تھے، ایک عمر سیدہ ریمانی نے ہمارا راستہ روک اس کی دانت میں ہم انجان شکاری تھے جو شکار کے خوش میں بلک کر اصرار لگے تھے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ شکار کے لیے یہ علاقہ ٹھیک نہیں۔ ہم

نے سمجھا کہ وہ ڈاکوؤں وغیرہ کا تذکرہ کرے گا وہ ایک اور ہی فسانہ لے بیٹھا۔ اس نے دو ایک فریل بل کھائی کھائی کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ اس کھائی کے پار تقریباً تمام پہاڑیاں ہوائی چیزوں کے قبضے میں ہیں۔ ان ہوائی چیزوں کی تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ سن پینتالیس میں ایک انگریز کپتان اپنی پوری کپنی کے ساتھ سلطان نای نوجوان کا تعاقب کرتے ہوئے ان پہاڑیوں میں داخل ہوا تھا۔ سلطان کے ساتھ اس کی حاملہ بیوی بھی تھی۔ وہ میاں بیوی انگریز سرکار کے معتب تھے۔ انگریز فوجیوں نے سلطان کو گھیر کر مار دیا اور کپتان نے اس کی بیوی گھینے کو رات بھر زیادتی کا نشانہ بنا کر مار کر ۱۱۱۰ اس کے بدن نشے میں دھت کپتان اور اس کے فوجی وہیں جمولہ اریں میں ہو گئے۔ صبح ان میں سے کوئی بھی نہیں اٹھ سکا۔ ان سب کے جسم پر گولیوں کے نشان تھے اور خون بہہ کر لوٹھروں کی صورت میں پتھروں پر جما ہوا تھا۔ صرف ایک مسلمان خوالدار زندہ بچا تھا۔ ایک شبی آواز نے اسے کہا کہ وہ جائے اور جا کر تالوں کے انجام سے لوگوں کو باخبر کرے۔ اس واقعے کے بعد ان پہاڑوں سے اکثر سلطان اور گھینے کے قبیضے نکال دیے ہیں۔ ان قبیضوں کے ساتھ متوطن فوجیوں کی چیخیں اور آؤ بکا بھی ابھرتی ہے اور صاف بچائی جاتی ہے۔

بوڑھے نے جو کہ بتایا وہ غیر متوقع نہیں تھا۔ اپنے دور دراز اور بے آباد علاقوں میں ایسی کمائیاں اکثر سننے میں آتی ہیں۔ ہاں اگر ایسی کوئی روداد ہمارے کانوں تک نہ پہنچی تو یہ ضرور غیر متوقع بات ہوتی۔ کم از کم میں تو ضرور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ ہمارے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہو رہی! امر رسیدہ پہاڑی اپنا کام کر کے چلا گیا اور ہم اپنے کام پر روانہ ہو گئے۔ ہمارا کام ہی یہ تھا کہ ایسی جگہوں تک پہنچیں جہاں لوگ نہیں پہنچتے یا پہنچنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اگر یہ پہاڑیاں ”موسم علاقہ“ تھیں تو عین ممکن تھا، میاں سے ہمیں کچھ حاصل ہو سکے۔ اس روز ہم کھائی تک ہی پہنچے تھے کہ تیز بارش شروع ہو گئی اور ایک دم اگلے گرنے لگے۔ ہم نے درختوں سے پناہ لی اور یہ کام کسی اور وقت پر اٹھا کر واپس آ گئے۔ اگلے دن ہم نہ صرف ان پہاڑیوں میں داخل ہوئے بلکہ خوب گھومے پھرے۔ نہ کسی شر شرار میں ہوائی چیز سے ملاقات ہوئی اور نہ ہی کوئی بندہ بشر نظر آیا۔ چند جنگلی مار خودوں چار خرگوشوں اور ایک عدد خار پشت کو نشانہ بنا کر ہم واپس آ گئے۔ دوسرے دن بھی مار مار کر ہم انہی پہاڑیوں میں گھومنے کا تھا۔ کتوں کے غول کے ساتھ ہم نے پناہ چھوڑا اور خمدار

کا دیہہ ار کر! ہوں۔ پهلوان کو بچان لینے کے بعد مجھ سے جو پہلے بے ساختہ فعل سرزد ہوا وہ بھی تھا کہ میں اٹھ کڑا ہوا اور جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا دھلون کی طرف بڑھنے لگا۔ ذہن پر کار بکار کر رہے ہوں کہ وہاں کھائی کی حرکت نہ کر دیا جس سے پهلوان کے کھوجانے کا اندیشہ ہو۔ یہ عجیب وضع کے خبیث و فراز ملک جھپکتے میں پهلوان کو لنگھوں سے او بھل کر سکتے تھے۔ اننگلو باجوہ کسی دوسرے شخص کو آگاہ کرنے کا موقع نہیں تھا۔ کسی کو بتاتے بغیر میں پهلوان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

یہ میری زندگی کا طویل اور دشوار ترین تعاقب ثابت ہوا۔ مری کھائیوں اور پیچ دار راستوں پر میں نے پهلوان کے پیچھے تقریباً چار میل کا فاصلہ طے کیا۔ اس میں تقریباً دو گھنٹے لگے۔ ان دو گھنٹوں کا ہریل میں نے بلی صراط پر گزارا تھا۔ ہر لمحے یہ دھڑکا رہا تھا کہ میں پهلوان کو کسی کھائی میں کھودوں گا یا وہ کسی موڑ پر اچانک مجھے دیکھ لے گا۔ اس چار میل کے راستے میں پهلوان صرف دو مقامات پر ٹرک۔ پہلی دفعہ اس نے دو فخر سواروں سے پند باتیں کیں۔ پھر ایک تالاب پر ٹرک کر کھوڑے کو پانی پلایا اور خود بھی پیا۔ میاں مجھے چند پاؤندے (خانہ بدوش) بھی نظر آئے تھے۔ انہوں نے پهلوان کے زخمی کھوڑے کی ٹانگ ملاحظہ کی اور کچھ دیر پهلوان سے باتیں کرتے رہے۔ جوں جوں پهلوان دشوار گزار راستوں پر آگے بڑھ رہا تھا، میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ نجانے کیوں یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں عینی جان کے ذریعے سے قریب تر ہو رہا ہوں۔ معلوم نہیں یہ خوش فہمی تھی یا احوال واقعی مگر جو کچھ بھی تھا سنی خیر تھا۔ راستے میں جگہ جگہ جنگلی سیات کے مخصوص مناظر بھی دیکھنے میں آ رہے تھے۔ ایک جگہ درخت سے بندھی ہوئی ایک رتی نظر آئی۔ خون آلود رتی کے دوسرے سرے پر چند بڑیاں اور ایک بیڑ کے نوٹے بھونے پاؤں نظر آ رہے تھے۔ صاف پتا چلا تھا کہ کسی شکاری نے جنگلی جانوروں کے شکار کے لیے اس بیڑ کو چارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

جلدی مجھے اندازہ ہونے لگا کہ ہم پاؤندوں کی کسی ہستی کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ ان دیران پہاڑیوں میں کہیں کہیں پاؤندوں کے ذریعے موجود تھے۔ یہ نمات سخت جاں لوگ بھیڑ بکھلا پاتے ہیں، شکار کھیلنے ہیں اور اکثر موسم تبدیل ہونے پر نقل مکانی کر جاتے ہیں۔ میرا قیادہ درست نکلا۔ ایک پہاڑی کا بکر کاٹنے ہی مجھے اپنے سامنے ایک ہستی نظر آئی۔ یہ نیچے اور ہم نہایت مجھ پرندے تھے۔ بعض جمہورندوں کے گرد

کھائی کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ کھائی دھائی تین فلاگ طویل تھی اور اس کی شکل انگریزی کے حرف الیس سے مشابہ تھی۔ اس میں پھلای اور پھلدار کٹو کے بے شمار درخت آگے ہوئے تھے۔ اس کھائی سے ملتا جلتا ایک نشان مالک محمد کے دیے ہوئے خاکے میں بھی موجود تھا۔ تاہم ابھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم اسی جگہ موجود ہیں۔ ایس لی برکت صاحب آج ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ ہم نے دو تین گھنٹے خوب شکار کھلا، جنگلی پر کھائے اور درختوں کے ایک گھنٹہ میں ایک گیدڑ اور گیدڑی کے روپان مانی غور کیے۔ دوسرے کو ہم ستانے کے لیے ایک ہموار جگہ پر جا بیٹھے۔ یہ مقام ایک بل کھاتے راستے کے کنارے واقع تھا۔ راستہ تو تھا لیکن آدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک گھنٹے کے دوران میں نے اندھ من چھنے والی دو بوزی میاڑوں اور ایک دوقن چرواہے کے سوا کسی کو نہیں دیکھا۔ ہماری بارہلی کے بیشتر ارکان سو رہے تھے یا انکھ رہے تھے۔ کتوں کے منہ پر جالیاں چڑھا کر انہیں دو درختوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ وقتاً میں چونک گیا۔ خبیث میں کوئی پچاس فٹ نیچے مجھے ایک شخص نظر آیا۔ وہ ایک ستون نما چٹان کے عقب سے اچانک یوں نمودار ہوا جیسے آگ آیا ہو۔ وہ بیدل جا رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک چمکے ہوئے کھوڑے کی راسیں تھیں۔ لگتا تھا کھوڑے کی اگلی ٹانگ پر آواز آ رہی تھی۔ ایک مسافر اپنے زخمی کھوڑے یا کھوڑی کو کھینچتا ہوا معلوم منزل کی طرف جا رہا تھا۔ اس میں چونکنے والی بات نہیں تھی۔ چونکنے والی بات اگر تھی تو مسافر کی شکل و صورت اور اس کے ذیل ڈول میں تھی۔ نہایت کشادہ کھنڈوں والے اس شخص کو میں پہچانتا تھا۔ وہ جاگیر دار قادر زمان کے ملازموں میں سے تھا اور میں خولی میں کئی مرتبہ اسے دیکھ چکا تھا۔ میری آنکھیں دھوکا میں کھاری تھیں۔ یہ ایم کیو والا وہی پهلوان تھا جو علالت کے دوران میری عمرانی کر رہا تھا اور جب ایک رات میں نے خولی کے سمان خانے میں رقص و سرود کی محفل دہم پر ہم کی بھی تو اس نے پیچھے سے آکر میری گردن پر رائفل کاٹکے آزاد کیا تھا۔ میں ہلنے پر تھا اور مجھ سے پهلوان کا مجموعی فاصلہ تقریباً ڈیڑھ سو گز تھا۔ اتنی دوری سے آوی کو ٹھیک طرح شناخت کر لینا آسان نہیں ہوتا لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے، پهلوان کو شناخت کرنے میں اس کی صورت کے علاوہ اس کا ذیل ڈول بھی مدد دے رہا تھا۔ چند لمحوں کے اندر اندر مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ میں اس دور دراز خرابے میں جموں خاصاں کے ایک خاص الخاص شخص

کڑی کی بائیں لگائی تھی۔ ہستی کے بچوں بچ بھڑکیوں کے لیے اعلیٰ ہے ہوئے تھے۔ سپر کا وقت تھا اس لیے اعلیٰ خالی تھے۔ پاؤندوں کے روڑا در گردی، حطون، چر رہے تھے۔ غور دیکھتے پر ان روڑوں کے درمیان بے پالوں والے محافظ تھے بھی کشت کرتے نظر آتے تھے۔ پہلوان تھکے تھکے قدموں سے ہستی میں داخل ہو گیا۔ ایک دو افراد سے اس کی علیک سلک بھی ہوئی۔ قرآن سے ظاہر تھا کہ وہ یہاں ایک جانی پہچانی شخصیت ہے۔ یہ جگہ بھی جان کا ذرا تو ہرگز نہیں تھی پھر پہلوان یہاں کیا کرنے آیا تھا؟ میں ابھی یہی بات سوچ رہا تھا کہ میرے دائیں جانب نزدیک ہی کہیں ہلکی غراہٹ ابھری۔ پھر ”دودو“ کی آواز سنا دی۔ کوئی چوپایہ مثلاً کتا وغیرہ جب کسی پر حملے کے لیے لپکتا ہے تو یہ مخصوص آواز ابھرتی ہے۔ کبھی آپ نے غور کیا ہو تو اندازہ ہوا ہوگا کہ اس آواز میں بڑی خوف ناک قسم کی سنسنی ہوتی ہے۔ کھنٹی جھاڑیوں میں سنائی دینے والی اس آواز نے مجھے بھی سینکڑوں کے دوسرے میں چو کنا کر دیا۔ میں نے تیزی سے رخ بدلا۔ بڑے قد کا ایک الیشن کتا بڑی رفتار سے مجھ پر جم پڑا تھا۔ رانقل میرے دائیں ہاتھ میں تھی۔ بائیں ہاتھ نے ایک درخت کی شاخ کو تھام رکھا تھا۔ اتادقت نہیں تھا کہ میں رانقل کو ٹال کی طرف سے تھام کر کھلے کے طور پر استعمال کر سکتا..... کتنے سے مجھ پر جست لگائی تو میں نے رانقل کی ٹال نیزے کی طرح اس کی پسیوں میں ماری۔ ضرب لگانے کے ساتھ ساتھ میں بائیں طرف جھکا تھا اور یوں اس کی زو سے صاف بچ گیا تھا۔ خاموشی سے حملہ آور ہونے والا جسم کتا اب پورے زور سے جھوٹ رہا تھا۔ زمین پر پڑے کتے ہی وہ اس پرگ کی طرح اچھلا ایک ہی حرکت میں اس نے اتنا سر بھرا اور مجھ پر چلا گیا بھی لگادی۔ اس دفعہ میں نے اپنی گردن بھٹکل اس کے سفید نوکے دانٹوں سے بچائی۔ اس کے چلاٹک لگاتے ہی میں نے بچے کر گیا تھا اس لیے وہ میرے اوپر سے دول کرتا ہوا جھاڑیوں میں بھاگا۔ اس عمل کے دوران چند ساعتوں کے لیے میرا چہرہ اس کے بالوں مجھے سے بھٹ سے غرایا تھا۔ گرم بیٹ کی حرارت اور تیز حیوانی بو میرے حواس کو بھونچتی ہوئی آگے نکل گئی تھی۔ اب مجھے اپنی طرف لپکتے ہوئے چند افراد بھی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ گھبراہٹ شلو اور ان کے لیے کرتوں والے پاؤندے تھے۔ ان میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں کتے کی زنجیر محول رہی تھی۔ باقی دو آتش بھیاڑوں سے سناتے تھے۔ یہ سب کچھ میں نے ایک ساعت کے مختصر وقت میں دیکھا۔ اس کے

ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ کتا جھاڑیوں میں لوٹ لگانے کے بعد سیدھا ہو گیا ہے اور اب پھر میری طرف لپکنے کے لیے تیار ہے۔ دائیں ہاتھ میں رانقل کا ہوجہ اور اس کا زاویہ میرے لیے تسلی بخش تھا۔ میرا بائیں کندھا زمین سے لگا ہوا تھا اور صرف ایک کوٹ لے کر میں کتے کو نشانہ بنانے کی پوزیشن میں آسکتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میری زندگی میں یہ تیسرا بچہ تھا موقع تھا جب مجھے اس طرح کی کتے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہر بندے کی ایک سانسکی ہوتی ہے کچھ ایسی عادات ہوتی ہیں جن کا انسان کو خود بھی پتا نہیں ہوتا کہ وہ اس میں کیسے پختہ ہوئی ہیں۔ مجھے بھی ایسے لوگوں سے شدید نفرت ہے جو انسان پر کتا چھوڑتے ہیں اور کتے کے بل بوتے پر کسی کو زہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب کبھی بھی ایسا موقع آیا، میرے اندر شدید بیجان ساید ہوا اور کتے کے ساتھ ساتھ کتے کے مالک کے لیے بھی میرے دل میں عجب طرح کی بے رحمی عود کرتی۔ الیشن نے مجھ کو رخ میری طرف کیا تو میں بھی تڑپ کر اونچا ہوا گیا۔ اب وہ میرے نشانے پر تھا۔ جو کئی اس نے چلاٹک لگائی، میں نے لپٹی ہوا دی۔ زوردار دھچکا ہوا۔ کوئی یقیناً کتے کی کھوپڑی میں لگتی لیکن نشانہ خطا کیا۔ نشانہ خطا جانے کا سبب وہ دراز قد شخص تھا جس نے عین فائر کے وقت مجھ پر لاٹھی سے حملہ کیا تھا۔ لاٹھی کی ضرب نے میرے دائیں بازو کو ٹک کر کے رکھ دیا۔ کتا غرا ہوا میرے اوپر گر تھا۔ وہ بے حد وزنی اور بدبو دار کتا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر جڑا آزمایا لیکن دانٹوں میں صرف جیکٹ ہی آئی۔ کتے کا خون اکودہیت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اسے گولی ملی ہے۔ ایک پاؤندے نے رانقل میری طرف سیدھی کر رکھی تھی اور بچ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ رانقل اب میرے بائیں ہاتھ میں تھی اور دایاں ہاتھ کتے کی پچھلی ٹانگ پر جم چکا تھا۔ ایک جھٹکے میں سیدھا ہوا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تینوں پاؤندوں کے دہم دھم میں بھی نہ تھا۔ میں نے کیم عظیم الیشن کو پچھلی ٹانگ سے پکڑ کر گھمایا اور بے پناہ نفرت سے ایک پاؤندے پر دے مارا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے ہاتھ میں کتے کی زنجیر نظر آ رہی تھی۔ کتے اور اس کے مالک کا تمام بتنا اچانک تھا اتنا ہی شدید بھی تھا۔ دونوں جیسے آڑے ہوئے ایک میں فٹ کمرے گڑھے میں جا کرے اور وہاں سے دھڑلوان پر لڑاکہ کر مزید نیچے چلے گئے۔ باقی دونوں افراد اب ان کے لیے اس منظر کے سحر میں گرفتار ہو گئے۔ میں نے پک کر رانقل برداری رانقل پر ہاتھ رکھا اور سینے پر ٹانگ کی بجائے کئی ضرب لگائی۔ وہ ملنے سے

”او“ کی آواز نکلا ہوا گھاس نہر گرا۔ رانقل اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ میں نے رانقل ہمارا کردار بھارتیہ کا زمین پتک دی۔ لاٹھی ہوا نے اس موقع پر خلاف توقع دلیری اور پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ ایک نھو سا بندہ کر کے پلو سے جھپٹا اور لاٹھی میرے ہاتھوں پر ماری۔ ایک بار دہرائیں بازو پر چٹ لگی اور رانقل میرے ہاتھ سے گرے کرتے گئی۔ لاٹھی کا دوسرا وار میں نے جیسے ہٹ کر بچایا اور رانقل سونت لی لیکن جو تھی قدم پیچھے ہٹانے کے بعد میرا پاؤں زمین پر آیا ایک جھٹکے سے میری ٹانگ کو لیے تک جھٹکائی۔ اس کے ساتھ ہی کھٹکے کی آواز آئی اور کتے کے پاس شدید درد کا احساس ہوا۔ داغ میں چنگاریاں سی جھوٹ نکلی۔ اسے نیچے کی طرف نظر اٹھانے سے پہلے میں جان چکا تھا کہ کیا گزری ہے۔ میں جس جگہ کھڑا تھا وہاں چاروں طرف جھاڑیاں تھیں۔ زمین گھاس بھوس سے ڈھکی تھی اور یہ مقام ہستی سے پھوٹنے والے راستوں سے کافی ہٹ کر تھا۔ ایسے مقامات پر طالع آزمایا شکاری اکثر جنگلی جانوروں کے لیے پھندے لگا دیتے ہیں۔ مقامی لوگوں کو تو ایسی جگہوں کا پتا ہوتا ہے لیکن کوئی باہر کا شخص اگر ذرا استیصال راستوں سے ہٹ کر چلے تو ایسے پھندوں سے دوچار ہو سکتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں نے دل کڑک کرے نظر کا زاویہ بدلا۔ ہڈی کا ٹپلا حصہ ایک چوٹی کھٹکے میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ لکڑی کے بنے ہوئے دو مکان کی شکل۔ کبکھڑے تھے۔ انہیں ایک اسپرنگ سے مربوط کر کے مٹی اور گھاس میں چھپایا گیا تھا۔ پاؤں کا وزن بڑے ہی وہ گولی کی رفتار سے بند ہوئے تھے اور مختصر جکڑا تھا۔ مقام شکر تھا کہ یہ کھٹکے لکڑی کا تھا۔ وزن ہڈی کی بڑی بھی لڑا تھا۔ وہ ہو سکتی تھی۔ میں نے ٹانگ کو حرکت دینا چاہی تو اندازہ ہوا کہ زور لگانے پر یہ ”ایٹا لڈ والا کام“ اب بھی ہو سکتا ہے۔ ایک شدید نہیں نے مجھے پٹ کے بل کرنے پر مجبور کرنا۔ چند لمحوں کے لیے تو میرے دونوں حریف بھی نہ کچھ کے کہ اچانک یہ کیا ہوا ہے پھر ان کے چوں پر سرت امیر غضب کی پلٹا دی ہوئی اور وہ غراتے ہوئے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ بڑی کر جو تھی کسی اس ٹاپ میں۔ توڑی دہرے کے لیے ہم ایک جان تین قالب ہو کر رہ گئے۔ گھوٹے، ”لائٹس“ ٹھوکریں کیا تھیں جو انہوں نے مجھ پر بھارتیہ نہیں کیں۔ میری پی جیکٹ پھٹ گئی، قمیص اور عزیمتی اور چوٹوں لہلہاں ہو گیا۔ اس دوران خیب میں لڑنے والا شخص بھی نکل آتا ہوا موٹھہ پہنچ گیا اور اس ”پناہ دہت“ میں شریک ہو کر مٹی دھوئی کمرے لگا۔ غالباً اپنے غور غور کتے کو ”خونوں

خون“ دیکھ کر اسے کچھ زیادہ ہی راحت نصیب ہوئی تھی۔ وہ کود کود کر میری پلاٹیں لے رہا تھا اور دانت پس پس کر صدمے واری جارہا تھا۔ مجھے مار مار کر جب وہ تینوں بڑا حال ہو گئے تو آئندہ کالا کتا سن سوچنے لگے۔ اس دوران خیب سے تین اور افراد بھی موقع پر پہنچ گئے۔ یہ تینوں غالباً فائرنگ کی آواز سن کر آئے تھے۔ دراز قد شخص نے سننے آئے والوں میں سے ایک کی پگڑی لی اور مجھے اوندھا کر کے میری کھانیاں باندھ لگے۔ رانقل بردار نے میرے لباس کی تلاشی لی اور جیکٹ کی جیب سے شکاری چاقو نکال لیا۔ میری دست کڑی ”تقدی“ انگوٹھی اور رانقل ان کے قبضے میں تھے۔ ان کی آنکھیں اور زبانیں مجھ پر آتش فشانی کر رہی تھیں۔ میں صرف آنکھوں کی زبان سمجھ سکتا تھا اس لیے انہوں نے جب تک میرا کھٹکے نہیں کھولا اور دھکیل دھکیل کر مجھے دھڑلوان تک نہیں پہنچا دیا۔ مجھے یہ ہی نہیں چلا کہ الیشن مر چکا ہے۔ گولی اس کے سینے میں کہیں گئی تھی۔ رہی سہی کسر چھوٹ کر گرنے سے پوری ہو گئی تھی۔ اب وہ اپنے خوناک دانت ٹھوسے بے نور آنکھوں سے کمرے نیلے آسمان کو تک رہا تھا۔ وہ لوگ مجھے رانقل کی ٹال سے دھکیل دھکیل کر نیچے آتارے لگے۔ رخ سے اندازہ ہوا تھا کہ مجھے ہستی میں لے جایا جا رہا ہے۔ یہ صورت حال میرے لیے ناہنہ دہ تھی۔ تینوں خاند بدوشوں سے میں نے لڑائی بھی اس لیے مول لی تھی کہ یہاں سے بچ کر نکل سکوں۔ اگر پاؤں پھندے میں نہ چڑھتا تو پچاس فیصد سے زائد امکان تھا کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا مگر اب وہی ہو رہا تھا جو میں نہیں چاہتا تھا۔ مجھے گھیر کر ہستی میں لے جایا جا رہا تھا جہاں جا کر دار قادر زماں کا اہلکار موجود تھا اور اس کے علاوہ معلوم نہیں اور کون کون تھا۔ ساری پلانٹ ہی غصہ ہوئی نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر تو دوسوں کی یلغار رہی۔ پھر میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹک دیا۔ جو ہو گیا سو ہو گیا اب یہ سوچنا تھا کہ آئندہ کیا ہوگا۔ ہم ہستی کے قریب پہنچے تو بچے بوڑھے اور عورتیں سب گھروں سے باہر نکل آگئے۔ جس شخص کا تارا وہ قاتی سے رخصت ہوا تھا اس نے جوش میں آکر مجھ پر لاٹھیاں برسائی شروع کر دیں۔ ایک بوڑھے نے اسے دو کا۔ غالباً اپنی زبان میں اسے سمجھایا تھا کہ ”جیوا کونشن“ کے مطابق مجھے قیدیوں کے حقوق حاصل ہیں یا پھر اس سے ملتی جلتی کوئی اور بات کی ہوگی۔ نتیجتاً شخص... نے لاٹھی چارج سے ہاتھ روک لیا اور زبانی کلامی غصہ آتارے تک محدود رہا۔ ہستی

والے ہیں تو بھی اُنہی کی آہن نظر آنے لگتی تھی۔ اب یہ اُنہی کس چیز کی تھی اُس کا خود مجھے بھی پتا نہیں تھا۔ بس اندازہ ہو رہا تھا کہ پهلوان میری وکالت کر رہا ہے۔ توڑی دیر بعد سڑکوں کی کانفرنس ختم ہوئی اور دو لوگ میری طرف بڑھ آئے۔ اس مرتبہ جموںک خاصاں کا پهلوان سب سے آگے تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے کھلی دینے والے انداز میں تھکا پھرمیرے ہاتھوں کی بندش کھولنے لگا۔

”تبت حیران ہوا ہوں میں۔ تمہیں یہاں دیکھ کر“ اس نے نرم لمبے جھٹکے۔

”اے حیران میں بھی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیسے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”نی الحال تو کیسا ہی ہوں۔“

”خدا کا شکر کہ بڑے“ یہاں اس موقع پر میں بھی موجود ہوں۔ اس کہنے کے بدلے تمہاری ایک لت (ٹانگ) تو انہوں نے توڑی۔“ یہ تھی۔ دوسری بھی ٹوٹ جاتی تو کوئی بڑی گل نہیں ہوتی تھی۔

”ایک تو سمجھو ٹوٹ گئی تھی ہے۔“ میں نے دائیں پٹلا پر زور دیا۔

”نئی نہیں ہے۔ فیرتے گل پے مٹی ہے۔“

مجھے ساتھ لے کر وہ جھوم سے باہر نکلا۔ سردار کے ہاتھ میں میری راتقل نظر آ رہی تھی۔ یہ راتقل اس نے پهلوان کر دی اور پهلوان نے میرے سپرد کر دی۔ میری ٹوڑی اچھوٹھی اور زب سے نکلنے والا دوسرا پتہ بھی ٹوٹا رہ گیا۔ ہم دونوں بہت روتے چلتے پستی کے اس تے میں آگے جو پهلوان سے قریب تر تھا۔ مجھے چلنے میں کافی دشواری پیش آ رہی تھی۔ ایک تنگ گلی سے گزرا اور پهلوان مجھے ایک نیم پتے جمونیزے کے سامنے لے آیا۔ جمونیزے کی دیواریں گارے اور چٹوں کی تھیں جب کہ چمت گڑیوں کی تھی۔ اس جمونیزے میں باقاعدہ گڑی کا دروازہ لگا تھا۔ دروازے کے قریب ہی دو زخمی جمونیزے تھے۔ انہیں پهلوان کھینچتا ہوا آہنی تنک لایا تھا۔ ہم اندر آئے اور ایک دروازے پر بیٹھ گئے۔ یہاں چکر کی گڑی تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ چیمٹ کے پتے اور جمونیزے کے پتے۔

”ایک چٹنی سی آغوش ہوئی اور چٹنی“

”دوم ہوا کہ یہ ایک طرز کی آغوش تھی جو جمونیزے کے کھٹے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔“

میری نگاہ سے اوچھل گیا۔ ایک اہلی

پرسے سے گزر کر پہلوان اس مقبی حصے میں گیا اور دروازہ
بند ہاتھ میں ایک لوٹا ہاتر بن لیے نمودار ہوا۔ اس کے
دوسرے ہاتھ میں ایک چربی کی مٹی۔ لوٹے کے تیر گم پانی
سے اس نے میرا ہاتھ منڈھلایا اور چرے کے زخموں اور
خراشوں پر لگانے کے لیے ایک دہلی ساخت کا مرہم دیا۔ میں
نے پٹی ہولی دیکھ کر قیص اور قیص آنار دی تھی۔ پہلوان اندر
سے ایک لمبا سارنق برق کرتا لے آیا جو ظاہر ہے مجھے پشنا
چاہتے ہیں جو پرنسے کے مقبی حصے سے پچڑیوں کی مدغم
مدا آئی اور کسی عورت نے دھبی گواڑ میں پہلوان کو
پکارا۔ پہلوان لبک کر گیا اور ایک گول ٹرے لیے واپس آ
گیا۔ ٹرے میں گڑا مرہم قدے کی سیٹلی تھی۔ وہ چھوٹی پالیاں
تھیں۔ اس کے علاوہ ایک تھالی میں شیش، خشک خویاںیاں
اور شہتوت تھے۔ اس علاقے میں سمان نوازی بہترین
انداز کی تھا۔ پہلوان نے ٹرے میرے سامنے رکھ دی اور
بولاً "بادشاہو! یہ چیزیں اپنے وطن کے دودھ لسی کا مقابلہ تو
نہیں کر سکتیں؟ کپڑا کے دیکھو ہیں بہت مزے وار۔"
ڈرائی فروٹ واقعی کھانے کے لائق تھا۔ اس کے ساتھ
ساتھ اصل افغانی توتہ مار کرائی کے بعد اس ریتیش منٹ
نے خاصا الحف دیا۔ توتے کی چکیاں لیٹے ہوئے پہلوان نے
کہا۔ "ہاں جی! اب بتاؤ، یہاں کیسے آنا ہوا اور کیا ارادے
شراوے ہیں آپ کے؟"
یہ بڑا نازک سوال تھا۔ جواب دینے سے پہلے میں جانا
چاہتا تھا کہ پہلوان یہاں کسی حیثیت سے موجود ہے۔ میری
آخری اطلاعات کے مطابق وہ قادر زباں کا سلیخ محافظ تھا اور
چوٹی کے سمان خانے میں اس کی حیثیت خدائی فوجدار کی
تھی لیکن اب وہ اس دروازہ پانڈہ قی میں نظر آ رہا تھا اور
اس کے رویے سے لگ رہا تھا کہ وہ قادر زباں سے تعلق ختم
کر چکا ہے۔ اب معلوم نہیں یہ صرف میرا خیال تھا یا حقیقت
میں آیا ہو چکا تھا۔ میں نے پہلوان کے سوال کا جواب دینے
سے پہلے اسے نونان چاہا۔ میں نے پوچھا۔ "میرے ارادے
شراوے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"
کہنے لگا۔ "یہ کہ آئندہ کا کیا پروگرام ہے۔ جہاں تک
مجھے یاد ہے تم جاگیردار کے کہنے پر چوٹی سے طس مسم پر نکلے
تھے وہ لڑکی کیا نام ہے اس کا۔ انجم۔ وہ بھی تمہارے
ساتھ تھی۔ شاید تنہا چلی جاتا تھا۔"

تک میرا مطلب سمجھ گیا۔ کیر لگا۔ ”گھبرا نہیں میرے بھرنے۔ اس وقت ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، جو بات کہنی ہے کل کہنا کے کر۔“

میرے اچانک بن کر کہا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں۔“

اس نے کشتی سے ٹھیک لگا کر ایک لمبی ڈھار لی۔ یوں لگا جیسے پیالی پر محروہ کسی اندر سے کونکس میں جا کر اسے۔ وہ حسبِ عادت انگلیوں سے اپنے گھڑکڑا لے ہاتھوں میں لٹکھٹی کر کے بولا۔ ”سمجھ تو تم سب کچھ رہے ہو“ میب یار۔ بس میرے منہ سے کھلوا نا چاہے ہو۔ چلو ٹھیک ہے۔ اب پردے میں رکھنا بھی کیا ہے۔ بات یہ ہے میب کہ میں جاگیر دار کی نوکری پر لا۔ مار آیا ہوں اور اتنی زور سے لات مار رہی ہے کہ خود بھی دیکھنے سے یہاں آگرا ہوں۔ جاگیر دار کا ایک بندہ ضائع ہو گیا ہے میرے ہاتھوں۔ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے میری؟“

میں نے کہا۔ ”پہلوان! اگر سمجھانے ہی لگے ہو تو ذرا ٹھیک کر کر سمجھا دو۔ پھر میں بھی تجھیں ساری کشتا سنا دیتا ہوں۔“

وہ مسکرا ہوا۔ ”بڑے کشتی مزاج کے ہو تم۔ اچھا چلو پہلے میری ہی سن لو۔“ پھر وہ اپنے ٹھیک بختانی کعبے میں واقعی کھل کر اپنے متعلق بتانے لگا۔ پہلوان کا نام شہباز تھا۔ وہ جدی پستی جھوک خائن کا رہنے والا تھا۔ اس کے بولنے کا انداز دلشیں تھا۔ بات کرتے کرتے مسکرا اٹھا تو اندر کی طرف ہنسنے ہوئے دانت چپکنے لگتے تھے۔ ایسے دانتوں کے مالک عموماً سخت جان اور مضبوط اعصاب کے لوگ ہوتے ہیں۔ میں نے پہلوان کے لیے شروع میں ”پہلوان نما“ کا لفظ استعمال کیا ہے، وہ جیسے ضرور تھا لیکن بعد انہیں تھا۔ عمر بھی پچیس چھتیس سے زیادہ نہیں تھی۔ تو توڑی رعایت کے ساتھ اس پہلوان کے بجائے نونہد شخص کہا جاسکتا تھا۔ میری آنکھوں میں جھانک کر کہنے لگا۔

”تجز کا پتا ہے نا...؟“

میں نے چونک کر کہا۔ ”ہاں۔ وہی جو سمان خانے میں نوکرائی تھی۔“

بولا۔ ”میری معیت ہے۔“

میرے لیے یہ اطلاع بالکل نئی تھی۔ میں نے پوچھا ”لیکن تجز کا ذکر کہاں کیسے مل گیا؟“

”تجز کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ وہ خود بھی یہاں موجود ہے۔“ پہلوان نے دھماکا خیز اکتشاف کیا۔ میں حیرت سے

اس کی طرف دیکھ چلا گیا۔ پہلوان نے میری جرت میں مزید اضافہ کرنے کے لیے جو کو آواز دی۔ ”جو! اوھر!“

جمو پڑے کے عقبی حصے میں کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ پھر جمو نے سر پر جموٹا اونچی پر ہڈا اور میں نے جو کو سامنے پایا۔ پہلوان شباز کی طرح وہ بھی بچائی لباس میں تھی۔ شاید اس لباس میں وہ ایک دفعہ حویلی میں بھی نظر آئی تھی۔ عتالی شلوار، عتالی پھولوں والا کرتا اور اسی رنگ کا دھننا۔ اس کا جسم ایسا تھا کہ ہر لباس اس پر جتنا تھا۔ بغول شاعر بوسیدہ بوسیدہ کپڑا بھی تن سے چمکو جگمگا اٹھتا تھا۔

”سلام صیب جی۔“ اس کی جانی پہچانی آواز نے مجھے خیلوں سے جھکا دیا۔

”دیکھو سلام۔“ میں نے کہا اور غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ ”تم یہاں؟“ بے ساختہ یہ سوال میرے لبوں پر آ گیا۔

جواب میں تجوا بی بی بڑی سیاہ آنکھوں سے پہلوان کی طرف دیکھنے لگی۔ جو کہ بارے میں مجھے شتا ہے چلا تھا کہ حویلی میں جندال نامی عورت نے اسے زبردست تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ پھر اسے جاں بلب حالت میں کسی گاڑی میں ڈال کر حویلی لے جایا گیا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اب میں بھی جو کے متعلق اچھی خبریں سکوں گا لیکن وہ نہ صرف زندہ تھی بلکہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کچھ سوچ ہی نہیں رہا تھا کہ کیا بات کروں۔ کیا پوچھوں؟ کیا بتاؤں؟ پہلوان نے صورت حال بھانپ کر تجو سے کہا۔ ”جو! جا کھانا تیار کر۔ تیرے صیب جی نے آج کافی ورزش کی ہے۔ جو کو شوک لگی ہوگی۔“

جو ایک نگاہ مجھ پر ڈال کر تیزی سے اندر چلی گئی۔ پہلوان نے سگریٹ سلگ کر سرکوشیوں میں کھانا شروع کیا۔ ”جو! باپ میرے باپ کا بچپن کا یار تھا، ہم اسے لایا کرتے تھے۔ جو سے میری منگنی بچپن میں ہوئی تھی۔ تائے کی موت کے بعد ہمارے تعلقات پہلے والے نہیں رہے تھے لیکن میں تو جو کو منگ ہی سمجھتا تھا۔ جس پر بچے بچلے سے بچلے میں حویلی میں جو کچھ ہوا تھا، جاگیردار کو تعین تھا کہ ہمیں تمہاری بہن کے بارے میں بتانے والی تجوی ہے۔ ایسی غلطیاں جاگیردار بھی معاف نہیں کرتا۔ اس نے جو کو جندال کے شہر کر دیا۔ وہ عورت نہیں ایک ڈانچ ہے جو اس کے بس میں آجاتا ہے اس کا خون چوس لیتی ہے۔ اس نے تجو پر بڑا ظلم ڈھایا۔ یہاں تک کہ وہ آخری دموں پر آگئی۔ جاگیردار کو پتا چلا تو اس نے کہا کہ گڑی کو مار کر بیٹے کی قبروں میں دبا دو۔ اسے گاڑی میں ڈال کر لے جانے والا میں ہی تھا۔ میرے

ساتھ ہر سرا بندہ زور آور نصیب خاں تھا۔ بیلے کے راستے میں ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ جو کو مرے نہیں دوں گا، چاہے اس کے لیے مجھے جاگیردار سے بھارت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ نصیب خاں میرا پانا یا ریلی تھا لیکن۔۔۔ جانتا تھا وہ اس معاملے میں میرا ساتھ نہیں دے گا اور یہی ہوا۔ جب میں نے جو کو بچایا چاہا تو وہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بیلے کی قبروں میں ہمارے درمیان ہاتھ پائی ہوئی اور میں نے ایک وزنی بیلے مار کر اس کا سر دو ٹکڑے کر دیا۔ جو اس وقت نیم بے ہوش تھی۔ میں اسے گاڑی میں ڈال کر فیصل آباد لے گیا۔ فیصل آباد کے ایک ٹیکسی اسٹینڈر میں تے جاگیردار کی گاڑی چھوڑ دی اور ایک ٹیکسی کے جو کو اسپتال پہنچایا۔ یہ ایک پرائیویٹ اسپتال ہے۔ یہاں وہ ہسپتے جو کا علاج ہوا۔ رقم تو فرج ہوئی مگر جو کی حالت سنبھل گئی۔ وہ پہلے بھرنے کے قابل ہوئی تو میں اسے لے کر فیصل آباد سے بھی نکل گیا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم جاگیردار۔۔۔ کے ہر کاروں سے بچ بچا کر یہاں آزاد علاقے میں پہنچ گئے۔

یہ روداد میرے لیے دلچسپ اور حیران کن تھی۔ مجھے یاد آنے لگا کہ حویلی میں جب جو میرے ساتھ لگاؤ کا مظاہرہ کر رہی تھی تو پہلوان کس طرح بیچ و تاب کھاتا تھا۔ ایم جی رائے اس کے ہاتھوں میں بے قابو ہونے لگتی تھی! اس کا بس نہیں چلا تھا وہ شاید وہ تصور میں کئی بار مجھے شدائے عشق کی صف میں شامل کر چکا تھا۔ پہلوان کی داستان کے کئی پہلو ابھی وضاحت طلب تھے۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ وہ پہاڑی خاندان بدوشوں کی اس بستی کا۔ کیوں کر پہنچا اور وہ بدوشوں نے وہ آوارہ گردوں کو کیوں کر پناہ دی۔ پھر یہ بات بھی ایسی ہی تھی کہ پہلوان ٹھٹھ بچائی ہونے کے باوجود بدوشوں کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ میں نے اس بارے میں پوچھا تو پہلوان نے کھانا شروع کیا۔

”اور والا مسبب الاسباب ہے۔ صیب یار! یہ جو خاندان بدوش ہیں، افغان علاقے اور شمالی وزیرستان سے آتے ہیں۔ سرویوں کا موسم ان جمو پڑیوں میں گزار کر واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ جو علاقے تے ہاں آئے دو الے کا اس کے بارے میں ایک کہانی ہے، سلطان نام کے کسی بندے کی۔ کہتے ہیں کہ ایک انگریز کپتان نے اسے اور اس کی بیوی کو قتل کیا تھا۔ بعد میں کپتان اور اس کے فوجی خود بھی مارے گئے تھے۔ یہاں کے لوگ جن جموٹوں اور ہوائی جہازوں پر پڑا تعین رکھتے ہیں۔ اس معاملے میں ہم پنجاب کے دیہاتی بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بس یہ سمجھو کہ جو شے سمجھ میں نہ آئے اسے شر

ٹار کہہ دیتے ہیں۔“ پہلوان نے اٹھ کر جمو پڑے میں ایک کوئی غدار کھولا۔ جمو پڑے سے باہر تاریک چمیل بھی تھی۔ اہم چاندنی رات میں دور پہاڑی چوٹیاں نظر آرہی تھیں۔ پہلوان چوٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”لوگوں کا خیال ہے کہ وہ پہاڑیاں اور آلے والے کا سارا علاقہ سلطان کی مدوح کے قبضے میں ہے۔ یہاں جو ٹھہرتا ہے اسے سلطان اور اس کی بیوی کی مدوح تک کرتی ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس علاقے میں تے گھاس اور ہیراں سب سے زیادہ ہے۔ پورا پاؤندوں کو یہاں ڈیرے لگانے پڑتے ہیں لیکن جب تک وہ یہاں رہتے ہیں، سلطان والی کہانی کا اثر ان کے دافوں پر رہتا ہے۔ کسی بستی یا گاؤں سے بھاگا ہوا کوئی شادی شدہ جوڑا یا خا عورت ان ڈیروں پر آجائے تو اسے نہ صرف زور پانا مل جاتی ہے بلکہ اس کی حفاظت بھی کی جاتی ہے۔ مجھے اس بات کا پتا نہیں تھا۔ ہم تو جو کو دیپاس کے مارے اتفاق سے اس طرف آنکھ تھے اب دیکھ لو تمہارے سامنے بیٹے ہیں۔ ملک بشر گل نے ہمیں نہ صرف یہ جمو پڑا دیا ہے بلکہ اس میں دو مینے کا راشن بھی ڈال دیا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کا ارادہ ہے کہ وہ مجھے اپنے پاس پر کھڑا ہونے میں مدد دے۔ چیلے والے افغان علاقے سے خشک مہو، تنگو کپڑا اور سچی وغیرہ لاتے ہیں اور یہ سامان کوہات، نکل دھو میں لے جا کر فروخت کرتے ہیں۔ ملک کا کہنا ہے کہ وہ اس تجارت کے لیے مجھے کچھ رقم قرضے کے طور پر دے سکتا ہے۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ ہم کسی غیر ملاتی اور غیر قوم کے لوگوں میں ہیں۔ بالکل بہن بھائیوں جیسا سلوک ہے۔ میں اس سے پہلے جاگیردار کے کام سے لندی کوئی جا رہا ہوں بلکہ ایک دفعہ پورے چھ ماہ ہاں رہا تھا۔ مجھے جتنی سوچہ بوجھ ہے۔ جو تھوڑی بہت کسر ہے وہ یہاں رہ کر پوری ہو جائے گی۔ انشاء اللہ چند ماہ تک پورا بختوں بن جاؤں گا میں۔“

پہلوان نے مجھے اپنے بارے میں کافی کچھ بتا دیا تھا لیکن نجانے کیوں میں اس پر پوری طرح اعتماد نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک معاملہ سادہ ستور میرے اور اس کے درمیان موجود تھا۔ میں مکن تھا کہ وہ حقیقت کو توڑ موڑ کر پیش کر رہا ہو۔ جو کی خاطر جو کہ خاص جمو پڑے والی بات بھی میرے دل کو نہیں لگ رہی تھی۔ وہ سادہ سادہ سلونی جو کو اپنی تنگ بات رہا تھا وہ یہ بھی کہ رہا تھا کہ تائے کی موت کے بعد دونوں گھرانوں کے تعلقات پہلے والے نہیں رہے تھے پھر ایک دم وہ جو کے لیے اتنی بڑی قربانی دینے پر بھی تیار ہو گیا تھا۔ میری نگاہ میں

پہلوان کا کردار کچھ ڈانوا ڈول سا ہو گیا تھا لہذا پہلوان کو اپنے بارے میں بتاتے ہوئے میں نے محتاط رویہ اختیار کیا۔ اپنی گفتگو میں عینی جان اور شکر کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کے بجائے بتایا کہ میں اپنے چند پرینے ساتھیوں کے ساتھ شکار پر نکلا ہوا ہوں۔ آزاد تھا کہ اگر کوئی اچھا سبب بن گیا تو غیر علاقے میں ہی رہ جاؤں گا۔ امن کے سوا دنیا میں اور میرا کون ہے۔ موقع دیکھ کر اسے بھی یہاں بلا لوں گا اور اللہ اللہ خیر ملا۔

پہلوان نے میری روداد دھیان سے سنی۔ کہیں کہیں سوالات بھی کیے۔ میں اپنی طرف سے اس کی مکمل تسلی کرانا رہا۔ آخر میں وہ بولا۔ ”ننگر خان کتا ہے کہ تم اوپر جمو پڑوں میں چھپے ہوئے تھے اور لگتا تھا کہ کسی کو تازہ رہے ہو۔“ ننگر خان سے پہلوان کی مراد وہی شخص تھا جس نے مجھ پر کتا چھوڑا تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں۔۔۔ دراصل کسی کا بچپا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ جمو پڑوں میں کوئی موجود ہے۔“

”کس کا بچپا کر رہے تھے؟“ پہلوان نے پوچھا۔

”تمہارا۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ حیران ہو کر میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ کیسے میں نے باندی سے اسے بستی کی طرف آتے دیکھا اور کیسے چار میل تک خاموشی سے اس کا تعاقب کیا۔ اب ساری بات پہلوان کی سمجھ میں آرہی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک ضروری کام سے باکڑ خیل نامی بستی تک گیا تھا واپسی میں ایک دھولان پر ٹھوڑے کو ٹھوکر لگی اور وہ لنگڑا لنگڑا لگا۔ مجبوراً اسے کھینچ کر واپس لانا پڑا۔

ہماری اس طویل گفتگو کے دوران جمو پڑے کے عقبی حصے میں کھانا تیار ہوتا رہا تھا۔ خوشبو نے کئی بیترہے بدلے تھے اور اب پاؤں اور قورے کی خوشبو قائل ہو چکی تھی۔ ذرا در بعد جو کچھ پردے کے پیچھے تھا وہ سامنے آگیا۔ جو کوئل نے میں کھانا کھانے اندر داخل ہوئی۔ مجھے درمی پر ٹھکر اس نے آہستہ سے کھانا سامنے رکھ دیا۔ میری نگاہ نے اعتبار اس کے گریبان کی طرف اٹھی لیکن گریبان تک پہنچنے سے پہلے ہی جھجک گئی۔ معلوم نہیں اس جمو پڑے میں پہلوان اور جو میں کیا رشتہ تھا مگر وہ کتا قاضی تھا کہ اب نگاہ کو قابو میں رکھا جائے جو کے دیہاتی جسم سے توجہ ہٹانے کے لیے میں پاؤں کی چمک دکھ اور قورے کے رنگ۔ وہ پٹ میں کھو گیا۔ ساتھ میں کوئی طوطہ قسم کی ڈش بھی تھی۔ اس کے علاوہ

میری سب سے بڑی کمزوری نماز اور پوسے کی سلاہ تھی۔ معلوم نہیں تجھ نے اس دور افتادہ خیرہ بستی میں یہ سارا کھٹکھٹ کیے کر لیا تھا۔ پتلون تو کھاتے ہی چپٹ بھر کر ہیں، میں نے بھی پتلونوں کی طرح کھایا۔ کھانے کے دوران بھی ہم دونوں میں مسلسل گفتگو ہوتی رہی۔ کھانے کے فوراً بعد تجھ نے قہہ سڑو کر دیا۔ جھونپڑے کے وسط میں واقع عجیب وضع کی انجیٹھی اب دھکائی جا چکی تھی۔ انجیٹھی کی خوشوار حرارت میں بیٹھ کر قہہ پینے کا لطف آگیا۔ تجھ کا گے گے آتی جاتی رہی۔ اس کا چنا پڑنا بھی شاعری تھا تاہم یہ ایسی شاعری تھی جس میں گورے رنگ کا ردیف قافیہ نہیں تھا۔ یوں یہ آزاد شاعری بن گئی تھی اور عام شخص اس کی لطافت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا۔ خبر نہیں پتلون اور اس آزاد شاعری کے درمیان کیا رشتہ قائم ہو چکا تھا؟ میں اس بارے میں سوال کرنے کے لیے پر قول رہا تھا کہ وہ خود اسی طرف آ گیا۔ دے لیے میں کہنے لگا۔ ”میں دراصل کسی مولوی صاحب کو تلاش کر کے کیا تھا باگز خیل۔ لیکن وہاں بھی بات نہیں بنی۔“

”بھائی بات بنانا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

وہ سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ”سیب یار! تم پڑھے لکھے بندے ہو، ہم سے تو زیادہ عقل ہے تمہاری۔ ایک مسئلہ تو حل کر کے یہ بتاؤ کہ مرد اور عورت کیا خود اپنا نکاح نہیں کر سکتے۔“

”یہ نکاح کی بات درمیان میں کہاں سے آگئی؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا ”میری تو ساری بات ہے سیب یار۔ دراصل ہم دونوں رستے میں تو کہیں نکاح کر ہی نہیں سکے۔ افراتفری میں میاں بیچہ اور میاں بیچہ لپٹا پٹا کر کہاں بیوی ہیں لڑا میاں اگر بھی نکاح نہیں ہو سکتا تھا۔ اب۔ اب تجھ ہر وقت زور دیتی ہے کہ ہمارا نکاح ہونا چاہیے ورنہ۔ یہ سب کچھ گناہ ہے۔ اب بتاؤ۔ اس جگہ میں نکاح خواں کہاں سے ڈھونڈیں اور اگر مل بھی جائے تو کیا پادہ نکاح دے جائے؟ نہیں۔ پھر ضروری نہیں کہ یہ بات راز بھی رہے۔ ہم جھوٹے دیکھے تو ملک بشر کل میں لات مار کر بستی سے باہر کہے گا اور یہ بھی بڑی بات نہیں کہ جیسے دالے کوئی جھڑا عیسیٰ نہ رہے۔“

پتلون کی بات سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ اور تجھ میاں بیوی کی طرح نہ رہے ہیں۔ اب مزید وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ جہاں تک نکاح کا مسئلہ تھا تو میں اس

بارے میں بھلا کیا مدد کر سکتا تھا۔ میری معلومات بس اتنی تھیں کہ نکاح دو عاقل، بالغ اور مسلمان گواہوں کے بغیر منعقد نہیں ہوتا یعنی نکاح خواں کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل تین مردوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر دو عورتیں موجود ہوں تو پھر دو مرد کافی سمجھے جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ کی رعایت کم از کم میرے علم میں نہیں تھی۔ میں نے پتلون کو سمجھا کر یہ کام اتنا آسان نہیں بتاؤہ خیال کر رہا ہے۔ بی بی الحال دو دونوں اس مسئلے کو نہ چھیڑیں تو پھر جسے اس دوران جھونپڑے سے باہر کسی شخص نے پتلون کو پکارا۔ ”دودھ دان کھول کر باہر چلا گیا۔“

چند لمبے بعد اس نے اندر آ کر کہا۔ ”سیب یار! میں ملک بشر گل کے پاس جا رہا ہوں۔ تموزی دیر میں لوٹ آؤں گا۔ اتنی دیر تم تجھ سے باتیں شائیں کرو۔“

اس نے تجھ کو مجھ سے پردہ نہیں کر دیا تھا اور ذہنات چپٹ کے سلسلے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ چلا گیا۔ تجھ میرے پاس آجی۔ تاہم حویلی کے بیٹھے۔ ”اور اس بیٹھے۔“ میں بت فرق تھا کہ میں نے چادر سے سڑھک رکھا تھا اور بیٹھے کے انداز سے متانت جھلکتی تھی۔ میں نے کہا۔ ”تجھ میں تم سے شرمندہ ہوں۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا اس کی وجہ صرف اور صرف میں ہوں۔“

ایک دم وہ بھی آزدہ ہو گئی۔ جیسے حویلی کے عتوت خانے میں گزرتے ہوئے غدا ب نان شب و روز اس کی نگاہوں میں محوم گئے ہوں۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ وہ پڑے کی پھر اس نے خود کو سنبھالا اور دھیمی آواز میں بولی۔ ”سیب جی! میری جان بھی آپ کے کام آجاتی تو تمہارا خوش بختی تھی۔“

”اسیادیں کہ وہی ہو تجھ! میں اس قابل تو نہیں ہوں کیا بیاہن دیکھا ہے تم نے مجھ میں؟“

اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور بات بدل کر بولی۔ ”آپ میاں آگئے ہیں تو اب دلیں نہ جائیں۔ اپنی بہن بھی میاں بلا لیں۔ میں ج کتنی ہوں“ اس میں آپ کی بہتری ہے۔“

میں نے کہا۔ ”گناہے میاں آکر اور شباز کے ساتھ کرشم خوش ہو۔“ اس نے ہلکی جھپٹ کر کہا۔ ”خوشی تو معتد ہے۔“ ہے جی نہ اتنا ضرور ہے کہ حویلی کے بھانجے دور ہو کر سکون مل گیا ہے۔ وہ جاگیر نہیں ہے جی ایک دونوں اللہ دیری دھن کو اس میں نہ چھینکے۔“

”میں ماں باپ تو یاد آتے ہوں کے ناں؟“ میں نے کہا۔ ”بھائی! میں تمہارا ہم عمر سیلیاں سب کچھ اتنی جلدی بھول تو نہ گیا ہو گا؟“

وہ آہ بھر کر بولی۔ ”میں تو بے کوئی نہیں جی، ایک بھائی تھا وہ بھی جاگیر دار کے ہاتھوں مارا گیا۔ اب کو چاہی ہو گئی تھی۔ ایک ماں ہے وہ بھی نہ ہونے لگی۔ ازل کی بیٹا ہے ہر وقت فہم کھا کر پڑی رہتی ہے۔ اس کا کاس کی گلیاں بازار ضرور یاد آتے ہیں۔ ساری عمر وہی گزری ہے ناں۔“

میں نے پوچھا۔ ”شباز سے تمہاری عقلی تمہارے والد کے مرے سے پہلے ہو گئی تھی؟“

”جی سیب جی۔“ تجھ نے شباز کے بیان کی تصدیق کی۔ ”مجھے ہوش ہی نہیں ہے کہ کب کی بات ہے میرے اپنے کے پاس کافی زمینیں تھیں۔ کھانا پچا زمیندار تھا۔“

شباز کے گھر والے اتنے کھسی نہیں تھے۔ تیل کا ڈبو تھا ناں کا۔ نہیں گزر ہو جاتی تھی۔ اس وقت شباز کی ماں لگا کر تھی۔ کیا ہوا؟ کڑی کارنگ ذرا لگا ہے تو؟ عقل کل والی تو ہے ناں۔ میری ماں لگا کر تھی۔ دیکھنا جتنے بڑی ہو کر میری لڑی

دودھ کی طرح سفید نکلے گی۔ لیکن پھر میرے اپنے پر تھ گیا۔ تین چار سال کے اندر تھا بے بچہ کیوں کے چکر میں ساری زمینیں پک گئیں۔ جو کچھ تھا ہمارے پاس، اپنے کے ساتھ ہی قلم ہو گیا۔ اس کے بعد چاہی جتنے بے بی ہمارے گھر کی دلہنیا نہیں کی۔ بس میری ماں ہی کسی کھار سے مل آئی تھی۔ جب وہ بیٹا ہو گئی تو یہ حلق واسطی ختم ہو گیا۔

بھائی مجھ سے چھوٹا تھا۔ ماں کے ساتھ ساتھ اس کا بوجھ بھی مجھ پر تھا۔ مجھے حویلی میں تو کڑی کرنی پڑی پھر ایسا ہوا کہ جس بھائی کے لیے خزاں ہوتی تھی وہ بھائی بھی نہ رہا میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ جاگیر داروں نے اس پر نصیب کو نیلے میں بھگا

بھگا کر مار دیا تھا۔ ”بھائی کے ذکر پر تجھ کی آنکھیں بجک گئیں۔ وہ تموزی دیر ناگ سے سہی سوں کی تو اس کا تھی رہی۔ پھر آنسوؤں کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر بولی۔ ”شباز نہ ہوتا تو اب میں بھی نیلے کے قبرستان میں ہوتی۔ یہ مجھے اپنی جان پہ

کھڑک کے میاں لایا ہے۔ اب۔ اب۔“ کچھ کہتے کہتے وہ پھر رگ کئی پکوں پر بوجھ سا پڑ گیا تھا۔

”ہاں۔ ہاں۔“ میں نے اسے دلا سا دیا۔

وہ بولی۔ ”شباز مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ کتا ہے کہ ہم سوار بشر گل کے ساتھ افغانستان چل جائیں گے۔ توڑے دنوں میں سوار اپنی بکریوں کا ایک آج (دیون) چلا ہے۔ اس نے شباز کو رو کر دے گا وہ کیا ہے شباز کتا

ہے۔ وہ سردار کے چھوٹے بھائی رستم کے ساتھ مل کر کام کرے گا۔ وہ افغانستان سے سودا لاکر میاں منڈی میں بیچیں گے۔ اس میں بڑا منافع ہو تا ہے۔ اس نے میرے لیے چاندی کے زیور بنوا رکھے ہیں اور چند روپیہ بھی جوڑے بھی لایا ہے۔ کتا ہے۔ میں تجھے دو بھئی ہاتھوں کا اور ایک سال تک کوئی کام کاج تجھ سے نہیں لوں گا۔“ آخری جملہ جیسے دوانی سے تجھ کے منہ سے نکل گیا تھا۔ وہ شرمیلی۔ خون کے دباؤ سے اس کا سانولا رنگ کچھ اور سانولا ہو گیا۔

میں نے موضوع بدلے ہوئے کہا۔ ”بستی والوں کو تو تم دونوں نے بھی بتایا ہے کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ اب پھر نکاح کرو گے تو وہ کیا کہیں گے؟“

تجھ کا سر زحمت سے جھک سا گیا۔ دھیمی آواز میں کہنے لگی۔ ”میری تو ابھی چھوٹے سیب جی سے شادی ہو چکی ہے۔ اب تک نہیں ہوئی۔“

تجھ کی بات نہ میں کر سکتا تھا نہ وہ خود اسی طرف آ گیا۔ دے لیے میں کہنے لگا۔ ”میں دراصل کسی مولوی صاحب کو تلاش کر کے کیا تھا باگز خیل۔ لیکن وہاں بھی بات نہیں بنی۔“

”میں ماں باپ تو یاد آتے ہوں کے ناں؟“ میں نے کہا۔ ”بھائی! میں تمہارا ہم عمر سیلیاں سب کچھ اتنی جلدی بھول تو نہ گیا ہو گا؟“

وہ آہ بھر کر بولی۔ ”میں تو بے کوئی نہیں جی، ایک بھائی تھا وہ بھی جاگیر دار کے ہاتھوں مارا گیا۔ اب کو چاہی ہو گئی تھی۔ ایک ماں ہے وہ بھی نہ ہونے لگی۔ ازل کی بیٹا ہے ہر وقت فہم کھا کر پڑی رہتی ہے۔ اس کا کاس کی گلیاں بازار ضرور یاد آتے ہیں۔ ساری عمر وہی گزری ہے ناں۔“

میں نے پوچھا۔ ”شباز سے تمہاری عقلی تمہارے والد کے مرے سے پہلے ہو گئی تھی؟“

”جی سیب جی۔“ تجھ نے شباز کے بیان کی تصدیق کی۔ ”مجھے ہوش ہی نہیں ہے کہ کب کی بات ہے میرے اپنے کے پاس کافی زمینیں تھیں۔ کھانا پچا زمیندار تھا۔“

شباز کے گھر والے اتنے کھسی نہیں تھے۔ تیل کا ڈبو تھا ناں کا۔ نہیں گزر ہو جاتی تھی۔ اس وقت شباز کی ماں لگا کر تھی۔ کیا ہوا؟ کڑی کارنگ ذرا لگا ہے تو؟ عقل کل والی تو ہے ناں۔ میری ماں لگا کر تھی۔ دیکھنا جتنے بڑی ہو کر میری لڑی

دودھ کی طرح سفید نکلے گی۔ لیکن پھر میرے اپنے پر تھ گیا۔ تین چار سال کے اندر تھا بے بچہ کیوں کے چکر میں ساری زمینیں پک گئیں۔ جو کچھ تھا ہمارے پاس، اپنے کے ساتھ ہی قلم ہو گیا۔ اس کے بعد چاہی جتنے بے بی ہمارے گھر کی دلہنیا نہیں کی۔ بس میری ماں ہی کسی کھار سے مل آئی تھی۔ جب وہ بیٹا ہو گئی تو یہ حلق واسطی ختم ہو گیا۔

بھائی مجھ سے چھوٹا تھا۔ ماں کے ساتھ ساتھ اس کا بوجھ بھی مجھ پر تھا۔ مجھے حویلی میں تو کڑی کرنی پڑی پھر ایسا ہوا کہ جس بھائی کے لیے خزاں ہوتی تھی وہ بھائی بھی نہ رہا میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ جاگیر داروں نے اس پر نصیب کو نیلے میں بھگا

بھگا کر مار دیا تھا۔ ”بھائی کے ذکر پر تجھ کی آنکھیں بجک گئیں۔ وہ تموزی دیر ناگ سے سہی سوں کی تو اس کا تھی رہی۔ پھر آنسوؤں کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر بولی۔ ”شباز نہ ہوتا تو اب میں بھی نیلے کے قبرستان میں ہوتی۔ یہ مجھے اپنی جان پہ

کھڑک کے میاں لایا ہے۔ اب۔ اب۔“ کچھ کہتے کہتے وہ پھر رگ کئی پکوں پر بوجھ سا پڑ گیا تھا۔

”ہاں۔ ہاں۔“ میں نے اسے دلا سا دیا۔

وہ بولی۔ ”شباز مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ کتا ہے کہ ہم سوار بشر گل کے ساتھ افغانستان چل جائیں گے۔ توڑے دنوں میں سوار اپنی بکریوں کا ایک آج (دیون) چلا ہے۔ اس نے شباز کو رو کر دے گا وہ کیا ہے شباز کتا

ہے۔ وہ سردار کے چھوٹے بھائی رستم کے ساتھ مل کر کام کرے گا۔ وہ افغانستان سے سودا لاکر میاں منڈی میں بیچیں گے۔ اس میں بڑا منافع ہو تا ہے۔ اس نے میرے لیے چاندی کے زیور بنوا رکھے ہیں اور چند روپیہ بھی جوڑے بھی لایا ہے۔ کتا ہے۔ میں تجھے دو بھئی ہاتھوں کا اور ایک سال تک کوئی کام کاج تجھ سے نہیں لوں گا۔“ آخری جملہ جیسے دوانی سے تجھ کے منہ سے نکل گیا تھا۔ وہ شرمیلی۔ خون کے دباؤ سے اس کا سانولا رنگ کچھ اور سانولا ہو گیا۔

میں نے موضوع بدلے ہوئے کہا۔ ”بستی والوں کو تو تم دونوں نے بھی بتایا ہے کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ اب پھر نکاح کرو گے تو وہ کیا کہیں گے؟“

تجھ کا سر زحمت سے جھک سا گیا۔ دھیمی آواز میں کہنے لگی۔ ”میری تو ابھی چھوٹے سیب جی سے شادی ہو چکی ہے۔ اب تک نہیں ہوئی۔“

وہ پانچ سو روپے لے گیا اور سردار کو دے کر جلد ہی واپس آگیا۔ اب ان کے قریب دس بج چکے تھے کہ سفید کو چمکراتے والی فانی ہوا جو پینڈوں اور آدنی خیموں پر عظیم پلٹار کر رہی تھی۔ یہ بھی دور سے کسی گیدڑ یا بھیڑیے کی چلاتی ہوئی آواز نہ تھی۔ اور فضا میں ایک سنسنی سی محسوس ہوتی تھی۔ اور شہباز پھلانگ اڑ رہا تھا۔ اس کی جسمانی حالت کے قریب ہم دراز ہو گئے۔ پھلانگ نے اپنی رات قبل لوڈ کر کے سربانے رکھ لی اور مجھے بھی ایسا کرنے کا مشورہ دیا۔ خشک خباثتوں اور پستے سے بھری ہوئی فضا ہمارے درمیان تھی اور انہیوں میں سرگرت تھے۔ پھلانگ نے جین سوکر تھا۔ سرگرت طبعی میں بند کر کے پڑا ہوا ناک کی لگاتا تھا۔ وہ لباس اور ڈیل ڈول کی حد تک پھلانگ تھا جس کی باقی وہ ساری قابض اس میں موجود تھیں جو کسی پھلانگ کو تھوڑے ہی عرصے میں "سابق پھلانگ" بنا دیتی تھی۔

پھلانگ نے کئی لاکھ کھوئے ہوئے لمبے میں کہا۔ "مجھے دو رات اچھی طرح یاد ہے جب ہم نے ایک جیل کی گاڑی پر حملہ کیا تھا۔ یہ وہی ایرپلین تھی جو ہمیں لے کر اسپتال کی طرف جاری تھی۔ ہمیں کچھ نہیں تھا کہ اس میں کون ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ ہم تو صرف ایرپلین کے ڈرائیور اور علی کو سنبھالنے آئے تھے۔ یہ باور علی کئے کہ تو ایک ڈرائیور تھا لیکن پڑھنے خاں اور جھڈے باز بندہ تھا اور تو اور جاگیردار تک کو انہیں دکھانا تھا کہتے ہیں "جھیل میں رہ کر مجھے سے بھر نہیں ڈالا جاتا۔ وہ جاگیردار کی زمینوں میں رہ کر اس کے سامنے آکر آتا تھا۔ جاگیردار نے اسے اغوا کر کے کا حکم دیا تھا۔ ہم نے ایرپلین کو وہاں اندر بیٹھنے ہوئے پھیلے ہوئے ہم پر فائر کھول دیا۔ ہم نے بھی اسٹن کا جواب چرسے دیا۔ پھر پانچ لاکھ گاڑی چمکراتے ہوئے باور علی بھی غائب ہو گیا۔ صرف تم اندر لگی بیٹ پر پڑے رہ گئے۔ تم بے ہوش تھے اور چوٹی کی رگ ہو رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ بھاتے چوری کی گولی سی سی۔ ہم جیل کی ایرپلین تمہارے سمیت اپنے ساتھ لے گئے پھر کچھ آگے جا کر ایرپلین تو چھوڑ دی مگر ہمیں تنگ لے جا کر جاگیردار کی حویلی میں پہنچا دیا۔ اسپتال میں ڈاکٹر رحمان نے تمہارا علاج شروع کیا اور ہمیں ہوش آگیا۔ قاتل زماں نے ایک جیل سے پناہ کراواتی ہوئی تھی۔ قاتل زماں نے اس کا جواب دیا۔ یہ ہمارے کام کا بندہ ہے اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرو۔ بعد میں پناہ چلا۔ جاگیردار نے تمہاری سکی بن کاٹھج لگایا ہے

اور اسے بھی اغوا کر کے حویلی میں آکر لیا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ تمہیں پناہ دیا جا رہا تھا۔ چند دن بعد اندر کی بات سامنے آگئی۔ جاگیردار نے تمہیں دوڑے جبر ساجی کو کھٹانے لگانے کے لیے لاہور روانہ کر دیا۔ "پھلانگ کی باتیں میرے لیے بہت کارآمد تھیں۔ آج کی ماہ بعد میرے اغوا کی بات صاف ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا قاتل زماں نے مجھے کسی پلاننگ کے تحت اغوا نہیں کرایا تھا۔ پہلے اغوا ہوا تھا پلاننگ بعد میں ہوئی تھی۔ شکر کے ساتھ جاگیردار قاتل زماں کا تعلق تھا اور ساری صاحب ہاتھ دھو کر شکر کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ شکر آزادی سے کام نہیں کر پاتا تھا۔ قاتل زماں نے اس شخص کو رہا کر دیا تھا۔ قاتل زماں نے یہ کام مجھے سونپا دیا۔ ایک تیرہ سے دو شکر کرنا چاہتا تھا۔ ساری صاحب رات سے بہت جاتے اور میں بھی ایک بار پھر قاتل بن کر قاتل زماں کی پناہ کا طلب گار ہو جاتا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ ساری صاحب اور میں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ انہوں نے میرے اور ساری صاحب کے درمیان سے کئی پروے اٹھ گئے اور مجھے اندازہ ہوا کہ شکر ہم دونوں کا مشترکہ دشمن ہے لیکن کئی اہم ترین سوالات ابھی تک حل طلب تھے۔ مثلاً جیل میں مجھ پر قاتلانہ حملے کرانے والا کون تھا؟ سرگرت سے بھری ہوئی گڑبڑ، نور محمد کی موت اور میری گردن میں ڈھنسنے والا آہنی تار میں کچھ بھی بھلا نہیں تھا۔ پھر شکر کی مہل موجودگی بھی ابھی تک معما تھی۔ وہ اپنی تمام تر خوبصورت سمیت کر کس مقصد سے یہاں دندا رہا تھا؟ اس قہرے کی بازگشت بھی میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھی جو جنگ کے قریب ایک پرانی حویلی کے کمرے میں کھایا تھا اور ساتھ ساتھ عطا محمد نے شاعر "دوسروں جو مرس گئے جن کی لاشیں سڑکوں پر تر پڑی گئی اور مرقہ خاؤں میں اکر گئیں گی۔" اس زہرناک قہرے کا تعلق کس سے تھا اور یہ الفاظ مہارانی شخص کے سامنے کی زبان سے کیوں ادا ہوئے تھے؟

وہ ساری رات میں نے پھلانگ کے ساتھ گپ شپ کرتے گزار دی۔ بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پھلانگ سے ہے۔ یعنی محبت بے نشان نہیں رہی تھی۔ میں نے بڑے محتاط طریقے سے یہی جان کا ذکر کیا اور پھلانگ نے فہم لینے کی کوشش کی کہ وہ اس بارے میں کیا جانتا ہے۔ پھلانگ نے اعتراض کیا کہ اس نے جیل میں کیا نام سن رکھا ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ میں جیل وادائیں کرنے کے بعد قیامی علاقے میں دیویش ہو جاتا

ہے۔ تاہم اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں جان آج کل میں دنے منت کے علاقے میں ہے۔ میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے پھلانگ نے بتایا کہ میں جان کو عورتوں کا شکاری کہا جاتا ہے۔ خاص طور پر شادی شدہ عورتوں کو پھلانگ اور زبردستی خراب کرنے میں اسے پڑھنی حاصل ہے۔ پھلانگ کو انہیں سسوں دہلے داتے کا بھی پتا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ ان میں سے ایک انہیں سس بعد ازاں پشاور کے پچھلے میں پائی گئی تھی۔ میری آنکھوں میں مالک محمد کی صورت گھومتی تھی اور پھر اس کے ساتھ نیلہ کا انجانا سراپا بھی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ انہی قاتل خبیث و فراز میں اس کی آواز اور جان گئی تھی۔ اس سنگھار دیرانے میں معلوم نہیں کہ کتنے جتنی ہو گئے، کتنا مدد ملی ہوگی اپنے معصوم بچوں کو اس نے کیسے کیسے یاد کیا ہوگا اور پکارا ہوگا۔ پھر وہ اپنی تمام بے بسیاں سمیت کر ایک کمرے کھد میں جا کر گئی تھی۔ یہی نہ اٹھنے کے لیے اس کھد میں گرنے والی یہ پہلی عورت نہیں تھی اور نہ ہی آخری تھی۔ معلوم نہیں کب سے جرائم پیشہ لوگ قانون کے لیے ہاتھوں کو کاٹ کر ان پھاڑوں میں پناہ لینے رہے ہیں۔ ان نیکت برسوں سے "اضافہ کی دھڑک" ان خبیث و فراز میں سسکتی رہی ہے اور "مقاومت کا دیو" اس کے گرد ہمیشہ رقص کرتا رہا ہے۔ اس ملک میں ان ہی مردوں کے اندر چند مخصوص علاقوں میں پہنچ کر مجرم ہر فکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ سوال ہر غور کرنے والے کے ذہن میں پہنچ کر ابھرتا ہے اور تادیب سماعت میں گونجتا رہتا ہے۔

لاٹین کی خرابیاں روشن میں پھلانگ اور میں مسلسل مصروف گفتگو رہے۔ رات بھینکتی چلی گئی اور آخر کار اس جموہوریت سے باہر صبح کاؤب کے آثار نظر آئے۔ مجھے یہ یاد تھا کہ سیموں کا خیال آ رہا تھا۔ میں کسی کو بتانے بیٹھے یہاں چلا گیا تھا اور اب میری "گندگی" کو قریباً پندرہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں بات تھی کہ سب لوگ میرے لیے فکر مند ہوں گے۔ خاص طور پر ایس بی برکت کا تو میری "جڈائی" میں بڑا مال ہونا چاہی تھا۔ میں ممکن تھا کہ وہ پولیس والوں کا مخصوص گاڑی "آج مورے ہاٹا تیرا" انتخاب ہے۔ "گاڑی ہوں اور ضروری صورت میں مجھ سے مکالمات کر رہے ہوں۔ میں نے کہا کہ اندر میرا چھتے ہی یہاں سے نکل چلوں گا اور سات گھنٹے تک بڑاؤں میں پہنچ جاؤں گا کہ میری وجہ سے آج کا ہارام دور ہم پر ہم نہ ہو لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے "میں نے فرار اپنے ارادوں کی ناکامی سے بچانا" یہاں بھی قدرت

کامل نے اپنی موجودگی کا ثبوت دیا۔ ساڑھے تین چار کا وقت تھا جب کبھی کے کتے زور و شور سے بھونکنے لگے۔ جواب میں کچھ فاصلے سے چند اور کتوں نے بھی اچانک بھونکنا شروع کر دیا۔ میرے ساتھ ساتھ پھلانگ کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ پھلانگ نے اٹھ کر جموہوریت کا کھڑی تیار دیکھ کر باہر جھانکے گا۔ رات قبل اس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔ دھنکا پھل کتوں کی مخصوص آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میرے کان دھوکا نہیں کھا رہے تھے۔ یہ بیٹیا کبیر علی شاہ کے کتے تھے۔ نوجوان میری آواز ہی ہوئی جبکہ سوتی دھاکے سے مرمت کر دی تھی اور انہیں کو بھی گزارے لائق کر دیا تھا۔ میں پھلانگ لباس اتار کر جلدی جلدی اپنی اوقات میں آیا اور باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ پھلانگ میری جگہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے سامنے ڈھونڈتے ہوئے پہنچ گئے ہیں۔ ہماری آوازیں سن کر نوجوانی عقی صے سے آگئی۔ اس کی آنکھیں پتا رہی تھیں کہ ہماری طرح وہ بھی نہیں سوتی۔ "میب جی! آپ جا رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔ "نہیں، "نشاہ جانا ہی پڑے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن کھانا امت" ابھی ہم نہیں ہیں۔ کل یا پھر سون دوبارہ ملاقات ہوگی۔"

میرے جواب نے نوجوان مطمئن کر دیا۔ وہ میرے شکاری ٹوٹ لے آئی۔ انہیں دھوکا اور صاف کر کے اس نے بالکل چکا دیا تھا۔ میرے ٹوٹ پھٹنے پھٹنے جموہوریت کے دروازے پر دھک ہو گئی۔ ایک شخص نے پھلانگ کو پکارا۔ پھلانگ نے دروازے پر جا کر چند باتیں کیں اور آکر مجھے بتایا کہ میرا اندازہ درست تھا۔ کچھ لوگ مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں اور اب سردار بشر گل کے پاس کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے پھلانگ کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا اور وہیں جموہوریت میں اس سے رخصت ہو کر سردار بشر گل کے جموہوریت پر پہنچ گیا۔ میری نگاہ سب سے پہلے انسپٹر باجوہ پر پڑی۔ اس کے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل نذیر بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ کبیر علی شاہ اس کے دو خادم اور خضار نورس کے پانچ جوان بھی اس پارٹی میں شریک تھے۔ مجھے دیکھ کر انسپٹر باجوہ کے چہرے پر کامیابی کی چمک نمودار ہو گئی۔ اس وقت ہم شکاروں کے جھگڑے میں تھے۔ انسپٹر باجوہ دیکھ کر پکڑ نہیں تھا۔ انسپٹر باجوہ نے اپنے افسرانہ غصے پر قابو پا کر باری دوسری کے لیے میں کہا۔ "بھلے ہاں! کیا کیا کرتے ہیں ہمارا تو آدھا خون خشک ہو گیا ہے جس میں ڈھونڈ کر۔"

"ہیں باجوہ صاحب! حالات ہی ایسے ہو گئے تھے ابھی

تانا ہوں آپ کو۔“
انکیز باجوہ اور کبیر علی شاہ کی نگاہیں میرے چہرے کی خراشوں اور خستہ حال جبکہ برہمیں۔ میں نے پهلوان کو منع کیا تھا لیکن وہ پھر بھی میرے پیچھے موٹے پر پہنچ گیا۔ سردار بشر گل کے ساتھ پهلوان کی چند باتیں ہوئیں۔ میں نے پهلوان کے ذریعے سردار کا شکریہ ادا کیا جو آپا سردار نے پهلوان کی وساطت سے سب کو قوے کی دعوت دی۔ کبیر علی شاہ نے مقامی زبان میں پانزدہ سردار سے چند جملوں کا تبادلہ کیا۔ غالب اس نے معذرت کی بھی اور کہا تھا کہ وہ مدت جلدی میں ہیں اور سورج نکلنے سے پہلے اپنے پڑاؤ میں واپس پہنچنا چاہتے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم پانزدہ ہستی سے رخصت ہو کر اپنے پڑاؤ کی طرف گامزن ہو گئے۔ دو فرلانگ کا فاصلہ انکیز باجوہ نے بمشکل طے کیا پھر اپنی پوری آسرا نہ شان سے مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ ”ہاں جی! یہ کیا تماشا ہے۔ کچھ پتے پائے کتنا خوار ہوئے ہیں ہم! ایس بی صاحب نے ایک ایک بندے کو سمجھایا تھا کہ بغیر پتے کئی اور اُور نہ ہو اور سب سے زیادہ زور تم پر دیا تھا۔ کچھ یاد ہے تمہیں؟“

”یہاں یاد ہے جناب۔“ میں نے ماتحتانہ انکسار سے کہا۔ ”تکبیر موقع ایسا تھا کہ میں کسی کو نہ جگا سکے اور نہ بتا سکے۔ بس ایک دم ہی وہ خانہ خراب سامنے آ گیا تھا۔“

”کون آ گیا تھا سامنے؟“

”وہی جناب جس سے ابھی ملے ہیں آپ۔ وہ لال کرتے اور دھوتی والا۔ پهلوان شہزادہ کہتے ہیں اسے۔“

”کون ہے یہ؟“

”بڑے کام کی شے ہے جی۔ میں نے پونی چار میل اس کے پیچھے جوتے نہیں توڑے۔ یہ بندہ جھوک خاصاں کا رہنے والا ہے۔ جاگیردار کی حویلی میں کام کرتا رہا ہے اس کے خاص کارندوں میں شمار ہوتا تھا اس کا۔“ انکیز باجوہ کا تانا چورم پر دیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے ہی تو بتایا تھا کہ ایشیاری بیٹی جان اور جاگیردار قادر زان میں ٹانگا ہے۔ یہ پهلوان اس ٹانگے کا حکم کھلا ثبوت ہے۔“

انکیز باجوہ نے پوچھا۔ ”تم اسے کیسے جانتے ہو؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے جی۔“ میں نے کہا۔ ”رجال سہی صاحب کو پتا ہے سب کچھ۔ انہوں نے ایک بار سادہ لباس میں مجھے قادر زان کی حویلی سمجھا تھا۔ وہیں سے ہماری جان پہچان ہوئی تھی۔ انکیز باجوہ کو سہی صاحب سے میرے

بارہجی دکنی شہکی کے پراٹھے، مکھن اور تلے ہوئے دکنی انڈے ولاجی پاشنے دانوں میں رکھ دیئے، ہم راتھیں سجالے اور کتوں کے پیچھے پیچھے خیب و فراز میں گم ہو جاتے کتوں کا کیا ہوا شکار ہمارے کسی کام کا نہیں تھا۔ وہاں کون سے بڑا ل اور ہرن گھوم رہے تھے، بس خرگوش، سسہ، بڑا کدو وغیرہ ملتے تھے۔ ایک دو ٹیکڑی کتوں کے ہتھے چڑھے اس بارا ماری سے بس کتوں کا پتہ بھر جاتا تھا اور ہم ”جنگلی قانون“ کے عملی نفاذ کا نظارہ کر لیتے تھے۔ ہاں راتھل کے ذریعے ہم جو پرندے گراتے تھے ان کا کوشٹ کمانے کے قابل ہوتا تھا اور ہم کھاتے بھی تھے۔ دوران شکار مالک محمد کا فراہم کردہ نقشہ ہر وقت کبیر علی شاہ کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ وہ اس بات کی تصدیق کر کے تھا کہ دھوکا ٹالاب کے نواح میں ”ایس“ کی شکل میں بل کھاتی ہوئی کھائی دی ہے جس کی نشاندہی خاکے میں کی گئی ہے۔ اس کھائی سے آگے ایک آبی گزرگاہ اور پڑاؤی روتے کا کھوج بھی لگا چکا تھا۔ اگر اس پیش رفت کو درست تسلیم کر لیا جاتا تو ہم اس مقام سے زیادہ دور نہیں تھے جہاں چندا ہیلے بیٹی جان اور مالک محمد کے درمیان زور وازمخرب ہوئی تھی اور دونوں طرف کے دو دو آدمی کام آئے تھے۔ مالک محمد کو یقین تھا کہ بیٹی جان کا میرا مخرب والے مقام سے زیادہ دور نہیں بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مخرب ذریعے یہی ہوئی ہو۔ ٹل شرے ہم ایک ایسے غرض کو بھی ساتھ لے آئے تھے جو بوق خونلی مخرب میں مالک محمد کی طرف سے شریک ہوا تھا۔ یہ ایک یوہا سادہ وزیر ستانی لشکر تھا۔ رقم لے کر وہ کسی کی طرف سے بھی لو سکتا تھا۔ تجربے کے بعد پتا چلا کہ وہ راستہ کھوجنے کے سلسلے میں ہماری کچھ زیادہ دھونس کر سکتا۔

کئی دیر اے میں شب و روز بھر کر انیا آسان نہیں ہوتا جیسا کہ انہوں اور قلدروں وغیرہ میں نظر آتا ہے۔ طما و نام سے لے کر دفع حاجات تک اور نمازے دھونے سے سونے جانے تک ہر معاملے میں کثرت اٹھان پڑتا ہے اور اگر موسم بھی سخت ہو تو کیا ہی کہنے ہماری شکار پانی کو بھی موسم کی سختی پر پیش تھی، ایسی برقی اور کھلی دوائے۔ ہم کھیرا رابطہ دیا ہے۔ بڑوں میں گروا تک شینے لگتا تھا۔ شکاری خوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے ٹانگیں تو قدرے گرم ہو جاتی تھیں مگر بالائی جسم بدستور فریز میں لگ رہتا تھا۔ کبیر علی شاہ انہوں کو آمیز اردو میں بار بار ہمیں ہدایت کرنا کہ ہوا کی براہ راست کٹ سے نہیں، خاص طور پر سر و حنا پ کر رکھیں۔ اس کا تجربہ تھا کہ ایسے موسم میں بعض اوقات شدید گرمی

سرد شروع ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ واعظ کو نصیحتوں کی اور ڈاکٹر کو دواؤں کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ ہم سب نے کبیر علی شاہ کی ہدایات پر عمل کیا اور بدلے کچھ رہے لیکن وہ خود پتار پڑ گیا۔ شاہی اس حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کام دکھائی۔ ایک شام پڑاؤ میں واپس آتے ہوئے بارش شروع ہوئی۔ ہم سب ایک تجربے لے سائیاں تلے پناہ کریں ہوئے مگر کبیر علی شاہ اپنے ایک پیچھے رہ جانے والے ملازم کی تلاش میں نکل گیا۔ بھگ جانے سے اس کے سر میں درد شروع ہو گیا اور رات ہوتے ہوتے شدید بخار نے آیا۔ ضروری دوا میں حارے پاس موجود تھیں۔ صوبے دار صاحب خود بھی ”میڈیسن“ سے شغف رکھتے تھے۔ پڑاؤی میں کبیر علی شاہ کو ٹریٹ منٹ دی گئی۔ صبح تک بخار میں افاتہ ہو گیا۔ بندہ سخت جان تھا۔ اس حالت میں بھی کتوں کے پیچھے بھاگنے کو تیار تھا مگر صوبے دار صاحب نے اعلان کیا کہ آج عمل آرام کیا جائے گا۔ ایک طرح سے یہ سب کے دل کی آواز تھی۔ ”تھکاوٹ“ سب کی مشترکہ مجبوری تھی۔ اس کے علاوہ اپنی اپنی مجبوریاں بھی تھیں، جیسے میری مجبوری سوجا ہوا انڈر جیک پینڈے کی کالی ہوئی ”پتلی“ کالی تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔

اس روز پڑاؤ میں خوب ہلاک رہا۔ تاش کی زبردست محفل تھی۔ ساتھ ساتھ سبز جانے کا دور چلا رہا۔ شکار کیے ہوئے گوشت کا سالن بنایا گیا اور آجیل برائے کائے گئے۔ شام کو ایک الغوزہ نواز نے مختلف دھنیں بھینتی شروع کیں اور خضار فورس کے چار جوانوں نے دواچی رقص پیش کیا۔ رقص و موسیقی کا ماحول بنا تو خضار و فورس کے ایک کم کو لائن ٹانگ عباس خاں کے جوہر بھی کھل کر سامنے آئے۔ وہ کلاسیک گلوکار تھا اور اچھے راگ الاپتا تھا۔ مجھے

لمہار کی پہچان نہیں تھی اور نہ ہی اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ لمہار گانے سے برسات شروع ہو جاتی ہے مگر ٹانگ عباس خاں نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی ضرور۔ اس کے مظاہرہ فن کے دوران ہی موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ یعنی بادیا ران کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے جڑ گیا اور ایسا جڑا کہ جڑتا ہی چلا گیا۔ جمرات کی شام کی بارش شروع ہوئی اور اتوار کی شام تک پانی کا آہر نہیں ٹوٹا۔ بھالی کی وہ کمکات درست ثابت ہو گئی تھی کہ ”جمرات دی بخاری سو جڑ دی لڑی“ ہم اپنے خیموں میں محصور ہو کر رہ گئے۔ لگتا تھا ”دوڑو حشر تک یہ بارش برے کی اور بنگل لگا ہوں کے سامنے رہے گا۔“ ”بنگل اور بارش“ بڑا خوبصورت تصور ہے۔ شاعر

حضرات نے اس تصور کو شعروں میں باندھا اور معصوموں نے کیوں پر اٹھارے مگر علی زئی کے نواح میں اس جنگی بارش نے ہمیں انا کا کر رکھا۔

یہ اتاری شام کا واقعہ ہے ہم غصے ہوئے غیموں میں مسکرتے سنے بیٹے تھے کہ خلیفہ سے اٹھنے والی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے کیر علی شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ شکاری تھا اور ایسے لوگ بڑی تیز جس سماعت رکھتے ہیں مگر وہ اس آواز کو سن سیکر غلابا کسی گمری سوچ گیا تھا۔ ممکن ہے بارش کی طوالت اور کتوں کے راتب کا حساب کتاب جو ڈر رہا ہو۔ خوش گونا گویا عباس خاں بھی اس آواز سے بے خبر رہا۔ وہ خیمے کے وسط میں بھیل بپ کے قریب گردن جھڑنے افرودہ بیٹھا تھا۔ اس افرودگی کی وجہ تو قیقنا کچھ اور رہی ہوگی مگر مجھے لگ رہا تھا کہ ٹانگ صاحب اس وقت کو کوس رہے ہیں جب انہوں نے پکا راگ چھیڑ کر بارش کو دعوت دی تھی۔ ٹانگ کے عقب میں انسپٹر باجوہ ایسے خراٹے لے رہا تھا۔ جیسے وہ بارش کے ساتھ شرط باندھ کر سویا تھا۔ ظاہر ہے اس نے بھی یہ آواز نہیں سنی ہوگی۔ چند لمحوں بعد آواز دوبارہ ابھری۔ اس مرتبہ قدموں کی چاپ خاصی واضح تھی۔ یہ ایک سے زائد افراد تھے جو خلیفہ سے آ رہے ہو کر پاؤں کی جانب آ رہے تھے۔ اب کیر علی اور ٹانگ عباس کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے لپک کر اپنی رانٹلیں سنبھال لیں۔ خیمے میں موجود باقی باج افراد بھی ایک دم چوکس ہو گئے۔ میں نے خارج قدام کر کے بارہ بنایا۔ در کے عین سامنے تین ”ہماڑی“ کھڑے نظر آئے۔ ان میں سے دو کے پاس لکھاڑیاں اور ایک کے پاس تھری ٹاٹ تھری رانٹلیں تھیں۔ ان تینوں نے تیرساتیاں اوڑھ رکھی تھیں، پھر میری لباس پانی میں شرب اور پاؤں پتھر میں لت پت تھے۔ میری تاراج کا روشن دائرہ رانٹل پردار کے چہرے پر پڑا۔ محسوس ہوا کہ میں نے اس شخص کو دیکھا ہوا ہے۔ پھر ایک دم میں پہچان گیا۔ وہ پاؤندوں کے سردار بشر گل کا چھوٹا بھائی رستم تھا۔ تجو نے اپنے جھوپڑے میں اسی رستم کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ شہباز اس کے ساتھ مل کر کاروبار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اب ساتھ والے خیمے سے ایس بی صاحب مع صوبہ دار مرغان کے باہر نکل آئے تھے۔ اس کے علاوہ قریب گھڑی جپوں سے بھی فوس کے جوان باہر جھانکنے لگے تھے۔

”کون ہے؟“ ایس بی نے کڑک کر پوچھا۔
میں نے بتایا کہ پاؤندہ بستی کے لوگ ہیں۔ اس اطلاع پر ساری ”شکار پارتی“ ان کے گرد اٹھی ہوئی۔ کیر علی شاہ نے

آگے بڑھ کر سردار کے بھائی سے نکال دیا۔ کافی سنجیدہ قسم گفتگو تھی۔ یہ اس میں ایک دو بار شہباز کا نام بھی آیا۔ میرے کان تو ابھی قدموں کی چاپ سے ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ اب صورت حال کی سنجیدگی کا احساس بھی ہوا تھا۔ پھر نکالہ ختم کر کے کیر علی شاہ نے مجھے بتایا کہ شہباز پهلوان کو رات سے لاپتا ہے۔ اس کے جھوپڑے سے کچھ چیزیں گر گئی ہیں جن میں ایک ہستی ترک اور تین چار ہزار روپہ نقد ہے۔ کوشش کے باوجود ابھی تک نہ شہباز کا کچھ پتا ہے اور نہ گمشدہ چیزوں کا۔

یہ اطلاع تشویش ناک تھی۔ ظاہر ہے آج دن بحر طائر کرنے کے بعد ہی یہ لوگ میری طرف آئے تھے۔ میرا طرف آنے کی وجہ بھی عیاں تھی۔ صرف چار روز پشاور پاؤندہ بستی میں پهلوان سے ملا تھا اور اس کے جھوپڑے پر رات گزارا تھی۔ یوں پهلوان سے میری شناسائی ثابت ہوئی تھی۔ اب بستی والوں نے سوچا ہو گا کہ ممکن ہے پهلوان مجھ سے ملنے کیسے میں پہنچا ہو۔ رستم وغیرہ کو معلوم ہے کہ ہمارا ایک ڈھکی مالاب کیس پاس ہے لہذا وہ پاؤندہ چور چور کا دھواں فاصلہ ملے کر کے یہاں پہنچ گئے تھے۔

ہم نے تین افراد کو خیمے میں بٹھایا۔ قوے اور بیکلڈ سے قوامع کی کیر علی شاہ نے انہیں بتایا کہ پچھلے دنوں سے مسلسل بارش ہو رہی ہے اور باہر کا کوئی بندہ بھولے ہوئے بھی ادھر نہیں آیا۔ یہ بات سن کر اطلاع سننے کے بعد وہ اور اس کے دونوں ساتھی جلد از جلد واپس جانا چاہتے تھے۔ میں نے ایس بی صاحب کے خیمے میں جا کر ان سے رستم کے ساتھ جانے کی اجازت طلب کی۔ ایس بی صاحب کو پهلوان کے اعتراض ہو سکتا تھا۔ یہاں بھی تو ہم بیکاری بیٹھے تھے۔ مگر تھا کہ حرکت میں برکت کا کوئی پھلو نکل آتا۔ حدیث صرف ایک ہی تھا کہ کیس پهلوان کی گمشدگی میں مجھے ملوث نہ کر جائے۔ اسی حدیث کے چشمہ نظر ایس بی صاحب پر پڑا۔ رہے تھے میں نے ان کی چٹکی ہٹ کا راز پایا تھا۔ لہذا وہ دو یوں میں ہی انہیں رام کر لیا۔ وہ کہنے لگے۔ ”ٹھیک ہے۔ لیو۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔ جانا چاہو تو جاتے۔ لیکن بہتر ہے کہ ایک دن جاؤ۔ ویسے بھی زبان کی مشکل نہ آئے گی۔“

انسپٹر باجوہ نے کہا۔ ”چودری صاحب! کیوں نہ جائے؟ عباس کو ساتھ بھیج دیا جائے۔“
ایس بی صاحب نے سوالیہ نظروں سے صوبہ دار مرغان خان کی طرف دیکھا۔ مرغان خان نے کہا۔ ”مجھے

اعتراض نہیں۔ اگر تم چاہو تو میں خود بھی جانے کو تیار ہوں۔“

اس طرح طے پا گیا کہ میں اور عباس خاں بستی والوں کے ساتھ جائیں گے۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ بارش کے سرلاٹوں سے بھل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ شب کی تیرکی میں آسمان کسی زوروش عاتق کے مانند زمین پر جھکا ہوا تھا اور خلیفہ و فراز بھینچے طے چارہ تھے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا کہ زمین و آسمان کے فلاٹے میں پانی اور گرج چمک کے سوا کچھ باقی ہی نہیں رہ گیا۔ میں اور ٹانگ عباس شکاری بوٹ پہن کر اور لوہیتین کی ہوم میڈ برساتیاں اوڑھ کر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ حسب معمول شکاری چاقو، تارچیں اور رانٹلیں ہمارے پاس تھیں۔

قوع کے عین مطابق یہ ایک دشوار سفر ثابت ہوا لیکن اس کی طوالت ہماری قوع سے کم نکلے۔ پاؤندہ راستے کی ہر اونچ سے واقف تھے۔ اس کے علاوہ انہیں شارٹ کٹ راستوں کا بھی علم تھا۔ وہ صرف بڑھ گھٹنے میں ہمیں ڈھکی مالاب سے پاؤندہ بستی میں لے آئے۔ بستی والے ہمیں دیکھ کر تھوڑا سا حیران ہوئے۔ ہمارے خیمے پر سردار بشر گل نے ہمیں اپنے خیمہ گرم جھوپڑے میں بلایا۔ وہ چار عدد عورتوں کا ملا شرکت خیرے مالک تھا۔ یعنی وہ اس کی بیویاں تھیں۔ سب سے چھوٹی بیوی اس کے ساتھ جھوپڑے میں ہی رہتی تھی جب کہ باقی تین کے لیے دو علیحدہ خیمے نصب کیے گئے تھے۔ سردار نے جھوپڑے کے موانے میں ہمیں شرف لاکھ بخشا۔ پهلوان کی گمشدگی سے وہ خاصا پریشان نظر آتا تھا۔ اس نے ٹانگ عباس خاں کو حترجہ بنا کر کچھ سے چند سوال کیے۔ یہ سوال بالکل غلطی انداز کے تھے۔ سردار بشر گل نے پوچھا۔ ”تم پهلوان کو کب سے جانتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”قریباً چھ ماہ سے۔ ضلع جنگ کے ایک موسم میں اتفاقاً ملاقات ہوئی تھی پھر جان پہچان ہو گئی۔“ وہ بولا۔ ”پهلوان سے آخری ملاقات کب ہوئی؟“

”تیس بستی میں مشکل کی محبت آپ لوگوں کے سامنے۔“
”نکل کی رات تم اس کے ساتھ جھوپڑے میں رہے۔“
”بالکل نہیں۔ ایسی کوئی بات کی تھی؟“
پهلوان سارا وقت اپنے آئندہ پروگراموں کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کا مکتا تھا کہ آپ نے اسے کچھ رقم دینے کا

وعدہ کیا ہے اور وہ آپ کے چھوٹے بھائی رستم خاں سے مل کر کوئی کام کرے گا۔“

سردار نے اپنی مڑ مڑی کی آدمی چلم ایک طویل کش میں بند کر کے ہونے کہا۔ ”تم اس کے دوست ہو، ہم سے زیادہ جانتے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر وہ خود گیا ہے تو کہاں جا سکتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ سردار۔ مجھے اب تک جو کچھ معلوم ہوا ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود نہیں گیا۔ اگر اس کی بیوی یہاں ہے تو پھر اس نے کہاں جانا تھا۔ اس کے علاوہ نقدی اور زیورات کا غائب ہونا بھی ظاہر کرتا ہے کہ کوئی حادثہ ہوا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے چوری وغیرہ؟“
”بالکل، یہی بات ذہن میں آتی ہے۔“
سردار کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ خود بھی اسی انداز سے سوچ رہا ہے۔ میں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ کی اجازت ہو تو میں شہباز کی گھر والی سے مل آؤں؟“

سردار نے اس ملاقات پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ درحقیقت بستی میں آکر اور سردار بشر گل کی بوجھ کچھ کا سامنا کر کے میں نے اپنا اعتماد بحال کر لیا تھا۔ اگر پهلوان کی گمشدگی کے حوالے سے کوئی کچھ پر شک کر رہی رہا تھا تو اب مطمئن ہو گیا تھا۔ ٹانگ عباس خاں کو سردار کے جھوپڑے میں جھوپڑے میں نچو کے پاس پہنچا۔ وہ اپنے جھوپڑے میں دو عورتوں کے ساتھ خاموش بیٹھی تھی۔ بال پریشان، آنکھوں میں رت دھکا، چہرے پر جیسے پهلوان کا انتظار تھا۔ ہوشیار تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک دم سسک اٹھی۔ اس کے پاس بیٹھی ہوئی عورتیں خود ہی آٹھ کر باہر چلی گئیں۔ میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”انتہی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ وہ کوئی بچہ تو ہے نہیں کہ کوئی اٹھا کے لے گیا ہو گا۔ سارا علاقہ اس کا دیکھا بھلا ہے۔ آجائے گا کہیں نہ کہیں سے۔“ وہ بدستور سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔ جب آنکھوں کے راستے دل کا غبار نکل بیجا تو قدرے پرسکون نظر آنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ”تمہیں کب پتا چلا کہ شہباز جھوپڑے میں نہیں ہے؟“

وہ بولی۔ ”شام کو درے سے آتا تھا۔ کتا تھا کہ سردار بشر گل کے پاس بیٹھا رہا۔ دوں۔ کتا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا اور سو گیا۔ میں بھی سو گئی۔ رات کسی وقت میری آنکھ کھلی۔ جھوپڑے میں بڑی غصہ تھی۔ میں نے دیکھا اور واہ کھلا ہوا ہے۔ لائین کی کوٹاؤں کے دروازہ بند کرنے لگی تو شہباز

ایسے بستر نہیں تھا۔ پھر میری نظر پرستی پر پڑی۔ وہاں جستی ٹنک بھی نہیں تھا۔ میں نے آئے دو اگلے کے جمونہڑوں سے پتاکا کسی کو کچھ مالوم نہیں تھا۔ اتنے میں سردار اور اس کا بھائی ترستہ بھی آگئے۔ سب ڈھونڈنے لگے لیکن شہباز کا کوئی پتا نہیں چلا۔

تجوی کی پوری روداد سننے کے بعد میں نے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے کہاں جا سکتا ہے وہ؟ بہت سی جگہوں سے کسی سے پتہ چلا تو نہیں ہو گیا تھا اس کا؟“
وہ بولی۔ ”جھکڑا تو کسی سے نہیں تھا، پر یہ بات تو کسی ایک کو مالوم ہو گی کہ وہ آج سردار سے پیسے لے کر آیا ہے۔“
”کون سے پیسے؟“

”وہی تین ہزار روپے جو جمونہڑے سے عائب ہوا ہے۔ وہ رقم شہباز اسی رات سردار سے لے کر آیا تھا؟“
یہ میرے لیے ہی اطلاع تھی۔ میرے پوچھنے پر تجو نے بتایا کہ یہ رقم اس نے شہباز کی جیب میں دیکھی تھی۔ پوچھنے پر شہباز نے بتایا کہ سردار سے لے کر آیا ہوں۔ تجو نے پوچھا کہ کیا کئی ہے یہ رقم؟ وہ مسکرا کر بولا۔ ”کچھ کئی ہے۔ تجو کے دو تین بار پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہیں بتایا۔ تجو نے سوچا کہ شاید وہ اسے کوئی قیمتی تحفہ دینے کے پیکر میں ہے۔ اس نے اسے منع کیا کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے۔ نئی زندگی شروع کرنے کے لیے انیس ایک ایک پیسے کی ضرورت ہے۔ شہباز اس کی باتیں سنتا رہا لیکن جواب کوئی نہیں دیا۔ میں نے تجو سے کہا۔ ”تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے کہ تمہیں چوری کا شک ہے۔“

وہ بولی۔ ”اس کے سوا اور کیا سوچا جا سکتا ہے مجھے لگتا ہے سردار کے جمونہڑے سے ہی کوئی اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ وہ جمونہڑے کے آس پاس پھرتا رہا۔ جب ہم سونے تو اندر گھس آیا۔ ہو سکتا ہے بعد میں شہباز کی آنکھ کھل گئی ہو۔ ٹنک عائب دیکھ کر وہ جمونہڑے سے باہر نکل آیا ہو۔ اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بہت سی جگہوں پر اہلکاروں کے پاس کھڑی کھڑی ہوا دست ملا ہے اور پہلی جگہ پر پاؤں کے نشان بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے شہباز کی کسی سے لڑائی ہو گئی ہو۔ ایک بار پھر تجو کے سانوں نے چرے کو اندیشوں کی تیرکی نے ڈھانپ لیا۔ اس حالت میں وہ مجھے بڑی قابلِ رحم نظر آئی۔ اپنی جہم بھری سے ٹیکوں میل دور اس دیرانے میں شہباز اس کی زندگی کا واحد سارا تھا اور اب وہ بھی لاپتہ تھا۔

میں نے کہا۔ ”میں نے تمہارے جمونہڑے کا درد اذہ دیکھا ہے۔ یہ باہر سے بند نہیں ہوتا لیکن اندر سے تو ہوتا ہے۔ ظاہر ہے رات کو تم درد اذہ کھلا چھوڑ کر نہیں سوتے ہو۔

معزف کر دیا تھا۔

قوس کے کپالی سے ہاتھ تاپتے ہوئے میں نے ایک جاس خاں کو درپیش اٹھارہ بایا اور سردار بشرگل سے پوچھا کہ کیا واقعی اس نے شہباز پہلوان کو تین ہزار روپے دیے تھے۔ سردار کا جواب ہاں میں تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں نے روڑی فروخت کے بعد اسے کچھ رقم دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے آٹھ دس ہزار روپے دے دوں گا۔ تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے لیکن وہ بہت بے مبرا ہو رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اس نے سندھ میں کچھ نیا رانگشیں اور بہتول دیکھے ہیں۔ فروخت کرنے والا بہت ضرور تند ہے اور میں بخش ہزار کا اسلحہ کوڑوں کے بھاڑ دے رہا ہے۔ وہ یہ سودا کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے رقم کا مطالبہ کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ میرے پاس تو دو تین ہزار روپے سے زیادہ نہیں۔ اس نے تین ہزار لے لیے۔ کل رات وہ نوبے کے قریب میرے پاس سے اٹھ کر گیا۔ صرف تین گھنٹے بعد یہ پتا چلا کہ وہ اپنے جمونہڑے سے عائب ہے۔ ہم جمونہڑے میں پہنچے تو اس کی بیوی بیٹی رو رہی تھی۔ جمونہڑے میں کہیں جدوجہد کے آثار نہیں تھے۔ بارش متواتر ہو رہی تھی۔ اس کے جمونہڑے سے باہر قدموں کے نشان بھی نہیں مل سکے۔ ہاں اور ہاڑی پر ایک کھڑی کا ٹوٹا ہوا دستہ اور پٹنی پرانی چیل ملی ہے۔ اب معلوم نہیں یہ چیزیں دیسی ہی وہاں پڑی تھیں یا کوئی خاص بات ہے۔“

میں نے کہا۔ ”سردار بشرگل، آپ ایک کام کریں۔ جہاں اتنی ہماگ دوڑی ہے وہاں ایک آدمی باگز خیل بھی بھیج دیکھیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں آنے کے بعد پہلوان دو تین مرتبہ وہاں گیا ہے۔“

باگز خیل کا ذکر کرنا ایک سفید ریش شخص چونکا۔ اس نے کہا۔ ”دو ہفتے پہلے میں نے بھی شہباز کو باگز خیل میں دیکھا تھا۔ وہاں ایک جگہ پر بندوں کی ”بولی“ ہو رہی تھی۔ شہباز مجھ میں کھڑا تھا۔ میں نے اسے بلاتا چاہا لیکن وہ ایک دم لوگوں میں گم ہو گیا۔“

چوڑیاں کرنا اور مارواڑ کرنا کے نکل جانا ان کا قدیم مشغلہ ہے۔ شکار چونکہ ان لوگوں کا ذریعہ معاش ہے لہذا یہ جانور پھینچتے ہیں۔ خاص طور پر شاہین، عقاب وغیرہ کے بدلے میں جنہی بھی انیس کافی رقم مل جاتی ہے۔ مجھے پنجاب کے مختلف علاقوں میں گھومتے والے ساسی خانہ بدوش یاد آئے تھے۔ یہ بھی ایسے ہی جھگڑالو اور جرائم پیشہ قسم کے شکاری ہوتے ہیں۔ بات بہت دور نکل گئی تھی۔ میں عباس خاں کی مدد سے مشکل اصل موضوع پر آیا۔ میں نے سردار بشرگل سے درخواست کی کہ ایک یا دو بندے باگز خیل بھیجے جائیں۔ سردار نے علی الصباح بندے بھیجنے کا وعدہ کر لیا لیکن میں اس سلسلے میں کوئی تاخیر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جو دقت ہم نے سردار کے جمونہڑے میں سو کر گزار دیا تھا، ممکن تھا اس کا ایک ایک بل شہباز کی جان کے لیے بہت قیمتی ہو۔ سردار کو تذبذب میں دیکھ کر میں خود باگز خیل جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے سردار سے کہا کہ وہ اپنا صرف ایک آدمی ساتھ بھیج دے یا پھر راستہ ٹھیک طرح سمجھا دے۔ میری اس ”سرگرمی“ نے کام کر دکھایا اور سردار میں مہمان نوازی کا جذبہ بوری شدت سے بے زار ہو گیا۔ اس نے فوری طور پر تین سارے افراد وعدہ دہندگان کے ہمراہ باگز خیل کی طرف روانہ کر دیے۔ میں نے اس پائی کا ساتھ دینا چاہا لیکن اس نے مجھے انکشی کے سامنے سے جہش نہیں کرنے دی۔

باگز خیل جانے والے افراد قریب چار گھنٹے بعد واپس آئے۔ اس وقت شب کے دو بج چکے تھے۔ بہت سی گلی میں سے افراد گئے تھے لیکن واپس آنے والے آٹھ تھے۔ ان میں سے چار افراد نے ایک چارپائی اٹھا رکھی تھی۔ چارپائی پر کوئی موجود تھا۔ اسے بارش سے محفوظ رکھنے کے لیے اس پر مومی کاغذ ڈال کر رکھی وغیرہ سے باندھ دیا گیا تھا۔ دور سے دیکھنے پر لگتا تھا جیسے یہ لوگ کسی کی ارٹھی اٹھا لے رہے ہیں۔ ایک دوسری سمت میں گڑگڑے۔ صرف وہ افراد ہمارے پاس آئے جو پہلوان شہباز کا پتا کرنے گئے تھے۔ ان لوگوں نے سردار بشرگل کے ساتھ چند جہلوں کا تبادلہ کیا۔ اپنے حترج مرہض ہے۔ اسے پانڈوں کے معالج کے پاس لایا گیا ہے۔ آنے والے پہلوان کے بارے میں ایک دھماکا خیز خبر لائے تھے۔ اس خبر کو سن کر یوں لگا جیسے یہ خبر پہلے سے مجھے مل چکی تھی۔ کہیں بہت اندر دل کے نماں خانے میں اس خبر کی گونج بچلے کئی گھنٹوں سے موجود تھی۔ کاش! یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ کاش پہلوان کے بہت نرنگ میں موجود وہ چاندی

کے زیور اور سپیوں سے جڑے لباس بنجھ کے لے ہوئے
لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ سب کچھ ایک دوسری لڑکی کے لے
تھا۔ وہ لڑکی جو پاکر خیل میں رہتی تھی اور جس کے ساتھ کل
دوسرے شہزادی رسم ہو گئی تھی۔ مقامی درواج کے مطابق لڑکی
کے سر پرست نے چار ہزار روپے نقد اور دو قیمتی راتھوں کے
موض اپنی لڑکی کا ہاتھ شہزادے کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ اس
واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے سردار کے کارندے آزاد خاں
نے کہا۔

”پہلوں شہباز چوری چھپے کئی بار باؤنٹل جا چکا تھا۔ یہاں غلام خاں نامی ایک شخص نے اس کی ایک سیلک ہوٹنی تھی۔ غلام خاں عادی نشے باز ہے اور رقم کی اسے ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ پہلوں نے پہلی ملاقات میں ہی غلام خاں کی گوری جتنی خوبصورت لڑکی پر رال بیکادی تھی۔ شادی کے لیے لڑکی کی عمر تھوڑی تھی۔ یعنی صرف چودہ برس مگر فوٹوں کی تھلک نے غلام خاں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کوشش کر کے اس نے اپنی بیوی کو بھی رضامند کر لیا۔ یوں اندر ہی اندر کچھڑی یک مٹی اور غلام خاں نے چار ہزار روپے نقد اور دو را نقلوں کے عوض پہلوں سے لڑکی کا سودا کر دیا۔ ایک ہزار روپیہ پہلوں پہلے دے چکا تھا۔ تین ہزار روپیہ اس نے کل دیا اور مقامی رسم کے مطابق لڑکی سے عقد کر کے لے لیا۔“

میں نے حیرت سے یہ سب کچھ سنا۔ بظاہر بات عجیب سی لگتی تھی۔ بغیر کسی ضمانت اور گہری جان پہچان کے اتنا بڑا کام ہو گیا تھا۔ ایک شخص نے چار ہزار روپے کے بدلے اپنی پانچ بیٹی ایک انجینی اور بے ٹھکانا شخص کے ساتھ بیاہادی تھی اور وہ اسے لے کر چلا گیا تھا لیکن جس علاقے اور جس ماحول میں یہ واقعہ ہوا تھا، وہاں یہ غیر معمولی نہیں تھا۔ میں نے اس سے ملنے جلنے کی کئی واقعات سنے اور پڑھے تھے۔ کدھ کی بات صرف ایک سی تھی کہ اس واقعے سے متاثر ہونے والی جو تھی۔ وہ جو پہلوان شہزاد کی حریفانہوں میں کھو کر یہ سمجھ رہی تھی کہ اس سے محبت کی جا رہی ہے اس کے کالے پن کو معاف کر کے ایک گورے جوان سے اپنا یا ہے۔ کیسا انہو خواب دیکھا تھا اس نے وہ کسی کوڑی بی بیٹہ کی اکھڑی بی بیٹیں تھیں، نہ کسی دھانساو فرکی دختر تھی۔

ایک معمولی لڑکی تھی وہ جس کے پاس اپنی خوش اطواری اور جسمانی دلکشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لہذا وہ بیچ بازار کے ٹٹ مٹی تھی۔ تہذیب کے حصار پر رونے پھینے کے سوا اب اسے اور کچھ نہیں کرنا تھا۔ کاش! وہ یہ سوچ لیتی کہ یہ مشرق

ہے۔ یہاں مکالمے گورے کا ختاس ذہنوں میں دور کر
پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کبھی گورا جو مسلمانوں یا کالی لڑکی سے
شادی نہیں کرتا۔ اگر کہتا ہے کہ شادی کروں گا تو فریبہ بن
جاتا ہے۔

کسی کو بڑی جبر پہنچا ایک ناخوشگوار فریضہ ہوتا ہے اور
 یہاں یہ فریضہ بھی کواد کرنا تھا۔ آنکھوں میں آس کے سلسلہ
 حلا کر بھیجی ہوئی تھو کوٹھے یہ بتانا تھا کہ اب یہاں کوئی نہیں
 کوئی نہیں آئے گا وہ زیور وہ لباس وہ خواب کسی اور کے
 لیے تھے جو شہباز نے اسے دکھائے تھے وہ تو ایک گرد کو
 زندہ تھی جس پر اپنا پاؤں رکھ کر اور جس کے بطن پر اپنا منہ
 چموز کر شہباز آگے بڑھ گیا تھا۔ اب اس کا کوئی نہیں تھا کہ
 وہ خود بھی اپنی نہیں تھی۔ اس کے پیٹ میں بچنے والی نشان
 بھی اس کی اپنی نہیں تھی۔ چلو ان چار ہزار روپے کے عوض
 اس کا لویز کو مع صلہ پانچ سو بیسی میں بیچ کر جا چکا تھا
 ہاں وہ پک چکی تھی ابھی یہ بات مجھے کسی نے نہیں کہی تھی
 تاہم میں ان قبائل کے رسم و رواج کے متعلق تھوڑا سا
 جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا، تجو فرخت ہو چکی ہے اب اسے
 بھر خریدے بغیر اس بیسی سے نہیں نکالا جاسکتا تھا۔

بست پر بجل قدموں سے میں جتوے کے جموڑے کی طرز پر تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ اطلاع جتو کو کس طرح دوں اور وہاں بھی جائیں۔ وقتی طور پر بات چیت کی جاسکتی تھی لیکن تا دیر نہیں۔ جتنی کے چوراہے میں پہنچ کر میں نے دیکھا۔ دور دور جتو کا جموڑا نظر آ رہا تھا۔ اُوہ کھلی کھڑکی جیسے جتو کی آگھ تھی جو پلک جھپکے بغیر اپنے چاہنے والی کی راہ کو دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی سے پھوٹنے والی روشنی میں یارش کی چٹکی پھانسیں اور پوچھاؤں کی پرہیز کے موسلا وھار آنسوؤں کی مثال دیکھیں۔ وقتاً میں ٹمک۔ مرزئی کے طویل پتوں سے بے ہوش ٹیک سائبان تلے خانیہ بدوش کا جھوم تھا۔ ان کے درمیان وہی چارپائی بڑی تھی جو میں نے تھوڑی دیر پہلے لوگوں کے کندھوں پر دیکھی تھی۔ چارپائی پر کوئی عورت دراز تھی۔ اس کا چہرہ دکھا ہوا تھا۔ ایک سفید زلیں پر ٹھکا اس کی کھائی تھامے بڑی محبت سے اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔ عورت کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ مجھے اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھنے کے بجائے نظر آنے و فضا میری نگاہ عورت کے پہلو پر ڈی اور میں سرتیاز دیکھا۔

عورت کے بائیں پہلو پر ایک خون آلود پی بدمی
 ل۔ یہ پی کسی اور مضمی کو پھاڑ کر بتائی گئی تھی اور اس کے
 بچے بولی وغیرہ رکھی ہوئی تھی۔ جس چیز نے مجھے ششہ رکھا

ہائی کے نیچے سے جھانکنا ہوا نیلگوں گوشت تھا۔ میں نے
 چمک کر پتی کو تھوڑا سا ہٹایا تو پیٹ کا کشاف نظر آیا۔ یہ
 پتی کی تیز حرارت آنے کا مہلک "کنک" تھا اور اس کے اندر سے
 بدبو آ رہی تھی۔ ایک منٹ ہی میں اس نے مجھے کھینچ کر پیچھے ہٹا دیا۔ وہ
 بدبو ایسا برا تھا۔ غالباً کہ رہا تھا کہ مجھے اس طرح ناخوش عورت
 کی جسم کو نہیں دیکھنا چاہیے۔ ایک ہی نظر میں مجھے زخم کی
 پٹی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اندرونی رگیں کٹنے سے خون پیٹ
 میں جمع ہو گیا تھا اور یہ صورت حال نہایت مخدوش تھی۔
 لوہے کے کسی بڑھیا کے کٹنے پر عورت کے چہرے سے
 پڑا ہوا تھا۔ وہ تقریباً چالیس برس کی ایک خوب صورت
 عورت تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ سانس لینے میں
 کٹھن محسوس کر رہی تھی۔ باقی جسم کی طرح اس کے چہرے
 بھی تشدد کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس کے گلے اور
 دھڑالے صاف ظاہر تھا کہ وہ مقلی ہے۔ بڑھیا نے
 ہر طرف دیکھ لی تو عورت کا چہرہ دھک دیا گیا۔ اس دوران
 میں ٹائیک عباس بھی میرے قریب آن کھڑا ہوا تھا۔ میں
 نے اس سے پوچھا کہ یہ عورت کون ہے؟ وہ اس سوال کا
 جواب معلوم کر کے کہتا تھا۔ "بائوٹیل کی رہنے والی ہے۔"
 اس لڑکی سے آج صبح پہلوان شہباز کا بیاہ ہوا ہے اس کی ماں

”یعنی پہلوان کی ساس؟“

مہاس نے اثبات میں جواب دیا کہنے لگا: ”سچے شوہر ہے
 کہ انہوں نے زخمی ہوئی ہے۔ بیٹی کی رخصتی کے بعد مہاس
 کی کئی بات پر غکرا ہو گئی تھی۔ شوہر غلام خاں نے پہلے
 سے ہی طے مارا اور پھر چاقو کا وار کر کے شدید زخمی کر دیا۔
 کئی کئی اہانتا ہے کہ بیوی کو گھما سٹ کر کے خود کیس چلا گیا۔
 اب یہ دوسرے گھر میں پڑی سبک رہی تھی۔ انوس پڑوس
 والوں نے اپنی سمجھ کے مطابق مزاحمتی کڑی لیکن خون بند
 ہونے میں نہیں آ رہا۔“

عباس خاں کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ کوئٹہ کو زخم
 کی جگہی کا اندازہ نہیں۔ دوسری غلطی انہوں نے عورت کو
 بے احتیاطی سے یہاں لا کر کی تھی۔ راستے میں گئے والے
 انہوں سے بے چاری کی احتیاط اٹھ کر باہر آئی تھیں اور
 "بلڈنگ" سے پیٹ شلیپر بن گیا تھا۔ پانڈہ بستی کا بوزھا
 صاحب اپنی خواہش رسیدہ، محبوب اقلیت ہانوں کو بار بار حرکت
 دے رہا تھا اور اس کے ہونٹ متحرک کرنے والے انداز میں
 تھوڑے سے بڑا رہے تھے مجھے یوں لگے جیسے وہ عورت کی جانب

بچانے کے بجائے اس کی جان چمڑانے کے لیے کوشاں ہے۔
 زخمی عورت کو اس وقت اس دور دراز خیرہ بستی میں نہیں
 آپریشن ٹیبل پر ہونا چاہیے تھا اور آپریشن ٹیبل یہاں نہیں
 تھی۔ قریب دو چار میں جتنی تھیں تھی۔ شاید پچاس ساٹھ میل
 کے فاصلے پر بھی نہیں تھیں۔ بہت دور ہوئی ہیں ایسی چیزیں
 ایسی بستیوں سے۔ اور مرئی کے اس شکت سائبان سے
 مسلسل برستی بارش میں نامعلوم عورت کی زندگی ٹھکل ٹھکل کر
 موت کے تاریک نالے کی سمت بستی جا رہی تھی۔

عورت کے سر پہ کھڑا ایک چنדרہ سولہ سالہ لڑکا اس کا بچپنا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے عباس کے توبہ سے لڑکے سے رابطہ قائم کیا اور اسے لکھا کہ وہ اس حادثے کے بارے میں ہمیں کچھ بتائے معالج کا عمل بہت طویل تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ یہ فرض محال عورت ساری رات بھی زندہ رہی تو یہ

عمل جاری دساری رہے گا۔ لڑکا ہمارے ساتھ ایک دوسرے
ساتھ ان کے آبپاشا۔ وہ بہت تھا ماند اور مغموم تھا۔ انھیں
بتا رہی تھیں کہ وہ دو کر آنسو خشک ہو چکے ہیں۔ اب یہ
انھیں حیران تھیں جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ ماں مر گئی تو غم کا
الٹا رہیے کرے گا۔ لڑکا تھوڑی بہت اور بھی جانتا تھا۔ میں
اس سے برا اور است سوال وجواب کرنے لگا۔ ظاہر ہے اس
استر بو کا محور لڑکے کی جاں ہے۔ لب والدہ ہی تھا۔ اس موقع پر
مجھے کرشن چندر کی ایک یادگار تحریر یاد آئے گی۔ سیکرٹریٹ
کے احاطے میں ایک درخت زمین بوس ہو جاتا ہے۔ ایک
بے چارہ قلم کار درخت کے نیچے دب جاتا ہے۔ یہ درخت
چونکہ ایک اہم غیر ملکی شخصیت نے لگا رکھا ہے لہذا اسے
کاٹ کر قلم کار کو بجانے کے لیے بالائی سطح سے منخوری کی
ضرورت ہے۔ دفتری چکر بہت طویل ہیں، کوئی کچھ نہیں
کر سکتا۔ سب مضروب کے سرانے بیٹھے رہتے ہیں اور وہ
سب سب کو ادنیٰ اہل کو لپک کر جاتا ہے۔

یہاں بھی صورت حال کچھ ایسی ہی تھی۔ اس دور دراز
 ویرانے میں بد نصیب عورت کی زندگی کے لیے کوئی کچھ نہیں
 کر سکتا تھا۔ ان روضہ راستوں پر عورت کو اٹھا کر رات بھر
 میں دس میل طے کر لینا بھی خاصا مشکل تھا اور پختہ سوک
 تین گنا قافلے پر تھی۔ اس طوفانی شب میں اگر کچھ کیا جاسکتا
 تھا تو وہ موت کا انتظار تھا اور یہ بھی احرام آدمیت ہی کے
 زمرے میں آتا ہے۔ ورنہ ایسے مت سے واقعات بھی سننے
 گئے ہیں کہ موت سے پہلے ہی تجبزو یھنن سے فراغت پائی
 گئی۔ بعد میں مرحوم قبرستان جاتے ہوئے ہڑا کر اٹھ بیٹھا
 اور سارے کندے دھڑے پرائی پھیر گیا۔

لوہے کا نام سحر خاں تھا۔ وہ جاں بہ لب عورت مکنہ کا بیٹا تھا۔ سحر خاں نے ہم سے آدھ پونہ پچھنے تک مفتوحہ کی اس کی خجھر آنکھوں سے ناپیدہ آنسو برہے تھے اور وہ بڑبائی انداز میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا اور اپنے سوالات سے میں نے اسے جو کچھ بتانے پر مجبور کیا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

سحر کا والد غلام خاں ایک خالم محض تھا اور سحر کی ماں کو بڑی طرح مارا چڑھتا تھا۔ سحر کی دوسری ماں میں اور بھی تھیں اور وہ دونوں سحر کی ماں سے چھوٹی تھیں۔ سحر کی ماں کوئی عیس برس پہلے "خوں بہا" میں غلام خاں کے قبضے میں آئی تھی۔ ایک درینہ قبا علی رواج کے مطابق مقتول کا خوں بہا سات عورتوں کی صورت میں دیا جاتا تھا۔ غلام خاں کا ایک بھانجا یوسف زئی قبیلے کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ اس

غلام خاں نے یہ دونوں کام نہیں کیے شادی کی دعوت سرے سے کی ہی نہیں گئی۔ یہ بے عرقی سحر کی ماں ہے اس امید پر بدداشت کر لی کہ قرض کے بوجھ سے نجات مل جائے گی لیکن آج وہی رجب غلام خاں سے اس سلسلے میں بات ہوئی تو وہ منافح ہنکر گیا۔ اس نے یکینہ سے کہا کہ وہ چار ہزار میں سے ایک چھوٹی کوڑی دینے کا وہ ادارہ بھی نہیں۔ یکینہ نے یہ سنا تو تیار کر رہ گئی۔ یا سچن کو رخصت کرنے کی غرض سے اس نے خود کو قرضے میں جکڑ رکھا تھا۔ غلام خاں کا انکار سنا تو اس نے زندگی میں پہلی بار شوہر کے سامنے زبان کھولی۔ زبان کھولنے سے مطلب یہ نہیں کہ اس نے شوہر کو ترکی یہ ترکی جواب دیا کوئی گالی دی یا بدعادت سے نکال دے۔ وہ صرف اتنا بولی کہ وہ قرض خاویں کو کیا جواب دے گی۔ اس جملے کی پاداش میں غلام خاں نے یکینہ کو اٹھا اٹھا کر زمین پر بٹھا دوئی کی طرح دھکا اور جب پھر بھی سینے کا آتش فشاں ٹھنڈا نہیں ہوا تو سمجھ بے ہوش بیوی کے پیٹ میں خنجر گھونپ دیا۔ وہ جب خون میں لٹ پٹ تڑپ رہی تھی تو غلام خاں نے اسے ٹھوکر کیں رسید کیں اور دندانہا ہوا کرے نکل مٹایا۔

میں اور عباس جیسے اہل شاہک سے سہ خاں کی باتیں سن رہے تھے۔ یہ سب کچھ عجیب لیکن اس ماحول میں قابلِ یقین تھا۔ اچانک ہمیں چونکا دیا۔ سردار بشرگل کے جمونہڑے کی طرف شور مٹائی دیا۔ پھر مجھے لائینیں خلیب و فرازا پر اچھلتی ہوئی ہماری طرف بڑھیں۔ یہ کوئی دس ہزار افراد تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں راتھلیں اور کلہاڑیاں تھیں۔ وہ سردار بشرگل کے ساتھ لڑتے جھگڑتے سامان کی طرف آرہے تھے۔ ایک لمبے قد کا مفعص بہت فیس میں دو کھائی دیتا تھا اور کھانا پھاڑ پھاڑ کر بیچ رہا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی ہمارے پاس بیٹھے سہ خاں کی ہلکے ہندھ گئی۔ ایک دم لگا کہ وہ اٹھ کر ہماک جانے گا لیکن شاید ناٹکوں نے ہی جواب دے دیا تھا وہ اٹھنے کے باوجود ہماک نہیں سکا اور پھر دھپ سے پتھر پینٹ گیا۔ ورازدہ مفعص نے لائین کی دوشنی میں زخمی عورت کا پھردو دیکھا پھر سرہانے کھڑے ایک مفعص کے منہ پر زناٹے وار پتھر مارا۔ وہ بے چارہ لڑکھڑا کر سامان سے باہر گرا۔ چارپائی لے کر آنے والے چاروں افراد اب بڑی طرح سے ہوئے تھے۔ ورازدہ مفعص راتھل ہرا ہرا کر ان پر گرنے لگا۔ گاہے گاہے وہ سردار بشرگل کے لئے بھی لے لیتا تھا۔ بشرگل کے بھائی رستم نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو ورازدہ نے اسے بھی بڑی طرح لڑا دیا۔ وہ پھولی ہوئی کپڑیوں والا بے حد فحشلا اور خلیبک مفعص نظر آتا تھا۔ میرے اپنے مکان تو وہاں ہونے والی تھگی

مجھے سے قاصر تھے، عباس کے ہی کانوں سے سن سکتا تھا میں،
میں نے عباس سے دریافت کیا تو چپکلا کہ یہی غلام خاں
ہو اس بات پر بہم ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر اس
بازاری کو یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ اگر وہ مرنے کی صحت مرطانی
ہو جی سے ڈر رہے تھے۔

تھا جسے ہی کہتے تھے اُنہوں کے درمیان ہونے والی یہ طرار
 صورت اختیار کر گئی۔ گردنیں تن کھینچیں، منہ بچھ
 تھیں اور آنکھیں مفلوج سے اٹلی پڑیں۔ پھر مجھے اندازہ ہوا
 کہ دروازہ کھل گیا اور اس کے سامنے میں نے حضرت خواجہ
 بایں زکریاؒ کے کسی بات پر اڑ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں
 نے اس لمحے میں عباس سے پوچھا تو یہ اندازہ درست نکلا۔
 دروازہ کھل گیا تھا کہ انہوں نے زنجی عورت کو تھپادی
 ہے اور ٹھیک دی ہے۔ یہ ایک انسانی زندگی کا سوال تھا اور

اب بھی ہے وہ اس عورت کو زخمی حالت میں یہاں سے لے جاتے ہیں۔ مگر سردار برٹرگل کا یہ اعلان غلام خاں اور اس کے ساتھیوں کے لیے جلتی پرنیلی کا کام کر گیا۔ وہ ایک دم لڑکی کی انتہا کو پہنچ گئے۔ غلام خاں نے رافعہ کاندھے سے اتار کر گتھ میں لے لی اور اس کی آنکھوں میں جھون پانچے۔ کاندھ کی طرف برٹرگل، رستم اور دوسرے لوگ بھی چوکس ہو گئے جیسا کہ میں جانتا تھا کہ یہ لوگ کسی بھی جوڑے یا عورت کو ہتھیاروں کی بستی میں پناہ دے کر اپنے تئیں ایک بالی دلایت کا پاس کر سکتے تھے۔ اب بھی انہوں نے یہی کیا تھا۔

مشتعل افراد کے درمیان ہونے والی گفتگو کہیں کہیں سے میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے چہوں کا انداز چہاڑ بھی صورت حال کی وضاحت کر رہا تھا۔ آنا ٹانا ہانکا کنا ابھی گولی چل جائے گی پھر ہر شخص کا ہائیڈرو سسٹم آگے بڑھا اور اس نے غلام خاں سے چند باتیں کہیں۔ اس گفتگو کے بعد باقی لوگ دائیں بائیں ہٹ گئے اور درمیان میں صرف دو سسٹم اور غلام خاں کھڑے رہ گئے۔ دونوں کی آنکھیں ٹپٹے اگل رہی تھیں اور چہرے غصے سے سرخ ہو رہے تھے۔ لڑنے یا جانے میں مطلقاً ہر نہیں لگی کہ سسٹم نے خون ریزی سے بچنے کے لیے غلام خاں کو دودھ مقابلے کی دعوت دی ہے۔ نئے غلام خاں نے ایک غصہ بانگ ادا کے ساتھ قبول کر لیا۔ یہ شواہد بتا رہے تھے کہ ان لوگوں میں پہلے سے بھی کوئی ان میں موجود تھی جو اب ایک دم الجھ کر نگاہ خیز ہو گئی ہے۔ بارش اب باریک پھوار کی صورت میں آ رہی تھی۔ کبھی کبھی دھولے سے چاند بھی جھانکنے لگا تھا۔ دیکھنے یا دیکھتے ہستی کے

لوگ ایک دائرے کی شکل میں کھڑے ہوئے اور ایک لمبے
تختے یا پائے سے غلام خاں اور رستم کے ہاتھ میں تختہ پھل
کی کھانیاں تھامیں۔ دونوں نے اپنی اپنی رائٹیں سائبان
کے نیچے ایک چارپائی پر رکھ دیں۔ میں وہاں پاس ہی کھڑا تھا۔
رستم کی آنکھ کھنکھن گئی جبکہ غلام خاں کے پاس بارہ پوچی دو
ٹالی تھیں۔ رائٹل کو جھاروں اور تیل بوتلوں سے سجایا گیا تھا۔
چوبی دستہ ارادو کے دو شہر کندھے اور نیچے غلام خاں آف
بازو خیل لکھا ہوا تھا۔ شہر عام بازاری قسم کے تھے لیکن
انہیں دیکھ کر مجھے اس بات کا پتہ چل گیا کہ غلام خاں ارادو کی
سیکھ بوجھ رکھتا ہے۔

مقابلہ اب شروع ہی ہوا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی جوانی کا بیشتر حصہ بارود خانہ کرتے گزارا ہے لیکن میرے جیسے شخص کے لیے بھی یہ خطرہ بیان خیر تھا۔ آقا کا سامعین و افراد کا

مرنے مارنے پر مل جانا اور پوری خونخواری کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے آجانباعین کسی قلم کا منظر لگتا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ اب یہاں کیا ہوگا۔ کیا یہ دونوں ایک دوسرے پر براہ راست وار کریں گے یا صرف داؤ پیچ کا مظاہرہ ہوگا۔ اگر براہ راست وار کریں گے تو کیا مخالف کو زخمی کیا جائے گا یا جان سے مار دیا جائے گا! دو تین بڑے بوڑھے اب بھی پیچ بھاؤ کی کوشش کر رہے تھے لیکن لگتا تھا معاملہ اب کافی آگے بڑھ گیا ہے۔ جہاں مجھے بعد میں معلوم ہوا دونوں قبیلوں میں دو تین ماہ پہلے بھی کسی چڑاگاہ کی ملکیت پر جھگڑا ہو چکا تھا۔ اب اس تازہ واقعے نے پرانے زخم بھی ہرے کر دیئے تھے اور دونوں طرف کے لوگ مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

چھ بچاؤ کرانے والے دو بوزے ابھی میدان میں ہی تھے کہ غلام خاں نے کسی بات پر مشتعل ہو کر رستم پر حملہ کر دیا۔ اس نے چارنٹ لمبی کھانسی سیدھی ادا کر اٹھائی اور بے دریغ رستم کے سر کو نشانہ بنایا۔ رستم نے خود کو بچانے کی کوشش کی۔ وار ہلک کر اس کے کندھے پر لگا، موٹی اونٹنی صدر کی کی وجہ سے کندھے کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا لیکن ضرب کی شدت سے رستم ڈگمگ گیا۔ غلام خاں کا دوسرا وار رستم نے بڑی مہارت سے اپنی کھانسی پر روکا اور کچھ مہلت حاصل کرنے کے لیے پانچ پانچ قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بے حد خوف ناک نظارہ تھا۔ یہ امر سو فیصد یقینی تھا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد یہاں دونوں میں سے کسی ایک کی لاش تڑپ رہی ہوگی یا کوئی ایک شدید زخمی حالت میں پڑا ہوگا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے

کھانا ہاں تھا ہے وہ دونوں غم دائرے میں پکڑے گئے۔ مجمع دم بخود تھا اور تماشائی نگاہیں تیز دھار کھڑکیوں پر جم کر رہ گئی تھیں۔ ایک ایک یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہو گیا۔ میں اپنے نزدیک کھڑے افراد کو دیکھتا ہوا میدان میں آگیا اور دونوں کھڑی بدواؤں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ غلام خاں جیسے دیوانگی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ وہ مجھ پر بھست پڑا۔ اس کے ہاتھوں کے اشارے بتا رہے تھے کہ وہ مجھے درمیان سے ہٹنے کے لیے کہہ رہا ہے۔

میں نے بڑے تحمل سے غلام خاں کو مخاطب کیا "ارو مجھے ہو؟"

"کیا بات ہے؟" وہ نکدہ کر بولا۔

"کس بات پر لڑ رہے ہو؟" میں نے دریافت کیا۔

"تم یہ بات پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟" وہ بھڑک کر میری طرف آیا۔

"تمہارا خیر خواہ ہوں۔" میں نے جواب دیا "اگر اس دنگے فساد کا مقصد زخمی عورت کو میاں سے لے جانا ہے تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

"کیسی مدد؟"

"میری کہ میں عورت کو تمہارے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔" "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ حرام زادہ بشر گل اور اس کے گمشتے ایسا ہونے دیں گے؟"

"میری بات سمجھ رہے ہو ان تم؟"

غلام خاں کی پیشانی پر تشویش کی ایک معمولی سی چھڑک ابھر کر غائب ہو گئی۔ اس اطلاع نے اسے مطلق غمزدہ نہیں کیا تھا۔ اس کے رد عمل سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میں نے اس کی بیوی کی بات نہیں کی، کسی چھپر بھیجی کے مرے۔ کیا بات کی ہے۔ اس نے خائزانہ نگاہ میری بائیں جانب ڈالیں۔ یہاں سائبان کے نیچے تنگی چارپائی پر وہ عورت سبک رسی تھیں۔

میں برس سے اس کی بیوی تھی۔ جس کے جبین جسم نے اس کی لافندہ راتوں کو جیت لیا تھا اور جس کے سختی ہاتھوں نے بڑا ہمارے اس کے سامنے دسترخوان چٹا تھا۔ جو نہ صرف اس کے بچے پیدا کرتی رسی تھی بلکہ ننگے پاؤں اس کی بھیج بکریوں کے پیچھے بھی بھاگتی رسی تھی۔ آج وہ عورت اپنی ساری خدمات کا سلسلہ ایک درونک زخم کی صورت لے کر رہا ہے۔

میں نے موڑی تھی اور غلام خاں نہامت کے آنسو بہانے کے بجائے تکبر سے منھ میں موڑ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کا چل نیچے جھکا کر ایک تیز آلود نگاہ سامنے کھڑے رستم زالی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "تم یہ بات سردار بشر گل کو کیوں نہیں سمجھاتے۔ اگر وہ مردی ہے تو اس کا مردہ شہر میں لے جا کر خراب کرنا کیوں چاہتا ہے اسے کو بہتری اسی میں ہے کہ میری بیوی میرے حوالے کر دی جائے۔"

میں نے کہا "یہ بات میں تم سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میری اردو سردار کی سمجھ میں نہیں آئے گی بلکہ میاں موجود کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میں تو بڑی بہت ڈاکڑی جانتا ہوں مجھے روپے میں چار آنے امید بھی نہیں کہ یہ بے چاری ایک گھنٹے تک زندہ رہ پائے گی۔ اب یہ بے وقوفی نہیں توادر کیا ہے کہ ایک مرنی ہوئی عورت کے لیے تم لوگ خون بہانے لگے ہو اور نہ ختم ہونے والی دشمنی کی شروعات کر رہے ہو نہ کہ یہ سب کچھ۔ مجھے غیب کا علم تو نہیں لیکن یقین ہے کہ ایک گھنٹے تک تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

میرے لہجے میں چھپی ہوئی زیر آلود تنگی کو غلام خاں نہیں چھو سکا اور نہ ممکن تھا کہ وہ اپنے پیچھے ہونے سے کا رخ میری طرف موڑ دیتا۔ غلام خاں کو نرم پڑتے دیکھ کر میں نے عباس خاں کے کان میں کھسک کر کہا۔ اس نے میری ترغیب کرتے ہوئے سردار بشر گل سے کہا کہ غلام خاں مان گیا ہے۔ وہ لوگ عورت کا علاج معالجہ جاری رکھیں۔ ماحول کا تاؤ ایک دم کم ہو گیا۔ رستم پیچھے بنا تو غلام خاں کے ساتھیوں نے بھی غلام خاں سے کھڑکی لے لی۔ سچ بچاؤ کرانے والے

ہوڑے ایک بار پھر سرگرم ہو گئے اور دونوں فریقین کو ہندو نصاب کی ڈوڑھنے لگے۔ سچ کی بات غلام خاں کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں تھی۔

فلکت ہاتھوں والا ابن رسیدہ معالج ایک بار پھر اپنی ناقابل فہم کارروائیوں میں مصروف ہو گیا۔ اس کا معاون ایک متشخص بالے میں سے کسی لیس دار دوڑے کے پیچھے بھڑک کر عورت کے منہ میں ڈال رہا تھا۔ لگتا تھا یہ کارروائی بھی کسی نوٹے ٹوٹے کا حصہ ہے کیونکہ دوا پلانے والے کو اس بات سے غرض نہیں تھی کہ دوا مریض کے حلق میں جاری ہے یا نہیں۔ وہ صرف ایک مخصوص وقت سے پیشی انداز میں پیچ

مریض کے ہونٹوں پر انڈیل دیتا تھا اور بہن۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ سب کچھ مریض کا گھونٹ ہٹانے بغیر کیا جا رہا تھا۔ معالج نے آنے کا ایک بیڑا سا مریض کی دونوں چھاتیوں کے درمیان رکھا ہوا تھا اور گاہے گاہے کچھ پڑھ کر اس پر پھونک دیتا تھا۔ ایسی چند پھونکیوں کے بعد وہ مٹی کے نوٹے سے کسی تیل نما مادے کے چند قطرے قیض کے اوپر

ہی سے عورت کے زخم پر ڈکاتا اور ہونٹوں سے ایک ناقابل فہم آواز نکال کر آگے پیچھے جھولنے لگتا۔ ان ساری کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی منٹ بعد عورت کا دم اکھرنے لگا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ علان معالجے کے جمیلوں سے آزاد ہو گئی۔ معالج مایوسی سے سر ہٹا نا اپنی چھوڑی میں واپس چلا گیا۔ لوگ کم کم چارپائی کے گرد کھڑے تھے۔ عورت کی موت کے ساتھ ہی ماحول میں موجود بھیگی کھسکی بھی دم توڑ گئی۔ سردار بشر گل غلام خاں اور دیگر سرکردہ افراد میں یکدم دیر

بات چیت ہوئی پھر میت کو واپس لے جانے کے انتظام ہونے لگے کسی کو احساس تک نہیں تھا کہ غلام خاں ایک قاتل ہے اور اس کے دستِ شمشیر اجداد کا شکار ہونے والی بد نصیب عورت ان کے درمیان لاش کی صورت پڑی ہے۔ ان کے لیے یہی اطمینان کافی تھا کہ مرنے والی مارنے والے کی بیوی کی اور بس۔ ممکن ہے ان کے دلوں میں رنج اور غصے کے جذبات ہوں لیکن ان جذبات کے اظہار کی ان کے نزدیک کوئی گنجائش نہیں تھی۔

میاں تک کہ اس جھوم میں میرا ہم زبان اور ساتھی عباس خاں بھی بالکل غافل نظر آ رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ سامنے بچے کے چھوڑنے کی طرف اٹھ گئی اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسری طرح کے تم نے دل کو گھیر لیا۔ مجھے یاد آیا کہ

مشہور ٹوی سیڑیل
منزلیں کی مَصنفہ
سیمّا غزل کا ایک
ناقابل فراموش ناول

کولی بہ تھکلی بہ

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰
جلد دوم: ۱۵۰

اپنے ہا کر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

بڑا دست منگوانے کا پتہ :-

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون: ۲۲۴۲۱۳

اسٹاکٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میوہ ہسپتال لاہور۔
فون: ۲۲۳۸۵۳

ابھی مجھے ایک نہایت ناخوشگوار فریضہ انجام دینا ہے۔ جو کہ بتانا ہے کہ شہباز پہلوان نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے اور اپنی آہود اور محبت کی قیمت اسے کیا ملی ہے۔ میں نے انھیں سلوڈ کر دیکھا تو مجھے جھوپڑے سے باہر ہی گھڑی دکھائی دے گئی۔ وہ طاہرانہ نگاہوں سے جھوم کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بجائے کیوں میرا حوصلہ ڈھکیا۔ میرا دل چاہا کہ اسے شہباز کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔ جو خواب اس نے اپنی آنکھوں میں سجا رکھے ہیں انہیں اتنی بے دردی سے امتحان فرماؤں کہ بے چاری کا گلیا بھی کھج کر آنکھوں کے رستے نکل آئے۔ شاید۔ شاید جو کچھ میں نے سادہ جھوٹ ہو اور اگرچہ ہو تو ہو سکتا ہے یہ سچ کی دوسرے سچ میں بدل جائے۔ ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔ کارخانہ قدرت میں انہوں نے کرسٹوں اور معجزات کی تعمیر شانہ روز جاری رہتی ہے۔ میں جو جملہ قدموں سے جو کہ جھوپڑے کی سمت بڑھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ہوشیار ہو گئی۔ آنکھوں میں آس نے چراغاں کر دیا اور ہونٹ شہادت انتظار سے لرز اٹھے۔ مجھے لگا جیسے وہ یہ زبان خاموشی اچھا کر رہی ہے۔ ”میب جی! مجھے کوئی اچھی خبر دینا بڑی خبر سننے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔“ میں نے اپنے اندر کو سینے کی گہرائی میں دھکیل دیا اور چہرے سے بشارت ہو ا کر گئی۔

”نک۔ کچھ بتا چلا؟“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بول پڑی۔ ”ہاں“ میں نے اعتماد سے جواب دیا ”تھوڑا بہت کھوج ملا تو ہے۔“ وہ سر ہٹا کر سوال بن گئی۔ میں نے سرگٹ سلگاتے ہوئے کہا ”آج باگز خیل کے ایک درگاہدار نے بتایا ہے کہ اس نے بدھ کے روز شہباز کو باگز خیل کے بازار میں دیکھا تھا۔ اس کے سر پر معمولی زخم تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کسی کام سے پارا چنار جا رہا ہے۔ ایک دو روز تک وہاں آئے گا۔“

”پھر وہ اب تک آیا کیوں نہیں؟“ جو کئی فکر مند یوں کی توں رہی۔

”مجھے یہ تو اب اس سے پوچھنا۔ ویسے نہ آنے کی ایک وجہ بارش بھی ہو سکتی ہے۔ یہ سارا علاقہ ندی نالوں سے آنا پڑا ہے اور تو اور پارا چنار جانے والی میں سڑک بھی کئی جگہ برساتی نالوں کے اندر سے گزرتی ہے۔ ہو سکتا ہے راستہ بند ہو گئے ہوں اور وہ پارا چنار میں رک گیا ہو۔“

”تو نے مجھے ٹوٹنے والی نظروں سے دیکھا جیسے بات کی نہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ناکام ہو کر وہ گہری سوچ میں غلطیاں ہو گئی۔ میں نے کہا ”ہو سکتا ہے یہ چوری کا کیس ہی ہو۔ شہباز نے مجھ میں کا پچھا کیا ہو اور وہ اسے زخمی یا بے

دانی سے کام لے کر رستم اور غلام خاں میں ہونے والی لڑائی روک دی ہے۔ پھر وہ اصل موضوع پر آگیا۔ وہ جو کہ بارے میں بات کر رہا تھا۔ کتنے گائیکین نہیں آنا کہ شہباز نے ایسا کیا ہے۔ لیکن مانے بغیر چارہ بھی نہیں۔ اس بات کے چارے زائید گواہ موجود ہیں۔ معلوم نہیں وہ بے چاری اس صدمے کو کیسے برداشت کر پائے گی۔ آخر میں سردار نے پوچھا کہ کیا میں نے اسے اس بارے میں بتا دیا ہے؟

”میں نے کہا“ ہاں۔ تھوڑا بہت اشارہ دیا ہے لیکن مکمل کر بات نہیں کی۔“

میرے اور سردار کے درمیان یہ گفتگو حسب سابق عباس خاں کے توسط سے ہو رہی تھی۔ سردار نے کہا ”بہتر تھا کہ تم اسے بتا دیتے۔ کسی کو جھوٹی آس دلا نا گناہ ہے کم نہیں ہوتا۔“

میں نے کہا ”لیکن سردار! ابھی تک کوئی بات پائیے ثبوت کو نہیں پہنچی۔ ہو سکتا ہے یہ معاملہ دینا نہ ہو جیسا ہمارے سامنے آیا ہے۔“

”اب اور پیچھے کیا رہ گیا ہے؟“ سردار نے کہا ”گواہ موجود ہے۔ غلام خاں ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں موجود تھا۔ لڑکی والہ کا جنازہ ابھی یہاں سے اٹھ کر گیا ہے اور کس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ میں۔“

میں بھی سردار کے منہ سے یہی کھلانا چاہتا تھا۔ اگلیوں کے سرے جوڑتے ہوئے میں نے پرسوج انداز میں کہا ”مجھ میں نہیں آتا اب اس لڑکی کا کیا ہو گا۔ اس کی زندگی تو شوہر سے شروع ہو کر شوہر ہی ختم ہوئی تھی۔ کہیں ایوی میں وہ کچھ کر دیں۔ بیٹھے میرا خیال ہے ہمیں اسے جلد از جلد گاؤں والیں پہنچانا چاہیے۔“

”کون سے گاؤں؟“ سردار نے چونک کر پوچھا۔

”جھوک خاسن۔ جھنگ کا ایک مضافاتی گاؤں ہے۔ میں بھی وہیں کا رہنے والا ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں اس کے والدین کو۔“

سردار کے چہرے پر رنگ سا اگر گزر گیا۔ اس نے دور دیکھ کر کئی گز گزری کو من پسند عورت کی طرح اپنی طرف کھینچا اور بڑے کراہنے لے کر ایک ہی کس میں سٹکی چلم کو راہ کر دیا۔ اس کی قہقہہ میں معصیتیں نے بھی اپنی اپنی لڑکپنوں پر طبع آزمائی کی اور جھوپڑا دھواں دھواں ہو گیا۔

سردار نے دھواں کی آواز سے اپنی سرخ آنکھیں مجھ پر تھامیں اور بولا ”خیراتی جلدی کی ضرورت بھی نہیں۔ ہمیں شہباز کا انتظار کرنا چاہیے۔ ممکن ہے وہ اپنی مصائب پیش کرنا

یہ بھڑک کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل سردار کہہ چکا تھا کہ اب تصدیق کرنے کو کچھ نہیں رہ گیا۔ میرا یہ خیال درست ثابت ہوا تھا کہ قبائلی رواج کے مطابق نوجوانوں کی ملکیت ہو چکی ہے اور اب میں قیمت چکانے بغیر اسے یہاں سے نہیں لے جا سکتا۔ اب میں نے عباس خاں کے ذریعے سردار سے مکمل کھل کر بات کی۔ جلد ہی سردار بشرگل کا دعاسانے آگیا۔ شہباز کے فرار ہونے کے بعد وہ جو کہ اپنی ملکیت جان رہا تھا۔ تین ہزار روپیہ تو شہباز نقد لے کر گیا تھا اس کے علاوہ ان دونوں پر سردار کا کم و بیش دو ہزار روپیہ خرچ اٹھ چکا تھا۔ پھر ایک قیمتی رات نقل بھی سردار نے شہباز کو مجھے میں دی تھی جو اب شہباز پہلوان دھن کے عوض غلام خاں کو سو پ چکا تھا۔ کل ملا کر تقریباً آٹھ ہزار روپے کی رقم بنی تھی۔ سردار بشرگل منافع لینے کا روادار نہیں تھا لہذا وہ آٹھ ہزار کے عوض جو کہ آزاد کرنے پر رضامند تھا۔ جو بھی سردار بشرگل کے منہ سے آٹھ ہزار کے الفاظ نکلے ”میں نے“ ہاں۔ ”کہہ دی۔ ایک ہزار روپیہ میں نے فوراً سردار کے ہاتھ میں تھمایا اور بھایا ادائیگی کے لیے ۴۸ گھنٹے کی مہلت طلب کر لی۔ اس کام سے فراغت یا کر میں اور عباس خاں ذرا کمر بیدار کرنے کے لیے سردار کے نیم گرم جھوپڑے میں ہی لیٹ گئے۔ صبح اب ہونے ہی والی تھی۔ جو کئی رات کی بار آور تھوڑی دیر کی گھڑی ہوئی روشنی غالب آئی ہم جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

○ ☆ ○

ہم ڈھکی تالاب پر پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ پڑاؤ میں صوبیدار صاحب کے دو خاسنوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ معلوم ہوا سب لوگ صبح سے شکار پر نکلے ہوئے ہیں۔ آج کی روز بعد مطلع صاف ہوا تھا۔ دھلا دھلا جھلک سورج کی نرم دھوپ میں چمک رہا تھا۔ پرندے پر پڑھاتے ہوئے اپنے کھونسوں سے نکلے تھے اور رزق کی تلاش میں جو پر واز تھے جھنگ کی دوسری مخلوق اترتے ہوئے خروش پڑا اور گھڑی وغیرہ بھی حرکت میں برکت کے مقولے پر عمل کر رہے تھے۔ یقیناً ان سے بڑے جانور بھی عجمت ہوں گے۔ خرودہ ہماری نگاہ سے اوچھل تھے میں اور عباس چار باج میل کا اشارہ قاصطے کر کے آئے تھے۔ بھوک خوب چکی ہوئی تھی۔ ہم نے افسران اعلیٰ اور دیگر احباب کا انتظار ضروری نہیں سمجھا۔ بیڑے کھانساں کے سامنے در خواست گزار دی اور اس نے کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے ہمارے سامنے ستر

خواب بچا رہا۔ مرغابی کے گوشت کا ناستہ لہذا نہ پاؤ تھا۔ ساتھ میں بودینے کی چٹی اور انکو کا شور بہ تھا۔ چٹائی پر بیٹھ کر یہ بچہ کہنے میں جو لطف آیا شاید کسی قاتلوں اشارہ ہونے میں بھی نہ آتا۔ ایک تو کھانا مزے دار تھا دوسرے اس میں گناہ کی لذت بھی شامل تھی۔ جی ہاں جناب ایس بی برکت صاحب سے پہلے کالیٹا اور وہ بھی چوری چھپے گناہ کے ذمے میں ہی آتا تھا۔ اگر وہ ہمیں اس حالت میں دیکھ لیتے تو یقیناً انکا لٹاکر کھانا پانا ہر نکال لیتے۔ میں کھانے کے آخری مراحل میں تھا جب اچانک میرے ذہن میں زخمی عورت کی دید کا منظر آ رہا ہو گیا۔ خاستری پٹی کے نیچے سے جھانکتی ہوئی نیکیوں آئیں! دل تھلا گیا۔ اس کے بعد ایک لمحہ لینے کو دل نہیں چاہا۔ سگھٹ سگھٹ کر میں سوچ میں گم ہو گیا۔ آخر کیا صورت تھا اس بد نصیب کا؟ یہی تاں کہ وہ ایک بیٹی کی ماں تھی اور اسے عزت سے رخصت کرنا چاہتی تھی۔ اپنے بچے کے کھڑے کو پیش کے لیے دوایع کرنے سے پہلے وہ اس کے کچھ چاڑ پورے کرنا چاہتی تھی اور وہ "چاڑ" بھی کیا ہوں گے چند معمولی چیزیں ہوں گی اور بیکروں کے دو تین جوڑے کچھ کھانے پکانے کے برتن اور ڈھنچے بچانے کی ایک دو چادریں۔ اور بس۔ ان چیزوں کے حصول کے لیے اس بے چاری نے قرض لیا تھا اور اب وہ یہ قرض چکانا چاہتی تھی۔ اپنے شوہر کی کمانی سے نہیں، اپنی بیٹی کے عوض حاصل ہونے والی رقم سے۔ یہ رقم آنسوؤں کے مول حاصل ہوئی تھی اور اس کا بیاج وہ تنگ تھی جو بیٹیوں کو انجانے دیں رخصت کرنے والی ماؤں کے دل میں پیش رفتی ہے۔ اس رقم پر صرف اور صرف سیکھ کا حق تھا۔ اس نے غلام خاں سے بھد عاجزی یہ حق مانگا تھا اور نتیجے میں بجز گھوب گراس کی آئیں باہر نکال دی گئی تھیں۔ شکار پانی کی دواپس وصال ہی بچے کے قریب ہوئی۔ وہ سب مت تھے نامے تھے آتے ساتھ ہی وہ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد برکت صاحب نے مجھے اپنے نیچے میں طلب کیا۔ صوبیدار اور کبیر علی شاہ بھی وہیں موجود تھے کبیر علی شاہ نے کہا "کاشییل صاحب! اب آج کل تم کیا پک کر چلنا پھر رہا ہے۔ وہ تمہارا پہلوان! کیا نام ہے اس خدا کی خوار کا پاں شہباز اس کا کچھ کھج موم لگا کر کہیں۔" میں نے کہا "کھج تو لگا ہے ہی لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا؟" "کیا مطلب؟" کبیر شاہ نے پوچھا "تم تو ایسے بات کرتا ہے جیسے وہ بچہ لے کر رو پکرو ہو گیا ہے۔" "جی ہاں رو پکرو پکری سمجھیں، لیکن دکھ اس بات کا نہیں کہ وہ بچہ لے گیا ہے بلکہ اس بات کا دکھ ہے کہ وہ بچہ چھوڑ

گیا ہے۔" کبیر علی شاہ نے ایس بی برکت سے مخاطب ہو کر کہا "ایس بی صاحب! ابھی کبھی تو ام کو گلے ہے آپ کا یہ کاشییل ٹکلی وہیں کے ڈراموں میں کام کرتے کرتے ادھر آ گیا ہے ہر بات تمہا پھر کر کرنا ہے۔" برکت صاحب نے مجھے گھور کر دیکھا "بات کو الجھایا مت کرو۔ کل کرتاؤ کا معاملہ ہے۔" میں نے کہا "وہ میں نے آپ سے جو نام کی لڑکی کا ذکر کیا تھا، جس کے ساتھ شہباز بغیر نکاح کے رہ رہا تھا۔" "ہاں ہاں ام کو معلوم ہے۔" کبیر شاہ نے زبردست دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا "تم آگے بولو۔" میں نے ساری کمانی دہرا دی۔ چچانے سے کچھ فائدہ بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی عباس خاں سامنے کی طرح میرے ساتھ رہا تھا۔ میں چچا آؤ تھا ظاہر کر دیتا۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ اب بھڑکی حیثیت اس بستی میں پر غالی کی ہے اور سردار بھر گل اس کی رہائی کے لیے آٹھ ہزار روپیہ طلب کر رہا ہے۔ صوبیدار مرجان اور کبیر علی شاہ اس رو داد سے بہت متاثر نظر آتے تھے جبکہ برکت صاحب کا معاملہ برعکس تھا۔ چونکہ اس قصے کا عین جان وغیرہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا لہذا وہ بے زاری ظاہر کرتے ہوئے اٹھ گئے اور دانتوں میں خلال کرتے ہوئے باہر تشریف لے گئے۔ کبیر علی شاہ نے شہباز کو کہتے ہوئے کہا "اس کا مطلب ہے وہ نہ زکا پچ نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو یوں اپنی عورت کو پاؤندوں میں چھوڑ کر نہ جاتا۔ کاشییل بھائی خدا کا قسم ام کو یہ سب سن کر دکھ ہوا ہے۔" صوبیدار مرجان نے پوچھ لیجے میں کہا "یہ بات تو طے ہے کہ وہ رقم لے بغیر لڑکی کو آزاد نہیں کریں گے۔ یہ بھی تم نے اچھا کیا کہ انہیں فوراً بیٹھی رقم دے دی۔ اب تم ان کم پر سونگ تو رہا ہند ہیں۔" میں نے سرگوشی کے لیے میں صوبیدار سے کہا "آپ ذرا اپنی طرف سے بات کر کے مجھے ایس بی صاحب سے اجازت لے دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج ہی واپس چلا جاؤں۔" "کس لیے؟" کبیر علی شاہ نے تیزی سے پوچھا۔ "رقم کا انتظام کرنے کے لیے" میں نے سادگی سے جواب دیا "دوسرے صحن ابدال کے قریب ہمارا ایک رشتہ دار رہتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ بچہ نہ کچھ ضرور کرے گا۔" کبیر علی شاہ نے تنک کر کہا "کیا بات کرتا ہے احسان

الہی کیا ام مرگیا ہے۔ ام انتظام کرے گا رقم کا تم بالکل بے فکر رہو۔ ابھی شام سے پہلے تم کو پھر مل جائے گا۔ تم جا کر یہ پیر سردار کے منہ باد اور اپنا عورت چھڑا کر لاؤ۔" صوبیدار نے بھی کبیر شاہ کی تائید کی اور مجھے تسلی دیتے ہوئے بولے "بے فکر رہو ہم شام تک رقم کا انتظام کر لیں گے رقم دے کر اپنی عورت لے آؤ، اگر پاؤندے پھر بھی اڑی مڑی کریں تو پھر ہم انہیں دیکھیں گے تم یہاں ہمارے سمان ہو۔ یہ تمہارا نہیں اب ہمارا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا "جناب اگر ایسا ہے تو پھر میں یہ رقم قرض کے طور پر لوں گا اور واپس جاتے ہی آپ کو لوٹا دوں گا۔" کبیر شاہ نے میری پینہ چٹکی "مجھ تو یاد رہا یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فیصل میں اپنا دماغ ہلکا مت کرو۔ جاؤ آرام کرو شاباش۔" حسب وعدہ شام سے تھوڑی دیر قبل کبیر علی شاہ نے سات ہزار کے نوٹ من کر میرے ہاتھ میں تمنا دیے۔ وہ کمانا پتہ شخص تھا۔ ممکن تھا اس نے یہ ساری رقم جب سے لے ادا کر دی ہو۔ اس کا باپ اور اعتماد میرے لیے متاثر کن تھا۔ رقم میا کرنے کے علاوہ اس نے برکت صاحب کو بھی قائل کر لیا تھا کہ ان کا ہیڈ کاشییل جو کچھ کر رہا ہے وہ عین مناسب اور حسب حال ہے۔ لڑکی کو رہا کرنا نہ صرف ان کا اخلاقی بلکہ قانونی فرض بھی ہے۔ برکت صاحب بڑا سادہ بنا کر چپ ہو گئے۔ ان کی کون سی جنگ پھٹکری تنگ رہی تھی۔ ہاں لڑکی پر آدھ ہو جاتی تو ان کی رپوٹیشن پر تھوڑا سا رنگ آسکتا تھا۔ اگلے روز علی الصباح میں اور عباس خاں رانٹھوں سے سنا ہو کر پاؤندہ بستی کی جانب روانہ ہو گئے۔ میرے نئے کی ہڈ اب بستر تھی۔ بس معمولی سا رنگ رہ گیا تھا۔ چند فرلانگ چلنے کے بعد پاؤں گرم ہوئے تو تنگ بھی دور ہو گیا۔ پاؤں سے پاؤندہ بستی تنگ کے سارے شارت تک اب مجھے آدھ ہوئے تھے۔ طویل فاصلے کو مختصر کرتے ہوئے ہم نے آدھ گھنٹے میں نصف سفر طے کر لیا۔ اوجھ بیچ کھانوں کے درمیان ایک ویران تالاب پر ہم کچھ دیر سستانے کے لیے رکتے رہے۔ جگہ بھی جہاں چند یوم قبل میں شہباز پہلوان کا نقاب کرتے ہوئے پہنچا تھا۔ پہلوان نے میان رک کر پانی کا قمار آدھ چند پاؤندوں نے اس کے گھوڑے کی زخمی ٹانگ کا سناٹہ کیا تھا۔ میں اور عباس دو چھوٹے بیٹھ گئے۔ میں نے زخمی نئے کو سسلانے کے لیے بائیں پاؤں کا شکاری بوٹ کھولا لیکن ابھی بوٹ پاؤں سے علیحدہ نہیں ہوا تھا کہ ایک گرجتی

ہوئی سی آواز کان میں پڑی۔ کوئی کسی پر مڑی طرح چلا رہا تھا۔ چلاتے والے کی آواز میں گونج تھی جس کا مطلب تھا وہ کسی غاریا کھو میں بول رہا ہے۔ ذرا غور سے سنا جاتا تو صاف بتا جاتا تھا کہ بولنے والا نشتے میں ہے اور چپنے کے ساتھ ساتھ کسی کو چپٹ بھی رہا ہے۔ میں اور عباس خاں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے پھر ایک ساتھ اٹھ کر ہم آواز کی سمت بڑھے۔ آواز کا منبع دھوڑنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ تقریباً پچاس گز دور ایک تنگ کمانی میں پھلائی اور گرگد کے درختوں کے درمیان ایک گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک کھوکھو کا دہانہ نظر آ رہا تھا۔ آواز کھوکھو کے اندر سے پھوٹ رہی تھی۔ میں نے رانٹھل کا بیٹھی کچھ ہانکا اسے تیار حالت میں کر لیا۔ عباس خاں نے میری تقلید کی۔ مختصر فاصلوں سے دہانے تک پہنچ کر میں نے اندر جھانکا۔ چند قدم آگے کھوکھو میں ایک رقم تھا لہذا اندرونی منظر نظر نہیں آیا۔ ہاں آواز اب بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ مجھے یہ آواز کچھ جانی پہچانی سی محسوس ہوئی۔ الفاظ بچو کے بتے لہذا مفہوم میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ شرابی دہانے کے ساتھ ساتھ کسی کی کھٹائی بھی کرتا جا رہا تھا۔ میں تجسس کی ذور سے کھوکھو میں کھینچتا چلا گیا۔ غم کی دوسری جانب میری نگاہ جپ چرے پر پڑی وہ میرے لیے جانا پہچانا تھا۔ یہ غلام خاں تھا ہر سوں رات میری اس سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنی بیوی کی لاش لے کر پاؤندہ بستی سے رخصت ہوا تھا۔ اب میں اسے یہاں نشتے میں دھت دیکھ رہا تھا۔ نشتے کی وجہ سے اس کی آواز کچھ بدلی بدلی تھی لہذا میں فوراً شناخت نہیں کر لیا تھا۔ غلام خاں کے سامنے گدھے کا ایک نوموڑو بچہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ تین ہفتے عمر رہی ہوگی۔ پھلائی کی ایک مولی مضبوط شاخ غلام خاں کے ہاتھ میں تھی اور اس نے اس شاخ سے مار مار کر گدھے کے پیچ کو لوہان کر رکھا تھا۔ میری طرف دیکھ کر غلام خاں چونکا۔ چند لمحے آگے پیچھے جھولتا رہا پھر اس کی آنکھوں میں ششاسانی کی چمک ابھری۔ شرابیوں کی طرح انگلی لہرا کر بولا "تم وہی ہو ناں جس نے ہر سوں رات۔ ہر سوں رات۔ آں کیا کیا تھا تم نے ہر سوں رات؟ یاں یاد آیا۔ تم نے اس حرای کو میرے ہاتھوں مرنے سے بچایا تھا۔" میں سمجھ گیا کہ غلام خاں کا اشارہ رستم کی طرف ہے۔ "ہاں وہی ہوں میں۔" میں نے تصدیق کی "لیکن تم یہاں۔" یہ کیا کر رہے ہو؟" "اس کا دماغ ٹھیک کر رہا ہوں۔" وہ گدھے کی طرف اشارہ کر کے پھکارا "اس کی ماں گدھی کا دماغ بھی میں نے

بالکل ٹھیک کر دیا تھا۔ میرے اشارے پر چلتی تھی۔ ذرا چوں چراہی نہیں کرتی تھی میرے سامنے پہ تو کوئی شے ہی نہیں۔ ابھی کل کا پچھلے سے اسے ناک سے پانی نہ پلاؤں تو غلام خاں نام نہیں میرا۔" مجھے سے صبح کمرہ ایک بار پھر کم سن گدھے پر ٹوٹ پڑا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ غلام خاں کی پہلی ٹانگ ٹوٹ چکی ہے۔ وہ شاخ کی ضرب لگا کر پھلتا تو بائیں جانب بری طرح ڈلگا جاتا تھا۔ غلام خاں پر جیسے جنون طاری تھا۔ گدھے کی پشت پر مضربیں لگاتے ہوئے وہ چیختے لگے "جنا۔ بتا کہاں ہے اسے وہ دکھاؤ جس سے مجھے قتل کرنے آیا تھا۔ بتا کہاں چھپا رہا ہے اسے؟"

نصف کچھ زیادہ سی چڑھ گیا تھا۔ وہ بالکل سن ہو رہا تھا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ گدھے کو سعد خاں کہہ کر مخاطب کر رہا ہے اور اسے چارے کی پٹائی بھی بطور سعد خاں ہی ہو رہی ہے۔ سعد خاں غلام خاں کے بیٹے کا نام تھا۔ برسوں رات میں نے اسے زخمی ماں کے سرہانے کمرے دیکھا تھا۔ بعد میں اس نے ہمیں اپنی ماں پر گزرنے والی مصیبت کی چٹا سٹائی تھی۔ غلام خاں نے اپنے کوٹ کی جب میں ہاتھ ڈال کر دسی شراب کا آڈھار آدھا کیا اور چند بڑے ٹھونٹ لینے کے بعد پھینکا "تھو۔ دیکھو ذرا اس ماں کے لال کی طرف۔ خدا کی خوار کسی طرح گھورتا ہے مجھ کو۔ ماں کا دل لے گا مجھ سے۔ مجھ کو قتل کرے گا۔ اپنی طاقت ہے تجھ میں؟ ہے اتنی طاقت؟" وہ ایک بار پھر کم سن گدھے پر چل پڑا اور اس کی چھڑی اوجڑنے لگا۔ عباس خاں اور میں نے اسے بمشکل قابو کیا اور ایک طرف لے جا کر اگ کے سامنے بٹھایا۔ یہ اگ خود غلام خاں نے ہی جلا رکھی تھی۔ قریب ہی شراب کی خالی بوتل اور پچوڑی ہوئی بڑیاں پڑی تھیں۔ غلام خاں جو دوا سی تباہی بک رہا تھا اس سے اندازہ ہوا کہ سیکڑ کی موت کے بعد وہ زبردست نفسیاتی دواؤں میں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سیکڑ کا نوجوان بیٹا ماں کی دردناک موت کا بدلہ لے گا اور گمات لگا کر اسے جان سے مار ڈالے گا۔ اپنے ذہن میں رقص خوف کے بحوتوں سے نجات پانے کے لیے وہ ان دیران ہٹاڑیوں میں چلا آیا تھا اور شراب لی کر غل غلاؤ کر رہا تھا۔ کسی لکڑیاڑے کا بھونکا ہوا یہ گدھا بھی شامت اعمال کے نتیجے میں اس کمرہ تک آیا تھا اور اب غلام خاں کے دست ستم کا شکار تھا۔ بیٹے کے حوالے سے غلام خاں کے ذہن میں جتنی بھی نفرت تھی اس نے بے گناہ جانور پر نکالی تھی۔

ہم غلام خاں کو اس کے حال پر چھوڑ کر جا سکتے تھے لیکن نجانے کیوں میرے ذہن میں بار بار یہ خیال آنے لگا کہ غلام

خاں ہمیں اپنے "داماد" شہباز پهلوان کے بارے میں کچھ بتا سکتا ہے۔ ظاہر ہے اسے کچھ نہ کچھ تو معلوم ہوگا کہ شہباز اس کی بیٹی کو لے کر کہاں گیا ہے۔ وہ نشے میں تھا اور ایسی حالت میں انسان اکثر دل کی بات بھی نکال باہر کرتا ہے۔ میں غلام خاں کے قریب ہی بیٹھ گیا اور گپ شپ کرنے لگا۔ اس کی سوتلی ابھی تک گدھے اور اس کی ماں پر اچھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں کو بے لطف سا رہا تھا اور بار بار چھاتی پھیلا کر زخمی گدھے کی طرف لینے کی کوشش کرتا تھا۔ ایسے میں عباس خاں اور میں اسے بمشکل سنبھال کر دوبارہ اگ کے پاس بٹھاتے تھے۔ میں نے اسے شہباز پهلوان کی طرف لانے کی ہمت کوشش کی لیکن اس نے کوئی جتن کالیاب نہیں ہونے دیا۔ وہ ہر بار شہباز پهلوان کی بات میں سے بھی سعد خاں کا ذکر نکال لیتا تھا اور گدھے پر بیٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔ مثلاً جب میں نے پوچھا کہ اس کی بیٹی کی شادی کس روز ہوئی تھی۔ تو اس نے جواب دیا۔ "مجھے کوہوئی تھی۔ مجھے کی رات کوئی میں نے خواب میں دیکھ لیا تھا کہ یہ خنزیر کا پچھری جانا کا دشمن ہے اس کے دل میں اگ بھڑک رہی ہے میرے لیے۔ میں کوئی اپنی شادی تو نہیں کر رہا تھا۔ اس کی بہن کا بوجھ ہی سرے امار رہا تھا۔ یہ کیوں لال لال آنکھوں سے گھورتا تھا مجھے۔ میں کوئی اس کا دیا کھاتا ہوں۔ یہ۔ یہ خرازی میرا دیا کھاتا ہے۔"

کالی دیر الٹی سیدھی مینے کے بعد وہ ایک دم داخل ہو کر سو گیا۔ اس کی آنکھ تقریباً ذیرہ کھٹکتے بعد کھلی۔ اس دوران میں اور عباس خاں ناکورہ گناہوں کی سزا بھگتے والے گدھے کو اس عقوبت خانے سے محفوظ دوری پر پہنچا آئے تھے اور تھوڑا سا سنبھلیا تھا۔ جاننے کے بعد غلام خاں نے ہوش و خرد کی بائیں شروع کیں۔ اس کا تین چوتھا ٹکڑا اتر چکا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار میرے چوڑے چنگے پر پھسل رہی تھیں۔ غالباً میرے قد کاٹھ نے اسے متاثر کیا تھا۔ وہ مجھے ایک شکاری کی حیثیت سے جانتا تھا اور اسی حیثیت سے مجھے مخاطب بھی کر رہا تھا، کہنے لگا۔

"یار! تم ایسے بھلے سمجھ دار نہ رہو۔ کیا رہیں زادوں کی ٹولی کے ساتھ خرگوش اور مرغیاں مارے پھرتے ہو۔ کوئی بڑا کام کہ جس سے نام ہو اور چیرہ بھی ملے اور ہٹاڑوں پر ملے جاؤ کوئی رنجہ مارو، بھینچا مارو، عقاب بکلا کتوں کے پیچھے کتوں کی طرح بھاگ بھاگ کر کیا ملتا ہے تمہیں؟" اس کی اردو بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ میں نے کہا "گلتا ہے" شکار سے تمہیں بھی دلچسپی ہے؟

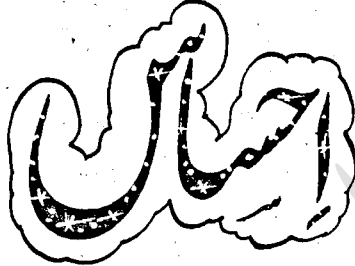
"دلچسپی؟" وہ بولا "ہمارا تو آؤڑھٹا چھوٹا ہی شکار ہے لیکن تمہاری طرح رئیسوں کا خدمت گار بن کے پانی سے مرغیاں نہیں نکالتی ہیں ہم نے اور نہ ان کے شکاری تھیلے اٹھاتے ہیں۔ خود شکار کیا ہے، کھانا بھی ہے اور عیش بھی کیا ہے" غلام خاں کی نگاہ دور رس تھی۔ گلتا تھا وہ بندے کے اندر تک دیکھ سکتا تھا۔ کہنے لگا "میرا خیال ہے تم دیہاتی بندے ہو۔ کسی چکر میں آکر ان رئیس شکاریوں میں پھنس گئے ہو۔"

میں نے اس کی توقعات پر پورا اترتے ہوئے کہا "پیٹ ہی سب سے بڑا چکر ہے خاں جی، بندہ دہلی روزی کی تلاش میں کیا کچھ نہیں کرتا۔"

وہ دھیان سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اب اس کی آنکھوں میں نشے کی دھند نہیں تھی۔ اس کی جگہ ایک تیز جھمکی چمک نے لے لی تھی۔ وہ بولا "سگریٹ ہوگا تمہارے پاس؟" میں نے جیکٹ کی جیب سے ڈیبا نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے سگریٹ سگایا کچھ طویل کش لے لے اور بولا "کہاں کے رہنے والے ہو؟"

میں اس سوال کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں نے اپنا فرضی تعارف کر لیا جس کے مطابق میرا نام احسان افغانی تھا۔ میں لاہور میں ایک درکشاپ چلاتا تھا۔ عباس خاں میرا پرانا دوست تھا۔ میں اس کے پاس سہہ آیا ہوا تھا۔ عباس خاں کے افسروں نے شکار کا پروگرام بنایا تو میں بھی عباس خاں کے ہمراہ اس شکار پانی میں شامل ہو گیا۔ غلام خاں دھیان سے یہ روداد سنتا رہا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میری روداد سننے کے بعد وہ مجھ سے کچھ کتنا چاہ رہا ہے لیکن کہہ نہیں پا رہا۔ شاید عباس خاں کی وجہ سے چپ تھا۔ اس نے عباس خاں کے ساتھ ابھی تک مکمل کربات نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے خاص اہمیت دے رہا تھا۔ غلام خاں کی چنگا پھٹ محسوس کرتے ہوئے میں نے عباس خاں کو باہر بھیجے کا فیصلہ کیا۔ کمرہ میں چلتی ہوئی اگ اب سرد پڑ چکی تھی۔ ایندھن کے لیے عباس خاں کو باہر بھیجنا حسب حال تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ باہر سے کچھ خشک لکڑیاں وٹھو لائے۔ عباس خاں باہر چلا گیا تو غلام خاں ایک دم ڈھب پر اٹھیا۔ کہنے لگا "یار! تم میرے دل کو لگے ہو۔ جی چاہتا ہے تم سے تعلق بنا رہے۔ اگر تم تھوڑا سا بھروسہ کر سکو تو میں تمہیں ایک زبردست منافع کا کام بتا سکتا ہوں۔ سمجھو چاندی کے بدلے سونا ملنے والی بات ہے" میں جہد تن متوجہ ہو گیا "وہ بولا "بات تو سربازوں والی ہے لیکن میں تو سربازی نہیں کر رہا۔ جو کہہ رہا ہوں، سچ

جناب ایم اے راحت
کا ناقابل فراموش ناول



حساس دل رکھنے والوں کے لیے حساس کہانی
مصنف نے اس ناول میں معاشرے کی
دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔

قیمت: ۸۰ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز

۲۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون: ۲۲۲۸۵۳

اسٹاکٹ: علی بکسٹال

نسبت روڈ، چوک میوہ ہسپتال لاہور

فون: ۲۲۲۸۵۳

اپنے ہا کو کیا قریبی
بکسٹال سے طلب فرمائیے

دل کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ مجھے جیسوں کی ضرورت ہے۔ اگر تم نہیں سے پانچ چھ ہزار کا انتظام کر سکو تو دو دو کے اندر میں تمہیں تین گنا منافع دے سکتا ہوں۔ یعنی تم چھ ہزار دو کے تو میں اٹھارہ ہزار تمہیں دوں گا۔

دنیا کا بہت سو گرم دیکھا تھا، اب بندے کا کلبہ پہچانا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ غلام خاں کا اچھا برا ہونا غلط بات تھی لیکن وہ خبیث جو کہ رہا تھا۔ دل سے کہہ رہا تھا۔ وہ دن کے اندر چھ بے بالے اٹھارہ ہون کی سونے کی کان اس کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ پسلا خیال ذہن میں کی آیا کہ یہ کوئی غیر قانونی کام ہوگا اور غلام خاں کسی حوالے سے مجھے بھی اس میں ملوث کرے گا۔ وہ جیسے میرے چہرے سے دل کا حال جانپانگ گیا۔ کہنے لگا "یہ کوئی غیر قانونی کام نہیں ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اس قانونی کام میں بھی تمہیں ہاتھ پاؤں نہیں ملتا پڑے گا۔ بس رقم دے کر آرام سے بیٹھ جاؤ اور دو دو بعد اٹھارہ ہزار وصول کرلو۔"

"کیا کوئی خاص سودا مارنے والے ہو؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔
تیر نشانے پر لگا تھا "وہ کچھ گڑبڑا سا گیا" نہیں۔ ہاں، چلو ایسا ہی سمجھ لو لیکن اس سودے کی تفصیل میں فی الحال نہیں بتا سکتا اور میرا خیال ہے تمہیں پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ تمہیں صرف اپنے منافع سے غرض ہونی چاہیے۔"

چھ ہزار کے اٹھارہ ہزار بتانے میں مجھے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ چہرہ بھی میری ضرورت نہیں رہا بلکہ اکثر اوقات اس کی موجودگی میرے لیے پریشانی کا باعث ہوتی ہے۔ جب ہماری ہو تو ساتھ ہی میری طبیعت بھی ہماری ہونے لگتی ہے لیکن غلام خاں کی باتوں نے میرا تجسس ابھار دیا تھا۔ آخر وہ کیسا سودا تھا جس میں وہ اتنے یقین کے ساتھ دو دو میں تین گنا منافع کی پیش کش کر رہا تھا۔

میں نے غلام خاں کی ہجرتی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے کہا "اگر میں چھ ہزار روپیہ تمہیں ابھی فراہم کر دوں تو؟"

اس کی آنکھوں میں حریف چمک نمودار ہوئی۔ اس نے جلدی سے اپنی رست دا پچ پر نگہ دوڑائی اور خوش سے بولا "اگر تم ابھی چھ ہزار دے دو اور سوچ دو بنے سے پہلے پہلے ہم باگز خیل پہنچ جائیں تو کل دوپہر تک میں اٹھارہ ہزار نقد تمہاری جیب میں ڈال سکتا ہوں۔ کو کبھی ایسا بندہ ملا ہے جس میں؟" وہ بڑے فخریہ انداز میں گردن اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگا۔

عباس خاں والیں اٹھیا تھا اس لیے ہمیں منتھو کا سلسلہ متعلق کرنا پڑا۔ عباس خاں کے آنے سے بچتی ہوئی ایک کو پھر اندر میں لے گیا اور اس کے ساتھ ہی کھوہ میں خوش گوار حرارت جاگ گئی۔ ہم آٹو والے پرانے اور سوڑے کا آچار پڑاؤ سے ہی لے کر آ رہے تھے۔ سر پہ ہونے والی تھی اس لیے کھانے سے فراغت پالی گئی۔ غلام خاں، عباس کی موجودگی سے کچھ ہچکچا رہا تھا۔ میں نے ایک طرف لے جا کر اسے سمجھایا کہ میرا یہ دوست سید حاسادہ دوا باندہ ہے اس کی وجہ سے فکر مند ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ تم یہ سمجھو کہ میں تمہارے ساتھ اکیلا ہی ہوں۔

غلام خاں کی پوری طرح تسلی تو نہیں ہوئی۔ بہر حال وہ عباس کو اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گیا۔ ہم تقریباً تین بجے اس کھوہ سے برآمد ہوئے اور پچھراستے پر سفر کرتے شاہی کھٹ بڑھنے لگے۔ ہماری منزل باگز خیل تھی۔

☆ ☆ ☆
دھوکہ ٹالاب سے تقریباً سو میل شمال مغرب کی طرف پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے۔ چھوٹی سی بستی باگز خیل کہلاتی تھی۔ کوئی دو ڈھائی سو گھر ہوں گے۔ ان میں نیم پختہ مکان بھی تھے۔ کڑی کے گھونڈے بھی اور عارضی جھونپڑے بھی۔ بستی کے بیچوں بیچ ایک مل کھاتا بازار تھا۔ جب ہم بستی میں پہنچے سوچ دو دو سرحد پار کے پہاڑوں میں اور جبل ہو رہا تھا۔ شام کی منی بدتر ہو رہی تھی۔ اترنے ہی والا تھا۔ بازار کی گھما گھمی ختم ہو چکی تھی۔ بس لاکڑ کاڈ کاٹوں کے سامنے کسل پوش شکاری کو کنبوں کے بیچرے لیے مثل رہے تھے۔ ایک جگہ چھوٹا سا مجمع لگا تھا اور تیر کی لڑائی ہو رہی تھی۔ قریب ایک بیچرے میں ایک منوس شکل جانور چیخ و تاب کھا رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر غلام خاں نے بتایا کہ یہ چیخ ہے۔ چیخ کی بدبو اور غلاط کے بارے میں میں نے سن رکھا تھا۔ جیسا سنا تھا دیا ہی پایا۔ دوپہر کا کھانا معدے میں بے قرار ہو کر رہ گیا۔ سب کچھ اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ خوب صورت بھی اور بد صورت بھی۔ یہ تمام کا تمام ایک نظام کا حصہ ہے۔ بد صورتی نہ ہو تو خوب صورتی کے کیا معنی؟

غلام خاں کا مکان کافی کشادہ تھا۔ یہ ایک طاقتور اور بااختیار مرد کا رحم تھا۔ یہاں وہ اپنی تین بیویوں اور ان کے بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ سب اس کے سامنے بھیڑ بکریوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک بھیڑ کو وہ چند روز پہلے ذبح بھی کر چکا تھا۔ ایک مظلوم عورت کو بھیڑ کہتے ہوئے دل دکھتا ہے لیکن اسے انسان بھی کس پر تے پر کما جاسکتا تھا!

وہ جو سرتا حکومت کے سامنے میں داخل چکی تھی کہاں رہ گئی تھی انسان۔ کہتے ہیں تالی ایک ہاتھ سے نہیں جیتی، کبھی سوجا ہوں عورت رہوئے والے علم کی تالی بھی دروٹوں ہاتھوں سے جیتی ہے۔ آخر کیں ظلم سستی ہے عورت؟ اگر مذہب اور معاشرے کے نام پر ظلم کرنا منہا عظیم ہے تو مذہب اور معاشرے کے نام پر ظلم سنا بھی کیا عظیم ہے۔ غلام خاں کے گھر میں مجھے سیکڑے کی دلی دلی سسکیاں سنائی دیں۔ اس کی آواز زاری "اس کے نوٹے ان دروہوں میں رہے ہیں تھے۔ مجھے لگا کہ میں کسی آسیب زدہ گھر میں اٹھ گیا ہوں۔"

گھر کے موانے میں غلام خاں نے ہمیں ایک کشادہ کمرہ دکھا تھا۔ اس میں فرش بستر کے علاوہ انجیٹھی کی سولت بھی موجود تھی۔ غلام خاں کے مطالبے پر میں نے چھ ہزار روپیہ اسے ادا کر دیا۔ رقم ہاتھ میں آتے ہی وہ گھر سے نکل گیا۔ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اسی کام سے کیا ہے جس میں ایک ہزار لاکڑ کی ہزار کا منافع ہاتھ آتا ہے۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ سیکڑے کا کل بھی غلام خاں کے اسی لالچ کا شکار ہے۔ وہ اس سودے میں غیر معمولی منافع حاصل کرنے کے لیے رقم جمع کر رہا تھا اور سیکڑے چارے بے خبری میں اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئی تھی۔ کاش غلام خاں سے میری ملاقات کچھ عرصے پہلے ہو جاتی۔ ممکن تھا سیکڑے کے بچنے کا کوئی وسیلہ بن جاتا۔

غلام خاں مغرب کے فوراً بعد گیا تھا۔ اس کی داہنی عشا کے بعد بھی نہیں ہوئی۔ اسی دوران سعد خاں بھی کہیں سے گھومتا ہوا ہمارے کمرے میں آ نکلا۔ ہمیں اپنے گھر میں دیکھ کر وہ اذہد حیران ہوا۔ اصولی طور پر اسے پوچھنا چاہیے تھا کہ ہم یہاں کیسے آئے ہیں لیکن اس نے نہیں پوچھا۔ لگتا تھا باپ کے مرنے کے بعد بے لگے اسے لیکر کا فقیر بنا کر کھایا۔ وہ دلی بات بتاتا ہے جو اس سے پوچھی جاتی ہے اور وہی بات پوچھتا ہے جس کے پوچھنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ عجیب صورت حال تھی۔ وہ باپ کے خوف سے ڈرا سا نظر آتا تھا جبکہ باپ اپنے تئیں اس سے بدبشت زدہ تھا۔ یقیناً دونوں میں سے ایک کا خوف بے معنی تھا۔ اور غالب امکان یہی تھا کہ غلام خاں کا خوف بے معنی تھا۔ اس کے اپنے ہی ضمیر کی ملائیں محضت بن کر اس سے چٹی ہوئی تھیں۔ جب رشتوں میں بے اعتمادی کا زہر مکمل جائے تو ایسی ذہنی باریاں تو جنم لیتی ہی ہیں۔ غلام خاں کی داہنی تقریباً نو بجے ہوئی۔ اس وقت میں اور عباس خاں کمرے میں تھا۔ میں نے باہر

احاطے میں کھلنے والی کڑی سے دیکھا۔ غلام خاں گھوڑے پر سوار بیٹھ کر دوڑنے کے سامنے رکا۔ نیچے اتر کر اس نے اپنی رائفل کھنڈے پر درست کی اور گھوڑے کو کھنڈے سے باندھ دیا۔ اس وقت میری نگاہ گھوڑے کی پشت پر پڑی۔ یہاں زمین کے ساتھ کوئی چوکور چتر منسلک تھی جیسے اسٹے کی پٹی ہو۔ پٹی نما چیز ایک ادنیٰ کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ غلام خاں نے بڑی احتیاط سے اسے زمین سے جدا کیا اور اٹھا کر برآمدے کی تارکی میں گم ہو گیا۔ وہ جس انداز سے چل کر برآمدے کی طرف گیا اس سے پتا چلا کہ وہ اسٹے کی پٹی نہیں کیونکہ وہ بے حد ہلکی تھی۔ غلام خاں نے اسے یوں تھام رکھا تھا جیسے ہفت اقدیم کی دولت اس کے ہاتھوں میں ہو۔

رات کے کھانے پر غلام خاں ہمارے ساتھ تھا اور نازل انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ میں شکر رہا کہ شاید وہ خود ہی اپنی آمدورفت سے پردہ اٹھائے لیکن وہ اس سلسلے میں یکسر خاموش رہا۔ وہ ایک ستر خد شخص تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھنے والا اور مرنے مارنے پر آمادہ ہو جانے والا لیکن اس وقت وہ قابل برداشت مؤذ میں تھا۔ اسے چہرہ چڑکھاتے اور دیکھ کر ہنسا کر بولتے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص صرف تین روز پہلے اپنی بیوی کو قبر میں اتار چکا ہے اور اسے موت کے گھاٹ اتارنے والا بھی ہے خود تھا۔ کھانے کے دوران غلام خاں کے دو سرے بچوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ لمبے کپیرے کپڑوں والے وہ خوف زدہ بچے کٹھ پتلیوں کی طرح غلام خاں کے گرد حرکت کرتے تھے اور ان کی ڈوریں غلام خاں کے ہاتھ میں تھیں۔ ہمارے سامنے اس نے چھوٹی بچی کو اس زور سے ڈانٹا کہ اس کا پیشاب خطا ہو گیا اور سعد خاں کو اسے اٹھا کر باہر لے جانا پڑا۔

اگلے روز علی الصباح غلام خاں نے ہمیں اٹھادیا۔ کڑا کے کی سڑی تھی۔ کڑی سے باہر سارے مناظر ایک ہی منظر میں چمپ گئے تھے اور یہ دھند کا منظر تھا۔ کڑی کی تپائی پر "چائے رس" کا ناشتا تیار کر رکھا تھا۔ پانچ منٹ میں ہم نے ناشتا کیا اور پانچ منٹ میں ہی غلام خاں نے اپنی بارود بوری رائفل کو صاف کر کے بالکل چمکایا۔ یہ دیر رائفل تھی جس کے دسے پر شکر کھتے تھے اور غلام خاں کا نام ہی درج تھا "ہم باگز خیل سے باہر جا رہے ہیں" غلام خاں نے اعلان کیا۔ ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ کپڑے جھاڑ کر ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ پیدل سفر تھا۔ غلام خاں اور عباس نے کھلی کی بالکل مار بھی تھی، میں نے خود کو چری جیکٹ میں سمیٹا ہوا

تھا۔ ہم تینوں مسلح تھے غلام خاں کے ایک ہاتھ میں دو چراہراں ڈبّا تھا جو اس نے رات کوڑے سے اتارا تھا۔ یہ ڈبّا دراصل ایک پنجو تھا جس کے چاروں طرف ایک ادنی چادر لپیٹ دی گئی تھی۔ میرے پوتے پر غلام خاں نے بتایا کہ اس میں باز ہے اس کی بات پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ بازے جتنی نشے اس بچے میں بھلا اور کیا ہو سکتی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کل رات غلام خاں کی پرندہ خرید کر لایا تھا۔ میرے کہنے پر غلام خاں نے چادر کا کونا ہٹا کر مجھے اس کی جھک بھی دکھا دی۔ واقعی وہ ایک شاندار پرندہ تھا۔ اسے دیکھ کر آدمی متاثر ہوا تھا۔ یقیناً ایسے پرندے کو پرندوں کا بادشاہ کہلانے کا حق حاصل تھا۔ غلام خاں نے بتایا کہ اسے ششی شہباز (ایلیٹن ہاک) کہا جاتا ہے میرے اندازے کے مطابق پرندے کی لمبائی کم و بیش ۲۵ انچ تھی۔ سترگردن اور پشت شہری مائل سیٹھی رنگ کی تھی۔ سینہ اور بطن بالکل سفید تھا اور ان پر آہ پار خوب صورت سیاہ زحاریاں نظر آ رہی تھیں۔ میں محبت سے قدرت کے اس انمول شاہکار کو دیکھتا چلا گیا۔ اس شخص پر افسوس ہونے لگا جو اس کی صحیح قدر و قیمت سے انکار نہیں تھا اور جس نے چند ہزار کے عوض یہ پرندہ ہاتھ سے کھو دیا تھا۔

ہم نے اونچے نیچے راستوں پر سفر جاری رکھا اور ڈھائی گھنٹے میں باگڑ خیل سے پانچ میل دور آگئے۔ دوران سفر غلام خاں نے بازو اٹھ کر بچہ ایک لمحے کے لیے بھی خود سے جدا نہیں کیا۔ آٹوموبائل پر اٹھ کر بالکل تار حالت میں اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ پوری طرح چونکنا تھا۔ آخر ایک دو گھنٹہ گزرتے سے گزر کر ہم ایک تنگ شریک میں داخل ہوئے۔ یہاں تاریکی تھی۔ مجھے اپنی تاریخ جانا پڑی۔ کئی جگہ راست اتنا تنگ ہوا تھا کہ پھنس پھنس کر گزرنے پڑا۔ شریک سے نکل کر ہم ایک دم کھلے آسمان تلے آگئے۔ یہ ہمارا جگہ اور گرد کی پہاڑیوں سے بالکل نفی ہوئی تھی۔ جنگل میں منگل کا محاذ وہ اس جگہ پر صادق آتا تھا۔ ان پہاڑیوں میں شاندار اور ہی آدم زاد کی صورت نظر آتی تھی لیکن اس مقام پر کم از کم دس افراد موجود تھے۔ آپ اسے ذمے شکت کی سنسان پہاڑیوں کا رستوران کہہ سکتے ہیں۔ ترک اڈوں پر بھی ہوئی جمادی ساز کی چارپائیوں جیسی چند چارپائیاں یہاں بھی موجود تھیں۔ اب معلوم نہیں انہیں یہاں تک کیسے پہنچایا گیا تھا۔ قریب ہی ایک کھود دھوئیں سے سیاہ نظر آ رہی تھی۔ یہاں چولہا بنا ہوا تھا اور ان ڈھلے برتن اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ موملے پر موجود افراد بھی "آن ٹوٹلے" برتنوں جیسے ہی

تھے۔ کوئی یہاں بڑا تھا کوئی وہاں۔ ان کے قریب چائے کی پیالیاں، سنان کی پٹیلیں اور شراب کی خالی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں۔ ان میں سے چار تو بے خبر سو رہے تھے تین جاگ رہے تھے اور تین سو رہے تھے نہ جاگ رہے تھے۔ ان اونگھنے والوں میں ایک لڑکی بھی تھی اور زبان حال سے پکار رہی تھی کہ وجہ وزن سے یہ تصویر کائنات میں رنگ بے حد رنگارنگ لباس پہن رکھا تھا اس نے اور اس سے بھی رنگا رنگ میک اپ تھا۔ شاید وہ میک اپ نہ کرتی تو خوش شکل نظر آتی مگر لپٹا پوتی نے اسے بالکل نمونہ بنا رکھا تھا۔ میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ اس بے ہودہ میک اپ کو مزید بے ہودہ بنانے میں کچھ قصور ان مردوں کا بھی ہے جو اس کے ارد گرد ہد ہوش پڑے تھے۔

میں دیکھ کر منگول خدو خال والا ایک گراڈیل شخص ہمارے قریب آیا۔ ایک دھلی ہوئی پلیٹ کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے اس نے غلام خاں کو کڑے تیروں سے گھورا اور کوئی بات پوچھی۔ غلام خاں نے جواب دیا۔ اسی نے ایک اور بات پوچھی۔ غلام خاں نے اس کا بھی جواب دیا تو زدی دیر پر تفتیشی گفتگو جاری رہی۔ پھر گراڈیل شخص نے بچے سے کچھ بات کر کے بڑے پر نظر ڈالی "اس کے بعد بڑی تیز نظروں سے مجھے سر پٹا گھورا۔ میری طرف اشارے کر کے غلام خاں سے چند سوالات کئے اور آخر میں اپنا گھوڑے جیسا سر ہلاتے ہوئے ایک طرف چلا گیا۔ شاید مجھے اندازہ ہوا کہ اس غریب گفت و شنید کے نتیجے میں ہمیں "رستوران" میں استراحت کرنے اور کھانے پینے کی اجازت مل گئی ہے۔ ایک چارپائی پر گائے بجانے کے آلات رکھے تھے انہیں ایک طرف سینٹ کر ہم نے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک ادیمز مرخص نے ہمارے سامنے کڑک چائے کی پیالیاں لا رکھیں۔ اس جگہ کا منظر عجیب کسی رستوران سے مشابہ تھا۔ رات دیر تک کھلے رہنے والے رستورانوں اور گلیوں میں صبح نوے بجے تک ایسی ہی بے ترتیب غونگی چلتی رہتی ہے۔ دن کے دوسرے بجے اگر کوئی گاہک آجائے تو اسے یوں گھورا جاتا ہے جیسے وہ بحری کے وقت چگانے آیا ہے۔

ہم چائے پینے رہے اور دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے رہے۔ غلام خاں کی زبانی پتا چلا کہ یہ اڈا اسی ادیمز مرخص کا ہے جس نے ابھی چائے ہمارے سامنے رکھی ہے۔ اس کا نام اکبر ہے۔ ہد ہوش پڑی لڑکی اس کی کوئی رشتہ دار ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اسے بتوں کی طرف سے اغوا کر کے لایا

ہے۔ بڑبڑلاہٹ سے اس نے لڑکی کو آؤسے میں رکھا ہوا ہے اور اس سے پیشہ کرتا ہے۔ ایک بار کچھ لوگ لڑکی کو اغوا کرنے کے چکر میں پڑ گئے تھے انہی دنوں اکبر نے اس مسئلے کو نوکر رکھا تھا۔ یہ بھی کوئی اشتہاری لڑکی ہے۔ ہم تو معلوم نہیں کیا ہے لیکن یہاں آئے جانے والے اسے منگول ہی کہتے ہیں۔ بڑا غصیلانہ شخص ہے۔ اسی آؤسے پر ہونے والے ایک چمکنے میں دو افراد کو کل بھی چکا ہے۔

میں نے غلام خاں سے پوچھا "یہاں کسی سے ملتا ہے ہیں؟" "ہاں" غلام خاں مختصر جواب دے کر چپ ہو گیا۔ لیکن پھر اسے خودی خیال آیا اور وہ وضاحت کرتے ہوئے پولا "یہ پکبھو (پرندہ) ہمیں پہنچا ہے اس کا خریدار میں آئے گا۔ میں نے کل شام ایک بندے کے ہاتھ اسے پیام بھیج دیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ اپنے ٹھکانے سے چل پڑا ہوگا۔"

میں جانتا چاہتا تھا کہ خریدار کون ہے اور غلام خاں اس سے کیا قیمت وصول کرنے والا ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ باز کسی سے اور کتنے میں خرید کر لایا ہے۔ یہ سارے سوال اہم تھے لیکن میں بھانپ چکا تھا کہ غلام خاں ان میں سے کسی کا جواب نہیں دے گا۔ پھر کچھ کر خواہ مخواہ چلے ہوئے والی بات تھی۔ جوں جوں وقت گزر گیا "آؤسے پر چھائی ہوئی ہے ترتیب غونگی سنائی گئی۔ اس پہاڑی رستوران کے معزز گاہک انگاریاں اور جمائیاں لیتے ہوئے بے وار ہو گئے۔ ان میں سے بیشتر صورت سے ہی چھپے ہوئے بد معاش نظر آتے تھے۔ اچھے ساتھ ہی انہوں نے ایک دوسرے کو شاندار گلیوں سے نوازنا شروع کیا۔ کچھ گلیاں اور غراے وغیرہ کرنے لگے۔ سرخ انگارا آٹھوں والے ایک نیم خیم چیم پوٹھواری نے اچھے ساتھ ہی بول کو منہ لگایا۔ ان میں سے شاید ہی کسی نے خاص طور پر ہمارا نوٹس لیا ہو۔ سب اپنے اپنے حال میں گمن تھے۔ غلام خاں نے یہاں پہنچنے ہی بازو اٹھ کر بچہ ایک بڑی چارپائی کے نیچے کھسکا دیا تھا۔ اب وہ مشکل سے ہی کسی کی نگاہ میں آسکتا تھا۔

رنگ برنگی لڑکی بیدار ہو کر نہ جانے کس کو نے کھد رے میں جا چھپی تھی۔ بس کبھی کبھی دھواں دھار کھوہ کے پھوٹاؤسے سے اس کی کھٹکتی ہوئی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ دھیر کا کھانا وال کوشت اور ایک اچھی موٹی خیری روٹی بد مشعل تھا۔ کھانے کے بعد تین چار افراد اہل لوٹ گئے۔ آہم جانے والوں کی جگہ پانچ چھ اور آگئے۔ یہاں سے جانے اور یہاں آئے والا ہر شخص مسخ تھا۔ میری نگاہ بار بار گلابی کی

گلابی کی طرف اٹھ رہی تھی۔ ہمیں اس "رستوران" میں پہلو بدلنے پانچ چھ گھنٹے ہو چکے تھے لیکن تھاجس کا انتظار وہ خریدار نہیں پہنچا تھا۔

اکتاہٹ عوج پر پہنچی تو ہم نے بھی دوسوں کی دیکھا دیکھی تاش کی بازی شروع کر دی۔ کھیل کے دوران میں غلام خاں کو ٹوٹنے کی کوشش بھی کرنا پڑا۔ وہ نشے میں تھا۔ میں نے اس کی دھمکی رکوں پر ہاتھ رکھا۔ سحر خاں کی بڑی بڑی آنکھوں اور ان میں چلتی ہوئی سرخی کا ذکر کیا۔ وہ اشارت ہو گیا اور جوان بیٹے کے حوالے سے اس کے ذہن میں ہونے ہوئے خدشات ایک ایک کر کے باہر آنے لگے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اب نہیں تو ایک دو سال تک ضرور ذہنی مریض بن جائے گا۔ "کھانا قاتل" عمل سے کسی کو مفر نہیں۔ جہاں شامت اعمال کا حقیقی اہتمام نہ ہو سکے وہاں قدرت تصوراتی اہتمام کر دیتی ہے۔ مجرم کو اس کا ذہن سزا دیتا ہے۔ اس کی سرچوں کے آواز نے اس کی کمال ادیمز سے ہیں۔ میں غلام خاں سے ہونے والی گفتگو کو تدریج اس کی نوبت بتائی یا سمجھن اور داماد شہباز پھولان کی طرف لے گیا۔ میں جانتا چاہتا تھا کہ شہباز اب کہاں پایا جاتا ہے۔ غلام خاں کی باتوں سے پتا چلا کہ انہوں نے پارا چنار کا رخ کیا ہے۔ ممکن ہے وہ شہری میں کہیں کرائے کی محنت تلے رہ رہے ہوں۔ لاری آؤسے کے قریب دھوار میں ایک ٹکا فروش رحمان زئی سے اس کے بارے میں پتا چل سکتا تھا۔ میں نے یہ معلومات اپنے ذہن کی "ڈائری" پر نوٹ کر لیں۔

جو کئی اندھیرا پہلا اس پہاڑی رستوران میں مٹی کے تیل سے جلنے والی لائٹیں روشن ہوئیں۔ ایک بڑا سا گیس لپ چارپائیوں کے مین درمیان لڑکی کی تپالی پر رکھ دیا گیا۔ روٹی ہوتے ہی رات والی لڑکی چم سے برآمد ہوئی اور پورے ماحول کو جھگا لگی۔ وہ بڑے بھیاں خیر لباس میں تھی۔ میک اپ ابھی "درہم برہم" نہیں ہوا تھا لہذا وہ خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ چارپائیوں کے مین درمیان ایک الاؤ توپیلے سے بزمک رہا تھا۔ اب یہ دوسرا متحرک الاؤ حاضرین کو گرمائے لگا تھا۔ چائے، شراب، قند، روٹی سب کچھ وہی سرگورری تھی۔ غلام خاں نے سرگوشیوں میں اس آؤسے کے قوانین بتائے ہوئے کما ک یہاں بیٹھے میں پانچ روز تاج ہوتا ہے۔ تاج کے بعد کا قاعدہ بولی گئی ہے۔ جو تین افراد سب سے زیادہ بولی دیتے ہیں ان کے لیے شراب اور کباب کے علاوہ شاپ کا انتظام بھی ہو جاتا ہے۔ باقی صرف شراب اور کباب پر گزارا کرتے ہیں اور ہڈا کھا کر کے سو رہے ہیں یا

والیں چلے جاتے ہیں۔

آٹھ بجے کے قریب اچانک غلام خاں کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ تنگ دروازے میں سے گزر کر ایک قوی ایٹھ شخص اس روشن احاطے میں داخل ہوا تھا۔ وہ درمیانے قد کا لیکن چڑا چٹکا اور مضبوط شخص تھا۔ اس کا چوہبوری مونچھوں اور داڑھی میں پچھا ہوا تھا۔ پیشانی پر کوئی نازہ زخم تھا جس پر پٹی باندھی گئی تھی۔ وہ مقامی لباس یعنی شلوار قمیص اور کھل میں لباس تھا۔ پاؤں میں پٹاوری چپل اور ہاتھ میں چھوٹی ٹال کی طاقتور رانگل تھی۔ اسے دیکھ کر غلام خاں بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ اڑے پر موجود دوسرے لوگ بھی چونکے گئے۔ چند لمحوں میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان میں سے بیشتر صرف نواد کو جانتے ہیں بلکہ اس سے مرعوب بھی ہیں۔

نواد نے اندر آتے ہی لڑکی کی کمر اس زور کی چنگلی کر دی کہ وہ تڑپ کر رہ گئی۔ اس کے بعد اس نے لڑکی کے بال سٹھی میں جکڑے اور بڑی شدت کے ساتھ ایک نازبا حرکت کی۔ مشکل ڈشٹرا جو آب تک آسیب کی طرح ہر شخص کے سر پر سوار تھا، صرف مسکرا کر رہ گیا۔ نواد کی نگاہ جو غلام خاں پر پڑی وہ لمبے ڈگ بھرا ہوا ہمارے پاس آگیا۔ میں نے قریب سے دیکھا تو اس کی شخصیت اور بھی بھاری بھر کم نظر آئی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کربے برے کے بجائے "تنگ بولی" کے قائل ہوتے ہیں۔ خاموش رہتے ہیں اور صرف اپنی جسمانی حرکات اور حدود پر اعتماد سے ہی دوسروں کے دل پر رعب جمالتے ہیں۔ غلام خاں نے جھک کر اس سے مصافحہ کیا "اس کے بعد عباس خاں نے اس کا اعتراف بھرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ تیر میری باری آئی۔ اس نے بے پروائی سے اپنا ہاتھ میری طرف پھینکا۔ میں نے بھی کسی خاص گرم چوٹی کا اعتراف نہیں کیا۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی تیز نگاہ میرے سر پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں وہی تاثر نظر آیا جو مجھے سمجھاؤ کہ آقا کا سامنے والے شخص نے مجھے اہمیت دی ہے اور میں کوئی ایسا شخص نہیں ہوں جسے دیکھ کر یوں ہی نگاہ بھیجی جائے۔

نواد نے غلام خاں سے میرے متعلق کچھ پوچھا۔ اس میں سے صرف "جنگلی" کا لفظ میری سمجھ میں آیا جس سے اندازہ ہوا کہ وہ پوچھ رہا ہے "یہ جنگلی کون ہے؟" غلام خاں نے اس سوال کا نقلی بخش جواب دے دیا۔ ویسے بھی یہاں کسی جنگلی سندھی یا بلوچی کا پایا جانا غیر متوقع نہیں تھا۔ یہ آزاد علاقہ پاکستان بھر کے مفردوں کی بخت تھا اور جتنی کہیں

کا بھی ہو بخت کی طرف کھینچ ہی آتا ہے۔ غلام خاں اور نواد میں مختصر گفتگو ہوئی جس کے بعد غلام خاں چارپائی کے نیچے سے بازو بالا بچھو نکال لایا۔ اب اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہی وہ خریدار ہے جس کا ہم صبح سے انتظار کر رہے ہیں۔ نواد کے اشارے پر مشکول الاڑی کی طرف گیا اور گیس لپ اٹھا کر بصرے کے قریب لے آیا۔ غلام خاں نے بڑی احتیاط اور نزاکت کے ساتھ لوٹی چادر مٹائی اور بصرے کا دروازہ کھول کر بازو کو باہر نکال لیا۔ بازو جھٹک دیکھتے ہی سب لوگ ارد گرد جمع ہو گئے۔ وہ واقعی ایک شاندار بازو تھا اور بڑی بات ہے کہ تربیت یافتہ تھا۔ ہاتھ پر چرمی دستار نہ تھا اور نواد نے بازو کو سٹھی پر بٹھالیا۔ بازو کے پاؤں میں چھلا تھا اور اس سے دیکھی زوری خشک تھی۔

نواد پر بندے کا ناقدانہ جائزہ لینے لگا۔ اس دوران غلام خاں نے اپنے لباس میں سے ایک چرمی پوٹی برآمد کی۔ اس میں گچھی کے ٹکڑے تھے۔ یہ ٹکڑے ایک پلیٹ میں ڈالے گئے اور لڑکی کی خادمہ کے انداز میں پلیٹ پکڑ کر نواد کے پہلو میں کھڑی ہو گئی۔ اس کی دودھیا کمر پر نواد کی دست درازی کا نشان نینکوں اجمار کی صورت نمایاں ہو گیا تھا۔ نواد کی پوری توجہ اب بازو کی طرف تھی۔ اس نے پلیٹ میں سے گچھی کے ٹکڑے لے لے کر بازو کو کھلانے شروع کر دیے۔ "مشکول" مائی شخص خوشامدانہ انداز میں نواد کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس نے نواد کو مخاطب کر کے پرندے کی تحریف میں کوئی بات کی۔ اس کے جملے میں صرف ایک لفظ میری سمجھ میں آیا اور اس لفظ نے مجھے یوں چونکا دیا کہ سر تپا سمجھو ذکر رکھ دیا۔ یوں لگا کہ بے خیالی میں میرا ہاتھ کئی ہزار دولت کے نیچے بنی تار سے چھو گیا ہے اور میرے جسم کا ہر ذرہ تھرا اٹھا ہے۔

لفظ کی کوئی اچھی تک میری حیرت زدہ ساعت میں باقی تھی۔ مشکول مائی غنڈے نے نواد کو ملک مینٹی کہہ کر مخاطب کیا تھا "ملک" کا لفظ حکیم کے طور پر کسی بھی شخص کے نام کے ساتھ لگایا جاسکتا تھا۔ میں حیرت سے تنگ تھا اور سوچ رہا تھا کہ کہیں میں مینٹی جان کے دوبارہ ہونے کا "شرف" تو حاصل نہیں کر چکا؟ مقام شکر تھا کہ میرے چرے کے بدلے ہوئے تاثرات کو کسی نے نہیں دیکھا۔ نواد سمیت وہ سب پرندے میں گمن تھے۔ میں نے بے اختیار اپنے ہاتھ کو حرکت دے کر پہلو میں رانگل کی موجودگی کا یقین کیا اور چاروں خانے چوس کر ہو گیا۔ پرندے کا معائنہ کر چکے کے بعد نواد اپنی جگہ سے اٹھا

اور غلام خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے احاطے سے باہر لے گیا۔ وہ دونوں دھواں دھواں کھوہ میں داخل ہوئے اور پچھون سے اوجھل ہو گئے۔ گمان غالب یہی تھا کہ وہ "سودے" کی بات کرنے گئے ہیں۔ میرے ذہن میں آمد حیاں ہی چل رہی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا "اپنے شک کی تہذیب کیسے کروں" یہاں کوئی ہم زبان نہیں تھا اور جو ہم زبان تھا وہ میری کیفیت سے بے خبر تھا۔ عباس خاں کو بالکل جان نہیں چلا تھا کہ میں نے کیا بات نوٹ کی ہے اور اب کس شکل میں چلا ہوں۔ میں نے اسے ایک طرف لے جا کر برگوشی میں کہا "عباس! مجھے ایک شک ہوا ہے؟"

"کیسا شک؟" اس نے پوچھا۔
"یہ بندہ باز خرید رہا ہے" مینٹی جان ہے۔"
میرے قہرے نے عباس خاں کے سر پر ہم کے دھماکے کا کام کیا۔ وہ چپٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا "تاجران جو نہ بتاؤ" میں نے اسے تنبیہ کی "وہ داخل نظر آنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا" میں نے کہا "مسئلہ یہ ہے کہ میں کسی سے بات نہیں کر سکتا۔ تم ذرا نواد کو ذکر کیا یہی عملی جان ہے لیکن بڑی احتیاط ہے۔ کوئی کھپلا ہوا تو یہاں ہم دونوں کی لاشیں ترقی نظر آئیں گی۔"

عباس خاں گئے ہوئے کچھارے تھے۔ مجھے لگا کہ وہ کوئی گویا کر دے گا۔ وہ اتنا پست حوصلہ تو نہیں تھا پتا نہیں اسے کیا ہو گیا تھا۔ غالباً ایک دم مینٹی جان کا سر کردہ ہو کلا سا کیا تھا۔ میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور اسے لگا کہ وہ کسی سے کچھ نہ کہے "میں خود معلوم کروں گا۔" صبح سے خاموش ساز بن اٹھے تھے اور نوخیز لڑکی الاڑی کی خواب ناک روشنی میں رقص کرنے لگی تھی۔ کسی ہتھوڑی کا گنے کی ڈھن تھی جس پر وہ اپنے لگد دار بدن کو توڑ موڑ رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے بولی سے پہلے ہی بولی شروع ہو چکی ہے۔ دیکھیے صاحبان! یہ مسئلہ ناخوش دیکھیے یہ پست یہ کندھے یہ سامنے کا گداز اور یہ پچھلی ہاتھیں۔ دیکھیے اور اندازہ لگائے "ان غصرتے ہوئے لٹ و لٹ پٹاؤں میں اس نرم نرم ریشم کی قیت کیا ہو سکتی ہے۔ تنک دھنا دھن۔ تنک دھنا دھن۔" ویرانہ گویا رہا تھا۔ پتہ نہ چل رہا تھا اور شانہ ناچ رہی تھی۔ میں نے پونہی شانہ لگھ دیا۔ پتا نہیں اس کا کیا نام تھا۔ ویسے ناموں میں رکھا بھی کیا ہے۔ وہ ایک لڑکی تھی۔ وہ ان گنت زمانوں سے اسی طرح مجھ رقص تھی۔ مذہب کے فیصلے دار معاشرے کے چوہدری اور اخلاقیات کے گردا گرد "بزار ہا سال سے اسے بچا رہے تھے اور اس پر لغت لامنت کے ڈوگرے بھی

برسارے تھے۔ یہ دونوں کام ہمیشہ سے ہو رہے ہیں اور شاید ہمیشہ جاری رہتے ہیں۔
ہم بیٹھے رہے اور لڑکی ناچتی رہی۔ سرخ آنکھوں والے پونہو ہادی پر اس کی خاص نظر کرم تھی "اس کے علاوہ وہ مجھ پر بھی توجہ دے رہی تھی۔ مجھ پر توجہ دینے کی وہی وجوہات مجھ میں آتی تھیں۔ ایک تو میں پہلی بار اس محفل میں شرکت کر رہا تھا۔ دوسرے میں غیر مقامی تھا۔ اور میرا لباس نسبتاً امیرانہ تھا۔

غلام خاں اور نواد کی داپسی تقریباً نصف گھنٹے بعد ہوئی۔ جو کسی وہ روشنی میں آئے، مجھے اندازہ ہو گیا کہ غلام خاں کی داکٹ میں ایک بھاری رقم منتقل ہو چکی ہے۔ غلام خاں کا ہشاش بشاش چرو بھی اس حقیقت کا غماز تھا۔ نواد اس پہاڑی رستوران کے مالک سے باتیں کرنے لگا جبکہ غلام خاں ہماری طرف چلا آیا۔

"سودا ہو گیا؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں" غلام خاں نے سر میری سے جواب دیا اور ایک گلاس میں تین چار اچھ شراب بھر کر غٹاٹ چھا گیا۔
"بھرا کیا پروگرام ہے؟" چلیں واپس؟"
"تمہارا رواج تو ٹھیک ہے؟" غلام خاں نے اپنے مخصوص غصیلے لہجے میں کہا "کتنی رات گئے کہاں جانا ہے۔ کل دن چرے نکلیں گے یہاں سے۔"

"میری رقم؟" میں نے ذہین بن کر پوچھا۔
"میں بھاگ نہیں رہا ہوں یہاں سے" وہ میرے کان میں پھنکارا "تمہارے چھ ہزار میرے سینے پر لکھے ہوئے ہیں۔" اس کی باتوں سے کسی دودھیلے کی تن فن جھٹک رہی تھی۔ لگتا تھا کہ کوئی لمبی رقمی ہاتھ لگی ہے۔
میں نے کہا "بے اعتباری والی بات نہیں ہے غلام خاں۔ جی چاہا رہا تھا کہ یہاں آئے ہیں تو اب کچھ خرچ بھی کریں۔ تم نے خودی تو تیا تھا کہ یہاں بولی شری بھی ہوتی ہے۔" وہ میری بات کی بے تک پہنچ کر بولا "نہیں۔ نہیں۔" آج کچھ نہیں ہو گا یہاں۔ آج ملک مینٹی یہاں ہے۔ آج رات کوئی بولی نہیں ہوگی۔

"یہ ملک مینٹی ہے کون؟" میں نے پوچھا۔
وہ آواز دبا کر بولا "تیرے میرے جیسے اس کے موت میں بر جاتے ہیں۔ بہت بچی ہوئی چیز ہے۔ حرام زادے، تھری قہمت اچھی بھی جو بیچ گیا۔ ورنہ جس طرح تو نے اس سے مصافحہ کیا تھا وہ بولا جانا تو ہاتھ کندھے سے اکھاڑ کر پیٹک دیتا تھا۔"

میں نے اپنے لیے میں خود ساختہ خوف سمیٹ کر پچھا
 "کیس۔ کیس یہ بیٹی جان۔ تو نہیں ہے؟"
 "ہاں وہی ہے" غلام خاں نے سستی خیر انکشاف کیا۔
 ایک دم ہمیں خاموش ہونا پڑا۔ بیٹی جان کسی ارے
 بیٹے کی طرح جھومتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ ہمارے
 قریب بیٹے دو افراد نے جلدی سے اٹھ کر اس کے لیے جگہ
 بنادی۔ مشکل بھاگ کر آیا اور جگہ کر اس کے گھاس میں
 شراب اتر پڑے لگا۔ وہ بھیل کر چاہائی پر بیٹھ گیا اور ارد گرد
 موجود افراد سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے کن آنکھوں سے
 اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس چہرے کو دیکھ کر
 یقیناً لوگوں کے دلوں میں دہشت پروان چڑھتی ہوئی۔ میں بھی
 اسے جو سات سال پہلے دیکھا تو یقیناً ہراساں ہوتا۔ لیکن
 اب بچوں کے نیچے سے بت سا پانی برس چکا تھا۔ پچھلے سات
 برسوں میں ایسے موٹے بھی آئے تھے کہ دہشت نے مجھ سے
 دہشت کھائی تھی اور موت میرے آگے لگ کر اندھا بند
 بھاگ تھی۔ جیسے سحر اس میں ننگے پاؤں چلنے والوں کے کوسے
 بے حس ہو جاتے ہیں میرے ذہن میں بھی دہشت کا خاند بند
 ہو چکا تھا۔

میں نے بیٹی جان کو نگاہوں نگاہوں میں تو لا اور میری
 آنکھوں کی پودوں میں سستی خیر حرارت جاگ اٹھی۔ یہی وہ
 بیٹی جان تھائی عورتوں کا شکاری کما جاتا تھا اور جس کا
 خوف دوزخے موت کے نیچے وہم میں کسی آسپ کی طرح چکراتا
 تھا۔ اسی شخص کے بارے میں مالک محمد نے کہا تھا کہ اس سے
 کھیلنے کی حماقت کوئی باگلی ہی کر سکتا ہے۔ یہی بیٹی جان تھا
 جو مالک محمد کے گھر میں پناہ لگزیں ہوا تھا اور پھر اس کے بچوں
 کی ماں کو لے بھاگ تھا۔ وہ نیلہ کا قاتل تھا اور معلوم نہیں
 نیلہ جیسی کتنی عورتیں اس کے بہتر ہوس پر روندی جا چکی
 تھیں۔ بیٹی جان کا سب سے بڑا "کتاب" یہ تھا کہ ایک
 انیس اس کے سایہ عاطفت میں تھا۔ شکر شکر! جس کا نام
 ایک گالی تھا اور جس کا وجود محض اور بربادی کا دوسرا نام
 تھا وہ بیٹی جان کی ہی پناہ میں تھا۔

حسب توقع بیٹی جان بلا توش ثابت ہوا۔ وہ گلاس پر
 گلاس چڑھا رہا تھا اور پھر بھی پوری طرح ہوش میں تھا۔ وہ
 نہایت قیمتی برائے کے امپورٹڈ سگریٹ پی رہا تھا اور ان
 سگریٹوں کو آگ دکھانے والا لائٹر کمزور دیش چار پانچ بزار کا
 فوہیہ اور بات ہے کہ اس محفل رقص و سرور میں بیٹی کو
 ایک بار بھی لا ٹھکرلانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ جو منی وہ
 نما سگریٹ ہونٹوں میں دھاتا وہیں باتیں سے کوئی نہ کوئی

فصل لک کر سگریٹ کو آگ دکھا دیتا۔ وہ بڑے شاندار انداز
 میں گاؤں کی گلی سے ٹپک لگاتے بیٹھا تھا اور راتیں بکھا رہا تھا
 لال پری اب ہماری محفل پر سایہ فگن تھی۔ میرے اور
 عباس خاں کے سوا ہر کوئی ترنگ میں تھا۔ لی تو ہم بھی رہے
 تھے لیکن اس حد تک کہ گلاس ہونٹوں سے نکالتے تھے اور پھر
 نظر بچا کر دامن بائیں الٹ دیتے تھے۔ مستی میں اگر ایک
 فریہ اندام آفریدی نے کان پر ہاتھ رکھا اور ایک سگریٹ تین
 اٹھائی۔ چوتھ گیتوں کی دھڑکن عموماً دکھش ہوتی ہیں۔ یہ بھی
 ایک خوبصورت گیت تھا۔ ساز بجانے والوں نے خود کو اس
 گیت کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا اور لڑکی نے بھی اپنے رقص
 کے ہماؤ تازہ دل لے لیا۔ جیتا یہ کوئی "خود ساختہ" قسم کا فحش
 گیت رہا ہو گا کیونکہ سننے والوں نے ہائے ہائے کے فوہیہ بند
 کیے اور بیٹی جان کے ہونٹوں پر بھی لوفرانہ نہیں جی تھی۔

گیت کا ٹکڑا کر آفریدی چپ ہو گیا تو سرخ آنکھوں
 والے پڑھواری نے ایک مصرعے کی نمان اٹھائی۔ گیت کا
 مطلب بچہ اس طرح قاتل ہے پر اندے کے صفحہ پندوں
 پر نظر پڑتی ہے تو جرم کر رہا جاتی ہے۔ میں تیری چال دیکھ اس
 طرح تیرے پیچھے چل رہا ہوں جیسے بھوکا چمڑا بیز ہمارے کے
 پیچھے چلا ہے۔ بیٹی جان کو اب ساز کے ساتھ آواز کا لطف
 آنے لگا تھا۔ پڑھواری خاموش ہوا تو اس نے تیرے فحش
 کو کچھ گانے گے لے کہا۔ اس نے بھی بلا جھجک ایک ٹکڑا
 گا کر سنایا۔ اب یہ سلسلہ چل نکلا۔ باری باری سب ایک
 ایک دودو شعر گا کر سنانے لگے جن کی آواز اچھی تھی انہوں
 نے پورا پورا گیت گایا۔ یہاں تک کہ عباس خاں کی باری
 آئی۔ عباس خاں واقعی ایک خوش گو شخص تھا۔ اس محفل
 میں ایک بھی اس کے بائے کا "گھوکار" نہیں تھا۔ میں نے
 پڑاؤ میں اسے سنا تھا اور گھوکاری کے بارے میں کچھ زیادہ نہ
 جانتے ہوئے بھی اسے پسند کیا تھا۔ عباس خاں نے ایک گیت
 کا ٹکڑا گایا تو آواز کے سحر نے سب کو سنا کر لیا۔ اس سے پورا
 گیت سنانے کی فرمائش کی گئی۔ مجبوراً اسے پورا گیت گانا
 پڑا۔ محفل جھومنے لگی۔ خوب داد دی گئی۔ یہ گیت ختم ہوا تو
 ایک اور کی فرمائش ہوئی۔ اس مرتبہ فرمائش جان محفل یعنی
 رقص لڑکی کی طرف سے تھی۔ عباس خاں کو یہ فرمائش بھی
 پوری کرنی پڑی۔ عباس خاں کے بعد میری باری آئی تھی اور
 میں از حد پریشان تھا کہ اس صورت حال سے کیسے نمٹوں گا۔
 موسیقی سے میرا شوق صرف اور صرف سننے کی حد تک تھا۔
 بہر حال قدرت نے میری یہ مشکل آسان کر دی۔
 عباس خاں خاموش ہوا تو پڑھواری نے رضا کارانہ

طور پر ایک اور گیت شروع کر دیا۔ اس گرم گرم گیت کے
 دوران ہی بیٹی جان جھومتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور رقص
 لڑکی کو بھل میں دیکھ کر دھواں دھواں کچھ میں دھوٹ
 ہو گیا۔ جان محفل رقص ہو گئی تو محفل بھی زیادہ دیر نہیں
 چل سکی۔ شرکائے محفل تھوڑی دیر گالیاں کھتے اور ایک
 دے کو فحش مذاق کرنے کے بعد اپنی اپنی جگہ "مٹ لٹ"
 ہونے لگے۔ آٹھ گیت کے اندر اندر محفل اختتام کو پہنچ
 گئی۔

سب مدہوش ہو کر چارپائیوں پر پڑ رہے حالانکہ یہ جگہ
 جیت کے بغیر تھی مگر چاروں طرف سے اس طرح نیلیوں میں
 گھری ہوئی تھی کہ ہوا کا گزرنہ ہونے کے برابر تھا۔ پھر
 مسلسل بھرتے ہوئے الاؤ نے فضا کو گرا رکھا تھا۔ عباس خاں
 اور میں ایک ہی چارپائی پر آؤے تریجے لیٹ گئے۔ رات گھون
 کو سہانے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ غلام خاں الاؤ کے
 بالکل قریب زین پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے بھی اپنی رات گھون
 کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ نیند غلام خاں کی
 آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔ اسی کی دانت میں ایک موٹی
 رقم موجود تھی۔ اس رقم کی موجودگی میں اسے نیند ہی نہیں
 سکتی تھی۔

دوسری طرف میرا بھی سونے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔
 پروگرام ہوا بھی تو نیند کیسے آتی۔ ذہن تو فکروں کا میدان بنا
 ہوا تھا۔ بیٹی جان یہاں موجود تھا اور مجھے کچھ معلوم نہیں
 تھا وہ کب یہاں سے رخصت ہونے والا ہے اور کہاں جانے
 والا ہے۔ اب میرے سامنے دو ہی راستے تھے پہلا یہ کہ
 بیٹی جان کو گھر پر راکٹ پر رکھ لوں اور اسے اپنی مرضی کے
 مطابق چلانے کی کوشش کروں۔ دوسرا یہ کہ شہباز پهلوان کی
 طرح اس کا بھی تعاقب کروں اور اس کا ٹکڑا لٹاؤں ہوا اس
 کے آؤے تک پہنچ جاؤں۔ دونوں صورتوں میں خطرات
 موجود تھے بلکہ ایک سے بڑھ کر ایک خطرات تھے یہ علاقہ
 بیٹی جان کا گڑھ تھا اور یہاں اسے رات گھون کے زور پر اپنی
 مرضی سے چلا لینا آسان کام نہیں تھا۔ اسی طرح اس کا
 تعاقب بھی ڈاکائی سے دوچار ہو سکتا تھا۔ وہ ایک کھاگ اور
 پختہ کار مجرم تھا۔ شہباز پهلوان نہیں تھا کہ ٹاک کی سیدھ میں
 چنا رہتا اور مجھے اپنے پیچھے لگائے پھرتا۔ اس نے ہر قدم
 چوبک کر رکھنا تھا اور اپنے گرد دھڑلے سے پوری طرح باخبر رہتا
 تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ
 اس کے پاس سواری ہے یا وہ پیڈل والیں گا۔ اگر وہ
 گھوڑے چمڑو فیوہ پر آیا تھا تو میرے لیے اس کے پیچھے جانا

مکن ہی نہیں تھا۔
 اسی غفلت میں وقت گزرتا رہا۔ کچھ کے اندر سے کبھی
 کبھی بیٹی جان یا رقص لڑکی کی مدھم آواز سنائی دے جاتی
 تھی۔ عباس خاں سوچتا تھا جبکہ میں خود کو سویا ہوا غلابا کر رہا
 تھا۔ نیم وا آنکھوں سے میں بھی کبھی غلام خاں کی طرف بھی
 دیکھ لیتا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنی دانت کے زیریں سے پر
 جم کر رہ گیا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ نیند اس کی آنکھوں
 سے کوسوں دور ہے۔ اب میری طرح وہ بھی بے حس
 حرکت پڑا تھا۔ مشکل ٹائی و شرا اور پھولی ہوئی ٹاک والا
 اویز عمر شخص مسلسل جاگ رہے تھے۔ اگر چوکیداری کا
 مسئلہ ہوتا تو ان میں سے ایک سوسٹا تھا غالباً وہ بیٹی جان کی
 خوشنودی کے لیے ایسا کر رہے تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ بیٹی
 جان کو کسی چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ایسے میں وہ سونے
 پائے گئے تو درناش ہو جائے گا۔

رات آخری پڑماڑے میں بچے کے لگ بھگ میں
 نے غلام خاں کو اپنی جگہ سے اٹھنے اور اپنا کپڑا وغیرہ
 سنبھالنے دیکھا۔ وہ بڑی خاموشی کے ساتھ کھٹکے کی تیاری
 کر رہا تھا۔ مشکل ڈشکے کے پاس جا کر اس نے دھیمی آواز
 میں چند باتیں کیں۔ کھانے اور شراب وغیرہ کا مل چکایا اور
 الاؤ کی چلتی ہوئی لکڑی سے سگریٹ سلگا کر اس بجک راستے کی
 طرف بڑھ گیا جہاں سے چھٹ پھنکار ہم اس امانے میں
 داخل ہوئے تھے۔ غلام خاں سے ایسی بدھدی کی مجھے توقع
 نہیں تھی۔ غالباً اس کی نیت میں فوراً رقم ملنے کے بعد آیا تھا۔
 یہ پیسہ چیز ہی ایسی ہے بڑے بڑے ٹیکو کاروں کا پتائی کردتا
 ہے۔ غلام خاں تو قہا ہی ایک گھٹیا اور بد خصلت انسان۔

میں بھی اپنی جگہ سے حرکت کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ
 آؤے کا مالک اویز عمر شخص میرے قریب گیا۔ اپنی گز گز
 کے پچوکوں سے اس نے مجھے "چکایا" اور غلام خاں کی خالی
 جگہ کی طرف اشارے کر کے کچھ کہنے لگا۔ میرے لیے یہ
 سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اڑے کے مالک
 کے طور پر یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ مجھے میرے ساتھی کی
 پڑا سرا رو اسکی سے آگاہ کرنا۔ اویز عمر شخص کی آواز سن کر
 عباس خاں بھی جاگ اٹھا۔ لگتا تھا وہ بھی زیادہ کمری نیند نہیں
 سویا۔ اویز عمر شخص نے عباس سے پوچھا کہ جانے والے
 سے انہیں کچھ لینا دینا تو نہیں تھا۔ عباس نے اس سوال کا
 ترجمہ کر کے میری جانب اجمال دیا۔ میں نے نفی میں جواب
 دیا اور کہا کہ لینا دینا تو کچھ نہیں تھا مگر اس کا یوں جانا سمجھ میں
 نہیں آیا۔ میں نے عباس سے کہا "میں ابھی آتا ہوں"

ہوں "میں جانتا تھا کہ وہ آٹھ ہزار روپے لے کر راتقل میری طرف سیدھی کر لے گا۔
میں نے کہا "پورے تم نے کیا کرتے ہیں؟ آٹھ ہزار میرے پاس ہیں دس ہزار اور دے دو۔"
اس نے انگلی میری جانب سیدھی کی اور منہ سے جھاک اڑاتے ہوئے بولا "دیکھو تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ بت برا آدمی ہوں میں۔ میرا ذراغ محوم کیا تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ ابھی وقت ہے جھاک جاؤ یہاں سے۔"

میں نے کہا "جھاکنا ہو تو پیچھے کیوں آتا؟"
ایک دم وہ غصے سے ہانک ہو گیا۔ اس کے منہ سے گالیوں کی پوجا زنگلی اور قہقہے کے پیچھے اس نے غم دار خنجر نکال لیا۔ یقیناً یہ وہی خنجر تھا جو چند روز پہلے بد نصیب سکیڑ کا پیٹ جھاک کر کھاتا تھا۔ غلام خاں اتنے غصے میں تھا کہ کوئی اور اسے دیکھتا تو سختے میں آجاتا۔ ایسے لوگ ذمہ لگنے سے پہلے ہی مقتول ہو جایا کرتے ہیں۔ جانیوری ہوتے ہیں جو یہ بات جانتے ہیں کہ قبیلے قاتل اور اندھے قاتل میں آپس میں کای فرق ہوتا ہے۔ خنجر سونت کر غلام خاں تھری کی طرح میری طرف آیا۔ اس کا بایاں ہاتھ مجھے گریبان سے پکڑنے کے لیے یا دھکیلنے کے لیے یا یونہی غیر ارادی طور پر میری طرف اٹھا ہوا تھا۔ یہ اٹھا ہوا ہاتھ انڈاز ہی کی نشانی تھا۔

ماہر خنجر زن جان کر تے ہوئے کبھی یہ انداز نہیں اپناتا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر ٹانگ استیصال کرنے کے بجائے وہیں کھڑے کھڑے پہلو بدل کر یہ وار پھایا اور بالکل صحیح وقت پر ایک ٹھوک غلام خاں کے کولہوں پر رسید کی۔ وہ توازن کھو کر سر کے بل ایک تادر مہمانی سے ٹکرایا اور ایک کراہ کے ساتھ خنجر میں لٹک گیا۔ میں نے اس کا سایہ مہمانی کی شاخوں کے پیچھے او بھل ہوئے دیکھا۔ پھر ایک چپا کے کی آواز آئی اور غلام خاں کے منہ سے مغلطات کا دھارامہ نکلا۔ تاجر ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ غلام خاں نے خنجر نکالتے ہوئے اپنی تاجر پیچھے گرا دی تھی وہ اب بھی گھاس پر پڑی ہوئی جل رہی تھی۔ میں دونوں تاجر میں سنہال کر خنجر میں پھنجا۔ غلام خاں مجھے ایک کڑھے میں گرا نظر آیا۔

ڈھولان پر واقع یہ ایک دلدلی سا گڑھا تھا اور اب تک خنجر نہ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ کڑھے کا پالانی کنار پانی کے کنارے کو کھٹکھٹا کر تھا اور یہاں ایک تادر ودرخت کی جڑیں زمین سے نکل کر پانی میں تھری تھیں غلام خاں نے ان جڑوں کو تمام کڑھے سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو میری

راتقل تمام کر اور جوتی پن کر میں تھری سے غلام خاں کے پیچھے گیا۔ دراز نما راستے سے گزر کر باہر آیا تو جہت نہ ہوانے استیصال کیا یہاں ایک طرف لمبے بالوں والے تین گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ تین ممکن تھا کہ ان میں سے ایک گھوڑا جیسی جان کا ہو۔ دور پیچھے ڈھولان پر چند گھوڑوں کے لیے غلام خاں کی تاجر چمک کر او بھل ہوئی۔ میں نے تاریکی میں راستہ دیکھنے کے لیے پوری طرح آنکھیں کھولیں اور احتیاط سے نیچے اتر گیا۔

تقریباً چار فرلانگ آگے جا کر ایک تنگ گھاٹی میں 'میں نے غلام خاں کو پالیا۔ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر بڑی طرح چونکا۔ پھر بوکھلاہٹ کے بجائے اس کے چہرے پر غصے کی سرخی پھیل گئی۔ میری تاجر کے روشن دانے سے ایک طرف بٹنے ہوئے وہ بولا "کیا بات ہے کیوں نیند حرام ہوئی ہے تمہاری؟"

میں نے کہا "اس سوال کا جواب مجھ سے زیادہ تم جانتے ہو؟"

وہ ہنسا کر بولا "تمہارے چھ ہزار لے کر میں بازو پار نہیں کر جاؤں گا۔ سب اپنے گھریاں سب کچھ یہیں ہے میرا۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔ میں جھاک نہیں جاؤں گا۔ ابھی ایک دو گھنٹے میں دلایں آجاتا ہوں۔"

میں نے اس کے تمدنیز لہجے سے مرعوب ہوئے بغیر اپنی رقم کی واپسی پر اصرار کیا تو اس نے پہلے سے کن کر ایک طرف رکھے ہوئے چھ ہزار روپے میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ میں نے اسے اس کا وعدہ یاد دلایا تو ہمارے درمیان تلخ کلائی ہو گئی۔ اس نے بڑے "احسان" کے ساتھ دو ہزار روپے اور میری طرف اچھالے اور بولا "اب دفع ہو جاؤ۔"

"لیکن تم نے اٹھارہ ہزار کا وعدہ کر رکھا ہے" میں نے بدستور محاذ آرائی کا لہجہ اختیار کیے رکھا۔

وہ بولا "میرے پاس نہیں ہے اٹھارہ ہزار۔ اگر پوری بے منت ہو جاتی تو میں دے دیتا لیکن ابھی تو میری لگائی ہوئی رقم بھی نہیں ملے۔"

میں نے کہا "مجھے بے منت سے غرض نہیں۔ تم نے صرف چوبیس گھنٹے کی بات کی تھی اور اب دوسرا دن ہو گیا ہے اور اگر بے منت کی بات کرتے ہو تو اس کا بھی مجھے پتا ہے پوری رقم تمہاری جیب میں ہے۔ اگر نہ ہوتی تو رات کے اس پر تم چوبیس کی طرح بھاگ نہ رہے ہوتے۔"

انکا ابھی سب کچھ غلام خاں کی بدداشت سے باہر ہو گیا۔ وہ خطرناک انداز میں بولا "چھالو پیسے۔ میں پورے کھاتا

انگلی اٹھا کر لرزاں لمبے میں بولا "دیکھ۔ میں آخری بار۔ آخری بار تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ میرے رستے سے ہٹ جا۔ ہٹ جا ورنہ بڑا دکھ اٹھا کر مرے گا۔"

میں نے راتقل کا سیٹھی کیج بٹائے ہوئے کہا "جہانی استاد کا نام سنا ہے؟ نہیں سنا ہاں! کی تھری بد قسمتی ہے۔ جہانی استاد جو کتا ہے وہ کرگزتا ہے اور آج جہانی استاد تجھ سے کہہ رہا ہے کہ جو پوچھا جا رہا ہے وہ تارے ورنہ بے موت مارا جائے گا۔"

میرے بدلے ہوئے لمبے نے اسے ٹھٹھا دیا۔ یہ وہی لمبہ تھا جو تھرتھل کے اعصاب پر سوار ہو کر اسے مفلوج کر دیتا تھا۔ کچی چیزیں دھماکے سے غلام خاں کے اندر ٹوٹ گئی تھیں۔ یہ اس کی خود سری اور ہٹ دھرمی کا بخت تھا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میر کو سوار بیل کیا ہے لیکن رستی چلنے کے باوجود بیل نہیں گیا۔ وہ اپنے لمبے کی تن فہن پر قرار رکھتے ہوئے بولا "میں تباؤں گا۔ کچھ نہیں تباؤں گا۔ تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔ میں نے اٹھارہ ہزار کی بات تم سے نٹے۔ میں کی ہوگی لیکن تم نے اس بات کو پکڑ کر کتنے کی طرح بھونکا شروع کر رکھا ہے۔ میں دس ہزار کی وہ ہڈی تمہارے منہ پر مارنا ہوں۔"

میں نے راتقل اس کی طرف سیدھی کر لی اور بے احتیاطی سے لمبے میں کہا "اب بات دس ہزار کی نہیں۔ جو میں پوچھ رہا ہوں وہ تباؤ۔ ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور یاد رکھو یہ میری آخری وارننگ ہے۔"

غلام خاں کا چہرہ بیگنا ہوا تھا ورنہ اس کی چیٹائی پر بسنے کے قطرے نمایاں ہو جاتے۔ وہ بد بخت اندر سے سسار ہو گیا تھا لیکن اس کی سرخ گردن ابھی تک الٹری ہوئی تھی۔ غلام خاں سے کچھ پوچھتا میرا مطلع نظر نہیں تھا۔ وہ میرے سوالوں کے جواب نہ تھی رتا تو کیا فرق پڑ جاتا لیکن اس کی الٹری ہوئی سرخ گردن اب میرے لیے ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔

"نہیں تباؤ؟؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں" وہ اپنی ہمت بچ کر کے بولا۔ غالباً اسے یقین نہیں تھا کہ میں آخری حد تک جاؤں گا۔ میں نے راتقل اور تاجر کنارے پر رکھ کر خنجر بست پانی میں چھلاک لگائی اور چند لمحوں میں غلام خاں کو دوئی کی طرح دھنک دیا۔ وہ نیم بے ہوش تھا کہ اس کا ایک ہاتھ ابھی تک داسکت کی اندوئی جیب ہی پر بٹھا ہوا تھا۔ میں اسے ٹانگ سے ٹھیک کر گڑھے سے باہر لایا۔ راتقل کے ساتھ ساتھ "قاتل خنجر" بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ اس کا لباس کچھ سے لت پت

پروردہ ٹھوکر نے اسے پھر گڑھے کے وسط میں پھنچا دیا۔ اس نے گھڑھے پر راتقل ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ گڑھے میں ٹھیک نہیں ہو چکی تھی۔ ہاں خنجر ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا لیکن وہ اب خنجر سے اپنا پیٹ جھاک کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا اور شاید وہ جھلاہٹ میں ایسا سوچ بھی رہا ہو۔ اس نے آتما دی میں راتقل استعمال نہ کر کے غلطی کی تھی اور اب راتقل اس کے ہاتھ میں رہی تھی نہ خنجر کسی کام کا۔

لو کر کھا کرو ایک بار پھر ارے نے میرے کی طرح کنارے پر چڑھ "دا" میں نے بھی دوبارہ ٹانگ کو حرکت دی۔ شکاری بوٹ کی نرپ اس کے منہ پر پڑی۔ ایکشن ری لمبے ہوا اور وہ پھر گڑھے کے وسط میں گرا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ فرط غصہ کے سبب منہ سے جھاک نکل رہا تھا۔ جو بھی غلط ترین گالی اس کی زبان پر آسکتی تھی وہ لا رہا تھا اور اس کے ساتھ ایسی خنجر نکال دھمکیاں تھیں جو پھر کا جگر پانی کر سکتی تھیں۔ وہ ٹھوکر کے کمانے کے بعد غلام خاں پر جیسے جنون سوار ہو گیا۔ وہ اچھل اچھل کر کنارے پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا اور میری ٹھوکر میں کھانک کر پانی میں کرنے لگا۔ آخر وہ بے دم ہو گیا۔ اس کے انگلی دو تین دانٹ ٹوٹ چکے تھے اور چوہا لولہاں تھا۔ وہ اس قدر ہانپ گیا تھا کہ اب بولنا اس کے لیے قاتل ہو رہا تھا۔

میں نے اطمینان سے کہا "تم کہہ رہے تھے کہ بت بری چیز ہو تم۔ میرے خیال میں تمہیں غلط فہمی رہی ہے۔ تمہارے جیسا بیابانہ تو میں نے آج تک دکھائی نہیں۔ اتنی مار کھا کر بھی جو شخص مارنے والے کو انگلی تک نہ لگائے وہ برا کمال سے ہوا۔ اسے تو درودیش کا خطاب ملنا چاہیے۔"

غلام خاں کے لولہاں ہونٹوں سے ایک بار پھر گالیوں کا طوفان اٹھ پڑا۔ جوش غضب میں اس پر ایک وعدہ کی کیفیت ظاہر تھی اور یہ کیفیت اس سے عجیب و غریب گالیاں بوندوں کر ادا رہی تھی۔ بے بسی کی انتظار پر پتھ کر وہ فائر اتقل نظر آنے لگا تھا۔ "چج کر بولا "میں سب سمجھ گیا ہوں۔ ہاں سب سمجھ گیا ہوں میں۔ تم۔ یہ رقم تم سے چھیننا چاہیے۔ اب ایک چوٹی کوڑی نہیں دوں گا۔ ایک کوڑی نہیں۔"

میں راتقل ہاتھ میں لے کر گڑھے کے کنارے بیٹھ گیا "تم تو بعد کی بات ہے پیارے۔ پہلے یہ تباؤ کہ وہ باز کمال سے لیا ہے، تھمتے میں لیا ہے، تھمتے میں بچا ہے۔ اور اس سے پہلے ایسے تھمتے سووے کر گئے ہو تم؟"

اس نے ایک بت گہری سانس لے کر اپنے غضب کے نندازہ کوڑھے پر کاٹھی ڈالنے کی کوشش کی اور میری طرف

اور خوش دھنوں سے انداز تھا۔ ہم مجاز جھکاڑ سے اُٹی ہوئی ایک تنگ گھاٹی میں تھے اور قرب و جوار سے ہمیں دیکھ لیتا آسمان نہیں تھا۔ میں نے بڑے اطمینان سے غلام خاں کی واسط میں ہاتھ ڈال کر ایک دو مال میں لپٹے ہوئے کرکسی نوٹ باہر نکال لیے۔ نوٹ بھگ گئے تھے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یہ پانچ پانچ سو کے نوٹوں کی تین گڈیاں تھیں۔ یعنی ڈیڑھ لاکھ روپے۔ مسکراتے راج الوت۔

ان میں سے صرف ایک گڈی ذرا بچی تھی۔ اس میں سے آٹھ ہزار روپے نکال کر بیچے دیا گیا تھا۔ میں نے غلام خاں کی تمام جیبیں کھنڈل ڈالیں۔ ایک جیب سے ڈیڑھ سو روپے کے کرکسی نوٹ ملے۔ ایک جیب میں ایک سو روپے کی ڈائری تھی جس میں چند کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ گیس کی جیب سے ایک ہل پوائنٹ اور ریڈ گاری ملی۔ ڈائری کے کاغذات میں ایک رسید بھی تھی۔ ساتھ کاغذ پر لکھی ہوئی یہ رسید باگڑ خیل کے کسی گل جان نامی شخص کی طرف سے تھی۔ دو دو پہلے گل جان نے ایک بازبوس باہ ہزار روپے نصف جن کے چھ ہزار روپے ہوتے ہیں، غلام خاں کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ کل رقم نقد وصول کر لی تھی اور اب اس پر پندرہ ہر گل جان کا کوئی حق دعوئی نہیں تھا۔ نیچے دو انگوٹھے گئے ہوئے تھے۔ یعنی گل جان نامی کسی انجان شخص سے یہ باز باہ ہزار روپے میں خرید کر غلام خاں نے ڈیڑھ لاکھ میں بیچا تھا۔ لاچ کی انتہا یہ تھی کہ اس سو روپے میں ایک لاکھ چالیس ہزار کے قریب منافع حاصل کر کے بھی دو روپے اضافہ ہزار لے کر فرو پکر ہو رہا تھا۔ روپے کی بات نہیں تھی بات غلام خاں کی تھی۔ وہ ایک فضیلا درندہ تھا۔ غیر تو غیر اپنے بھی اس کے شر سے محفوظ نہیں تھے۔ میں نے باگڑ خیل میں اس کے اہل خانہ کو دیکھا تھا۔ وہ اس کے اہل خانہ میں تھے۔ میرے غلام تھے۔ اس کی دہشت ناک آواز ان کے پیشاب خطا کرتی تھی۔ وہ اس کے گھر میں بول رہے تھے جیسے کسی خون آشام مگر مجھ کے ساتھ جھیل کی بوگڑا مخلوق رہتی ہے۔

میں جو کچھ غلام خاں سے معلوم کرنا چاہتا تھا وہ مجھے اس کی جامہ خلائی سے معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے غلام خاں کے کھیل سے اپنے شکاری بوٹوں کی کچھ صاف کی۔ یہ کھیل اس وقت مہمان کی شاخوں سے اچھڑ گیا تھا۔ غلام خاں کڑے میں گرا تھا۔ اپنی جیکٹ کی جیبوں سے کچھ روپے نکال کر میں نے ماسچینوں میں ٹھوس رائفل اٹھائی اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ غلام خاں دشمنوں سے چورے حال ہوا تھا۔ میں نے بے پناہ سفاکی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا "غلام

خاں" میں جو جانتا چاہتا تھا جان گیا ہوں۔ اب میں جس چھوڑ سکتا تھا۔ لیکن چھوڑوں گا نہیں۔ میں نے تم سے ہنگامی کا وعدہ کیا تھا اور میں وعدہ غلامی نہیں کر سکتا۔ میرے لیے تیار ہو جاؤ۔

غلام خاں کو میری آنکھوں میں جیتنا موت نظر آئی تھی اس کا کٹھنہ کھل گیا۔ میری رائفل نے دھماکے سے شلر اٹھا اور غلام خاں کی پیشانی پر سیاہ سوراخ نمودار ہو گیا۔ اس نے ایک دس پندرہ گولہ کھڑا اس کے کھیل میں رکھا اور کھیل اس کے پیٹ سے باندھ دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنی گٹھرائی رائفل اور مختصر جھوٹا "موسٹرن" کے لیے تیار ہو کر اس کے اندر وقوع پزیر ہو گیا تھا۔ میں نے نوٹوں کی بھٹی ہوئی گڈیاں چری جیکٹ کی اندرونی جیبوں میں رکھنی چاہیں لیکن ان اجمار مشکوک نظر آ رہا تھا۔ میں نے کل دس ہزار روپے نکال کر باقی ساری رقم دو مال میں لپٹی اور اسے کڑے کے قریب مجاز جھکاڑ کے اندر ایک محفوظ رختے میں چھپا دیا۔ اس بد میں مستحکم قدموں سے داپس "پناہی رستوران" کی طرف روانہ ہو گیا۔ رات ابھی تاریک تھی تاہم مشرق صبح صادق کا اجالا نمودار ہو رہا تھا۔ میرے پیچھے کڑوں سے ہوا بدن حمدی گزرتی رہی۔ ابھی میں بلندی کی طرف سو ڈیڑھ سو گز ہی گیا تھا کہ ایک آواز نے مجھے چوٹا دیا۔ آواز ایک بڑے پتھر کی اوٹ سے آئی تھی۔ اس کے فوراً بعد وہ کی روشنی میرے ارد گرد چمکی۔

"مکون ہے؟" یہ میری جان کی آواز تھی "میں اس تو کو اور اس صورت کو بھلا کیسے نہ پہچانتا؟ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مجھ سے پندرہ بیس قدم کی دوری پر کھڑا تھا۔ وہ دونوں جیسے ایک دم ہی اندھیرے سے اُگ آئے تھے۔ میں جان نے مجھے "اردو" میں مخاطب کیا تھا "اس کا مطلب تھا وہ مجھے پہچان گیا ہے۔ کہیں غلام خاں کو جسم واصل کرنے ہوئے مجھے دیکھ تو نہیں لیا گیا؟ یہ سوال میری سوجن میں سنسٹایا اور تیر کی طرح ذہن میں بیوست ہو گیا۔

"میں ہوں احسان" میں نے بلند آواز میں جواب دیا۔ ایک لمبے کے توقف سے میری جان نے پوچھا "کچھ پتا چلا تم؟"

"نہ۔ نہیں کچھ پتا نہیں چلا۔"

"ابھی اوپر ایک فائر ہوا تھا؟" میری جان نے پوچھا۔

"میں نے کیا تھا؟ میرا خیال تھا شاید کوئی جواب آئے لیکن کچھ نہیں۔"

میری جان دوسرے شخص کے ساتھ چلا ہوا اب میرے قریب آ گیا تھا "اس نے ماسچین کی روشنی میرے لباس پر ڈالی۔" "وئے خود؟" یہ کیا ہوا۔ کہاں گرا ہے؟"

میں نے کہا "اوپر دھولان پر دو تین گز سے۔"

اندھیرے میں پاؤں پھسل کر گڑے میں چلا گیا تھا۔

میری جان نے کہا "وئے؟" یہ غلام خاں ایک دم کیوں رو پکر ہو گیا۔ کوئی چیز میرے تو نہیں لے گیا تھا؟"

"نہیں میرے ساتھ تو اس کا حساب ہے باقی تھا" میں نے جواب دیا "یہ سب مجھے بھی نہیں آئی کہ وہ ایک دم کیوں نکل گیا۔"

میری جان کا سامنی بولا "اس کے پاس کافی رقم تھا۔ اتنی جلدی اور اکیلے نہیں جانا چاہیے تھا اس کو۔"

ہم کچھ دیر ٹیلوں میں کھڑے اور غلام خاں کو آواز میں دیکھ رہے تھے پھر بڑے پرواہیں آگے میں نے شکر کیا کہ میری جان نے کڑے کا رخ نہیں کیا۔ اپنی طرف سے میں نے شاید غم کھسکے تھے پھر بھی کڑے کے گرد پیش میں کوئی خطر میری جان کی عقلی نگاہوں میں ٹھک سکتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں پوچھ گئی۔ تاریکی کی دیریز صند سے شب و فراز نمودار ہوئے۔ لگے خوابیدہ جنگل ایک انکڑائی لے کر بے دار ہو گیا تھا۔ میری جان رت گئے کے بعد بھی بالکل تروتازہ نظر آتا تھا۔ اچالے میں اس کی صورت اور بھی کرخت دکھائی دی۔ نہ جانے کیوں اس کا چوہ دیکھ کر مجھے جاگ بواہر تھوڑا سا کاخار میں پتا اور تنہائی ہوا چوہ یاد آئے گا "تمہارا ہنسنے کی حد تک دونوں چہرے ایک جیسے تھے۔

میں ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا کہ میرا اٹھنا قدم کیا ہوگا۔ عباس خاں کا مشورہ یہ تھا کہ ہم میری جان کے روانہ ہونے سے پہلے ہی یہاں سے نکل جائیں۔ یوں ہمیں اپنا کھڑا عمل مرتب کرنے میں آسانی رہے گی۔ میرا اپنا خیال بھی اس سے ملتا تھا۔ تاہم واجب ہم نے میری جان کو چاہا ہی پر جیکل کر پائے اور جانے کا ناستا کرتے دیکھا تو خود بھی ذرا چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہماری تیاری دیکھ کر میری جان نے ایک دم ہانک لگائی "و خود؟" ہم کدھر جانا ہے۔ اوپر آؤ ہمارے پاس "اس کے ہماری ہجر کے لیے میں مجب غلطہ اور فرائڈ تھا۔ ہم اس کے قریب پہنچے۔

میں نے کہا "ہم جارہے ہیں ملک میری۔ اوپر شکار باہری میں ہمارا انتظار ہو رہا ہوگا۔"

وہ بولا "وئے عباس خاں۔ تم بھی جا رہا ہے؟"

عباس خاں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ جوش سے بولا "تم

نہیں جانے کا اوئے۔ تم ہمارے ساتھ جائے گا۔ رات تمہارا آواز ہمارے دل میں لگا ہے۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ وہاں رات کو تم ہمارے ڈیرے میں گائے گا۔ ہمارا لوگ بہت خوش ہوگا تمہیں سن کر "عباس خاں کا چہرہ ایک دم زندہ ہو گیا۔ وہ پہلے ہی میری جان سے کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ منہ سے تو نہیں کہہ رہا تھا لیکن اس کی دلی خواہش یہی تھی کہ اس معاملے میں وہ زیادہ ملوث نہ ہو۔ میری جان نے اس کے دہلے پہلے کندھے پر اپنا ہماری ہجر کا ہاتھ مارا "وئے پاگل کا بچہ۔ کیا چوڑے کے فاقی کا پتا ہے۔ اوپر ہم تمہارا بھتیجی نہیں پیچھے لگا۔ بس گھانے کا اور انعام دے کر داپس بھیج دے گا۔ گھبرانے کا بات نہیں۔ بے شک اپنے اس سامنی کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "ہم کیا ملتا تھا تم نے اپنا۔ اس احسان الہی۔ تم بھی چلو ہمارے ساتھ نکل رہیں آجائے۔"

اندھا کیا چاہے وہ آنکھیں۔ ایک مشکل ترین مسئلہ خود بخود مل رہا تھا۔ میں نے بے حد اعتناء سے عباس خاں کے بازو میں چنگلی لی اور میری جان سے کہا "ٹھیک ہے ملک جی۔ جیسے تمہارا حکم۔" پھر سوالیہ لہجوں سے عباس خاں کی طرف دیکھا۔ عباس خاں نے بھی رضامندی کے انداز میں سر ہلا دیا۔

○☆☆○

ایک پھر دن چہرے ہم ڈیرے سے میری جان کے ساتھ روانہ ہو رہے تھے۔ ہم اپنی رضامندی سے جا رہے تھے لیکن لگتا تھا کہ اگر رضامندی نہ ہوتی تو بھی ہمیں جانا ہی پڑتا۔ یہ میری جان کے قرائن تھی اور حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ معلوم نہیں اس پھر میں فون لٹیف سے شفقت کی یہ کیسی جو کھ گلی ہوئی تھی کہ وہ عباس خاں کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کر بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی یہ بھی شک ہو رہا تھا کہ کبیں یہ کوئی پکڑ نہ ہو۔ بعد از قیاس نہیں تھا کہ میری جان کو ہم پر کسی طرح کا شبہ ہو چکا ہو۔ یہ علاقہ اس کی "عملداری" میں آتا تھا اور یہاں پائے جانے والے کسی بھی مشتبہ فرد کو چھان بین کے لیے اپنے ساتھ لے جانے کا ہے "حق" حاصل تھا۔ بہر حال کچھ بھی تھا اب ہمیں اس کے ساتھ جانا تھا۔ بوت بوت دوا کی میرے ذہن میں باہار بخو کا خیال آ رہا تھا۔ پانڈہ بستی سے آتے ہوئے میں نے بخو کے سلسلے میں سوار بٹر گل۔ جے ۸۸ گھنے کی صلت مانگی تھی۔ یہ صلت اب گزر چکی تھی ابھی مجھے امید تھی کہ سوار میرا انتظار کرے گا۔

ہم ڈیرے سے روانہ ہوئے تو میری جان کے ساتھ وہ

منٹ پہلے میں چٹائی کے نیچے رکھ چکا تھا۔ عباس خاں کی جامہ
حلاشی بھی بے سر ہوئی۔ عیسیٰ جان آگے آیا اور میرے چہرے
پر ایک زنانے دار چمڑا کر بولا "کماں رکھا ہے رقم؟"
"کون سی رقم؟" میں نے چمڑا ہوی حوصلہ مندی سے
بدواشت کرتے ہوئے پوچھا۔
"وہی جو غلام خاں کی دواخت سے نکالا ہے؟"
"مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"رقم تو تمہارا والد محترم بھی نکالے گا احسان الہی" اور
وہ بھی نکالے گا جو تم نے بھی کوئی نہیں۔ اپنا نام من بچ
کر بھی تم ہمارا مطالبہ پورا کرے گا۔ اگر نہ کرے گا تو ہمارا نام
عیسیٰ جان نہیں۔"

وزیر ستانی نے اچانک ہی اپنی را نقل ہماری طرف
سیدھی کر لی تھی اور اب اپنے سردار کے اگلے حکم کا منتظر تھا
"یہ دونوں حرامی اس کرے سے باہر تو نہیں نکلا؟" عیسیٰ جان
نے اپنے کارندوں سے پوچھا۔ دونوں کارندوں نے عیسیٰ
انداز میں نفی میں سر ہلادیا۔ عیسیٰ جان اپنے کارندوں پر اور
اپنے اور گرد کے ہر شخص پر حاوی ہو جانے کی قدرتی صلاحیت
رکھتا تھا۔ ایک عجب فطرت تھا اس کی حرکات و سکنات میں۔
اس نے اشارے سے کارندوں کو حکم دیا کہ وہ کمرے کی
حلاشی لیں۔ حکم پر عمل کیا گیا۔ ہم را نقل کے نشانے پر تھے
اور ایک کونے میں کھڑے تھے۔ چند ہی منٹ میں چٹائی کے
نیچے سے غلام خاں کی اشیاء برآمد کر لی گئیں۔

عیسیٰ جان نے اپنی را نقل کی سردال میں میری پیشانی
پر رکھی اور سناٹا آواز میں بولا "ہم نے تم سے کچھ پوچھا
ہے۔ کماں چھپایا ہے وہ رقم؟"

"میں کسی رقم کے بارے میں نہیں جانتا" میں نے
پوری بے باکی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
میرے یوں دیکھنے سے وہ ایک دم بھڑک گیا تاہم لمبے
میں غیر معمولی ٹھنڈاؤ برقرار رہا۔ کہنے لگا "دیکھو احسان الہی۔
تم نے غلام خاں کو مارنے میں جتنا ٹائم لیا ہم اس سے تو حوا
مجی نہیں لیتا۔ جو تھا حصہ بھی نہیں لیتا۔ ہمیں بتاؤ غلام
خاں کا سرخ رومال اور اس میں بندھا ہوا ڈیڑھ لاکھ روپیہ
کماں ہے؟"

میں نے دیکھا اس کی انگلی لٹپٹی رہی تھی۔ غلام خاں نے
اس انگلی کو سمجھنے میں غلطی کی تھی اور مارا کیا تھا لیکن میں
غلطی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے لٹپٹی پر رکھی ہوئی ایسی کئی
انگلیاں دیکھی تھیں۔ مجھے معلوم رہتا تھا کون سی انگلی حرکت
کر سکتی ہے اور کون سی نہیں۔ عیسیٰ جان کی انگلی کم از کم اس

وقت حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ میں اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا۔
پیشانی پر سر ہلوے کے دباؤ کو خاموشی سے جھیلتا رہا۔ اور
ایک دم۔۔۔ سینے کے ہزاروں حصے میں عیسیٰ جان کو اندازہ
ہوا کہ وہ کسی معمولی شخص کے سامنے نہیں کھڑا۔ اس نے
را نقل میری پیشانی سے ہٹائی اور فور سے میرا چہرہ دیکھنے لگا۔
کچھ دیر بعد کچھ آواز میں بولا "کون ہے تم؟"
"احسان الہی" میں نے کہا۔

وہ بولا "اتنا تو جانتا ہے ہم۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ
جانتا ہے۔ ہاں۔ شکاریوں کے ہمیں میں وہ وردی والے
چور ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ تمہارا ایسی بی برکت
صوبے دار مرخان اور وہ لٹکا چٹا کبیر علی شاہ سب ہمارا دواخت
کے نیچے ہے سب کو چاکر ڈال دے گا ایک طرف۔"
میری ریزہ کی ہڈی میں سر ہلر ہوئی۔ عیسیٰ جان کے
انکشافات دھماکا خیز تھے۔ میں نے عباس خاں کی آنکھوں میں
خوف کا سیلاب اٹھتے دیکھا اور مجھے لگا کہ وہ دزد سرخ لڑکا
لڑکھار کر کہتا ہے۔ یہ سوال چیخ بن کر ذہن میں ابھرا کہ عیسیٰ
جان نے یہ نام کیسے لے لیے۔ جواب ایک ہی تھا۔ کوئی
ناخوشگوار واقعہ رونما ہو چکا ہے۔

عیسیٰ جان کی سنگ پاش نگاہیں میرے چہرے پر تھیں۔
وہ مسکرا کر بولا "کیا سوچ رہا ہے فیثا غوث کی طرح۔ ملنا
چاہتا ہے اپنے لوگوں سے؟" پھر میرے جواب دینے سے پہلے
ہی اس نے راجا رحیم کو اشارہ کیا۔ وزیر ستانی کی طرح اس
نے بھی را نقل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی اور بیٹھی
کچھ ہانک رہیں نشانے پر رکھ لیا "چلو" عیسیٰ جان نے اودھ کھلے
دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمیں مخاطب کیا۔ ہم
دروازے کی طرف بڑے تودوں را نقل بردار بڑے باجرا۔
انداز میں ہمارے پیچھے ہو گئے۔

کمرے سے باہر نہ ہونے والے ہمارا استقبال کیا۔ پتھر لی
دیواروں والے اکثر کمروں میں لاشیں اور دیے وغیرہ کی
دوشنی تھی۔ ایک دروازے کے سامنے بہت بڑی بڑی
موچھوں والا ایک فریہ اندام قبائلی سب مشین مرن لے
جس کو کھڑا تھا۔ دروازے پر مالا بھول رہا تھا۔ عیسیٰ جان کو
دیکھتے ہی فریہ اندام پہرے دار نے قریب رہی لاشیں داخوں
میں پکڑی اور جبکہ کر تالا کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی اندر کا
منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آیا اور چودہ طبق روشن
ہو گئے۔

سامنے ایک دیوار سے لاشیں بھول رہی تھی۔ اس کی
دوشنی میں ہمیں اپنی پوری نیم نظر آگئی۔ ایسی بی برکت

کر اس نے اپنے طلائی لاکڑے سے سلگایا تو انگلیوں میں ڈانٹ
کی انگلیاں جھلکا اٹھیں۔ دھواں فضا میں چھوڑ کر اس نے
گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"ہم اسی وقت تم دونوں کو بچان کیا تھا جب غلام خاں
نے تمہارا تعارف شکاری کے طور پر کر لیا تھا۔ تمہارا گرا نہیں
لوگ ایسی دن دھوکا تالاب سے پکڑا گیا تھا جس دن تمہاؤندہ
بستی کی طرف گئے تھے۔ بس ایک وہ کافر کا بچہ کیا نام ہے
اس کا کبیر علی شاہ؟ وہ ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔ اس کا دو کتا ہم
نے مار دیا ہے وہ خود بخود گر کر کھل گیا۔ چوڑے گائیں ہم اس کو۔
اگر وہ بیس ہے تو اسے ڈھونڈنے کا اور ڈنڈا ڈولی کر کے لائے
گایاں" میں نے خاموشی سے یہ سب کچھ سنا۔ عیسیٰ جان
نے میری طرف انگلی اٹھائی "اننگیز باجوہ کہتا ہے تم اس کا بیڈ
کانٹیل ہے کیا یہ بات صحیح ہے؟"

میں نے کہا "تم کو کیا لگتا ہے؟"
وہ بولا "مجھ کو تو ایک دم غلط لگتا ہے۔ تم کوئی چار سو بیس
کر رہا ہے۔ بیڈ کانٹیل تمہارے مافق خطرناک نہیں ہوتا۔
ایک دم چالی والا کھلنا ہوتا ہے وہ۔"

"مجھ میں تمہیں کیا خطرناک نظر آیا ہے؟" میں نے
پوچھا۔

"اوضائی خوار" تجھ پر اور والے کا مار "عیسیٰ جان نے
دانت کھوس کر کہا "ابھی تو نے کچھ کیا ہی نہیں۔ بے فٹ کا
بندہ بھون کر پانی میں غرقاب کر دیا اور دامن صاف کا
صاف۔"

لگتا تھا عیسیٰ جان نے غلام خاں کی موت کا منظر اپنی
آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن اگر ایسا تھا تو پھر وہ رقم کے بارے
میں کیوں نہ جان سکا؟ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔
عیسیٰ جان جہاں چھپا ہوا تھا وہاں سے وہ مجھے رقم نکالنے
لگاتے نہیں دیکھ سکا۔ اب وہ اس سلسلے میں میری زبان کھلوانا
چاہتا تھا اور اس کے ارادے خطرناک نظر آ رہے تھے۔ اس
نے ایک بار پھر را نقل میری طرف سیدھی کر لی اور بڑے
ضدی لہجے میں مجھ سے رقم کے بارے میں استفسار کرنے لگا۔

اس کی انگلی حسب سابق لٹپٹی رہی اور وہ دھوکائی کر رہا
تھا کہ جس طرح میں نے غلام خاں کو گولی ماری تھی وہ مجھے
مار دے گا۔ میں زیادہ دیر اسے تاؤ میں رکھنا نہیں چاہتا تھا
کوئی کتابتھی بڑا "نفیسات داں" ہو زیادہ دیر اس قسم کا رعب
نہیں لے سکتا۔ عیسیٰ جان زچ ہو کر مجھے گولی مار سکتا تھا کیونکہ
میری وفات حسرت آیات کے بعد بھی وہ گڑھے کے ارد گرد
رقم ڈھونڈ سکتا تھا۔ جبکہ مجھے کوئی کمانے میں فرشتہ اجل سے

صاحب "اننگیز باجوہ" صوبے دار مرخان، فورس کے جوان
بہاں موجود تھے۔ اگر کوئی نظر نہیں آیا تو کبیر علی شاہ
غایا بیڈ کانٹیل ڈنڈے۔ وہ سب کے سب چٹائی پر بیٹھے تھے اور
اپنے بیٹھے تھے کہ انہیں دیکھ کر آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا
تھا۔ ایسی بی برکت صاحب کا سر ایک خضار دار کی گودوں میں تھا
اور خضار دار کا سر صوبے دار مرخان صاحب کی پشت پر دھرا
ہوا تھا۔ مرخان صاحب ہاتھ پاؤں پھیلائے اوندھے پڑے
تھے اور آنکھیں بند کیے تھانے کیا بیڑا رہا ہے تھے۔ اننگیز باجوہ
سب سے الگ گھٹنوں میں سر ہوی بیٹھا تھا اور عجیب سی آواز
میں بھون رہا تھا۔

باقی لوگوں کا حال بھی اس سے ملتا جلتا تھا۔ ان سب کی
آنکھیں سرخ انگارے ہو رہی تھیں اور وہ ہوش و حواس سے
بے گان تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ انہیں زیادہ مقدار میں
لیڈن وغیرہ کھلا کر دیکھنے والوں کے لیے قابلِ رحم بنادیا گیا
ہے۔ کہاں وہ چوڑی جھانپوں والے چوچوٹ لیے جان جو
تالوں توڑنے والوں کے دانت کھٹے کرنے کا عزم رکھتے تھے
اور جیڈ جیٹ الوٹھی سے سرشار "ڈوے مشٹ کے نشیب
فرز میں ڈاکوؤں کو کھوجتے پھرتے تھے اور کہاں یہ سکڑے
نئے زمین چانتے ہوئے انگوٹھی" میں ششدر رہ گیا۔ یقیناً
انہوں نے خود سے تو یہ لعنتی نقشہ نہیں کیا ہوگا "انہیں زبردستی
بلکہ بے زور بازو اس حال کو پہنچایا گیا تھا۔"

ایسی بی برکت صاحب نے اپنی چند حیاتی ہوئی آنکھوں
سے میری طرف دیکھا۔ سر ہجے ان کے کندھوں پر سنبل
نہیں پارہا تھا۔ کچھ دیر مجھے بچانے کی کوشش کرتے رہے پھر
بے دم سے ہو کر دوبارہ خضار دار کی گودوں میں ڈھے گئے۔ ایک
ناٹس ٹانگ میرے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ اس نے عباس
خاں کو بچان کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن پر کٹے پر بندے کی
طرح اوندھے منہ زمین پر جا کر اس کے منہ سے رال برہ
رہی تھی۔ عیسیٰ جان کے اشارے پر فریہ اندام چوکیدار نے
دروازہ پھر منقل کر دیا۔ را نقلوں کی زد میں ہم دونوں کو داہیں
پھلے والے کمرے میں لایا گیا۔

عیسیٰ جان اب پہلے سے زیادہ با اعتماد نظر آ رہا تھا۔ غالباً
اس اعتماد میں گونا گوں اشارے کا ایک سبب عباس خاں کے
جہرے پر پھیلی ہوئی زردی اور بدحواسی بھی تھی۔ وہ ڈھولے
ایسے اور دو بے گانے والا نازک مزاج لڑکانہ جانے کس
طرز لائٹس ٹانگ بھرتی ہو گیا تھا۔ اب موت اس کی آنکھوں
کسی نہیں ٹوڑے جسم میں ناچ رہی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر
عیسیٰ جان ایک کرسی فاشے پر بیٹھ گیا۔ امپروڈ سکرٹ نکال

لغات کے سوا کوئی اذواج نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک لاکھ چالیس ہزار روپیہ بچا کر میں نے کون سا عمل کھڑا کر لیا تھا۔ میں نے مناسبت کی راہ اختیار کرتے ہوئے عیسیٰ جان سے عندیہ ظاہر کیا کہ میں اسے رقم کے بارے میں بتا دوں گا۔ اس نے کہا ”تم جانتا چاہتا ہے کہ وہ کہاں چلایا ہے تم نے؟“

میں نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا ”تمہارا کیا خیال ہے؟“

میرا یہ ہلکا سا انداز عیسیٰ جان کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ جس قسم کا غصہ تھا تو کبھی اس کے سامنے یہ لہجہ اختیار کرتے ہوں گے۔ وہ مجھے کڑی نگاہوں سے گھور کر بولا ”ہمارا خیال ہے تم نے گڑھے کے آس پاس درختوں میں کہیں رکھا ہوگا۔“

”تمہارا خیال صحیح ہے“ میں نے جواب دیا۔

”کہاں رکھا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اس طرح تو نہیں بتا سکوں گا“ میں نے جواب دیا۔ ”اندھیرا تھا اور وہاں چاروں طرف ایک جیسے ہی درخت ہیں۔ ہاں وہاں بچہ کھڑا چلتا مشکل نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے“ عیسیٰ جان اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر بولا ”اب آرام کرو۔ صبح تمہیں ہمارے ساتھ جانا ہوگا۔“

وہ کچھ چلتا ہوا سا تھا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ وہیں ”پہاڑی رستوران“ پر اس نے ہم دونوں کی تلاش کیوں نہ لے لی۔ دراصل میری پھولی ہوئی جیکٹ کی وجہ سے وہ دھوکے میں رہا۔ اسے یقین تھا کہ رقم میرے پاس ہی ہوگی۔ عیسیٰ جان اور اس کے دونوں مسلح ڈشکے باہر نکل گئے تو دھواڑے پر ایک وزنی کالا ڈبکڑا اور یوں ہائی ”چھاپا ماریم“ کی طرح ہم بھی پابند سلاسل ہو گئے۔ ہاں یہ فرق ضرور تھا کہ ہم نشتے میں نہیں تھے۔

میں نے عباس خاں کی دھارس بندھائی اور اس پر لفافہ ڈال کر اسے سوجانے کی ہدایت کی۔ خود میں بھی لفافہ لپیٹ کر لائین کے قریب دروازہ ہو گیا۔ ذہن گھڑو ڈاکہ دیدان بنا ہوا تھا۔ ایس بی برکت اور دیگر حضرات کیسے ”نرپ“ ہوئے؟ کبیر علی شاہ کہاں ہے؟ شکر ابھی تک سامنے کیوں نہیں آیا؟ یہ اور ایسے ہی سوال ذہن کو بچو کے نگارے تھے اور ان سب سوالوں پر حاوی یہ سوال تھا کہ عیسیٰ جان اب مجبوس افراد کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایسی مثالیں موجود تھیں کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار مجرموں کے ہتھے چڑھے اور ان کے بدلے خلیفہ رقم

بطور تادان مانگی گئی۔ انہیں قتل بھی کیا جاتا تھا اور بعض اوقات افغان علاقے میں اسمگل بھی کروایا جاتا تھا۔ اس زوئے شبت کے اس دور افتادہ خرابے میں بھی یہ سب ہو سکتا تھا۔

میں لفافہ میں خود کو چھپائے دیوار کی طرف چہرے کی لہجہ تھا۔ پتھر کی چوکر سلوں کی دیوار جسے جگہ جگہ پھاس نا کلکوں سے سارایا گیا تھا۔ میری آنکھوں سے صرف ایک فٹ کی دوری پر تھی۔ بے خیالی میں دیوار کی طرف دیکھتے دیکھتے اچانک میں چونک پڑا۔ دیوار کی ایک سل اپنی جگہ سے ہلکے ہوئی سی تھی۔ میں نے ہاتھ سے دیا تو وہ ہلنے لگی چیرے وہ دیوار میں نہ جتنی ہو سکی میز پر دھری ہو۔ سل ہلنے کے ساتھ ہی پتھر کے کچھ چپے گولے فرش پر آ کر گرے۔ میں چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ لائین اٹھارہ نزدیک کی اور غور سے دیوار پر یہ حصہ دیکھا۔ ایک دم رنگوں میں خون کی گردوش تیز ہوئی۔ پتھر کی اس سل کے ارد گرد مسالا۔ اور گار کا رید کرید کر اسے بڑی حد تک دیوار سے جدا کر دیا گیا تھا۔ یقیناً یہ کام کئی دنوں بلکہ ڈیڑھ دو ہفتوں میں انجام پایا تھا۔ نقب زن کوئی ہوشیار شخص واقع ہوا تھا۔ وہ سل کو آخری حد تک گھس کر کھڑا تو اس کے باوجود طائرانہ نگاہ سے دیکھتے پر دیوار صحیح سالم نظر آتی تھی۔ سل کے ارد گرد نمودار ہونے والی دراڑ کو اس نے پچھلے کلکوں اور مٹی سے اس طرح بھریا تھا کہ کہیں کوئی رشتہ ظہر نہیں آتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑا تھا اس کمرے کے دائیں بائیں اور عقب میں کمرے تھے۔ پھر یہ نقب کیا سوز رکھتی تھی؟ کیا نقب زن صرف ساتھ والے کمرے میں بچہ چاہتا تھا!

میں نے دروازے کو اندر سے گنڈی چڑھائی اور بڑی احتیاط کے ساتھ سل کے ارد گرد سے پتھر کے چپے گولے اور بھر بھر مٹی نکالنی شروع کی۔ یہ کوئی ڈیڑھ فٹ موٹی دیوار تھی۔ نقب زن سل کے چاروں طرف تقریباً ایک فٹ گہرائی پھیل چکا تھا۔ شاید اسے ایک آدھ دن اور ملتا تو وہ اس خلا پر بار کر دیتا۔ سل کے چاروں طرف یہ خلا دو انچ چوڑا تھا لیکن کہیں کہیں یہ چوڑائی چار انچ سے تجاوز کر رہی تھی جہاں چوڑائی زیادہ تھی وہاں کریدنے کا کام زیادہ آسانی ہوا تھا لہذا خلا گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے نکالی کی گھڑی دیکھی ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ سرویوں کی طویل رات ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ ایک لمبی سلاطین میرے پاس ہو تو س پندرہ منٹ کی کوشش سے میں یہ چوکر سل اس دیوار میں سے باہر کھینچ سکتا ہوں۔ کھانے کے بر

ابھی تک کمرے کے ایک گوشے میں دھبے تھے۔ میں نے وہاں سے سالن کا پڑا چٹا لیا اور اس کی ڈنڈی سے دیوار کا کچا مسالا کریدنے لگا۔ یہاں سے خلا کی چوڑائی زیادہ تھی لہذا میرا پورا ہاتھ اندر جا رہا تھا۔ شروع میں دقت ہوئی لیکن جلد ہی سرخ بھر بھر مٹی باہر آنے لگی۔ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا جتنا نظر آ رہا تھا۔ دو گھنٹے کی کار جدوجہد نے مجھے سینے میں شرابور کر دیا اور پچھلے استحال سے شیزھا ہو کر رہ گیا۔ عباس خاں بھی اب جاگ چکا تھا اور یہ سارا منظر حیرت اور خوف کے لیے نئے آثارات سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سمجھ جوتی کے حق میں نہیں تھا لیکن میرے سامنے زبان بھی نہیں کھول سکتا تھا۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ دل ہی دل میں وہ میری ہانک کی لیے دعا کر رہا ہے۔

”احسان صاحب! ام کو لگتا ہے یہ دیوار ڈیڑھ فٹ کا نہیں ہے۔ ڈیڑھ فٹ کا ہونا تو اب تک آپ کا ہاتھ آ رہا ہے ہو چکا ہوگا۔“ اسی الفاظ اس کے منہ سے نکلتے تھے کہ میرا ہاتھ آ رہا ہو گیا۔ مسالا اور کنکر وغیرہ پر شور آواز سے ساتھ والے کمرے میں گرے۔ آواز معمولی تھی لیکن شب کے گہمیر سناتے میں اسے پر شور کے بنا چاہ رہا تھا۔ عباس خاں ہنس کر رہ گیا۔ اس کے سینے کی وجہ نہایت مقبول تھی۔ دیوار میں سوراخ نمودار ہوتے ہی دوسری جانب سے مدھم نوسانی بڑبڑاہٹ سنائی دی تھی۔ پھر کوئی لڑکی یا عورت خوابیدہ آواز میں چیختی تھی۔ اس کے بعد دیوار کی دوسری جانب دھڑ دھڑ دھواڑہ جتنے کی آواز آئی اور عورت زور زور سے چلانے لگی۔

”دھواڑہ کھولوں میں کبھی ہوں پالی خاں دروازہ کھول۔ پالی خاں۔ پالی خاں“ وہ مسلسل بکارتی جا رہی تھی۔ عورت کالب ولجہ غیر متعاقب تھا۔ وہ اردو بول رہی تھی۔ نہ جانے کیوں میری چہرہ حس نے پکار کر کہا کہ یہ بھی ہماری ہی طرح کوئی مجبور دلا چلا رہی ہے۔ میں نے دیوار کے سوراخ سے منہ لگایا پھر جو خبی عورت چیتنے چیتنے سانس لینے کے لیے رکی۔ میں نے تیز سرگوشی کی ”میری بات سنو میں۔ میری بات سنو۔ میں دشمن نہیں ہوں۔“ عورت کی چیخ دیکار گم گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس نے میری آواز سن لی ہے اور میری اردو دانی نے اسے چونکا دیا ہے ”بھئی میری بات سنو“ میں نے درخواست کے لیے میں کہا ”میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں“ ہم دونوں ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔

اندھیرے میں چلایا ہوا یہ تہہ بھی نشانے پر لگا۔ سوراخ میں چپکتی ہوئی روشنی کا زاویہ تبدیل ہوا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ

عورت لائین لے کر کمروں کی درمیان دیوار کی طرف آ رہی ہے۔ ”کون ہو تم؟“ سوراخ کے قریب سے ایک نہایت ڈری سہمی ہوئی آواز ابھری۔ ”آپ کی طرح کا قیدی ہوں میں بھی۔ بھڑا آپ کو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ جو تم کہیں نہیں کھانے کو تیار ہوں۔“

”ٹھیک۔ کیا چاہتے ہو تم؟“

”آپ کا اعتماد اور تعاون۔“

”میں کچھ سمجھی نہیں۔ اور یہ دیوار کیوں توڑی ہے تم نے۔ کیا اس سے پہلے بھی تم ہی اس دیوار کو کھودتے تھے؟“ ”جی ہاں“ میں نے بے ضرر جھوٹ بولا ”بڑی مشکل سے آپ تک پہنچا ہوں۔ اب تمہاری ہی ہمت آپ کریں۔ جو کام میں کئی گھنٹوں میں نہیں کر سکتا وہ آپ دس پندرہ منٹ میں کر لیں گی۔ اگر کوئی آہنی سلاخ یا اس قسم کی چیز آپ کے پاس ہے تو اپنی طرف سے اس سل کو میرے کمرے میں دھکیلیں گی کوشش کریں۔“

”لیکن تم چاہتے کیا ہو؟“ عورت کے لیے میں بدستور خوف کی لڑزش تھی۔ ویسے وہ کوئی پڑھی لکھی خوش اطوار خاتون معلوم ہوئی تھی۔

میں نے کہا ”بھئی جی! ایک قیدی رہائی کے سوا اور کیا چاہتا ہے۔ یقیناً آپ بھی یہی چاہتی ہوں گی۔ یقین کریں آج رات ہم دونوں کی مراد پوری ہو سکتی ہے اور ایسے محفوظ طریقے سے کہ آپ قصور بھی نہیں کر سکتیں۔ ہم یہ رستہ بتائیں تو میں آپ کو سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ آپ خود کہیں گی کہ ہاں ہم رہا ہو سکتے ہیں۔“

میں اپنے پر اعتماد لہجے سے عورت کی دھکتی رنگوں پر ہاتھ رکھ رہا تھا۔ اور وہ میرے دکھائے ہوئے من پسند خواب میں الجھنے لگی تھی۔ میں نے اشاروں کنایوں میں عباس کو خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا تھا اور عورت کے سامنے خود کو تھا خا ہر کر رہا تھا۔ دو کے بجائے ایکے محو پر اعتماد کرنا عورت کے لیے زیادہ آسان تھا۔

دو تین منٹ ہمارے درمیان گفتگو ہوئی اور عورت میرے ذہب پر آگئی۔ میں نے عورت کے متعلق جو اندازے لگائے وہ بالکل درست تھے۔ عیسیٰ جان کی پستانی ہوئی ڈبچیریں ہم دونوں کے درمیان دروہ مشترک کی حیثیت رکھتی تھیں۔ عورت نے میرے سینے پر عمل کیا اور تھکی نوکدار چیز سے سل کے ارد گرد کا مسالا جھاڑنے لگی۔ اس

طرف سے میں نے بھی کوشش جاری رکھی۔ دس پندرہ منٹ میں ہم چوکور سل دیوار سے ٹکائے میں کامیاب ہو گئے۔ ہیٹ کے بل لیٹ کر میں سوراخ میں سے بہ آسانی گزر گیا۔ دوسری طرف لائین کی روشنی میں ایک حسین و جمیل شاداب عورت میرے سامنے تھی۔ اس کی عمر تیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اپنے خدوخال سے وہ وسطی پنجاب کی رہنے والی نظر آتی تھی۔ لمبا قد، بھرا بھرا جسم، بزرگوار فیصں پر اس نے ایک سفید چمکیلی جری پن ریکی مٹی گرم چادر اس کے سر سے ڈھلک کر شانوں پر رکھی ہوئی تھی اور سپید کبوتروں جیسے نرم و نازک ہاتھ مٹی میں تھمڑے ہوئے تھے۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف و ہراس لہو میری طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔

”تم کھڑا نہ بن۔ ہماری طرف سے تمہیں کوئی خطرو نہیں ہے۔“ میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر قریب چاہائی پر بٹھا دیا۔

”کک۔۔۔ کوئی اور بھی ہے تمہارے ساتھ؟“ اس نے درمیانی خالی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔ میرا سامھی ہے۔ تم میری طرح اس پر بھی بھروسہ کر سکتی ہو۔“

اس کے ہونٹ تھرا تھرا کر رہ گئے۔ میں نے خلا کے پاس جھک کر عباس خاں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی لائین بٹھا دے۔ دونوں کمرؤں کی درمیانی دیوار کے ساتھ ٹکڑی کی ایک الماری رکھی تھی۔ الماری کی ایک سائڈ کو سنگار میز کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ وہاں بیٹھ لگا ہوا تھا اور پچھلے پر میک اپ کا سامان بٹھا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ عورت نے خوشبو لگا رکھی ہے اور چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی ہے۔ کمرے میں دو چار پائیاں تھیں۔ ان پر پھلدار چادریں بچھی تھیں اور سرخ شیشیل کے لفافے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں ایکٹھی بھی موجود تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ایک چارپائی پر کوئی سو رہا ہے۔ قد کاٹھ سے وہ بچہ نظر آتا تھا۔

”کون ہے یہ؟“ میں نے عورت سے پوچھا۔

”بچہ ہے۔ میرے ساتھ اس کمرے میں رہتا ہے۔“ عورت نے مختصر جواب دیا۔

میں نے ہنر سمجھا کہ ٹکڑی کی الماری کو تھوڑا سا کھٹک کر خلا کے سامنے کھڑا جائے۔ عورت نے میرا ہاتھ پٹایا اور ہم نے الماری کو حرکت دے کر درمیانی خلا ڈھانپ دیا۔ میں نے عورت کا اعتماد بحال کرنے کے لیے پہلے اسے اپنے پارے

میں بتایا۔ ظاہر ہے یہ ایک اور حوا تعارف تھا بلکہ میرے نام کی حد تک فرضی بھی تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہملا ہور سے آئے ہیں۔ کچھ متناہی دوستوں کے ساتھ مل کر دھوکی تالاب کے علاقے میں شکار کھیل رہے تھے کہ بیٹھی جان کے پتے چڑھ گئے۔ اب کئی دونوں سے اس ڈیرے پر پابند ہیں۔ عورت جلد از جلد جانا چاہتی تھی کہ میرے پاس وہ کون سی جادو کی چھڑی ہے جس کے بل بوتے پر میں یہاں سے نکلنے کا دعویٰ کر رہا ہوں۔ چھڑی بھی ہی نہیں تو میں دکھا دیا۔

یہ کرا بھی ہمارے کمرے کی طرح تین اطراف سے گھرا ہوا تھا اور قطعی ناقابل شکست تھا بلکہ یہاں تو دروازے کے ساتھ وہ سلاح دار کون بھی نہیں تھی جو ہمارے کمرے میں موجود تھی۔ اس کی جگہ صرف ایک روشن دان تھا۔ تاہم میں نے اپنی مایوسی عورت پر ظاہر نہیں ہونے دی اور اسے اپنے سوالوں کے دھارے میں بھاگ کر ”تعارف“ کی طرف لے گیا۔ وہ ایک سمجھ دار اور محتاط عورت تھی۔ اپنی سائڈ ہر طرح محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے شائستہ لہجے میں معذرت چاہی کہ وہ اپنا نام بتا نہیں سکتی تاہم یہ بتا سکتی ہے کہ وہ کیسے اور کون کون سی جگہیں۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ جو وہ بتا رہی تھی میں نے اسی کو قیمت جانا۔ عورت نے بتایا کہ وہ دو بچوں کی ماں ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ بیٹھی جان نے کسی طور اس کے شوہر کو بلیک میل کیا اور پولیس سے بچنے کے لیے ان کے گھر میں ایک ماہ تک زبردستی پناہ گزین رہا۔ اسی دوران اس کی نیت خراب ہو گئی۔ جب وہ ان کے گھر سے رخصت ہوا تو ساتھ ہی اسے بھی اغوا کر کے یہاں قبالہ علاقے میں لے آیا۔ اب وہ بچپنے کی ماہ سے یہاں اس کی جس بے جا میں تھی اور وہ سارے ٹوٹے پھیلے دی گئی جو ایک مغویہ کی قسمت ہوتے ہیں۔

میرا دماغ سننا رہا تھا۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی خود عورت کو سر تپا کھورا پھر میرے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔ ”میں۔۔۔ میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔ تم نبیلہ ہو۔“ مالک محمد کی پوری۔۔۔ تم تینو پر میں رہتی ہو۔“

عورت کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اور چہرہ چند لمحوں میں کئی رنگ بدل گیا۔ ”کک۔۔۔ کس کی بات کر رہے ہو؟“ وہ کمزور سی آواز میں بولی۔

”پہچانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ نبیلہ۔ تم اعتراف کر دیا نہ کرو۔ حقیقت یہی ہے کہ تم نبیلہ ہو۔ اور میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔ تاہم اب وہ باتیں بھی جو ابھی تمہارے

علم میں نہیں۔ تمہارا پہلا خاوند، تمہارا تیسرا بچہ، تمہاری وہ بیوی جس نے تمہیں مالک محمد کی بیوی بنایا۔ یہ سب کچھ میرے علم میں ہے۔“

نبیلہ جان گئی کہ اب ہتھیار ڈالنے کی سوا چارہ نہیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سرایتی گہری لے دی تھی۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر وہ بولی ”آپ کیوں کر رہے ہیں ایسی باتیں کون ہیں آپ؟“

میں نے ملاحت سے کہا ”تمہارا خیر خواہ ہوں نبیلہ“ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اجنبیت کی دیوار نہیں گراؤ گی۔۔۔ تو ہم وقت ضائع کرتے رہیں گے اور آج کی رات یہ وقت ہی سب سے قیمتی چیز ہے۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ نہ صرف خود بلکہ کچھ اور لوگوں کو بھی نکالنا ہے۔ مجھے بتاؤ تم یہاں کیسے پہنچی ہو؟ کب سے یہاں بند ہو اور تمہارے خیال میں یہاں سے نکلنے کے امکانات کیا ہیں؟“

وہ بولی ”پہلے آپ بتائیں۔ آپ مالک محمد کو کیسے جانتے ہیں کیا آپ ان سے ملے تھے؟“

”ہاں مالک محمد سے میری پرانی صاحب سلامت ہے۔ قادر زمان ہمارا مشترکہ دوست تھا۔ اکثر جموں خاص میں مالک سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ چند روز پہلے میں شوپورہ میں تمہارے گھر جا چکا ہوں۔ تمہارے بچوں سے بھی ملا ہوں“ وہ سب تمہاری چھائی میں پریشان ہیں اور ہر بل تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔“

بچوں اور شوہر کا سن کر وہ مصیبت زدہ تڑپ اٹھی۔ آنسوؤں نے آنکھوں پر یلغار کی اور احتیاط کا ہر بند توڑ کر رخساروں پر بہہ نکلے۔ ”کیسے ہیں میرے بچے؟“ آپ نے خود انہیں دیکھا تھا؟ وہ ٹھیک تو ہیں۔ بیمار تو نہیں ہو گئے۔ پہلی کیسا قرا زیادہ دوا تو نہیں تھا۔“ ایک دم اس کی چکیاں تیز ہو گئیں اور وہ کھجکا تھام کر آگے کو جھک گئی۔

سردی بہت زیادہ تھی اور چادر اس کے کندھوں سے ڈھلک کر زمین پر گر گئی تھی۔ میں نے چادر اٹھائی اور احتیاط سے اس کے سر پر ڈال دی۔ میرے ہمدردانہ انداز نے اسے کھل کر رونے پر مائل کر دیا۔ مٹی سے آلودہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے ہوئی آواز کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن غم کی یورش میں تفصیل ضبط کا ہر بند ٹوٹا چلا گیا۔ میں نے اسے روکنے دیا۔ یہ آنسو اس کی آنکھوں کو شیشے کی طرح شفاف کر رہے تھے اور میں جانتا تھا جب تھوڑی دیر بعد وہ بلیکس اٹھائے گی تو اس شیشے کے آریار سب کچھ صاف نظر آئے گا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جب گھٹا مجموعہ کمرس چکی اور نبیلہ کا چہرہ

دھلا ہوا زرد گلاب سا نظر آنے لگا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اور اس کے درمیان بہت سے بڑے اٹھ گئے ہیں۔ پودیں میں تو دس کی طرف سے آنے والی ہوا بھی اچھی لگتی ہے۔ میں تو پھر ایک جیتا جانتا فرد تھا۔ نہ صرف اس کا گھر دیکھ کر آیا تھا بلکہ اس کے جھکڑوں سے بھی مل چکا تھا۔ وہ مجھ سے اپنی شہ بدنت کا حال دریافت کرنے لگی۔ کمریہ کرید کر سوال پوچھنے لگی۔ میں بتاتا جا رہا تھا اور اپنے کام کی باتیں اس سے پوچھتا جا رہا تھا۔ یہ امر میرے لیے نہایت خوش گوار حیرت کا سبب بنا تھا کہ وہ ابھی تک حیات تھی۔ معلوم نہیں مالک محمد تک اس کے مرنے کی غلط اطلاع کیونکر اور کیسے پہنچی تھی۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ مالک محمد اسے مردہ تصور کر چکا ہے اور نہ ہی یہ بتایا کہ اس کا سلا پچھل چکا ہے اور اب مالک محمد نے اسے بیٹوں کی طرح گھر میں رکھا ہوا ہے۔ یہ اطلاعات یقیناً اس کے لیے مستحسنی خیز نہیں اور میں فی الحال اسے مزید پہچان کا شکار کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے بے دار ہونے کے بعد وہ بڑی طرح بیچتی چلائی تھی اور دروازہ بھی بیچتی رہی تھی پھر بھی کوئی اندر نہیں آیا اس کی کیا وجہ ہے؟ وہ آہ بھر کر بولی ”میں ان چیتنے چلانے پر کوئی کان نہیں دھرتا“ کونگے ہرے لوگ ہیں یہ۔ پتا نہیں کتنی راتیں میں نے اسی طرح بیچتے چلاتے گزار دی ہیں۔ اب تو عادت ہی ہو چکی ہے روکنے کی اور روکر سو رہنے کی۔“

میں نے پوچھا ”اتنی بیچ کر دھاڑ کے پاؤں جو نہ لڑا کھی ہے کدھ بڑا رہا ہے۔ کہیں اسے بھی کوئی نشہ وغیرہ تو نہیں کھلایا گیا؟“ میرا اشارہ چارپائی پر سوئے لڑکے کی طرف تھا۔

”آپ ٹھیک سمجھ رہے ہیں“ نبیلہ نے جواب دیا ”لیکن۔۔۔ اسے نشہ کھانے والی میں خود ہوں۔ میں اسے اس کمرے میں رکھنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ ایون کھا کر بے کدھ بڑا رہے۔ رات بھر اس کمرے میں کچھ بھی ہوتا رہے۔ یہ بے خبر سو رہا ہے۔“

آخری الفاظ کہتے کہتے نبیلہ کے چہرے پر فحالت اور بے کسی کا ایسا تاثر ابھرا کہ میں لرز کر رہ گیا۔ ”رات بھر اس کے کمرے میں کچھ بھی ہوتا رہے۔ یہ بے خبر سو رہا ہے۔“ اس کمرے میں کیا ہو سکتا ہے؟ یہ سوال کسی جواب کا غالب نہیں تھا۔ نبیلہ ایک مغویہ تھی۔ کمزور دوتاواں عورت اس کے محافظ باز اس سے بہت دور تھے کسی کو اپنی بے کسی کا تاوان ادا کرنے کے لیے اس نے لباس میں خوشبو لگا رکھی تھی اور چہرے پر سنگار کر رکھا تھا۔ برسر میں جموں جموں

علم میں نہیں۔ تمہارا پہلا خاوند، تمہارا تیسرا بچہ، تمہاری وہ بیوی جس نے تمہیں مالک محمد کی بیوی بنایا۔ یہ سب کچھ میرے علم میں ہے۔“

نبیلہ جان گئی کہ اب ہتھیار ڈالنے کی سوا چارہ نہیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سرایتی گہری لے دی تھی۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر وہ بولی ”آپ کیوں کر رہے ہیں ایسی باتیں کون ہیں آپ؟“

میں نے ملاحت سے کہا ”تمہارا خیر خواہ ہوں نبیلہ“ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اجنبیت کی دیوار نہیں گراؤ گی۔۔۔ تو ہم وقت ضائع کرتے رہیں گے اور آج کی رات یہ وقت ہی سب سے قیمتی چیز ہے۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ نہ صرف خود بلکہ کچھ اور لوگوں کو بھی نکالنا ہے۔ مجھے بتاؤ تم یہاں کیسے پہنچی ہو؟ کب سے یہاں بند ہو اور تمہارے خیال میں یہاں سے نکلنے کے امکانات کیا ہیں؟“

وہ بولی ”پہلے آپ بتائیں۔ آپ مالک محمد کو کیسے جانتے ہیں کیا آپ ان سے ملے تھے؟“

”ہاں مالک محمد سے میری پرانی صاحب سلامت ہے۔ قادر زمان ہمارا مشترکہ دوست تھا۔ اکثر جموں خاص میں مالک سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ چند روز پہلے میں شوپورہ میں تمہارے گھر جا چکا ہوں۔ تمہارے بچوں سے بھی ملا ہوں“ وہ سب تمہاری چھائی میں پریشان ہیں اور ہر بل تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔“

بچوں اور شوہر کا سن کر وہ مصیبت زدہ تڑپ اٹھی۔ آنسوؤں نے آنکھوں پر یلغار کی اور احتیاط کا ہر بند توڑ کر رخساروں پر بہہ نکلے۔ ”کیسے ہیں میرے بچے؟“ آپ نے خود انہیں دیکھا تھا؟ وہ ٹھیک تو ہیں۔ بیمار تو نہیں ہو گئے۔ پہلی کیسا قرا زیادہ دوا تو نہیں تھا۔“ ایک دم اس کی چکیاں تیز ہو گئیں اور وہ کھجکا تھام کر آگے کو جھک گئی۔

سردی بہت زیادہ تھی اور چادر اس کے کندھوں سے ڈھلک کر زمین پر گر گئی تھی۔ میں نے چادر اٹھائی اور احتیاط سے اس کے سر پر ڈال دی۔ میرے ہمدردانہ انداز نے اسے کھل کر رونے پر مائل کر دیا۔ مٹی سے آلودہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے ہوئی آواز کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن غم کی یورش میں تفصیل ضبط کا ہر بند ٹوٹا چلا گیا۔ میں نے اسے روکنے دیا۔ یہ آنسو اس کی آنکھوں کو شیشے کی طرح شفاف کر رہے تھے اور میں جانتا تھا جب تھوڑی دیر بعد وہ بلیکس اٹھائے گی تو اس شیشے کے آریار سب کچھ صاف نظر آئے گا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جب گھٹا مجموعہ کمرس چکی اور نبیلہ کا چہرہ

دھلا ہوا زرد گلاب سا نظر آنے لگا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اور اس کے درمیان بہت سے بڑے اٹھ گئے ہیں۔ پودیں میں تو دس کی طرف سے آنے والی ہوا بھی اچھی لگتی ہے۔ میں تو پھر ایک جیتا جانتا فرد تھا۔ نہ صرف اس کا گھر دیکھ کر آیا تھا بلکہ اس کے جھکڑوں سے بھی مل چکا تھا۔ وہ مجھ سے اپنی شہ بدنت کا حال دریافت کرنے لگی۔ کمریہ کرید کر سوال پوچھنے لگی۔ میں بتاتا جا رہا تھا اور اپنے کام کی باتیں اس سے پوچھتا جا رہا تھا۔ یہ امر میرے لیے نہایت خوش گوار حیرت کا سبب بنا تھا کہ وہ ابھی تک حیات تھی۔ معلوم نہیں مالک محمد تک اس کے مرنے کی غلط اطلاع کیونکر اور کیسے پہنچی تھی۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ مالک محمد اسے مردہ تصور کر چکا ہے اور نہ ہی یہ بتایا کہ اس کا سلا پچھل چکا ہے اور اب مالک محمد نے اسے بیٹوں کی طرح گھر میں رکھا ہوا ہے۔ یہ اطلاعات یقیناً اس کے لیے مستحسنی خیز نہیں اور میں فی الحال اسے مزید پہچان کا شکار کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے بے دار ہونے کے بعد وہ بڑی طرح بیچتی چلائی تھی اور دروازہ بھی بیچتی رہی تھی پھر بھی کوئی اندر نہیں آیا اس کی کیا وجہ ہے؟ وہ آہ بھر کر بولی ”میں ان چیتنے چلانے پر کوئی کان نہیں دھرتا“ کونگے ہرے لوگ ہیں یہ۔ پتا نہیں کتنی راتیں میں نے اسی طرح بیچتے چلاتے گزار دی ہیں۔ اب تو عادت ہی ہو چکی ہے روکنے کی اور روکر سو رہنے کی۔“

میں نے پوچھا ”اتنی بیچ کر دھاڑ کے پاؤں جو نہ لڑا کھی ہے کدھ بڑا رہا ہے۔ کہیں اسے بھی کوئی نشہ وغیرہ تو نہیں کھلایا گیا؟“ میرا اشارہ چارپائی پر سوئے لڑکے کی طرف تھا۔

”آپ ٹھیک سمجھ رہے ہیں“ نبیلہ نے جواب دیا ”لیکن۔۔۔ اسے نشہ کھانے والی میں خود ہوں۔ میں اسے اس کمرے میں رکھنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ ایون کھا کر بے کدھ بڑا رہے۔ رات بھر اس کمرے میں کچھ بھی ہوتا رہے۔ یہ بے خبر سو رہا ہے۔“

آخری الفاظ کہتے کہتے نبیلہ کے چہرے پر فحالت اور بے کسی کا ایسا تاثر ابھرا کہ میں لرز کر رہ گیا۔ ”رات بھر اس کے کمرے میں کچھ بھی ہوتا رہے۔ یہ بے خبر سو رہا ہے۔“ اس کمرے میں کیا ہو سکتا ہے؟ یہ سوال کسی جواب کا غالب نہیں تھا۔ نبیلہ ایک مغویہ تھی۔ کمزور دوتاواں عورت اس کے محافظ باز اس سے بہت دور تھے کسی کو اپنی بے کسی کا تاوان ادا کرنے کے لیے اس نے لباس میں خوشبو لگا رکھی تھی اور چہرے پر سنگار کر رکھا تھا۔ برسر میں جموں جموں

والے شہر اور سانیکل چلانے والے چیتہ کو دیکھ کر سب خوش ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ ان بے زبان جانوروں کو خلاف فطرت کاموں پر مجبور کرنے کے لیے کیا کیا ستم ڈھائے گئے ہیں۔ نیبلہ بھی ستم زدہ تھی۔ اس کے لباس کی خوشبو اور چہرے کا سنگار بھی ایسے ہی نادار جبر کی گمانی شاہ تھا۔ آنسوؤں اور آہوں کے درمیان اس نے مجھے اپنی روداد سناتے ہوئے کہا "میں جی جان مجھے شیخوپورہ سے نوشہرہ لے آیا تھا۔ یہاں اس کا ایک شاعر رمضان لکھانی نے زانیہ سورت کا کام کرتا ہے۔ میں جی جان نے مجھے دو تین روز اس کے گھر رکھا۔ رمضان لکھانی کا ایک ٹرک ہوزری وغیرہ کا سامان لے کر نوشہرہ سے نکل جا رہا تھا۔ میں جی جان میرے ساتھ اس ٹرک میں چھپ گیا اور یوں ہم نکل چپے آگے کا سفر ہم نے گھوڑوں پر طے کیا۔ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر سیاں پہنایا گیا۔ ایسی ڈیرے پر کم از کم سو افراد موجود ہیں وہ سب کے سب خطرناک لوگ ہیں ان کے پاس جدید رائلٹیں ہیں وہ اکثر کہیں میں لڑتے ہیں اور قتل و غارت کی نوبت آ جاتی ہے لیکن میں جی جان کا ایک ساتھی شکر شکر اکمل تھا۔ بعض لوگ اسے شکر بھارتی بھی کہتے ہیں۔ سنا ہے کہ وہ بے حد خطرناک شخص ہے چند روز پہلے میں جی جان کے کچھ ساتھیوں میں جھگڑا ہوا تھا۔ اس جھگڑے کی پاداش میں شکر شکر نے تین مردوں اور ایک عورت پر تیل چھڑک کر انہیں سرعام زندہ جلا دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد ڈیرے پر لڑائی بھڑکانا ہونے کے برابر ہو گیا ہے اور ہر شخص پر اسی شکر نامی قاتل کی دہشت سوار ہو گئی ہے۔ اس ڈیرے پر مردوں کے علاوہ چار پانچ عورتیں بھی موجود ہیں۔ وہ سب اغوا کر کے لائی گئی ہیں اور اب یہی خوشی ان ڈاکوؤں کے ساتھ رہ رہی ہیں۔"

نیبلہ اپنے بارے میں بتاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ تاہم اس نے انشاوروں کنایوں میں اپنے بارے میں جو کچھ بتایا اور میں نے اپنے سوالوں سے جو کچھ انکوائیاں اس کا لب لباب یہ ہے۔ میں جی جان ایک گھناؤنا اور بے رحم شخص تھا لیکن نیبلہ کے ساتھ اس کا رویہ خاصا مختلف رہا تھا۔ وہ اس کی غلامی و باطنی خوبیوں سے متاثر ہوا تھا اور اس سے نرمی کا برتاؤ کر رہا تھا۔ ابھی تک اس نے اپنے سوا کسی کو نیبلہ کے قریب نہیں پہنچنے دیا تھا۔ وہ نیبلہ کو اپنے مخصوص لمبے میں "شہزادی" کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اس کے لیے رنگ برنگ پوشاکیں لے کر آیا تھا اور چاہتا تھا کہ نیبلہ پیچھے کا دکھ بھول کر ہر وقت نئی سنوری رہے۔ شروع شروع میں نیبلہ بہت جیتی چلاتی تھی اور اس نے کئی بار بھانسنے کی کوشش بھی کی

تھی لیکن آخر جان مٹی تھی کہ یہ سب کوششیں بے سود رہیں۔ وہ میں جی جان کی مرضی کے بغیر یہاں سے نکل نہیں سکتی تھی۔ اپنے جگر گوشوں کو دوبارہ دیکھنے کی آس نے اسے زندہ رکھا اور وہ بوٹائی روٹلا کی ایک صابری دیوی کی طرح ہر شب سانپ کا ڈنک کھا کر بھی چاند کی کرنوں سے اپنے گشہ بچوں کی پوشاکیں بنی رہی اور ان سے دوبارہ ملنے کی دعا کرتی رہی۔ نیبلہ کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ میں جی جان اکثر اس کمرے میں آتا ہے اور صبح تک رہتا ہے۔

میں نے ایک نگاہ کمرے کے بند دروازے پر ڈالی۔ دروازے سے باہر سرد تاریک رات کی حکمرانی تھی۔ دور دراز سے کوئی آواز کوئی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی کچھ فاصلے پر کنگنا ہوا جھڑپا بھی شاید رات کے اس ہر خاموش ہو گیا تھا "کیا سوچ رہے ہیں؟" نیبلہ نے پوچھا۔

میں نے ایک نگاہ اس کے دلکش سراپا پر ڈالی اور نگاہیں چڑا کر پوچھا "کیس ایسا تو نہیں کہ میں جی جان۔" میں نے بات جان بوجھ کر ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"نہیں۔ اب کافی دیر ہو گئی ہے۔ وہ نہیں آئے گا" اس نے میرے ادھورے سوال کا مکمل جواب دے دیا "لیکن آپ بے بات مت۔ بھولیں کہ۔" وہ کچھ کہتے کہتے اچانک خاموش ہو گئی۔

"کیا کیا چاہتی ہو؟" میں نے اس کی وسیع و عریض آنکھوں میں جھونکا۔

"آپ بہت خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں" وہ بولی "معلوم نہیں آپ کی اس حرکت کا انجام کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کل اس سانولے شخص کی جگہ آپ کھڑے ہوں دیوار کے ساتھ۔"

"دیوار کے ساتھ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ پھر اچانک یہ خیال ذہن میں برق کی طرح گزرا کہ مجھے اپنی زبان قابو میں رکھنی چاہیے۔ میں نے نیبلہ کو یہی بتایا تھا کہ میں اپنے شکاری دوستوں کے ساتھ پچھلے کئی روز سے یہاں میوے ہوں۔ شاید نیبلہ اسی تاثر میں کسی واقعے کا ذکر کر رہی تھی۔ میرے سوال پر وہ چونک سی گئی "مجھے غمور کر رہی" کل آپ یہاں نہیں تھے کیا؟

"نہیں۔ میں اور عباس خاں دو تین روز سے دن کے وقت ڈیرے سے باہر ہوتے ہیں۔ میں جی جان کو غلام نہیں ہے کہ ہم نے کچھ قیمتی رائلٹیں ڈھونڈ لی ہیں اس کے اور گرد چھار بھی ہیں۔ وہ ہم سے دور رائلٹیں برآمد کرانا چاہتا ہے۔" ایک جھوٹ چھپانے کے لیے کئی جھوٹ بولنے پڑے

ہیں۔ میں بھی بولی رہا تھا۔ ایسی کچھ ضرورت تو نہیں تھی جھوٹ بولنے کی لیکن اس مرحلے میں میں کسی قیمت پر نیبلہ کا اصرار کھوتا نہیں چاہتا تھا۔ وہ حیرت سے بولی "کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ اپنے ساتھی کی موت سے بھی بے خبر ہیں؟" میرا دماغ سنسنہ کر رہا گیا "میں ساتھیوں کی بات کر رہی ہوں تم؟"

وہ بولی "آپ خود ہی تو بتا رہے ہیں کہ پکڑے جانے والے شکاری آپ کے ساتھی ہیں۔ شاید آپ بے خبر ہیں کہ پچھلے تین روز سے ان پر سخت مصیبت آئی ہوئی ہے۔ میں اس کھڑکی سے سارا تماشا دیکھتی رہی ہوں۔ وہ جس کی گردن اور ٹھوڑی پر پھنسی کے داغ سے تھک دلا پٹا لبا سا۔" شخص ایسا نام تھا اس کا آپ کا ساتھی تھا آپ تو جانتے ہوں گے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ بیڈ کا ٹیشیل نذیر کی بات کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ میں نذیر کے متعلق کئی بڑی خبر سننے والا ہوں "میں نے کما مذیر نام تھا اس کا۔ لیکن کیا ہوا ہے اسے؟"

وہ غم گرا انداز میں بولی "کل قتل کر دیا اسے شکر نے اور اب پتا نہیں کس کی باری ہے؟"

"کیا ہوا نذیر کے ساتھ؟" میں نے آرزو لہجے میں پوچھا۔

"یہ اسٹاک آؤی ہے وہ شکر بلکہ اسے آؤی کتا ہی نہیں چاہیے۔ اس کی صورت بھی کہاں ملتی ہے انسانوں سے کوئی خوشخوار جانور لگتا ہے۔ آپ نے وہاں جھرنے کے پاس "چاند ماری" کا میدان قودیکھا ہوگا۔ وہیں گولی ماری تھی انہوں نے اس بے چارے کو۔ اسے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا اور سر پر کتا ماری کے شرت کی چھوٹی سی بوتل رکھ دی تھی۔ شکر اور دوسرے نشانہ باز اس بوتل کو نشانہ بناتے تھے ایک بوتل ٹوٹ جاتی تھی تو دوسری رکھ دی جاتی تھی۔ وہ کب تک زندہ رہتا۔ آخر اسے مرنا ہی تھا اور وہ مر گیا۔ ایک شخص کی گولی اس کی پیشانی پر لگی اور وہ تڑپ کر کھنڈا ہو گیا۔ موت تو ہر ایک کو آتی ہے مگر وہ روز تک اس بد نصیب نے جو عذاب سانس کا تصور بھی لرزہ خیز ہے۔ موت کے خوف نے اس کے اعصاب کو کچل کر رکھا تھا۔ کسی وقت وہ ہانگوں کی طرح بیچن ہوا "نشانہ بازوں" کے قدموں میں گر پڑا اور ان کی منہیں سا جیس کرتا۔ وہ پکار پکار کر اسے پھر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیتے اور قتل دیتے کہ اگر وہ ان کے کسے پر مل کر رہا تو زندہ رہے گا۔ کل چاند ماری شروع ہونے کے

دس پندرہ منٹ بعد ہی اسے گولی لگ گئی۔ اس کی جگہ گھومنے والے ہاتھوں والے اس سانولے شخص کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ کل وہ پورا ایک گھنٹا موت کے منہ میں رہا ہے معلوم نہیں اب بھی اس کی جان بخشی ہوئی ہے یا نہیں۔"

گھومنے والے ہاتھوں اور سانولے شخص کا اشارہ بھی فوراً ہی میری سمجھ میں آ گیا۔ نیبلہ انکھڑا باجھ کی بات کر رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ کچھ دیر پہلے جب میں جی جان مجھے ایس بی اور صوبے دار وغیرہ سے ملانے لے گیا تھا تو وہاں انکھڑا باجھ کھنڈوں میں سونپے زار و قطار رو رہا تھا۔ غالباً نیبلہ کی اطلاعات درست ہی تھیں۔ ہینڈ کا ٹیشیل نذیر کے بعد اب انکھڑا باجھ کو دردناک صورت حال کا سامنا تھا۔ میری نگاہوں میں وہ ہینڈ کا ٹیشیل نذیر کی صورت گھونٹنے لگی۔ خاصا روحانی بندہ تھا وہ۔ میں اس کا ہم منصب "چاند ماری" سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف تھا۔ ایس بی برکت کی کلون مزاحیہ پر سرگوشیوں میں جٹ بنے تھے میرے کرنا اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ مجھے اس کی کئی خوبصورت باتیں یاد آئیں اور دل اندوہ سے لرز رہا ہوا گیا۔

بحیثیت مجموعی یہاں صورت حال ہماری توقع سے خاصی مختلف نکلی تھی۔ سب سے بڑا "سیٹ بیک" تو یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ ایس بی صاحب ڈاکوؤں پر چھاپا مارے ڈاکوؤں نے ان پر چھاپا مار دیا تھا اور اب چھاپا مار رہی اپنی گاڑیوں اور اسلحے سے محروم ہو کر نشے میں چور یہاں بند پڑی تھی۔ دوسرے میں جی جان کے اس ڈیرے پر ہجران باصفائی تعداد ہمارے اندازوں سے زیادہ تھی۔ نیبلہ نے بتایا تھا کہ یہاں کم بیش سو افراد ہیں۔ سونہ بھی ہوتے تو ساتھ ستر کہیں نہیں گئے تھے۔ اگلے لینے کے دینے پڑنے والا عمارہ یہاں صادق آیا تھا۔ شکر شکر اور میں جی جان قیوم پر قابو پانا تو بعد کی بات تھی پہلے تو یہاں سے نکلنے کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ نیبلہ ایسی سونے داغ کی نہیں تھی کہ صورت حال سمجھ نہ سکتی تھی وہ جان چکی تھی کہ میرے پاس ایسا کوئی پلان دلان نہیں جو جادو کی چھڑی کا کام کرے اور ہم یہاں سے جان بچا کر نکل جائیں۔ صرف اسے تعاون پر آمادہ کرنے کے لیے میں نے پلان کی بات کی تھی۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تھا۔ نیبلہ اور میں ایک دوسرے پر اعتماد کر رہے تھے تاہم اس دو طرفہ اعتماد کے حصول کے سوا یہ جدوجہد ناکام ہی رہی تھی۔ اور اب نیبلہ سرا سیدہ نظر آ رہی تھی۔ دونوں کھوں کی درمیانی دیوار کا خلا ایک جان لیوا زخم کی طرح ہماری نگاہوں کے سامنے کھلا

پڑا تھا۔ نہ یہ رفو ہو سکتا تھا اور نہ اسے ٹانگے لگ سکتے تھے۔ اور پردہ پوش رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔
”اب کیا ہو گا؟“ آخر نبیلہ کے دل کی بات زبان پر آئی۔

”یہ تمہارے سوچنے کی حدیں ہمارے سوچنے کی بات ہے۔ دیوار ہم نے چھڑی ہے تم چیتنے چلائے اور دروازہ پھٹنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھیں اور وہ تم نے کیا ہے۔ اس کے بعد صدمے سے بے ہوش ہو گئیں اور صبح تک بے ہوش رہیں۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟“

”لیکن آپ۔۔۔ آپ دونوں کو کیا ہو گا؟ وہ عینی جان تو آپ سے بہت بڑی طرح پیش آگے گئے۔ اور مانی گاڑ۔ یہ بہت بُرا ہوا ہے۔ بہت ہی بُرا ہوا ہے۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر قلم کیا۔

”دیکھو نبیلہ“ میں نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا ”خواہ مخواہ خود کو ہٹان نہ کرو۔ صبح ہو گا دیکھا جائے گا اور ہم خود دیکھیں گے“ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔“

اچانک ہم دونوں کو بڑی طرح ہنسا پڑا۔ کچھ قائلے پر باتوں کی مدغم آواز سنائی دی۔ پھر کوئی ہماری بھڑکے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ دنیا جہاں کا خوف نبیلہ کی آنکھوں میں سمٹ آیا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی ”ہائے میں مر گئی، مینی آ رہا ہے۔“

ایک لمحے کے لیے میں بھی پکرایا لیکن پھر خطرات سے بھاگنے والی ترنگ میرے اندر بے دار ہو گئی۔ میں نے دیکھا کڑی کی الماری بالکل خالی تھی۔ خلا کا کوئی حصہ نظر نہیں آ رہا تھا اور فرش پر گرے والا لمبا بھی الماری کے نیچے چھپ گیا تھا۔ میں نے نبیلہ کے کان میں تیز سرگوشی کی ”میں دروازے کے پاس کھڑا ہوجاتا ہوں دروازہ کھلے گا تو باہر نکل جاؤں گا گھبراہٹ امت ورنہ ہائز اچھوٹ جائے گا۔“

”لیکن؟“ اس نے کچھ کتا جا بھر آواز ملتی ہی میں گھٹ گئی۔ باہر دروازے کا تالا کھولا جا رہا تھا۔ کھاسی کی آواز سے اندازہ ہوا کہ تالا کھولنے والا عینی جان ہی ہے۔ گھڑی کر کر اس نے دروازے کو دھکیلا مگر اندر سے بھی گھڑی لگی ہوئی تھی۔

اس نے دھک دی اور طالع آواز میں بولا ”او شتراد!“ ہم تمہارا عینی جان ہے دروازہ کھولا وہ جگہ سے نٹے میں تھا۔

نبیلہ کا چومنی ہو رہا تھا۔ اس کی کشادہ آنکھیں سوائے انداز سے میرے چہرے پر جمی تھیں۔ یہ جان کر مجھے خوشی

ہوئی کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی رفاقت میں اس نے مجھ پر اعتماد کیا شروع کر دیا ہے۔ میں نے تیزی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ کوئی قابل اعتراض چیز وہاں موجود نہیں تھی۔ میں نے آنکھوں سے اسے اشارہ کیا کہ وہ آگے بڑھ کر دروازہ کھول دے۔ دروازے کی سمت بڑھی ہوئی خوابیدہ لمبے بولی ”آجھا۔ آئی ہوں“ میں نے جلدی سے لائین کی ٹوپی بچی اور دیوار سے پشت لگا کر چوٹ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ لائین کی زبردستی میں نبیلہ کا گھڑی چوڑیوں والا ہاتھ غصا میں اٹھا اور حنائی انگلیوں نے باہم بڑھ کر چوٹی کو قلم کیا۔ فیملے کا لہو آپسپا تھا۔

جو خونی دروازہ کھلا اور عینی جان اندر آیا، میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور بڑی سرعت کے ساتھ باہر نکل آیا۔ بس یہ ایک ساعت کا مکمل تھا۔ عینی جان نے اندر آکر جو ایک ساعت اپنی منظور نظر کو دیکھنے میں صرف کی تھی وہ میرے کام آگئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ محوم کر دروازہ بند کر آ، میں اس کے دائیں پہلو سے بال بال پچھا ہوا باہر نکل آیا تھا۔

باہر نکلتے ہی مجھے اپنی دائیں جانب ایک سایہ نظر آیا۔ یہ عینی جان کا کارندہ تھا۔ رات اٹھ اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ سوچنے کا نہیں حرکت میں آنے بلکہ حرکت میں رہنے کا وقت تھا۔ دروازے سے نکلے ہوئے میرا جو ”موسمیکسم“ بنا تھا وہ ابھی تک یہ قرار تھا۔ اسی موسمیکسم کو بچھاتے ہوئے میں نے جست کی اور چوہہ پندرہ فٹ کا فاصلہ پھلانگ کر پہرے دار پر جا پڑا۔ میرا بچاؤ اسی صورت میں تھا کہ پہرے دار کی آواز نہ نکلے اور میں اس کو خوش میں کامیاب ہوا۔ میرا بالیاں ہاتھ اس کے منہ پر آیا اور میں اسے اپنے جسم سے دھکیلتا ہوا ہمارا زمین پر گر آ۔ یہی وہ وقت تھا جب عینی جان دروازہ بند کر کے اندر سے گھڑی چڑھا رہا تھا۔ پہرے دار کے گردے اور اس کی رات اٹھ زینہ سے بھاگنے کی صدا زیادہ بلند نہیں تھی لیکن ایسی معمولی بھی نہیں تھی کہ کسی کے نوٹس میں نہ آسکتی۔ خاص طور پر عینی جان سے غلو تھا جو قوت سے قریب تر تھا۔

ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے تڑپتے پڑھتے پہرے دار کو گھسیٹا اور چھٹے کی طرف مہمانی کے مجھے ہودوں میں لے گیا۔ وہ اپنے ہونٹ میری پٹیلی سے آزاد کرانے کی پوری کوشش کر رہا تھا اور اس کی یہ کوشش کسی بھی لمحے کامیاب ہو سکتی تھی۔ میں نے اس کی غورمرد گردن اپنے بازو کے مخصوص داؤ میں جکڑی اور معمولی کوشش سے اسے اٹا

فعل کر دیا۔ بعد ازاں مجھے اپنی اس کارروائی پر افسوس بھی ہوا کیونکہ پہرے دار ہوش میں رہتا تو مجھے یہاں کے حالات سے آگاہ کر سکتا تھا۔ کم از کم یہ بتا چکا کہ شکر ڈپرے پر ہے اور اگر سے تو کہاں لے گا۔ اب پہرے دار کو ہوش میں لانے کی کوشش فصول تھی بلکہ یہ بھی دوشن سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ آئندہ ہوش میں آئے گا یا نہیں۔ وہ بے طرح مزاحمت کر کے نہ صرف میرے کام سے گیا تھا بلکہ ممکن تھا اپنے کام کا بھی نہ رہا ہو۔ وہ بہت گھبرائے سانس لے رہا تھا۔ آنکھیں اودھ کھلی تھیں اور ان میں صرف سفیدی نظر آ رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی اس کی کمرے کو لیں والا بیٹ کھولا اور اپنی کمرے سے باندھ لیا۔ رات اٹھ لوٹ گئی۔ میں نے اسے چپک کرنے کے بعد کدھر سے لٹکایا۔ پہرے دار کی جامد حلاشی کے دوران ایک مارچ اور پیش قبض نما خنجر بھی میرے ہاتھ لگا۔ میں نے یہ چیزیں اپنی جیکٹ میں منتقل کر لیں اور پیش آمدہ ہنگامے کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا۔

اچانک مجھے عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر تاریکی میں ایک خوابیدہ سی آواز ابھری ”بالی خاں“ کوئی بالی خاں کو پکار رہا تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہا کہ بالی خاں وہی ہے جو میرے پہلو میں بے مددہ پڑا ہے۔ کچھ دیر پہلے کمرے میں نبیلہ نے بھی اسی بالی خاں کو آوازیں دی تھیں۔ اس وقت بالی خاں نے سنتے ہوئے بھی نہیں سنا تھا اب وہ سنتے سے معذور تھا۔

بالی خاں کو آوازیں دینے والا اُدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے یہاں پہنچ سکتا تھا۔ میں زمین پر بیٹھے بیٹھے اوندھے منہ لیٹا اور تیزی سے ایک طرف رینگ گیا۔ چند فٹ آگے جا کر میں نے سرخ آتش طرح پھیرا کہ میرا چوہہ بے ہوش بالی خاں کی طرف ہو گیا۔ بالی خاں کا ڈیڑھ فٹ لمبا ٹھنڈی خنجر میرے ہاتھ میں تھا اور میں اسے استعمال کرنے کے لیے پوری طرح تیار۔ بالی کو ڈھونڈنے والا چہرے پان کا ایک نوجوان تھا۔ وہ ہاتھ میں لائین لے ایک مہمانی گھے عقب سے نمودار ہوا۔ رات اٹھ اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں لائین اور دوسرے میں چائے یا قہوے کا پیالہ تھا۔ پیالے کی طرح نوجوان کے ہتھوں سے بھی دھواں خارج ہو رہا تھا۔ وہ جانتا نہیں تھا موت اس کے کس قدر قریب سانس لے رہی ہے جب میں نے دیکھا وہ خوب صورت تھا اور اس کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے سوچا کاش وہ یہاں نہ آتا اور اگر آگیا ہے تو بالی خاں کو دیکھ کر بغیر چلا جائے۔

بالی خاں سے آٹھ دس فٹ دور ٹوک کر اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ بالی کا جسم چونکہ ایک گڑھا ناخیب میں تھا اس لیے لائین کی روشنی اس پر نہیں پڑی اور نوجوان واپس پلٹ گیا۔ مگر پھر اچانک اس کی بدھشتی نے آواز دی۔ موت حیات کی کشش میں جلتا بالی خاں کے حلق سے خرخر کر کے مدغم آواز نکلی۔ نوجوان بڑی طرح چونک گیا۔ لائین اور پیالہ ایک ساتھ ایک پھیر رکھ کر اس نے بڑی پھرتی سے رات اٹھ ہاتھ میں کی اور بالی خاں کی طرف آیا۔ میں اب پوری طرح تیار تھا۔ جو خونی اس نے جبکہ کر بالی خاں کو دیکھا میں گھٹات میں بیٹھے شکاری جانور کی طرح اس پر بھجنا۔ میں اس کی گردن دوچوتا چاہتا تھا لیکن وہ تڑپ کر میری گرفت سے نکل گیا۔ میں صرف اس کے لیے بالوں کو مٹھی میں جکڑا۔

ہر قبائلی کی طرح اس کے پاس بھی خنجر موجود تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے خنجر ہاتھ میں گھڑا لیکن مجھے اس پر فوجیت حاصل تھی۔ خنجر پہلے سے میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے وہ اس کی گردن میں گھونپ دیا۔ دونوں ہتھیلیں کے درمیان سے خنجر کی نوک اس کی گردن میں گھسی اور شہ رنگ کا تھی ہوئی پچھلی طرف سے نکل آئی۔ مضمون کے منہ سے آواز تک نہیں نکلی۔ وہ بد نصیب کسی شربابی کی طرح لڑکھایا اور اندھیرے میں کسی کا سارا ذہن آتا ہوا اوندھے منہ جاں بہ لب بالی خاں پر جا کر۔ میں نے اپنا خنجر اس کی گردن میں ہی اٹکا رہنے دیا اور اس کا خنجر اس کی بند مٹھی سے نکال کر اپنے لباس میں رکھ لیا۔ لائین بھجھا کر اور قہوے کا پیالہ جھازوں میں پھینک کر میں غلط قدموں سے چھٹے کی طرف گیا اور چاند ماری کے احاطے سے گزر کر انہی چھت والے کمرے کے عقب میں آگیا جو ایک قطاری صورت دور تک چلے گئے تھے۔ ان کمرے کے عقب میں سلاخ دار کونکریاں تھیں اور کسی کسی کونکری میں رات کے اس آخری پر بھی روشنی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

میں اب ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ ایک دھشت سی صبح جو مجھ پر طاری ہو رہی تھی اور اس دھشت کا سبب شکر کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ عینی کیس تھا۔ انہی دیواروں میں کہیں پوشیدہ تھا۔ اس کی موجودگی کا احساس میری رگوں میں آٹھیں ستال بن کر دوڑنے لگا تھا۔ طویل دیوار کے ساتھ چپک کر چلا ہوا میں ایک روشن کونکری کے قریب پہنچا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی لیکن اس سے آگے دو کمرے چھوڑ کر جو کونکری تھی وہاں زندگی کے آثار موجود تھے۔ کوئی وہاں بول رہا تھا۔ میں جبکہ کر چلا ہوا وہ

تاریک کمریوں کے نیچے سے گزرا اور روشن کمری تک پہنچ گیا۔ یہ کمری اٹھ کھلی تھی اور اندر کی آوازیں واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے محفوظ ذابے سے کمرے میں جھانکا اور چونک گیا۔

اس غیر معمولی طور پر کشادہ کمرے میں کم و بیش پندرہ افراد موجود تھے۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور دو گیس پیسوں کی روشنی میں وہ گرما گرم بحث کر رہے تھے۔ ان مقامی لوگوں میں تین غیر مقامی بھی موجود تھے۔ یہ ملتان یا خانیوال کی طرف کے چہرہ دی ٹاپ افراد تھے۔ ان میں کئی مومچوں اور بادامی آنکھوں والے ایک نوجوان کو دیکھ کر کئی بڑی طرح چونک گیا۔ یہ ملک میں اس نئی اُبھرنے والی سیاسی پارٹی کا سرگرم رکن تھا جو آمریت کی بساط لپیٹ دینے کا عزم لے کر میدان میں آئی تھی اور اپنی طاقت کا بیج عوام کو بتا رہی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے اس پارٹی کے ایک مخالف سیاسی لیڈر نے راولپنڈی میں ایک بڑے جلسہ عام کا اہتمام کیا تھا۔ اس جلسے کو سیوا ناؤ کرنے کے لیے فائرنگ کی گئی تھی جس کے نتیجے میں کئی افراد ہلاک ہوئے تھے اور بڑے ملک میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ اس فائرنگ کیس کی خبریں ابھی تک اخباروں کی زینت بن رہی تھیں۔ نامزد قربان میں یہ کئی مومچوں والا نوجوان بھی شامل تھا۔ اس کی تصویر میں ایک سے زائد مرتبہ اخبار میں دیکھ چکا تھا۔ اب یہ شخص راولپنڈی اور ملتان سے سیکڑوں میل دور اس دور وراز ویرانے میں ان خطرناک لوگوں کے درمیان بیٹھا تھا اور اپنی کھنی مومچوں کے نیچے سے سگریٹ کا دھواں خارج کر رہا تھا۔ مجھے اس کا نام یاد آیا۔ وہ حقیق عرف پاشا تھا۔ پاشا چونکہ ایک جیل کے ایک وارڈن کا نام بھی تھا اس لیے مجھے یاد ہو گیا تھا۔

پاشا یقیناً صاف سیدھی اردو بول سکتا ہوگا لیکن مقامی افراد میں بیٹھ کر وہ بھی شوقیہ اردو کی ٹانگ توڑنے میں مصروف تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا ”میں رست خاں“ ہم جنہیں اور مصیبت میں ڈالتا نہیں جانتا۔ بس اب جانا چاہیے ہمیں۔“

رست خاں ایک زخم زخم چرے والا خطرناک شخص تھا۔ وہ بولا ”خیار! تم پھر طوطے کا ناقہ رٹ لگاتے ہو۔ جب ملک بھینے نے بات ختم کر دیا تو بس پھر ختم سے تم یہیں رہے گا۔ اب اگر جانے کا توام سب کو ناراض کر کے جائے گا۔“ پاشا نے کہا ”دیکھو رست“ صرف ہماری وجہ سے یہاں چار آدمیوں کا جان چلا گیا ہے۔ ہم یہاں اور دو گنا قتل نہیں

جانتا۔“

رست تک کر بولا ”چار کیا چار سو آدمیوں کا جان بھی چلا جائے تو تم یہیں رہے گا۔ یہی ملک بھینے کا حکم ہے۔ اور تم خود کو ہم سے جدا کیوں سمجھتا ہے۔ ہم سب ایک ہیں۔ ایک ہی لیڈر کا لیڈری مانتا ہے۔ ہم سب۔ بس اب ہم کو کچھ نہیں سننا۔“

پاشا کا ایک ساتھی اپنی ہماری بہر کمزوری ہوئی آواز میں بولا ”خاں صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہتا ہے، ہم آپ کے جذبے کا قدر کرتے ہیں لیکن اگر آپ آپس میں لڑے گا تو یہ ہمارا ہی نقصان ہے۔ لشکر خاں کے ارادے مجھے کچھ اچھے نہیں لگتے۔ جب تک ہم یہاں ہیں وہ بس گھورتا رہے گا۔ مجھے تو ڈر ہے وہ اپنے بندوں کا انتقام لینے کے لیے کوئی اور بھی حرکت نہ کر بیٹھے۔ سوز کا بل ہے اس کی آنکھ میں۔“

”کچھ نہیں ہوگا“ رست خاں نامی شخص نے اپنا بچہ اٹھایا ”کس کی کیا جال کہ سردار کے سامنے گردن بھی سیدھی کرے۔“

پاشا کا ساتھی بولا ”میں گردن سیدھی کرنے کی نہیں چاہتا۔ میں چھرا گھونپنے کی بات کر رہا ہوں۔ آپ ذرا سمجھنے کی کوشش کریں۔“

وہاں ہونے والی گفتگو سے میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ جلسہ عام کی فائرنگ کیس میں ملوث ہو کر ان تین افراد نے بھینے جان کے پاس پناہ لے رکھی ہے جبکہ لشکر خاں نامی کوئی دوسرا شخص ان کے ميان رہنے کے خلاف ہے اور اس کا خیال ہے کہ ان پناہ گزینوں کی وجہ سے پولیس اس ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے سرگرم ہو جائے گی۔ اس معاملے پر ہونے والی آج کھائی کے نتیجے میں چند روز پہلے شکر مشعل ہو کر چار افراد کو زندہ بچا چکا ہے۔ اس واقعے سے یہ معاملہ تبصرہ ہو چکا ہے اور اب یہ پناہ گزین افراد یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ لشکر خاں کون شخص ہے جو بھینے خاں اور شکر سے اختلاف رائے کی جرات کر رہا ہے اور چار ساتھیوں کا نقصان کرا کے بھی اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہے۔

اچانک کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور ایک شخص ہلپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ یہ سب مشین مگن والا وہی فریہ اندام شخص تھا جس نے ایس بی برکت سوہے دار مرحمان اور باجوہ دھیرہ کا پرزائے دیکھا تھا۔ وہ کمرے میں کھسا تو بس سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ اس نے مقامی زبان میں کوئی تعین اطلاع حاضرین کو پہنچائی۔ ایک دم سب لوگ باہر

کی طرف لپکے۔ ان کے چہروں پر شدید غصہ نظر آ رہا تھا۔ یہ نیاں بندوق کی طرح میرے ذہن میں گوندا کہ ابھی یہاں پالی ہاں اور نوجوان پہرے دار کی بات کی گئی ہے۔ نوجوان پہرے دار تو مری چکا تھا۔ میں ممکن تھا کہ پالی خاں بھی عدم نادمہ مار گیا ہو اور اب دونوں کی لاشیں جتنے کے قریب پھیلی گئی ہوں۔

اس وقت مجھے سب سے محفوظ جگہ چھت نظر آئی۔ چند قدم بائیں جانب ہٹ کر میں نے ایک کمری کی چو کھٹ پر اڑن رکھا اور ایک کمرنڈر تمام لی۔ پھر راتقل چھت پر رکھ کر میں نے کھانوں پر زور دیا اور یہ آہنگی اور پہنچ گیا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ چھت کے قریب میمالی کے بیڑوں میں اینٹیں گردش کر رہی تھیں اور خیرے میں بائیں کرنے کی آواز آ رہی تھی پھر ان آوازوں میں کسی مرد کے دھماڑے ابرا کر رونے اور کسی عورت کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ چاند باری کے احاطے میں چند افراد کی ایک ٹولی جھگڑنے والے انداز میں زور زور سے بول رہی تھی۔ پانچ مجھے صورت حال کی تحقیق کا احساس ہوا۔ حالات نے ایک بالکل غیر متوقع کوٹ لے لی تھی۔ نوجوان سرے داروں اور پالی خاں کی موت کو لشکر خاں والے جھگڑے سے ختمی کر دیا گیا تھا۔ یوں لگا جیسے ان دور افتادہ ہٹکون ٹیلوں میں اچانک ہی کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہے۔ فوریہ رات شور و غصہ کے ساتھ جاگی اور ہر طرف گرام بچ گیا۔

چھت پر اوندھے لیٹے ہوئے میں نے دیکھا۔ دس بارہ افراد کی ایک مسلح ٹولی راتقلیں لہرائی اور لکارتی ہوئی دھولان کی طرف بھاگی۔ ان کے پیچھے تین تین چار چار کی ٹولیاں میں کئی اور افراد دوڑے۔ دھولان پر بھی چھڑے کو ٹھوں کی دو قطاریں موجود تھیں۔ تمام وہاں مکمل تاریکی تھی اور لگتا تھا کہیں سوئے ہوئے ہیں۔ جو کئی مشعل افراد ان کو ٹھوں تک پہنچے اچانک فائرنگ شروع ہوئی۔ دھماکوں سے خیب و فزاز لڑا اٹھے اور ہر طرف چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ فائرنگ کے ساتھ چیخنے دہانے ٹرے بھی سنائی دے رہے تھے اور ان کی شدت میں ہر لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اچانک ایک ہر شور دھماکے سے درو دیوار دیل گئے۔ ٹک کی کوئی متجانش نہیں تھی لڑائی میں دستی سم استعمال ہوا تھا۔ پھر کچھ بعد دیکرے ایسے ہی دو اور دھماکے ہوئے میں نے دیکھا دھولان پر واقع ایک مکان سے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ فائرنگ اب دو طرفہ ہو رہی تھی اور اس کا راند وسیع ہو رہا تھا۔

میں چلا گیا لگا کر چھت سے اترتا اور بھاگتا ہوا اس کمرے تک پہنچا جہاں ایس بی برکت اور سوہے دار مرحمان سمیت تمام افراد بند تھے۔ اب دروازے پر کوئی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے راتقل کی نال آہنگی نالے پر رکھی اور اوپر سے دو فائر کیے۔ ٹالوٹ کر لگ گیا۔ دروازہ کھول کر میں اندر داخل ہوا تو بس لوگ اسی طرح الٹے سیدھے بڑے نظر آئے۔ انہیں کچھ ہوش نہیں تھا کہ باہر کیا قیامت ہوا ہے۔

”انگو! انگو!“ میں چیخا ”ہمارے یہاں سے“ وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ میں نے انہیں کھینچ کھینچ کر بٹھایا۔ راتقل کے کدے سے فوکے کدے۔ ان میں سے چند ایک نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ٹوکڑا کر پھر گر گئے۔ صرف انیسٹراچوہ بہت کر کے دروازے تک آیا۔ میں نے اسے سارا دیا لیکن اس میں پلٹنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے چاکر اٹھ کدے سے راتقلوں غرا چاکر وہ ڈھے گا اور کھنوں کے بل کر کرتے گرنے لگا۔ میں نے سوچا اتنی دیر میں عباس خاں اور خیلہ کی خبروں۔ دیوار کے ساتھ ساتھ جھک کر بھاگتا ہوا میں اپنے بندے خاں کے دروازے تک پہنچا۔ ابھی میں دروازے سے آٹھ دس قدم دور ہی تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک شخص کی طرف اٹھی رہ گئی۔ مجھ سے صرف دس گز کے فاصلے پر۔ جسم شیطان۔ شکر شکر کھڑا تھا۔ وہ مجھ سے پہلے مجھے دیکھ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں روسی ساخت کی طاقت ور راتقل تھی۔ حسب معمول باریک ہونٹ مضبوطی سے ایک دو سرے پر رہے ہوئے تھے اور آنکھوں میں وہ مخصوص چمک تھی جو صرف سفاک ترین قاتلوں کے حصے میں آتی ہے۔

ایک لمبے کے اندر اندر نامی کی ایک طویل قلم میری نگاہوں کے سامنے چل گئی۔ وہ سارے زخم سارے حادثے اور مہر کے یاد آگے جو شکر شرا سے وابستہ تھے۔ رگ رگ اینٹھ گئی۔ بے اختیار میں نے راتقل شکر کی طرف سیدھی کی۔ وہ غیر معمولی پھرتی سے دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں جانتا تھا شکر سے دو دھماکے کرنے کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں۔ ضروری تھا کہ میں اپنی مرنی کا میدان چنوں ایسی جگہ جہاں ہم دونوں کے لیے برابر کے مواقع ہوں۔ میں ایک دم دھولان کے درختوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ شکر میرے پیچھے نہ آتا۔ اور وہ آ رہا تھا۔ میں بغیر دیکھے جان سکتا تھا کہ وہ آ رہا ہے۔ میری راتقل کا بیگزین خالی ہو چکا تھا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے پانچ گولیاں لوڈ کیں اور دائیں جانب زیادہ کچے درختوں کی طرف



تھے "کشان ربانی" پر قابو پانے کے بعد یہ لوگ دونوں کازیاں بھی پیچھے رہیں یہاں تک لے آئے تھے اس سے آگے جانا نہیں ہوا لہذا انہیں یہیں کھنی جھازوں کے چھوڑنا گیا تھا۔

اچانک ایک خیال برق کی طرح میرے ذہن میں کودا۔ وقت رخصت ہم نے ایک جیب کی نشست کے چور خانے میں دو سب مشینیں اور ان کے ٹیکوں راؤنڈ رکھے تھے۔ کیا یہ اسلحہ اب بھی اس جیب میں موجود تھا؟ اس سوال کا جواب کسی نے نہیں دیا تھا میں نے خود معلوم کرنا تھا اور میرے پاس ٹیکٹوں کی نہیں کھوں کی سہلت تھی۔ میں نیلے اور بچے کے ساتھ اندھا دھند بھاگتا ہوا پچھلی جیب تک پہنچا۔ ہم گھوم کر دوسری ساڈ میں آئے تو عارضی طور پر گولیوں کی زد سے نکل گئے میں نے دو اوازے کھینچے۔ جیب لاک تھی۔ راتقل ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور پوری قوت سے آگے کی ضرب شیشے پر لگائی۔ ایک دھماکے سے شیشہ ٹوٹ کر پھیل گیا۔ میں نے ہاتھ والے مرد کو دواؤں کو ہلا کر پچھلی نشست پر آیا۔ کہیں قریب سے شکر کی پاٹ دار آواز ابھری "گھڑی کی طرف گئے ہیں"

ایک دوسری آواز آئی "اٹلی گاڑی کی طرف ہیں۔"

تیسری آواز آئی "میں پچھلی گاڑی ہے۔"

"بھون دو۔۔۔ لوڈی بچوں کو" شکر بھنگا رہا۔

ٹن ٹن کی آواز سے جیب کی باڈی لڑا کھی۔ درجنوں گولیوں نے آگنی چادر میں سوراخ کھولے تھے نیلے اور بچے اگلے تازے سے چنے چنے رہے تھے میں نے نشست اٹھا کر دیوانہ وار تارک خلا میں ہاتھ چلایا۔ میری انگلیاں شفاف سرد لوہے سے گرا گئیں۔

لوہا۔ جو سب مشین مگن تھا ہوا۔ جو موت تھا!

میں نے آوندے منہ لینے لینے سب مشین مگن چور خانے سے نکالی اور اسے لوڈ کرنے لگا۔ اس دوران چند اور گولیاں جیب کے شیشے توڑتی ہوئی میرے سر پر سے گزرتی گئیں۔ نیلے اور بچے بدستور اگلے تازے سے چنے ہوئے

میں تیس گز آگے جا کر میں نے تین فائرز کیے اور پھر نا بیٹھیں راتقل سے اچانک کیا۔ غالباً اس ٹیکٹوں میں کوئی خرابی تھی۔ کوشش کے باوجود میں کوئی مزید فائر نہیں کر سکا۔ راتقل اب میرے ہاتھ میں لاٹھی سے زیادہ قدر نہیں رکھتی تھی۔ اس لاٹھی سے میں کتوں کا سر ہار سکتا تھا! ایک عجیب طرح کی جھٹلاہٹ مجھ پر طاری ہوئی چلی گئی۔ گھبراہٹ ہونا بابا تھا۔ عباس خاں نے نیلے کو سارا دے رکھا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اچانک اس کا پاؤں رٹنا اور وہ میرے سامنے لڑھک کر میں پچیس فٹ گھسیٹا میں جا کر۔ میں نے اس کا سر کسی چتر سے ٹکرانے اور دردناک جھج بلند ہونے کی آواز سنیں۔ اگر عباس خاں جان سے نہیں گیا تھا تو شاید زخمی ضرور ہو چکا تھا مگر ہم اسے ٹوک کر دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکھانے والا سنبھلا رہتا ہے اور سارا دینے والا ڈھے جاتا ہے۔ جس شخص نے اب تک بڑی کوشش سے نیلے کو سارا دے رکھا تھا وہ خود ڈھے گیا تھا۔

میں نے راتقل بائیں ہاتھ میں لے کر نیلے کی کلائی تھامی اور اسے کھینچتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں نے چند ہٹنے پلے کماں سوچا تھا کہ مالک محمد سے جس انگلش میڈیم اسکول کی استانی کا اجازت رہا ہوں وہ کچھ عرصے بعد دوسرے مشن کے ایک مضمصرے ہوئے جنگل میں رہتے سرورہند یا میرے ساتھ بھاگ رہی ہوگی۔ ایسے کہ ہمارے چاروں طرف غلطوں کا رقص ہو گا اور خوف ناک لگا رہے ہوں گے۔

"بھاگو۔ نیلے تیز بھاگو" میں نے اسے بے رحمی سے کھینچے ہوئے کہا۔ میری نگاہ میں تیس گز دور ایک کٹی ہوئی سطح پر تھی۔ یہاں مرنے کی اونچے پودے تھے اور کوٹاہ قد جھانیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ جھانیاں کانٹوں سے لیس ہوتی ہیں لیکن قدرت نے کبھی موت دیکھا کر بخار پر راضی کرتی ہے۔ ان کانٹوں کی جبین اب ہمارے لیے عاورد آگاہی کی تکلف تھی۔ لیکن مقصد یہ تھا کہ اندھیرے میں سنسنائے والے پھلے سے بچا جائے۔

"وہ جارہے ہیں" اچانک خشب سے شکر کی لگارتی ہوئی آواز ابھری "اس کے ساتھ ہی ہمارے قدموں میں چنگاریاں بکھر گئیں۔

ہم گرتے پھلتے جھانیاں کی طرف ٹپکے۔ میری نگاہ ایک شے پر پڑی اور چمک اٹھی۔ میں نے آنکھیں کھلی کر دیکھا۔ ہاں۔ یہ جی بی تھی بلکہ دو جبین تھیں۔ وہ نامہوار بکھرے ہوئے طریقے سے کھڑی تھیں۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی جبین تھیں جن پر ہم ذوقی تالاب کے پڑاؤ تک پہنچے

طرف مسلسل لڑائی پوری تھی۔ قمری ٹاٹ قمری، ایشیاہ بچیں، بارہ بور، اچھی مٹی سب کچھ چل رہا تھا۔ بیچ بیچ میں کسی وقت سب مشین مگن کی خنڈاں تڑپتی سانی دسے جاتی تھیں۔ پیچھے موت تھی اور آگے ان دیکھا جنگل میں ان تینوں کو کدھر رکھا تھا!

"آؤ میرے ساتھ" میں نے ان تینوں سے کہا۔ پچھلے میں لڑکھار رہا تھا۔ میں نے اسے کدو میں اٹھایا۔ وہ پاؤں سے نچکا تھا اور قمری قمری کا بڑا ہاتھ عباس نے اپنی ہوئی آواز میں کہا کہ گولیاں چلتے ہی تھیں جان لی والے کمرے سے نکل گیا تھا۔ اس نے دو بارہ بھی بند نہیں کیا۔ ام الماری دھکیل کر بیڈ۔۔۔ والے کمرے میں پہنچا۔ لی لی بولا نکل پتلے ہیں۔ ام نے بچے کو اٹھایا اور دوڑ پڑا۔ قسمت تھا کہ کچھ نکلا۔ ورنہ اتنا گولی چل رہا ہے کہ۔

عباس خاں کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ دھماکوں کے ساتھ کئی گولیاں سنسنائی ہوئی ہمارے سروں سے گزرتی گئیں۔ نیلے لڑکھارے آوندے منہ مگر کی اور اس کے ہونٹوں سے بیچ نکل گئی۔ عباس خاں نے اسے سارا دے کر اٹھایا اور ہم سر ہٹا کر بھاگتے چلے گئے۔

"گھبرو گھبرو اور دوں کو" شکر کی درندگی سے پھر پور آواز جنگل میں گونجی گونجی بک کر نہ جائے۔ کوئی نہیں۔"

مجھے ارد گرد کچھ فاصلے پر لائین اور چار جبین چمکتی دکھائی دیں۔ شکر نے وہی کیا تھا جو اس جیسے گھاگ دشمن کو کرنا چاہیے تھا۔ تمام میرے پیچھے آنے کے بجائے وہ ایک سلا جھٹالے آیا تھا۔ اب ان میں چند ایک ہلاک یا زخمی بھی ہو جاتے تو ہم بک کر نہیں جاسکتے تھے میرے قیاس کے مطابق وہ کم از کم بیس افراد تھے اور نیم دائرے میں پھیل کر ہماری طرف بڑھ رہے تھے اور وہ کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ ان میں سے ہر ایک پختہ کار مجرم اور مفرو تھا۔ وہ شب و روز بارود کی بو سونچتے تھے اور کسی شخص کو مار دینا ان کے لیے کبھی پچھر سٹلنے کے برابر تھا۔

موت کے ان ہر کادوں کو خود سے فاصلے پر رکھنے کے لیے میں نے گھوم کر دو تین فائرز لے کر اپنی رفتار تیز کر دی۔ سماعت شکن دھماکوں نے بچے کو سا کر رکھ دیا تھا وہ کسی مضمصرے بولے ہوئے کی طرح میری پیش میں گھسنا جا رہا تھا۔ میں نے حساب جوڑا میرے پاس اب آٹھ گولیاں تھیں۔ آٹھ گولیاں جن سے چار جانوں کی حفاظت کرنا تھی۔ لی جان گولیاں۔ بڑا کمزور دفاع تھا یہ۔ دست قدرت ہی حرکت میں آتا تو ہم اس حصار سے نکل سکتے تھے۔

مز گیا۔ اسی وقت میرے عقب میں دو دھماکے ہوئے اور گولیاں درختوں کی شاخوں سے ٹکراتی ہوئی نکل گئیں اچانک مجھے احساس ہوا کہ شکر ٹوک گیا ہے۔ ایک تادور درخت کی اوٹ لے کر میں نے آہوں پر کان لگائے وہ واقعی ٹوک چکا تھا۔ اس کے انتہائی عیار ذہن نے خطرے کی بو سونگ لی تھی۔ ان تینوں درختوں میں میرے پیچھے کس کدو مجھے کوئی رعایت دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے درخت سے ٹپک لگائے لگائے سانس درست کیں اور شکر کے اگلے قدم کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کسی لومڑی کی طرح خچرا اور دغا باز تھا۔ کسی لمحے کچھ بھی کر سکتا تھا وہ۔ ایسے حریف کے مقابلے میں ایک لمحے کی سستی کا مطلب موت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ آیا تو میرے دائیں پولو سے آئے گا۔ یہ جگہ نسبتاً بلند تھی اور وہ "خشب کے نقصان" سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ میں نے اپنی تمام توجہ اس پولو پر مرکوز رکھی اور اگلے قدموں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ تقریباً پچاس قدم پیچھے ہٹنے کے بعد میں ٹھک گیا۔

اچانک سامنے کٹو کے ایک ٹھنڈ میں سرسراہٹ سنائی دی۔ میں نے ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں پوزیشن لے لی۔ انگلی راتقل کے ڈیک پر تھی "پینڈ زاپ" میں نے موت پیچھے سر دیکھیں جسے شکر کو پکارا۔ کوئی نہ مکمل ظاہر نہیں ہوا۔ قریب تھا کہ میں گولی چلا دے مگر ایک آواز نے میرا ہاتھ روک دیا۔ کٹو کے ٹھنڈ میں شکر نہیں تھا۔ کوئی لڑی تھی یا بچہ تھا جو کھلی کھلی آواز میں رہا تھا۔ میں راتقل سونے پتھر کی اوٹ سے نکلا۔

"کون ہے؟" میں نے دہلی آواز میں پوچھا۔

کسی مرد کا سایہ میرے سامنے ابھرا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ میں تاراج نہیں جلا سکتا تھا لہذا اسے دیکھنے کے لیے چند قدم آگے آیا۔ "ام عباس خاں ہے جی۔" تارکی سے عباس خاں کی لڑاں آواز ابھری۔ اس نے خود کو کھیل میں لپیٹ رکھا تھا۔ پھر اس کے دائیں بائیں دو اور سائے نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک نیلے تھی اور دوسرا وہ بچہ جسے میں نے نیلے کے کمرے میں مخو خواب دیکھا تھا۔

"آ۔ آپ یہاں؟" بے اعتبار نیلے کے منہ سے نکلا۔

میں ان تینوں کے قریب پہنچ گیا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ صورت حال کتنی محدود ہو گئی ہے۔ میں اس وقت ایک "سراپا موت" کے دوہو تھا۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں تھی لیکن ان تین جانوں کا میں کیا کرنا چاہتا تھا؟ کیا کرنا چاہیے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے تیزی سے سوچا۔ ڈیرے کی

تھے۔ اچانک نبیلہ بڑائی انداز میں ہنسی۔ معلوم نہیں اسے کوئی لگ ہی تھا یا وہ صرف خوف زدہ تھی۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ ہمارے گرد گھبراہٹ ہو رہا تھا۔ اب شکر اور اس کے ہر کارے کسی بھی دقت ہمیں چھٹی کر سکتے تھے۔ میں نے بھاری ہنجر سب مشین گن کی ٹال ایک نوٹے شیشے سے باہر نکالی اور انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ اب میں اپنی طرف بڑھنے والی موت پر اٹھ بڑانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ سب مشین گن کو آئیں گن بھی کہا جاتا ہے۔ مشین گن میں گولیوں کا بلیٹ چل رہا ہے جبکہ سب مشین گن میں میگزین استعمال ہوتا ہے۔ میرے پاس جو سب مشین گن تھی اس کے میگزین میں اٹھائیس گولیاں ڈالی جا سکتی تھیں۔ ایک دفعہ کلک کر کے یعنی اسپرنگ کھینچ کر تمام رائیفل فائر کیے جا سکتے تھے۔ میں نے گن کو "ایف" پر سیٹ کر کے گندا شانے سے پوسٹ کر لیا۔

اچانک میری نگاہوں کے سامنے ٹارچ کی روشنی چمکی اور پھر ایک بھاڑی کی اوٹ سے تین سائے نکلے اور پوری رفتار سے جیب کی طرف لپکے۔

یہ بڑا جارحانہ انداز تھا۔ فوجی زبان میں اسے چارج کرنا کہتے ہیں۔ جنگ عظیم دوم کے موضوع پر پڑھنے والی فلموں میں ایسے مناظر اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ خاص طور پر جاپانی فوجیوں کا یہ انداز تو خوف اور دہشت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ لڑائی کے دوران اچانک وہ اپنی پوزیشن چھوڑتے تھے اور چیخے چلاتے ہوئے اتحادی مورچوں پر حملہ آور ہو جاتے تھے۔ ایسے حملوں میں اگر ایک جاپانی بھی گولیوں سے بچ جاتا تھا تو وہ دشمن کے مورچوں تک ضرور پہنچتا تھا اور کم از کم ایک شخص کو سنگین میں پروتا تھا۔ اور اکثر فریٹے والے جاپانیوں اور سنگین میں پروئے جانے والے اتحادیوں کی تعداد سیکڑوں میں ہوتی تھی۔ چھوٹے پیمانے پر یہاں بھی وہی منظر ہوا جارہا تھا۔

جیب کی طرف لپکنے والے سراپا موت تھے۔ میرے ذہن میں آیا کہ میری جوانی فائرنگ سے ان کا کوئی سامگیا ہلاک یا شدید زخمی ہو چکا ہے۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ مختلف فریق کے حدود درج غیلا و غصب کی ایک وجہ ان کا جانی نقصان بھی تھا۔ ڈھلوان پر بھاگتے ہوئے میں نے جو آخری تین گولیاں چلائی تھیں ان میں سے ایک گولی ایک شخص کی کمر پڑی تھی مگر وہ نیچے میں اس کا مغز چرنے پر برہنہ نکلا تھا۔

میں چٹان میں بیٹھنے ٹھہری کے مانند پوری طرح چوکس

تھا۔ جوئی بھاگنے والے مناسب فاصلے پر پہنچنے میں نے زبرداریا۔ سب مشین گن کا خوفناک قہقہہ فضا میں گونجا۔ آواز میں شعلے لپکے اور دو حملہ آور بھاگتے بھاگتے آندھے منہ کر کے دور تک لڑھک گئے۔ تیسرے نے پھرتی اور حاضر رہائی کا مظاہرہ کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ ٹھٹھک جاتا یا زنگ کر سکتیوں کو دیکھا، اس نے بھاگتے بھاگتے جھٹ لگائی اور اڑتا ہوا آندھے منہ ایک تاریک خلیہ میں گرا۔ میں نے بلا توقف سب مشین گن کا رخ خلیہ کی طرف پھیر کر لپکائی۔ ایک مرتبہ پھر دھماکوں سے شعلے لپکے اور گرد و پیش لر اٹھے۔ خلیہ میں کودنے والا میری ریچ سے باہر تھا لہذا بر سر ران لگاں گیا۔ میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ خلیہ میں ابوجھل ہونے والا شکر کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ایسی تیزی اور پھرتی کا مظاہرہ صرف وہی کر سکتا تھا۔ جوئی میرا دوسرا برسر حتم ہوا، دائیں جانب میمانی کے جھنڈے سے کم و بیش چار افراد مزید برآمد ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں آتشیں ہتھیار تھے۔ وہ بھی فائرنگ کرتے ہوئے جیبوں کی طرف لپکے۔ یہ سرا سرا خطراری حرکت تھی۔ چند لمحوں پہلے وہ نہ صرف سب مشین گن کی گھن گرج سن چکے تھے بلکہ اپنے ساتھیوں کو نیزہ خاک ہوتے بھی دیکھ چکے تھے، ان کے لیے مناسب اقدام یہی تھا کہ یوں سامنے آنے سے گریز کرتے مگر فوجی نصب نہ ان کے ہاتھ سے احتیاط کا دامن چھڑا رہا تھا۔ وہ مجھے لقمہ تر سمجھ کر جوئی کھلی جگہ پر آئے، میں نے ان کے منہ میں لوہے کے پتے ڈال دیے۔ ایک بار پھر سب مشین گن نے آگ اٹھائی اور دو افراد چمڑک کر کانٹے دار جھاڑیوں میں گرے۔ بقیہ دو ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک گئے پھر آؤ کی تلاش میں ان کی نگاہ ایک ساتھ سامنے والی جیب کی طرف اٹھی۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ جیب کی طرف دوڑتے، میں نے آخری رائیفل فائر کیا۔ اس دھم میں نے جسموں کو چمچیدے کے بجائے اعصاب کو نشانہ بنایا۔ دونوں حملہ آوروں کے پاؤں میں چنگاریاں سی پھوٹ نکلیں۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹے اور قلا بھیل بھرتے ہوئے جھاڑیوں میں گم ہو گئے۔ میں نے فوراً دوسرا میگزین گن سے اٹچ کر لیا۔ ایک بار پھر میری نگاہ اس خلیہ کی طرف اٹھی جہاں تین چار سینکڑے پہلے شکر اور جھل ہو گیا تھا۔ وہ ٹھٹھکا کر گر بیٹھ سکا تھا۔ کسی بھی لمحے وہ جوانی والی کرنے والا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس کا وار بڑا تندہ تیز ہوگا۔ وہ نہ مقابل کے پاؤں سے زمین نیچے لینے کا عادی تھا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ شکر خلیہ سے برآمد ہو یا کھلاوا کاٹ کر دائیں طرف سے آئے گا مگر جس وقت میں

سوچ رہا تھا وہ کسی زہریلے ٹانگ کے مانند پھنکارا ہوا جیب کے میں پھلوں میں چٹخ چکا تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، دونوں جیبیں سخت ناموار جگہ پر کھڑی تھیں۔ میں جس جیب میں تھا ہوا تھا اور جس کے ایک ٹانگے کے ساتھ نبیلہ اور بچہ جوئوں کی طرح چپے ہوئے تھے، تقریباً تین درجے کے زاویے سے بائیں پھلوں پر چھٹی ہوئی تھی۔ شکر نے دائیں پھلوں سے زور لگایا اور معمولی کوشش سے جیب اُٹار دی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے سمجھنے یا باہر کو نکلے کا موقع ہی نہیں ملا۔ آٹا فانا میرے پاؤں ونگاٹے ٹھوڑی سامنے شیشے سے ٹکرائی اور مجھے پتا چلا کہ جیب لڑھک چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں نبیلہ کی کرب ناک چیخیں گونجیں۔ جیب ڈھلوان پر تھی۔ اس نے دو تین قلابازیاں کھائیں اور چند لمحوں درخون کو توڑتی ہوئی ایک بوئے پھرتے جا لگرائی۔ دیر اسکرین سمیت کوئی شیشہ سلامت نہیں بچا تھا۔ چھٹ اٹھ حصے سے چپک چپک تھی۔ میں نے خود کو بروقت ایک نشست سے چٹایا تھا لہذا شدیدہ چوڑوں سے محفوظ رہا۔

جوئی جیب کی جان لیوا حرکت تھی، میں نے سب مشین گن کی تلاش میں چاروں طرف ہاتھ کھمایا۔ نئی ٹوٹی جیب نے کی قلابازیاں کھائی تھیں لیکن اس عمل کے بعد کسی جہالت کی طرح اپنے پاؤں پر ہی کھڑی ہوئی تھی۔ یعنی چاروں ٹانگوں میں پڑے تھے اور اس کا یوں فیصد درست تھا۔ میں پشیمت کے بل درمیانی نشست پر لیٹا تھا۔ جیب کی اندرونی لائن خود بخود آن ہو گئی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ سب مشین گن دونوں نشستوں کے درمیان فرش پر پڑی ہے۔ میرے ہاتھ سے اس کا فاصلہ دو فٹ سے زائد نہیں تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھایا مگر اس سے پہلے کہ میری بے تاب انگلیاں مشین گن کے مہیاں لوہے کو چھوئیں، جیب کی کھڑکی پر شکر شرا نظر آیا۔ جیب کی اندرونی روشنی میں اس کا چہرہ اپنی پوری جزئیات کے ساتھ دکھائی دے رہا تھا۔ اگر میں کہوں کہ وہ بہت خوب صورت اور بہت بھیاں تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے اندر کی درندگی نے اس کے خوب صورت نقوش کو سفاکی کی میں چھپا رکھا تھا۔ وہ خونی تھا، قاتل تھا، گینگسٹر تھا، دہشت گرد تھا اور پتا نہیں کیا کچھ تھا۔ اس کے جسم کا ہر عضو فلاح میں ڈھلا ہوا تھا اور اس کے کاسٹ سر میں مغز کی جگہ کوئی انکارا رہ کر رہتا تھا۔

وہ بدلتی لڑا تھا اور پہلا قتل اس نے صرف تیرہ سال کی عمر میں کیا تھا۔ نشہ تو اس کی گھنٹی میں شامل تھا۔ اس کی ایک ایک ذہنت تھی۔ ڈھانچا پاندھ کر اور سانڈی پر سوار ہو کر

ڈاکوؤں کا ساتھ دیتی تھی اور جوش میں آن کر مروانہ وار ہونڈیں مارتی اور لالچیاں چلاتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اس نے شکر کو شراب کی معمولی سی دہی اور لڑپن سے ہی اتے گائے گائے شراب پلانے لگی تھی۔ بہت کچھ میں رکھا تھا میں نے شکر کے بارے میں اور جو کچھ میں رکھا تھا اس سے کہیں بڑھ کر پتا تھا ہے۔

شکر کے ہاتھ میں یقیناً کوئی ہتھیار تھا لیکن کوئی کہی کہ جو کتنے میں مجھے صرف اس کا بالائی دھڑ نظر آ رہا تھا۔ اس کے کندھے نے ہنسن کی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنا سلسلہ ہاتھ میرے ردیو نارا ہے۔ مجھے "ہینڈز اپ" کرانے کے لیے یا شاید میری پیشانی پر سرخ بندھا لگانے کے لیے۔ میری نگاہ جیب کے دروازے پر پڑی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ دروازہ لاک نہیں۔ جیب کے لڑھکنے سے جہاں اور بہت سی شکستہ ریخت ہوئی تھی وہاں یہ دروازہ بھی کھل چکا تھا۔ تاہم دیکھنے میں وہ بند نہ لگتا تھا۔ یہ کھلا ہوا دروازہ میرے لیے امید کی کرن تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ فرش کی طرف جھک کر گن اٹھاؤں اسے پوزیشن میں لانا اور شکر بد فائر کھولنا۔ ہاں اتنا وقت ضرور تھا کہ لینے لینے اپنی دونوں ٹانگیں جوڑاں اٹھائیں سمجھنا اور پوری قوت سے دروازے پر دے مارا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ اس سے پشیمت شکر کا رول اور جیب کی کھڑکی میں طلوع ہوا اور شکر کے زہریلے ہونٹوں سے کوئی پھنکار نکلی۔ میرے دونوں پاؤں پھر پوری قوت سے جیب کے دروازے پر پڑے۔ شکر دروازے سے بھاگ کھڑا تھا۔ دروازے پر لگنے والی ضرب در حقیقت اس کے جسم پر لگی تھی اور یہ کوئی معمولی ضرب نہیں تھی۔ اس کے پیچھے میرے جسم کی پوری قوت اور میرے دل میں چھپی ہوئی بے پناہ نفرت تھی۔ شکر اچھل کر سنگلاخ زمین پر گرا اور لڑھک کر پھر خلیہ میں چلا گیا۔

میں نے دوسری جانب کا دروازہ کھولا۔ نبیلہ اور بچہ چلا کر مجھ سے لپٹ گئے جیب بائیں جانب اٹتی تھی اور وہ مخالف سمت میں تھے ورنہ ان کا پچھا محال تھا۔ میں ان دونوں کو اپنی اوٹ میں لیتا ہوا لے لے پاؤں پیچھے بنا۔ پیچھے ہٹنے کے ساتھ ساتھ میں فائر بھی کر رہا تھا۔ میں نے گن کو سیکل شاٹ پر سیٹ کر لیا تھا۔ ہر بار لپٹی دبانے سے صرف ایک ہی رائیفل فائر ہو رہا تھا۔ جیب سے اترنے کے بعد بائیں چھ سینکڑے اندر میں نے آٹھ یا نو رائیفل فائر کیا۔ ان میں سے آخری رائیفل ایک حملہ آور کی چھاتی میں لگا اور وہ ہم سے صرف دس گز کی دوری پر چچ کر ڈھیر ہو گیا۔ جیب سے اترتے وقت میں نے

گولیوں سے بھرے ہوئے دو بیک اپی جیکٹ اور سینے کے درمیانی خلا میں رکھ لیے تھے۔ اس کے علاوہ تین لوڈ میگزین بھی تھے۔ اس سارو سامان کے ساتھ میں شکر کے نرے سے نکلنے کی کاسیاب کو شش کر سکتا تھا مگر میں اکیلا نہیں تھا۔ نیبلہ اور پچ میرے ساتھ تھے اور میں انہیں اس منہدار میں چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا تھا۔

ایک ایک ہمارے اطراف میں فائرنگ شدت اختیار کرتی نیبلہ کے ہونٹوں سے ٹھنی ٹھنی آہ نکلی اور اس کی کیفیت دیکھ کر مجھے کاخوف بھی سوا ہو گیا لیکن میں کچھ اور محسوس کر رہا تھا۔ دھماکے ضرور ہو رہے تھے مگر ہمارے آس پاس پھلے ہیے کی سنسناہٹ نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو بہت کم اور پھر جلد ہی مجھ پر یہ خوش آئند انکشاف ہوا کہ ہستی میں ہونے والی لڑائی اس اٹھوان تک پھیل گئی ہے۔ شکر کے مخالفین یہاں تک پہنچ گئے تھے اور انہوں نے آٹا فانا شکر اور اس کے ساتھیوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ فائرنگ میں شدت آتی جاری تھی اور گاہے گاہے تاریکی میں جنگلی لٹکارے بھی گونجنے لگے تھے۔ اسے تاخیر نہیں ہی کہا جاسکتا تھا۔ میں نے روئے لڑکھڑاتے بچے کو ایک بازو میں سمیٹا اور نیبلہ کے ساتھ مجھے تاریک درختوں میں بھاگنا چاہا۔

غضب و فزاسے پر تاریک جنگل میں معمولی رفتار سے چلنا بھی کارے وارو ہوتا ہے کماں ہے کہ ہمیں بھانگنا پڑا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ کون سا پاؤں اٹھنے کے بعد واپس زمین پر نہیں پڑے گا پناہوں طرف اندھی گولیوں کی پرداز تھی اور خود کار رائفوں کی ٹھٹھا ٹھٹک تھی۔ پچ میرے بائیں بازو پر تھا۔ دوسرے ہاتھ میں گمن گنجی اور نیبلہ نے مین جیکٹ تھام رکھی تھی۔ گاہے گاہے جیکٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی اور وہ "ہائے اللہ" پکارا کرتی۔ وہ ٹنگے پاؤں تھی۔ اس سنگلاخ راستے میں اس کے نازک ٹکڑوں پر نہ جانے کیا بیت رہی تھی۔ ایک دو بار وہ لڑکھائی بھی تاہم خود کو سنبھالنے میں کامیاب رہی۔ جلد ہی ہم فائرنگ رینج سے باہر نکل آئے اور جنوب کی طرف نسبتاً کم گنجائی درختوں کی طرف آگے بڑھنے لگے۔ ہم موت کے نرے سے بچ کر نکلے تھے لیکن ابھی اس بات پر یقین کر لیا ہمارے لیے دشوار تھا۔ کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ جب کے گرد ہونے والی فائرنگ کے دوران نیبلہ بڑی طرح جیتی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا "نیبلہ تم زخمی تو نہیں؟"
"نہیں" اس نے لاپتہ ہوئی آواز میں کہا "اور آپ؟"
"میں بھی ٹھیک ہوں" میں نے جواب دیا۔

پچ بدستور نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ میرے کندھے پر اس کی گردن برابر دائیں بائیں ڈھلک جا رہی تھی۔ کسی وقت گردن کو زور وار جھٹکا لگتا تھا تو اس کے سر سے ہلکی سی کراہ نکل جاتی۔ ہم قریب آواٹھنا بدستور حرکت میں رہے۔ تاریک جنگل میں یہ نیم شب کی جوتنگ ہے ہر بولناک تھی۔ سخت سردی میں جسم سینے سے شرابور پڑے ہائے ہوئے اور قدم گاہے ست پڑتے ہوئے گاہے تیز آگے ہوئے تاہم گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ تحفظ کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر میں نے خود کو "میں" کی شکل والا کھائی کے قریب پایا۔ یہ کھائی کا مغربی حصہ تھا۔ یہاں تھا جھٹکا زیادہ نہیں تھی اور زمین بھی نسبتاً ہموار تھی۔ سر کے درخت یہاں کثرت سے تھے اور یہ ایک خود رو باغ سا رہ گیا تھا۔ درحقیقت کھائی عبور کرنے کے بعد ہی ہم خود محفوظ تصور کر سکتے تھے لہذا میں نے ہمت چا کر کلاوا کاٹنے بجائے تاک کی سیدھ میں کھائی کے اندر آخرا جائے۔

تاریکی میں بڑے خطر و ہولان پر آرتا نہایت دشوار تھا۔ جیسے جیسے ہم یہ کام کر گزرے۔ کھائی کے اندر تیز جگہ بہت کی کٹ نہ ہونے کے برابر تھی۔ فائرنگ کی آوازیں ہمارے دائرہ سماعت سے باہر ہو گئی تھیں یا ممکن تھا لڑائی کھم کی ہو میری جیکٹ میں سب مشین گن کے میگزین آپس میں ٹکرا مسلسل آواز پیدا کر رہے تھے۔ میں نے تمام ایمونیشن جیکٹ اور سینے کے درمیانی خلا سے نکال کر میزبوں میں ٹھونس لیا۔ پچ غودگی کے عالم میں "پیشاب پیشاب" کی رٹ لگاتے لگے نیبلہ نے اسے سارا دے کر ایک بڑے پتھر کی اوٹ پر بٹھا دیا۔ میں چندہ میں قدم آگے نکل کر راستے کا جائزہ لے لگا۔ تاروں کی روشنی میں ان دیکھے علاقے کے مذہم خود غلام ہی نظر آ رہے تھے۔ اچانک ایک گرفت آواز نے مجھے چا دیا۔ یہ آواز میرے سامنے چند فٹ کے فاصلے سے آتی تھی بولنے والی کوئی عمر رسیدہ عورت تھی۔ اس ویرانے میں آواز ناکل آجی محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی سے آواز سمت دیکھا۔ ایک رائفل بردار بھائی عورت سینہ تانے کڑی تھی۔ مجھے اس کے عقب میں ایک خاستری چڑ روشنی کی چمک سی دکھائی دی جیسے کہیں قریب ہی کسی کھ غار میں لائین جل رہی ہو اور اس کا مہووم سا کھس چہ پڑ رہا ہو۔

عورت کا ٹھکی آستینوں والا لہبا لہبا ہوا میں پڑھتا تھا اور اس کے کمرے ہونے کے انداز میں زبردست جارحانہ پن تھا۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ میں نے ایک ف

آگے بڑھایا تو وہ گولی چلا دے گی۔ سب مشین گن میرے میں تھی اور ایسے زاویے پر تھی کہ میں معمولی سی جھٹک عورت کو شوت کر سکتا تھا مگر میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بے حس و حرکت دیکھ کر عورت ایک بار پھر غرائی۔ وہ بدستور غائب تھی۔ میری سمجھ میں الفاظ تو نہیں آتے لیکن سمجھ میں آئی۔ ظاہر ہے وہ مجھے گن جھٹکنے کا حکم دے رہی تھی۔ نہ جانے دل میں کیا آتی کہ میں نے بچے جیک کر زمین پر رکھ دی۔ وہ چند قدم بڑھا کر میرے سامنے آئی۔ ہلکی تاریکی میں میں اس کا سر باہر طور پر دیکھ سکتا تھا۔ کوئی لمبی چوڑی عورت نہیں تھی۔ درمیانہ قد تھا۔ جسم بھی تھا لیکن عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اس کی کمر میں خم مائی نہیں دیتا تھا۔ وہ کسی فواد کی بیٹی کی طرح سنگلاخ زمین پر کھڑی تھی اور مرنے مارنے پر آمادہ نظر آتی تھی۔

میں اس کے سوال کا جواب نہ دے پایا تو وہ قدم اور کے بڑھی اور میری بھائی پر زور سے رائفل کا ٹوکا دیا۔ تھے میں دوستوں نما پتھروں کے درمیان سے نکل کر ایک اور حق موقع پر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے کھڑی دکھائی۔ قریب پہنچنے پر نوادہ خاصا کم عمر نظر آیا۔ بمشکل گیارہ سال کا دکھائی دے رہا تھا۔ بوڑھی عورت اور اس کا نو عمر اخی تندرست لہجے میں مجھ سے کچھ دریافت کرنے لگے۔ اتنے نیبلہ اور اس کا ساتھی پچ بھی موقع پر پہنچ گئے۔ نیبلہ اور بچے کو دیکھ کر اور یہ جان کر کہ وہ دونوں میرے ساتھی ہیں تندر زان بڑھیا کے تیز قدرے نرم پڑ گئے۔ اس نے رائفل ہی بھائی سے ہٹائی اور سوالیہ نظروں سے نیبلہ کی طرف دیکھ لی۔

کھڑی بردار لڑکا بدستور آمیز اردو میں مجھ سے مخاطب ہوا "تم اردو بولتا؟" میں نے فوراً ہاں میں جواب دیا وہ بولا "تو کون ہے کہ میرے آتا ہے؟"
"مسافر ہے یہاں سے جانا چاہتا ہے۔ ہم ٹل سے آیا۔ شکار کھیلنے کے لیے ہے۔ میرا بہن اور۔۔۔ اور اس کا بچہ۔" لڑکا لوگ ہم سے ہجڑا کیا۔ گاڑی واڑی سب ان کے پاس رہ گیا۔ ہم سخت معصیت میں ہے۔

لڑکے نے تیز نظروں سے میری پھولی ہوئی جیکٹ کو دیکھا۔ پھر اس کی نگاہ زمین پر پڑی ہوئی سب مشین گن پر جم گیا۔ اس نے پوچھا "کون سی بات کی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ سب مشین گن کے سبب شکاری کی حیثیت سے میری پہچان ٹھوکر ہو گئی تھی۔ تاہم نیبلہ اور بچے کی موجودگی بدستور علوان ثابت ہو رہی تھی۔ پڑھیا اور کھڑی بردار لڑکا

خونِ انشام

مُصنّف: ایم اے راحت

قیمت: -/۲۰ روپے
ڈاک خرچ: -/۲۰ روپے

ایک ایسے لڑکے کا کہ جس کی داستانِ جن کی زندگی میں ایک نوجوان داخل ہو گیا۔

وہ بوڑھا صدیوں سے زندہ تھا۔ اُس کی آنکھیں پاتاں میں جھانک سکتی تھیں۔

اُس بہادر نوجوان کی پُر اسرار سرگزشت جو ایک نئے اور خوفناک سفر پر روانہ ہوا۔ اور کامیابی اُس کے قدم چومتی رہی۔

پبلشرز
علی میاں پبلی کیشنز عزیز ناکریٹ اردو بازار لاہور
اسٹاکسٹ

علی بکسٹال نسبت روڈ چوک میوہسپتال لاہور

تینوں کو روشنی کی طرف لے گئے۔ اس دوران بڑھیا ایک لمحے کے لیے بھی میری طرف سے غافل نہیں ہوئی تھی۔ اس کی رائیق کا رخ بھی میرے سر کی طرف تھا۔ اکثر چھان مورتیں بھی مردوں کی طرح زبردست نشاں باز ہوتی ہیں۔ یہ منجی بڑھیا بھی یقیناً انہی میں سے ایک تھی۔ بے حد ہم آہنگی تھی اس کی حرکات و سکنات میں۔ دور سے نظر آنے والی روشنی لائٹن کی تھی مگر لائٹن کی کھوپیا غار میں نہیں ایک جیسے نہیں بل ری گد۔ یہ درمیانے سائز کا آؤٹی فیکر ایک بڑی چٹان کی اوٹ میں استادہ تھا۔ نیچے پریمیاں کے گھنے پتوں کا سایہ تھا۔ یک دوجہ کی گہلندی سے یہیں خیمہ یا اس میں جلتی ہوئی روشنی کی جھلک تک دکھائی نہیں دی تھی۔ یہاں مجھے ایک خچر ایک گرہا اور دو گھوڑے بندھے نظر آئے۔ گھوڑوں کو سردی سے بچانے کے لیے ان کی پشت پر بوسیدہ باندھ دیے گئے تھے۔ نیچے کے اندر چٹانی کے بستر پر ایک نوجوان دراز تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی اور چہرہ مدقوق تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بیمار ہے اور یہ کوئی ایسی بیماری ہے کہ وہ بٹنے جھٹنے سے محذور ہو گیا ہے۔

گھلاڑی برادر لڑکے نے نیچے میں پہنچ کر گھلاڑی ایک طرف رکھ دی اور میری سب مشین گن اٹھانے کے لیے باہر نکل گیا۔ وہ گورا چٹا گدراٹے ہوئے جسم کا لڑکا تھا۔ ہاتھوں اور چہرے پر کالک لگی ہوئی تھی جیسے چوہا سمجھتا رہا ہو۔ حجامت اس نے ٹائی کے بجائے ٹائلا کی موچی سے بنو رکھی تھی۔ بڑے بے ہوشے بال تھے۔ مجھے اس لڑکے میں کچھ عجیب سی بات محسوس ہو رہی تھی۔ تاہم میں فوری طور پر اپنے اس احساس کو کوئی معنی نہیں پہناتا۔

بڑھیا بدستور سر پر رائل ٹائے کھڑی تھی۔ اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور وہ مسلسل ہمیں دھکاری دیتی تھی۔ اس کے اشارے پر ہم تینوں نیچے کی عقبی دیوار کے ساتھ چٹائی پر بیٹھ گئے۔ میرے لیے اس سخت و زنا عورت پر قابو پانا چھان مشکل نہیں تھا۔ ایسے مواقع پر استعمال ہونے والے کسی ”طرزیت“ سے کسی بھی لمحے اسے زیر دام لایا جاسکتا تھا۔ لیکن میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ستر مراجمی سے قطع نظر عمر رسیدہ عورت کی دلیری اور خود اعتمادی متاثر کن تھی اور مناسب نہیں تھا کہ میں اس خود اعتمادی کو مجروح کر دوں۔ اس کے حکم پر عمل کرتے ہوئے میں نے فرمانبرداری سے اپنی جینٹ کی زب کوٹھلی اور مختلف جیبوں میں شخصی ہوئی سب مشین گن کی گولیاں اسے دکھادیں۔ غالباً اسے خدشہ تھا کہ جینٹ کے اندر بھی کوئی آتشیں ہتھیار ہوگا لیکن

صرف گولیاں دیکھ کر وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ دوران لڑکا باہر سے میری سب مشین گن اٹھالایا تھا۔ میں پہنچ کر اس نے بڑی چالاک دستی سے گن کو ان لوڈنگ خیمے کے ایک کونے میں چٹائی کے نیچے کہیں چھپا دیا۔ ہر ہوا پیار نوجوان بھی کچھ کی کچھ اردو بول لیتا تھا۔ وہ کہنے لگا: ”بھئی بارو دکھا ہے کہ کوئی شخص اس طرح عورت اور لڑکے کر سکاں شکار کھیلنے نکلا ہو۔“

”بس غلطی ہو گئی بھائی۔ بہت بڑی غلطی ہوئی۔“ نے مایوسی سے سرھلایا ”ہم ادھر پنجاب میں تھو پورا چھانگے مانگے کی طرف شکار کھیلنا کرتے ہیں۔ وہاں سپر سادے راستے ہیں۔ ہر جگہ چھپیں پہنچ جاتی ہیں۔ شکار کا ہوتا ہے اور چنگ کی چنگ۔ شکار پارٹوں میں عورتیں کبھی کبھی تو بچے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ بس وہاں بھولے ہوئے ہم ادھر بھی آگئے۔ اب جان کے لالے پڑے ہیں تو سمجھ میں آیا ہے کہ مقامی دوست ٹھیک ہی کہتے تھے۔ ”کون مقامی دوست؟“ ہم دراز نوجوان نے پوچھا۔ ”خرلائی کا ایک شکاری ہے۔ کیر علی شاہ اور کرم کا صوبے دار مرغان ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ دوسرے ہیں۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ یہاں شکار پر ٹکنا آسان ہے۔ بس مت ہی ماری گئی تھی ہماری۔“

”اب کہاں ہیں وہ لوگ؟“ میں اس سوال کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ ایک کما میں ذہن میں ترتیب دے چکا تھا۔ عام فہم انداز میں میں نے کہا: ”یہ کمائی ان لوگوں کے گوش گزار کرو۔“ اس مختصر کمائی مطابق ہم ڈھکائی کے کنارے فروکش تھے۔ پڑاؤ۔ گھوٹے پھرنے کے لیے نکلے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے سب بچہ درہم برہم پایا۔ نیچے چاروں شانے چت پڑے تھے۔ شکار پارٹی غائب تھی۔ نہ کہیں سامان دکھائی دے رہا تھا اور نہ سواری کے جانور۔ غالب گمان یہ ہے کہ ڈاکوؤں کا کوا جت جاتے ساتھیوں کو بانک کر کے لیا ہے۔

یہ کمائی چونکہ جزوی طور پر درست تھی لہذا ہمارے ”بیار میزبان“ پر اثر انداز ہوئی۔ بیار نوجوان کا نام رشید اور وہ بڑھیا کا فرزند ارجمند تھا۔ لڑکے کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ رشید کا بھائی ہے اور اس کا نام خادو ہے۔ رشید نے ”اگر بات وہی ہے جو ہم بتا رہا ہے تو پھر بڑا خطرناک مالہ ہے۔ اس علاقے میں جنگی جانور کے ساتھ ساتھ انسان بھی رہتا ہے لیکن خصلت سب کا جنگی جانور جیسا ہے۔ تم نے ذہنی غلطی کیا۔ ایک تو اس علاقے میں شکار کے لیے آیا اور یہ

روانہ اور بچہ کو لے آیا۔ ام کو تو لگتا ہے تمہاری طرح ہزار میزبان بھی عقل سے پیدل ہے۔ خدا کے بندے ادھر لڑنے لے کر آئے گا جو ان عورت کو۔ شکر کو تم بچ گیا، نہیں کسی کو نہ دکھانے کے قابل نہ رہتا اور نہ دکھانے کا بھی کیا ہے۔ تم نے واپس ہی نہیں جانا تھا۔ عورت تو رہی ایک رف۔ یہاں تو مرد کا بھی بولی لگ جاتا ہے۔“ میں حیرت زدہ چہرے سے رشید خاں کی باتیں سن رہا تھا اور یہ ظاہر کر رہا تھا کہ صورت حال کی اصل سنگینی جان کر بری ٹی ٹیگم ہو رہی ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران بڑھیا رائل سمیت نیچے کے دروازے پر بیٹھ گئی تھی۔ رائل اب اس کی گود میں تھی مگر اب بدستور دستے پر تھا۔ وہ کسی بھی صورت حال کے لیے بوری طرح تیار تھی۔ میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ بھیس بلی بادامی ”بال برف کے مانند سفید“ رخسار چھریوں پرے اور کمر لالھی کی طرح سیدھی۔ وہ بے حد سخت جان تھی اور اس کا ایک ثبوت اس کا لباس بھی تھا۔ شدید سردی میں وہ صرف شلوار قمیض پہنے ہوئے تھی۔ قمیض کو چوٹا کٹا زادہ مناسب تھا۔ یہ سیاہ چوٹا گھٹنوں سے نیچے تک پہنچتا تھا اور اس پر بے شمار چھوٹے چھوٹے آئینے جڑے ہوئے تھے۔ نیچے کا دراب اونچی پردے سے بند کر دیا گیا تھا اور لائٹن بھائی مٹی تھی۔ اس کے باوجود نیچے میں روشنی تھی۔ یہ روشنی آہنی انکیشی میں دیکھتے ہوئے انگڑوں کی تھی۔ ان انگڑوں میں گامے گامے شعلے کی لپک پیدا ہوتی تھی تو کمر لالہ روشنی نظر آنے لگا تھا۔

نیچے کی حرارت میں بیچتے ہی نیلے کے ساتھ آنے والا بڑے خیر ہو کر سونیا تھا۔ اس کا سر نیلے کی گود میں تھا اور ہاتھیں چٹائی پر۔ میں دیکھ رہا تھا کہ نیلے کے پاؤں زخمی ہیں اور ان سے خون رس رہا ہے۔ لیکن وہ خود شاید ان زخموں سے بے خبر تھی۔ اندیشوں کی پرشور خیانت نے اس کے حواس مفلوج کر رکھے تھے۔ غالباً وہ اب بھی شکر اور نیستی جان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ہم ان دونوں کے چہارے ابھی بہت دور نہیں گئے تھے۔ یہ انہی کا علاقہ تھا۔ یہاں درخت کے برتنے مٹی کے برزڈے اور چھکرے ہر پرزے پر ان کی چھاپ تھی اور پھر یہ مصیبت۔ دو ایک خود کار رائل کی صورت ہماری آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی! یقیناً نیلے اس رائل سے بھی خوف زدہ تھی۔ لال بی بی کی مائی یہ بڑھیا اپنے پیار بیٹے کی زبانی ہماری گزارشات سے آگاہ ہو چکی تھی مگر اس کے چہرے پر نرمی کی کوئی جھلک نمودار نہیں ہوئی

تھی۔ چائے پانی کا پوچھنا تو دور کی بات ہے، وہ ہمارے ہاتھ پاؤں بلانے پر بھی راضی نہیں تھی۔ جب نیلے نے اپنے کاسر اپنی گود سے نکال کر اسے انکیشی کے نزدیک چٹائی پر لٹا دیا تو وہ چلا کر کھڑی ہو گئی تھی اور رائل مان کر خوف ناک سناج کی دھمکیاں دینے لگی تھی اور ایک بار تو میرے داڑھی کھجائے پری وہ ”ہوشیار باش“ ہو گئی تھی۔ وہ جہانگیرہ عورت تھی اور لگتا تھا حالات کی بہت سستی ہوئی بھی ہے۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے کسی بھی طرح کا ریسک لینا نہیں چاہتی۔

سارا معاملہ سب مشین گن کی وجہ سے خراب ہو رہا تھا۔ جو کمائی میں نے سنا ہی اس میں یہ سب مشین گن کسی طور پر فٹ نہیں بیٹھی تھی۔ ہم ڈھکائی کے دراز سے گھوٹے پھرنے کے لیے نکلے تھے تو یہ سب مشین گن کیوں ہمارے ساتھ تھی اور سب مشین گن ہی نہیں اس کے اُن گت راؤنڈز بھی تھے۔ اس کے بعد نیلے کے سامنے بیٹے کا معاملہ تھا۔ وہ صاف طور پر شے میں دکھائی دیتا تھا۔ میں نے رشید خاں کو یہ جانکام مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی کہ راستے میں بچہ مسلسل رو رہا تھا۔ ہم نے اسے ٹھانے کے لیے تھوڑی سی ایفون کھادی ہے مگر رشید اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔

ہمارے میزبانوں کی بے اطمینانی اپنی جگہ بہر حال مجھے یہ اطمینان تھا کہ اس مختصر سی ہوئی نامیائیں شب کی صبح کرنے کے لیے یہ محفوظ ترین خیمہ ہر طرح مناسب ہے۔ خیر ایسے ڈھنگ سے لگایا گیا تھا کہ خصوصی کوشش کے بغیر دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر رشید کی والدہ لال بی بی خود ہمارے راستے میں نہ نہ تو ہم بھی اس خیمے کو دیکھ کر بغیر آگے نکل گئے ہوتے۔

لال بی بی اور بیار نوجوان رشید کے درمیان مسلسل گفتگو ہو رہی تھی۔ اس گفتگو کی نوعیت ہماری سمجھ سے باہر تھی۔ تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ لال بی بی اور اس کے بیٹے میں کسی بات پر اختلاف ہے۔ لال بی بی ہمارے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنا چاہتی تھی جبکہ نوجوان رعایت دینے کا خواہش مند تھا۔ سب کچھ برہہ راز میں تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ سخت رویے کی کیا نوعیت ہوگی اور اگر رعایت برتی جائے گی تو اس سے کیا مطلب ہوگا۔ لال بی بی کے کہنے پر فریاد انداز کا ایک بڑے چڑی خیلے میں سے ایک رتی نکال آیا۔ رتی دیکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ لال بی بی ہماری مشکلیں کس کے ایک طرف ڈال رہا چاہتی ہے جبکہ رشید خاں اس سلوک کو ناروا

مجھ رہا ہے اور اختلاف کر رہا ہے۔ توڑی در بعد میرا یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ بات یقیناً ہماری مشکلیں کھلنے کی ہی ہو رہی تھی۔ رشید خاں نے احتجاج کر کے رتی واپس خیلے میں رکھوا دی اور والدہ کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا پھر اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ماری والدہ کتنی ہے تم وہ نہیں ہے جو بتا رہا ہے جیسا مشین گن تمہارے پاس ہے دیا صرف ڈاکو لوگ کے پاس ہوتا ہے یا کریم لوی کے پاس۔“

میں نے کہا ”میں بتاؤ کیا ہم شکل سے تمہیں ڈاکو یا کریم لوی والا نظر آتا ہے؟“

وہ بولا ”شکلیں دھوکا دیتی ہیں بابو صاحب۔ دینے اگر تم ڈاکو یا لوی والا نہیں تو مجھی ہمارے لیے تو خطرناک ہی ہے۔ تم میاں سے جائے گا تو دوسروں کو بتائے گا کہ وہاں ویران گھاتی میں ایکلا خیمہ لگا ہوا ہے۔ پھر ہمارے لیے میاں رکتنا مشکل ہو جائے گا۔ ہمیں جانا پڑے گا۔ اگر نہیں جائے گا تو کوئی نہ کوئی خدائی خوار ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر دے گا۔ اس لیے ماری والدہ کتنی ہے کہ تم کو میاں سے جانے نہ دیا جائے۔“

خاصی مہم جو قسم کی بڑھیا تھی۔ بہر حال رشید خاں خود بخود میرے پسندیدہ موضوع کی طرف آ رہا تھا، میں نے کہا ”اگر ایسا ہی ڈر ہے تو پھر میاں پڑاؤ سے مطلب؟ کیا کسی سے چھپے ہوئے ہو؟“

وہ تنک کر بولا ”ماری رنگوں میں افغان خون ہے کسی سے چھپتا نہیں ہے ام اور نہ کسی سے ڈرتا ہے۔ ماری اس بوڑھی ماں کو دیکھو اگر یہ تم جیسے جوان کو نشانہ کر کے میاں باندھ سکتی ہے تو ام کیا نہیں کر سکتا۔ اس حالت میں بھی ام اپنے دشمن کا گھارہا کر اس کا دم بھیج سکتا ہے۔“

جوش کے سبب رشید خاں کا جسم کھل کے نیچے لرز کر رہ گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا دایاں پلو ٹھیک طور پر کام نہیں کر رہا۔ خاص طور پر ٹانگ، پاؤں سے لے کر کولے تک قطعی منطوق ہے، میں نے زری سے کہا ”میں خدا کا خواست تمہیں بزدل نہیں کہہ رہا۔ اگر دشمن سے چھپنا بزدلی ہے تو مورچے میں بیٹھا سپاہی بھی بزدل ہے۔ یہ سب وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ کتنے سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ یہ جگہ کسی طور پر بھی تمہارے پڑاؤ کے لیے مناسب نہیں، خاص طور پر اس صورت میں کہ تمہارے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی ہے۔“

”کون لڑکی؟“ رشید خاں بڑی طرح گڑبڑایا۔

”میرا خیال ہے تم میری بات سمجھ چکے ہو“

اطمینان سے جواب دیا۔ میرا لہجہ اتنا دھیمہ تھا کہ آوا رشید کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

رشید خاں ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ وہ نہیں سکتا تھا۔ اگر جھٹلاؤ تو صرف اپنے آپ کو دم یہ حقیقت تھی کہ اس خیمے میں ایک خورو نوجوان لڑکی تھی۔ یہ گد رانے ہوئے جسم کا وہی لڑکا تھا جو لالہ با بیچھے کھڑی لپے پر آ رہا تھا اور بعد میں میری سس خن باہر سے اٹھا کر لایا تھا۔ پہلی نگاہ میں ہی مجھے ام ہو گیا تھا۔ پھر مجھے میں پہنچ کر اور اس کی چال وصال و شبہ یقین میں بدل گیا تھا۔ وہ چندہ سولہ سالہ لڑکی مومنے اوٹی کپڑوں میں اس کے جسمانی خلیب و فزاد تھے۔ تراشیدہ بالوں اور مردانہ لباس کے سبب اسے طور پر شناخت کر لیتا آسان کام نہیں تھا۔ رشید خاں چہرے پر فکر مندی کے آثار دیکھ کر میں نے کہا ”میرے گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں۔ اگر تمہارے ساتھ عورت تو میرے ساتھ بھی عورت ہے۔ ہم ایک دوسرے پر کر کے ایک دوسرے کا سہارا بن سکتے ہیں۔ جس تمہاری والدہ نے مجھے روکا میرے ہاتھ میں بھری ہوا تھی، اگر میں نے اس وقت کچھ نہیں کیا تو اب کیوں گا۔ یقین رکھو میری طرف سے تم لوگوں کو کوئی نقصان پہنچے گا۔“

رشید خاں پر میری باتوں کا اثر ہو رہا تھا اور اس کیفیت اس کی نیکیوں آنکھوں سے ظاہر تھی۔ جلدی دونوں میں ایک بے نام سے اعتماد کا رشتہ استوار ہو گیا۔ خاں بولا ”تم جو کوئی بھی ہے، تمہارا نگاہ خاصا تیز ہے۔ امید نہیں تھا کہ تم اتنی جلدی پہچان جائے گا۔ یہ۔ یہ۔ اماری ہی ہے۔ تین ماہ پہلے شوال کے مہینے میں اس سے شادی ہو گیا تھا۔ میں اس روز سے ام بستر پر پڑا ہے اور پچارہ رات دن آنسو بہا رہا ہے۔“

میں نے کہا ”گلتا ہے تمہاری دائیں ٹانگ اور ڈا با زو پر اثر ہے۔ کوئی چوٹ وغیرہ لگ چکی تھی؟“

”ہاں۔ گولی لگا تھا اور ابھی تک وہیں پھنسا ہوا۔ اس نے انگلی سے اپنی کرکی طرف اشارہ کیا۔

”یعنی تین ماہ پہلے لگی ہوئی گولی ابھی تک جسم ہے؟“

”ہاں“ رشید خاں نے افر روی سے کہا ”پہلے بہت ہوتا تھا۔ اب دو نہیں ہوتا مگر جسم آدھا رہ گیا ہے۔ آ

جسم زندہ ہے آدھا مڑوہ۔ یہ آدمی زندگی پوری موت سے بدر ہے بھائی صاحب۔“

”کوئی جھگڑا ہوا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، جھگڑا ہی تھا لیکن دشمن بزدل تھا۔ پینے سے دار کیا اس کافر کے بچے نے۔ گولی چلا کر مہاک گیا۔ وہ امارا ساگ رات تھا۔ خوشی کا رات جس کا ہر ایک کو انتظار ہوتا ہے۔ ام نے وہ رات اپنی موت سے لڑتے ہوئے گزارا۔“

دھیرے دھیرے رشید خاں کی زبان رواں ہو رہی تھی۔ وہ مجھے اپنے بارے میں بتانے لگا۔ اس دشمن کے بارے میں بتانے لگا جو اس کی کنواری خوشیوں کو آنسوؤں اور آہوں میں ڈبو گیا تھا۔ ان حالات سے پردہ اٹھانے کا جن کا شکار ہو کر وہ اور اس کے اہل خانہ اس دیرانی میں بے یار و مددگار پڑے تھے۔ سرو ہوا کے جموں کے پڑ پڑاتے اوٹی خیمے میں ”انگ روں کی خواب ناک روشنی کے سامنے بیٹھ کر رشید خاں نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

رشید خاں کے بڑے بھائی کا نام مرزا محمد تھا۔ وہ لوگ تین افغان سرحد پر توٹک نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ باپ کی موت کے بعد مرزا محمد روزگار کے چکروں میں ایسا الجھا کہ بڑی مصیبت کا شکار ہو گیا۔ علاقے میں کچھ لوگ پوست کی کاشت اور ناجائز فروخت کا کام کرتے تھے۔ مرزا محمد ان میں شامل ہو گیا۔ مرزا محمد کے اہل خانہ کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ خاص طور پر مرزا محمد کی ماں رات دن اس مدد سے بھگان رہتی تھی۔ اس کی رنگوں میں بخش خون تھا۔ بہت عسرت اور تنگ دستی کے دن بھی اس نے دیکھے تھے لیکن کسی موقع پر بھی عزت نفس کو سینے سے جڑا نہیں کیا تھا اور سفید پوشی کا مجرم قائم رکھا تھا۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک مرزا محمد راہ و راست پر نہیں آتا وہ بستر پر سوئے گی نہ اپنے کمرے سے قدم باہر نکالے گی۔ ماں کے علاوہ رشید خاں کو بھی اپنے بڑے بھائی سے بے پناہ محبت تھی۔ درحقیقت وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ بھائی کی بے راہ روی دیکھ کر رشید خاں بھی خون کے آنسو بہا تھا۔ یہ سلسلہ کوئی دو برس تک چلا۔ آخر مرزا محمد کو اپنے پیاروں کی خدمت کے سامنے جھینوار ڈالنا پڑے۔ اس نے جرائم پیشہ لوگوں سے قطع تعلق کر لیا اور محنت مزدوری کا راستہ اپنایا۔ مرزا محمد کو چھوٹے بھائی کے سر پر سارا دیکھنے کی بہت آرزو تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی شادی سے پہلے رشید خاں کو دلہا بنائے گا۔ اس نے رات دن محنت کر کے

طاہر حارثی مغل کے طلسم شہر
تسلیم سے ایک تصویر
ناول

اتدھی

ایک آپ بیتی، خونچکا
اور ولولہ انگیز داستان
ایک نہ رکنے والا ایڈیو پتھر جس
میں آپ بہتے چلے جائیں گے
قیمت:
جلد اول: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے

پیشہ کار کا مقصد کے لیے

براہ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز

۳۔ عزیز مارکیٹ آرڈو بازار، لاہور۔ فون: ۳۲۳۸۵۳

اشاکٹ: علی بک سٹال

نسبت روڈ چوک میوہ ہسپتال لاہور۔ فون: ۳۲۳۸۵۳

اس شادی کا اسباب جمع کیا اور شادی کی تاریخ بتی کر دی۔ رشید خاں کی ہونے والی دہن اس کی ماموں زاد بھین کی سال پہلے دونوں کی ملگلی ہو چکی تھی اور وہ ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے۔ سب کچھ خوش اسلوبی سے انجام پایا۔ ایک رات رشید خاں چاندی دہن کی ڈوبلی لے کر اپنے گاؤں واپس آگیا۔ بڑی دھوم دھام کی شادی تھی۔ مرزا محمد نے اس تقریب پر اپنی استطاعت سے بڑھ کر خرچ کیا تھا۔ پارا چنار سے دھول مٹانے والے بلائے گئے تھے زنانہ لباس میں رقص کرنے والوں کی ایک منڈلی سترہ کے نواح سے آئی تھی۔ براتیوں نے سروں پر گیس لبب افکار کئے تھے اور دھون کی بندولے رات کے ساتھ ستر کر رہے تھے۔ رسم کے مطابق رات کے راستے میں آنے کا چمڑا کھانچا جا رہا تھا اور کچھ لوگ زبردست ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ اس وقت رات دہا کی دہلیز پہنچ چکی تھی اور ٹھون کے طور پر دہا دہن کے قدموں میں بھینرن کی جاری تھی، جب اچانک دہا ترپ کر کھڑے ہوئے۔ گرا اور ہر طرف جھم دھاڑ مچی۔ ہوائی فائرنگ کرنے والوں میں سے کسی نے رشید خاں کو نشانہ بنایا تھا۔ ایک گولی رشید خاں کا کندھا چھیدتی گزر گئی جبکہ دوسری کمر میں پوسٹ ہو گئی تھی۔ براتیوں میں سے ہی کسی نے فائر کرنے والے کو کھ لیا۔ جب وہ رشید خاں کو گھاسل کر کے بھاگا تو لوگ اس کے پیچھے لپکے اور پچاس ساٹھ قدم آگے اسے ایک گلی میں مار گرایا۔ اسے خور کار راتقل کا پورا برست لگا تھا۔ نتیجے میں وہ فوراً ہلاک ہو گیا۔ ترپتے پڑنے والے کو اٹھا کر فوراً ستانی معالج کے پاس لے جایا گیا۔ اس نے کندھے سے سینے والا خون روک کر مرہم پی کر دی اور کمرے گولی نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ چہرہ پاڑ کے باوجود وہ گولی تک پہنچنے میں ناکام رہا۔ آخر کوشش ترک دی۔ وہ ساگ رات جو بمت منتوں اور دعاؤں کے بعد مامی دودو کرب کی خنی لہروں میں یوں ڈوبی کہ اس کا ہر ایک کراہ بن گیا۔ مرزا محمد کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ اس کا لڑا لائی اس کے ارمانوں کا دہا خون میں نہا کر بستر جاگرا۔ اور یہ سب اسی کی وجہ سے ہوا تھا۔ رشید خاں کو گھاسل کرنے والا رشید خاں کا اندام دشمن نہیں تھا۔ وہ مرزا کا دشمن تھا۔ وہی جرائم پیشہ لوگ جن سے مرزا محمد نے قلع تعلق کر لیا تھا اس کی خوشیوں کے قاتل بنے تھے۔ انہوں نے اپنی رنجش کے بد صورت اظہار کے لیے ایک خوب

صورت دن کا انتخاب کیا تھا۔ رات میں ہونے والی ہ فائرنگ کے دوران دہا کو ہلاک کرنے کا منصوبہ کسی شاذ ذہن کی پیداوار تھا۔ کسی کو خبر تک نہ ہوئی کہ کس کی رشید خاں کو چاٹ گئی ہے مگر دست قدرت نے اس منصوبہ کو کھل کامیابی سے ہنگامہ نہیں ہونے دیا۔ رشید خاں نے یہ اور بات ہے کہ یہ زندگی صرف نام کی زندگی تھی۔ بسترے لگا تو مرزا محمد کو تن بدن کا ہوش نہیں رہا۔ وہ جلد اسے صحت یاب دیکھنا چاہتا تھا لیکن صحت یابی کے لیے صرف بھاگ دوڑ کافی نہیں تھی، پیسے کی ضرورت بھی تھی اور مرزا محمد سب کچھ شادی پر لگا چکا تھا۔ وہ ڈلے لے کر بھائی کا علاج کرانے لگا۔ جس نے جس جگہ کہ وہ بھائی کو لے کر وہاں چل دیا۔ تعویذ گننے، جھاڑ پھونک، واکرزی قریباً سبھی کچھ وہ آزما چکا تھا۔ اسے اب چلا تھا کہ رشید خاں کا علاج صرف کسی بڑے شہر کا راجی لا وغیرہ میں ہی ممکن ہے۔ دس روز پہلے وہ اپنے گاؤں توڑ سے ایک خانہ بدوش قافلے کے ساتھ ٹھٹھ کی طرف رو ہوا۔ گاؤں میں وہ اپنی مختصر کھیتی اور مکان بیچ چکا تھا لہذا کی روایتی مستقل نوعیت کی تھی۔ یعنی وہ واپس آنے کا ار نہیں رکھتا تھا۔ بیمار بھائی کے علاوہ اس کی دہن اور اپنی کو بھی مرزا محمد نے ساتھ لیا۔ خانہ بدوش قافلے کے ساتھ کرتے ہوئے وہ اس علاقے سے گزرنے تو ایک شب لے گیا۔ یہاں پڑاؤ کرنا پڑا۔ اس کھانی میں خانہ بدوشوں نے گاڑ دیے۔ ان خیموں میں مرزا محمد کا خیر بھی تھا۔ اس را پہلے پر رشید خاں کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ مرزا خیمے کے دروازے پر کھڑا کسی انجینی سے باتیں کر رہا ہے۔ انجینی کی آواز میں کمرزا محمد اور رشید کی والدہ بھی جاگ مرزا محمد نے رشید سے کہا کہ تھوڑی دیر کے لیے پڑاؤ پر جا رہا ہے۔ ایک دو گھنٹے میں واپس آجائے گا لیکن اگر دیر بھی لگی تو وہ پریشان نہ ہوں۔ قافلے کی روایتی ہے وہ ہر صورت میں پہنچ جائے گا۔ مرزا محمد چلا گیا اور اگلے دس بجے تک واپس نہیں آیا۔ قافلہ کوچ کے لیے تیار تھا صرف مرزا محمد کا انتظار ہو رہا تھا۔ اس کی تلاش ۱۱ اور دھڑ دھڑ کھڑے دوڑائے گئے لیکن کچھ پا نہیں چلا۔ کھش میں سے ہر کے تین بج گئے۔ یادوں کا قافلہ سا اب مزید انتظار کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ دیگر لوگ بھی روا کے لیے بے تاب تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ علاقہ جراث پیشہ افراد کا گڑھ ہے اور یہاں مسلسل دو راتیں پڑاؤ کرنا

پر بھی مناسب نہیں۔ وہ اندھا کرنا ہونے سے پہلے پہلے سے نکل جانا چاہتے تھے۔ دوسری طرف رشید خاں کی اپنے بیٹے کے بغیر آگے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اعلان کیا کہ اگر قافلہ والے اس کے لیے مار کر سکتے تو نہ رکھیں وہ اپنے بیٹے کے لیے ضرور رکے۔ چار بجے کے قریب یادوں کا قافلہ یہاں سے روانہ ہوا اور لال بی بی اپنے پیارے اور جوان بسو کے ساتھ اس آنے میں تیار تھی لیکن وہ ایسی تیار بھی نہیں تھی۔ اس کا م اور غیر متزلزل یقین اس کے ساتھ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان چاروں طرف بھانک اندیشے نہ بھائے کھڑے ہیں۔ وہ ان حصار میں بھی بیٹے کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ وہ انھی اس نے مرزا محمد کو جنم دیا تھا۔ اسے ایک ایک پور تھے بھولنے دیکھا تھا۔ اب وہ جوان تھا اور اس نے ماں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ واپس آئے گا وہ اس کا انتظار کرے۔ باں کا قدم آگے کیے اٹھ سکتا تھا۔ اٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ دل کٹ جانے سے بچہ آزاد ہو جاتا ہے لیکن ماں بھر بھی ندرہتی ہے۔ ایک اُن دیکھی اتول زندگی بھر اسے اپنے بچے سے ہاتھ سے رہتی ہے اور اس اتول کو کوئی نہیں کاٹ سکتا۔ نہ وقت کا تیز دھارا نہ رشتوں کی فینچی نہ معاشرے کا زہن حالات کی ستم غریفی۔ کچھ نہیں۔ بیٹے کا انتظار کرنے کے لیے لال بی بی نے مردانہ وار راتقل تمام کی اور خیمے کی ناکھٹ کرنے لگی۔ ساری رات مرزا محمد کی راہ دیکھی تھی۔ ان وہ نہیں آیا۔ اگلا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ شام ہوئی تو لال بی بی نے بسو کے بال کاٹ کر اسے مردانہ لباس پہنا دیا اور لٹاؤی سے مسلح کر کے خطر مقام پر ڈیرا ڈالے چھ روز گزرا۔ اب انہیں اس پر خطر مقام پر ڈیرا ڈالے چھ روز دیکھتے تھے۔ انہیں مرزا محمد کی شہر تھیں اور کان برل اس کی آہٹ پر لگے تھے۔

رشید خاں کی دودا میں نے پوری توجہ سے سنی۔ اس کی باتیں بچہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ہماری اس طویل گفتگو کے دوران رشید کی والدہ لال بی بی اپنی جگہ جو کس بھی رہی تھی۔ اس کا ہاتھ بدستور راتقل پر اور نگاہیں میری حرکات و سکنات پر رہی تھیں۔ بے حد محتاط اور کسی حد تک قومی عورت تھی وہ۔ نیند سوئی پر بھی آجاتی ہے مگر اس عورت کو نیند آتی نہ اس سے پہلو بدلا۔ باں رشید خاں کچھ بربود لینا لینا سو گیا۔ نیلہ بھی کبھی کبھی نیند کی جمبوک میں برسے کندھے سے آکر آتی تھی۔ خدا خدا کر کے یہ پہاڑی

رات کئی اور سپیدہ سحر نمودار ہوا۔ اجالا بھلا تو خیمے کے روزن سے باہر کا منظر صاف دکھائی دینے لگا۔ یہاں سبز پوش اور زبردست دونوں طرح کی چٹانیں موجود تھیں۔ کس کس نیم پختہ زمین پر وہ سورخ نظر آتے تھے جو خیمے کی چوٹیں اکھاڑے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اودھ جلی خڑی کے تھڑے جانوروں کا قفلہ اور خشک چارے کے ڈانڈے اور دھڑا بھرے ہوئے تھے۔ ان چیزوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ چند روز پہلے یہاں کے قافلے نے پڑاؤ کیا ہے اور یہ خیمہ اسی پڑاؤ کی بقایات ہے۔

دن چڑھتے ہی رشید اور اس کی والدہ میں بھر بھر ہونے لگی۔ رشید کی زبانی پتا چلا کہ لال بی بی نے اب اپنے متوقف میں تھوڑی سی کلک پیدا کر لی ہے۔ رات وہ ہم تینوں کے ہاتھ پاؤں باندھنا چاہتی تھی مگر اب اس نے نیلہ اور لڑکے کو اس باندی سے سنبھل کر دیا تھا۔ رشید خاں اس سلسلے میں بالکل بے بس نظر آ رہا تھا۔ وہ مجھ پر بھروسہ کر رہا تھا لیکن ماں کو سختی سے روکنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا "ٹھیک ہے" جیسے تمہاری والدہ کی خوشی لیکن پہلے منہ ہاتھ دھو کر چنلے تو حلق سے آتا رہیں۔"

رشید خاں نے یہ بات والدہ سے کہی تو وہ نیم رضامند نظر آنے لگی۔ وہ راتقل سر پر تان کر مجھے خیمے سے باہر لائی اور گدلے پانی سے بھرا ہوا ایک لٹا میرے ہاتھ میں تھادیا۔ ایسے پانی سے منہ ہاتھ دھوئے سے بہتر تھا کہ تھوڑی سی اور مٹی رخ بد حال پر مل لی جائے۔ میں نے آدھے لوٹے سے اپنے شکاری بوتلوں کی کچھ صاف کر لی۔ باقی آدھے لوٹے کا کوئی مناسب استعمال سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک آواز سنائی دی۔ یہ آواز پہلے میرے کانوں سے عکراتی اور ایک لمحے بعد لال بی بی بھی اس سے باخبر ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے گھروں بھرے چرے پر اندیشوں کی یلغار ہو گئی۔ اس نے اپنے استخوانی ہاتھوں میں راتقل کو بے پناہ مضبوطی سے تھامنا تو کھائی کی پھولی ہوئی رکیں ابھر کر نمایاں ہو گئیں۔ وہ آواز کی ست دہننے لگی۔

اس گھڑی اس پر قابو پانا میرے لیے قطعی مشکل نہیں تھا مگر میں اپنی جگہ بے حرکت کھڑا رہا۔ جنوب کے رخ پر قدرے بلندی سے آنے والی یہ آواز گھوڑوں کی ٹاپوں کی تھی۔ کم دیش تین گھوڑے سرعت سے کھائی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لال بی بی نے غرا کر مجھے واپس بلانے کا حکم دیا۔ میں لٹا تھا مگر فرما بھڑا رہی سے واپس خیمے میں آگیا۔ لال بی بی



دو ہر تک دو مسلح افراد ہمارے سروں پر بندھ گئے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام جبار خاں تھا اور وہ شکل و صورت سے بھی "جبار خاں" ہی نظر آتا تھا۔ اسے اپنے ساتھیوں میں لیڈر یا سرغنہ کی حیثیت حاصل تھی۔ باقی کے باقی تین افراد اپنی رائفلیں لوڈ کر کے کسی جانب نکل گئے تھے۔ دوسرے دو خیمے سے زیادہ دور نہیں تھے۔ وہ درہ کران میں سے کسی کی لٹکانی ہوئی آواز ہوا کے دوش پر تیر کر ہم تک پہنچ جاتی تھی۔ ان کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نشے میں ہیں۔ غالباً لال ہی کا نشہ تھا۔ کل رات کے خونی مناظر کسی شیشی خیر ظلم کی طرح میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل غنڈہ کی دردناک موت کا تصور، میری جان کے ڈیرے پر میرے ہاتھوں دو افراد کا قتل۔ اس واقعے کے نتیجے میں برپا ہونے والا خونی ہنگامہ، اندھیرے میں شعلوں کی لپک اور دھندلی میوں کی گھن گرج، پھر عباس خاں کا گہری کھائی میں گرنا اور اس کی دردناک چیخ۔ وہ چیخ جیسے ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ گیارہ عباس خاں کی آخری چیخ تھی؟ یہ سوال کسی انگارے کی طرح ذہن میں جھٹکتا تھا اور پورے دن میں کرب کی لہر دوڑا رہا تھا۔ معلوم نہیں عباس خاں اس وقت کہاں اور کس حال میں تھا۔

میں سوچوں کے جھگ میں گھومتا رہا اور میری نگاہ خیمے کے وسط میں رکھی انٹیکسٹ پر جمی رہی۔ انٹیکسٹ میں اب راکھ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ علی کے اوٹ کے مانند "سروزی" پوری کی پوری خیمے میں گھس گھس تھی۔ میرے بالائی جسم پر اب صرف ایک قمیص تھی۔ گولیوں سے بھری ہوئی جیکٹ حملہ آوروں کے قبضے میں پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے بڑی پارک بنی سے مختلف جیبوں کی تلاشی لی تھی۔ جیکٹ میں گولیوں کی موجودگی نے جبار خاں کو میرے متعلق سخت شک میں ڈال دیا تھا۔ اس کی پوچھ گچھ کے جواب میں میں نے وہی درود ادا کیا تھا جسے جو اس سے پہلے رشید خاں اور اس کی والدہ لال بی بی کو سنا چکا تھا۔ سب ششیں گھن کے بارے میں میں نے بتایا کہ وہ راتے میں مجھ سے کہیں گرجتی ہے۔

دوسرے ذرا قبل نبیلہ کے ساتھ آنے والا پچھلے ڈھیرے کھیل کے نیچے کھسکا لگا۔ اس کا نشہ اب ٹوٹ رہا تھا۔ نبیلہ نے سوا لہ نگاہوں سے جبار خاں کی طرف دیکھا جیسے بچے کے قریب جانے کی اجازت مانگ رہی ہو۔ جواب میں جبار خاں نے قہر آنکھوں سے اسے گھورا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ جہاں بھی جاتا ہے شیشی رہے۔ پچھلے چند کروٹیں بدل کر خودی اٹھ

یہ سہ سہ تھی۔ ایک شخص نے پرجوش لہجے میں سرغنہ "اواؤ کیہ نہ دے" وا بلیکے دے" یعنی سرور یہ توڑی یہ اعلان سن کر بچے سنے سرور کی باجیس بھی کھل۔ وہ نبیلہ کے پاس سے ہٹ کر گلشن کی طرف گیا۔ رائفل گلشن کے کندھے پر رکھ کر دوسری رائفل سے لال کے چہرے کو چھوا اور بک بک کرنے لگا۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آتے لیکن رشید خاں کا لال بیلا چڑھتا ہوا کوئی نہایت دہلیات بات کہی گئی ہے۔

آنے والے اپنے اپنے طور اور اطوار سے سکے بند ڈاکو اپنے لباس کیلے کیلے اور داڑھیاں بڑھی ہوئی۔ ہار کر د، آنکھوں میں کھج اور کمرے گولیوں کے بیٹ بھی تھا۔ انہوں نے نبیلہ یا مجھ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ میری جان کے گروہ سے نہیں لیکن ایسا ہونا ضروری بھی نہیں تھا۔ میں ممکن تھا میری کے کسی ساتھی میری اور نبیلہ کی صورت سے نا آشنا ہو جاسا کہ نبیلہ نے بتایا تھا، وہ اغوا ہونے کے بعد بیشتر ایک مختصر کمرے میں بند رہی تھی۔ میری جان نے اپنے کسی کو اس کے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ ایک طرح سے بدترانی تھی۔ اس قید ترانی کی وجہ سے کسی لوگ اس کی ت دیکھنے سے محروم رہے ہوں گے۔ رہا پچھلے تو وہ ابھی تک مائل پناہے خبر سو رہا تھا۔ صرف ساتوں کے زبردست اذہ ہوا تھا کہ کھیل کے نیچے کوئی ذی روح موجود ہے۔ ان لوگوں سے خبر کی توقع رکھنا ایسے ہی تھا جیسے پانی سے تکی، آگ سے ٹھنڈک کی اور پچھو سے ڈنک نہ مارنے کی مار کی جائے۔ ان کی صورتیں ہی بتا رہی تھیں کہ وہ پرلے بے بد قاش لوگ ہیں اور یہاں دو عورتوں کی موجودگی اور انہیں کو بھی مات کر دیں گے۔ لال بی بی حملہ آوروں کی رشت میں زبردست مزاحمت کر رہی تھی۔ انہوں نے اسے اکڑی سے باندھ کر ایک کونے میں ڈال دیا۔ اب نبیلہ اور شبن سے انہیں کوئی خطرہ تھا نہ قاتل زہر رشید خاں سے۔ ہاتھ میں تھا، سوس میں بھی بیٹھی ملی بنا خاموش کھڑا تھا۔ میں ہوا دار کا کبھی نہیں رہا لیکن ایسا اب بھی نہیں کہ جو چھپتا ہوں، چھپا نہ سکوں۔ میرا اترتا ہوا چہرہ کچھ کر حملہ آوروں نے مجھ سے کوئی بہت زیادہ خطرہ محسوس نہیں کیا تھا۔ انہوں نے گرج برس کر مجھے بھی نبیلہ اور گلشن کے پاس چٹائی پر

نے جلدی سے پردہ برابر کر کے چری ڈوری کس دی۔ اب اس کی رائفل میرے سینے کی طرف تھی۔ نگاہیں میرے چہرے سے ہٹ کر کان باہری آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ چند لمحوں کی غفلت کے بعد اب وہ پھر پوری طرح بوجھ نظر آ رہی تھی۔ رشید خاں کی نوبیا بتا بیوی گلشن نے بھی کھڑی تمام لی تھی اور مرنے مارنے پر آمادہ نظر آتی تھی۔

خوڑوں کی ٹائیں مذہم پڑ گئیں۔ یقیناً وہ لوگ کھائی کی خطرہ خطرات طے کر رہے تھے۔ کھائی میں پہنچ کر آوازوں کا رخ کھائی کے متوازی ہو گیا۔ گھڑ سوار کھائی کے اندر ہی اندر چلے خیمے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ خیمے کے اندر جاؤ عورت کو پہنچ گیا۔ نبیلہ کے چہرے پر ہراس تھا۔ یقیناً میری طرح اس کی نگاہ میں بھی میری جان اور شکر کے چہرے گھوم رہے تھے۔ تاہم ہمارے "میزبان" امید و بیم کی کیفیت میں تھے۔ وہ آنے والوں سے خوف زدہ تو تھے لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں یہ توقع بھی تھی کہ شاید مرزا محمد الپس لوٹ آیا ہو۔

ٹائیں خیمے سے قریب تر ہوئی گئیں پھر تقریباً بیس گز کی دوری سے آگے نکل گئیں۔ یہ خیمہ بڑی محفوظ لائیکشن پر تھا اور میری توقع کے مطابق گھڑ سوار خیمے کو دیکھے بغیر آگے بڑھ گئے تھے مگر نہیں۔ اچانک ٹائیں گھم گئیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اندازہ ہوا کہ ہم ایک عمیق گھٹی کی کچے ہیں۔ مختلف آہٹوں سے پتلا چل رہا تھا کہ گھوڑے میں اس مقام پر رُکے ہیں جہاں غور ڈی در پہلے میں اور لال بی بی پانی کا ٹوٹا لے لے کھڑے تھے۔ میں نے وہاں شکاری بوٹ دھونے تھے اور پھر ہاتھ منہ دھونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ یہ جگت خیمے میں لوٹا پڑا تھا۔ خشک زمین پر تازہ گرا ہوا پانی ایک مصیبت کا پیش خیمہ بن گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ لال بی بی بات کی یہ تک پہنچی گھوڑے خیمے کے قریب وجوار میں دھنڈانے لگے گھڑ سواروں کی تعداد پانچ سے کم نہیں تھی وہ اوپری آواز میں بول رہے تھے اور خاموش پرجوش دکھائی دیتے تھے۔ لال بی بی بڑے دھیان سے ان کی آواز سن رہی تھی۔ یقیناً کل رات اسی طرح اس نے ہماری آہٹیں بھی سنی تھیں اور پھر رائفل تان کر میرے دوہو پہنچی تھی۔

خیمے کے باہر سے لال بی بی کے ساتھ گھڑ سواروں کا مختصر مکالمہ ہوا پھر رائفل پر چڑھی ہوئی ایک سنگین نے خیمے کے کمرے کو زمین سے چھت تک پھاڑ ڈالا اور ایک نہایت ہٹا کتا مختصر رائفل سونے اندر گھس آیا۔ لال بی بی نے چلا کر اسے وارننگ دی پھر خائیں سے گولی داغ دی۔ نوادہ فائز ہونے سے پہلے ہی جھک چکا تھا۔ گولی اس کے کندھے کو ہاتھ نہیں۔ سونے پکڑوں کے باوجود گلشن کی اصلیت

بنیاد میں نے پہلی بار اس کی شکل دیکھی اور دمک رہ گیا۔ میں نے اسے کہیں دیکھا ہوا تھا۔ کہاں؟ شاید لاہور میں، شاید جنگ میں یا پھر۔ ایک جیل کی بچہ بیروں میں۔ کہیں نہ کہیں دیکھا تھا میں نے اس بچے کو کیا اس کے کواغوا کر کے یہاں پہنچایا گیا ہے؟ یہ سوال بچے کو دیکھتے ہی ذہن میں ابھرا۔ اگر اس سوال کا جواب ”ہاں“ میں تھا تو اگوا کرنے والا خشک یا عیسیٰ جان کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ بھیڑیوں کے نرنے میں اس معصوم سینے کو دیکھ کر نیلے کے اندر کی عورت جاگ اٹھی تھی اور اس نے عیسیٰ جان سے کہہ کر بچے کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا، ورنہ اب تک اس کا نہ جانے کیا خبر ہو گیا ہوتا۔

بے دار ہونے کے بعد بچے نے انجینی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ نیلے کے سوا کچھ میں کوئی اس کے لیے شناسا نہیں تھا۔ وہ گرد پیش کے ماحول کو حیرت آمیز خوف سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک اس کو تے ہو گئی۔ تے میں خون کی آمیزش صاف نظر آ رہی تھی۔ نیلے اسے سنبھالنے کے لیے لپکی مگر جبار خاں کے ساتھی پرے دار نے رائفل سے دھکیل کر اسے پرے پھینک دیا۔ میرا خیال تھا کہ نیلے اب چپکی بیٹھ جائے گی لیکن وہ پھر کمر پر سے دار پر آئی اور اسے دھکیل کر بچے تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بچے کی ماں نہیں تھی لیکن ”ماں“ تو تھی۔ اور ماں بھی ایسی جو اپنے بچوں سے بچوں سے دور کر دیتی تھی۔ اس کی روگوں میں خون کی جگہ مٹاؤڑ رہی تھی۔ پھر سے دار نے دست درازی کی تو نیلے نے بے ساختہ اسے پھینک دیا۔ مارا۔ چٹا کی آواز سے خیمہ گونج اٹھا۔ ایک دم پرے دار پر وندگی طاری ہو گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وہی چمک دیکھی جو شکاری جانور کی آنکھوں میں شکار دیکھ کر نمودار ہوتی ہے۔ اس نے اڑنگا لگا کر نیلے کو پیچ کر اڑا دیا اور بے دریغ ٹھوکر مارنے لگا۔ اسے میں ایک ہیرا شخص بھی اندر داخل ہو گیا۔ اس نے ساتھی کی مدد کرتے ہوئے نیلے کو بالوں سے پکڑا اور باہر پھینچنے لگا۔ جبار خاں نے لپک کر سیون ایم ایم کی ٹال میری پیشانی سے لگا دی۔

خیمہ کھانے والا پھر سے دار خوف ناک انداز میں گلشن کی طرف بڑھا اور اس کا گردن پکڑ کر دوڑنے کی طرف کھینچنے لگا۔ صورت حال اچانک ہی سنگین رخ اختیار کر گئی تھی۔ دونوں خواتین کو خیمے سے باہر لے جایا جا رہا تھا۔ وہ خطہ جو رات کی سیاسی میں چھا ہوا تھا، دن و نیاں سے نیلے اور گلشن کے سر پر مڑنا لگا تھا۔

اب میرے لیے چپکا رہنا ممکن نہیں تھا۔ تیزی سے حرکت کی اور جنگ کرکٹ کے لیے بھرپور ضرورت خاں کے سینے پر لگائی۔ یہ ایک جتنی کٹی ضرب تھی۔ جبار اچھل کر خیمے کے چاک شدہ کپڑے سے غرا باہر جا کر۔ اس کی رائفل میرے ہاتھ میں رہ گئی تھی۔ واقعہ نصف سینکڑے کے مختصر عرصے میں وقوع پزیر ہوا۔ گھمبیرت کرنا میرے جانے والا شخص شکل میری طرف ہوا تھا کہ میں نے جبار خاں سے بھیجی ہوئی رائفل واپس لے لی۔ گولی اس کے شانے پر لگی اور وہ دھکے سے لال لال لال کی کتھوں میں گرا۔ لال لال لال ہی وہ دشت زور سے نظر دیکھ رہی تھی۔ اس کا منہ پھج مارنے کے اندر تھا مگر آواز حلق سے برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ لال لال لال قدموں میں گرنے والا شخص غیر مسلح تھا لہذا اسے آم حال پر چھوڑ کر میں باہر لپکا۔ بالی دو افراد دوڑتے ہوئے طرف آ رہے تھے۔ ان میں سے اگلا زیادہ تیز رفتار تھا۔ زیادہ بد قسمت تھی۔ رائفل اس کے ہاتھ میں ہوئی بات تھی مگر وہ جوش کے عالم میں خالی ہاتھ ہی خیمے کی بجھا گا چلا آ رہا تھا جیسے اندر کھتے ہی ہنگامہ بپا کرے۔ گردن موڑ کر کھدے گا۔

خیمے رائفل بدست دیکھ کر اس نے ”بریک“ لگا۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ رکتا رکتا میوہ میرے سامنے پہنچا۔ میں رائفل کو کھمکھلا کھی کی طرح پکڑ چکا تھا۔ اس کا نہایت تباہ کن ضرب آنے والے کے چرے پر پڑی اور نقشے کا بھڑکا بنا۔ وہ دھکے چکر کھارے جان شے کی طرح زرا گرا اور بے سدھ ہو گیا۔ اس کے گرنے ہی میں نے آوندھے منہ زمین ل۔ ماؤڈر کی دو گولیاں سنسناتی ہوئی یہ سر سے گزر گئیں۔ یہ فائر عقب میں آنے والے شخص کے لیے تھے۔ شاید وہ مزید فائر بھی کرتا مگر اسی دوران سرغز خاں جو خیمے کے چاک شدہ حصے سے باہر جا کر اٹھا اور ہم رائفل اب میرے ہاتھ میں تھی۔ اپنے پورے وزن ساتھ مجھ پر آگرا۔ گوشت دیوہست کے جسم کے بجائے کوئی پتھر یا مجسمہ میری پشت پر لڑھک گیا تھا۔ میری پہلا نے بڑی مشکل سے یہ یوہوسا۔ میری ایک کٹنی آزاد تھی اس کا ایک بھرپور وار جبار خاں کو میری کمر سے اچھال سکے مگر اسے خود سے جد کرنا میرے لیے مودت نہیں تھا۔ ماؤڈر کی زد میں تھا اور جبار خاں کے میرے ساتھ پڑ رہے تھے۔ میں میری سلامتی تھی۔ میں جبار خاں سے کھمکھم ہو گیا اور ہم دونوں لڑھکتے ہوئے کئی فٹ خیمہ میں پہنچے۔

دیکھتے وقت جبار خاں کی ایک ہڈی میری ٹانگوں کی قبضی میں تھی۔ میں اس پوزیشن میں تھا کہ اس ہڈی کو قابل تانی تسان پہنچاؤں اور میں نے جبار خاں سے کوئی رعایت نہیں کی۔ ماؤڈر بردار لپکی پانچلے رکے ہمارے گرد پکڑا رہا تھا اور دھکیلتی ہوئی میں تھا۔ پانچواں شخص چونکہ جھاڑیوں کے اندر نیلے سے اچھا ہوا تھا لہذا ماؤڈر بردار کے سوا مجھے کسی سے خطرہ نہیں تھا۔ میں ماؤڈر بردار کی طرف سے ایک غلطی کا شکار تھا۔ تھوڑا سا وقت ضرور لگا لیکن ماؤڈر بردار نے مجھے ”ایس“ نہیں کیا۔ بیجان کیفیت میں وہ جو کئی میرے اور جبار کے سر پہنچا، میں نے ایک دم جبار خاں کو چھوڑا اور اس پر جھپٹ پڑا۔

وہ اس حرکت کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جبار خاں نے مجھے جکڑ رکھا ہے جبکہ حقیقت برعکس تھی۔ جبار خاں کی ہاتھیں ہڈی کی دونوں ہڈیاں سرکھنے کی طرح ٹوٹ چکی تھیں۔ اس ملک چوٹ کے بعد اس کی گرفت میرے جسم پر نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی لہذا اسے چھوڑ کر ماؤڈر بردار پر جھپٹنے میں مجھے قطعی مشکل پیش نہیں آئی۔ ماؤڈر بردار پشت کے بل میرے پیچھے گرا۔ میرے ہاتھ پاؤں نے تیزی سے حرکت کی اور چند سینکڑوں سے روٹی کی طرح دھک دیا۔ وہ خود کہیں گرا۔ اس کا ماؤڈر کہیں اور پکڑی کہیں۔ میں نے اس کا ماؤڈر اُن لوڈ کر کے جھاڑیوں میں پھینک دیا۔

اس کشمکش کے دوران میں نے کن آنکھوں سے نیلے کی طرف بھی دیکھا تھا۔ وہ کانٹے دار جھاڑیوں میں تھی اور جبار خاں کا ساتھی اسے بری طرح روند رہا تھا۔ تاہم جب ماؤڈر بردار سے فراغت پا کر میں نے نیلے کی طرف دیکھا تو نقشہ بدلا ہوا تھا۔ نیلے نے غیر متوقع طور پر بے جد جرات کا ثبوت دیا تھا۔ وہ سنبھل کر حملہ آور پر ٹوٹ پڑی تھی اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں تو اینٹ سے ضرور دے رہی تھی۔ حملہ آور اسے پھینکا تو وہ اپنی ہمت کے مطابق بدلہ چکاوتی۔ وہ اس کے بال کھینچتا تو وہ اس کے جسم میں دانت گاڑ دیتی۔ گاہے گاہے وہ اس کے جسم کے نازک حصوں کو بھی نشانہ بناتی تھی۔ منصف نازک کی دلیرانہ مزاحمت کا یہ منظر بردار بیجان خیز تھا۔ یہ جنگ آمد جنگ آدمی بات تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اپنے سے طاقتور مرد کی خیمیں ساجیں کرنے والی اور آنسو بہانے والی سر تاپا قبرین تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے نیلے کے اندر چھپا ہوا کوئی آتش نشان پھٹ پڑا ہے۔ عیسیٰ جان کے ڈیرے پر اگلوتے روزن والے بند تار یک کمرے میں ایک

قابض شخص نے اس کی عزت نفس اور اس کے جسم پر جتنے چرے لگائے تھے وہ ان سب کا بدلہ آج چکا دیا جاتی تھی۔ آخر مجھے محسوس ہوا کہ حملہ آور برواشت کی آخری حد کو چھوئے لگا ہے اور اب وہ موقع ملنے پر رائفل کے استعمال سے دریغ نہیں کرے گا۔ میں اس پر قابو پانے کا سوچتی رہا تھا کہ نیلے اور حملہ آور کی کھینچائی میں اچانک حملہ آور کی رائفل سے گولی چل گئی۔ دونوں کھمکھاتے تھے۔ گولی نیلے یا حملہ آور میں سے کسی کو بھی لگ سکتی تھی لیکن اتفاقاً کسی کو بھی نہیں لگی۔ یہ دو ٹالی رائفل تھی۔ برقی کی طرح یہ خیال میرے ذہن میں کودا کہ اس رائفل سے ایک فائر کیلے ہو چکا ہے۔ یعنی اب رائفل خالی تھی۔ میں نے عقب سے جا کر حملہ آور کے سر پر اپنی سیون ایم ایم کا آہنی کندا مارا اور پھر اسے دھکیل کر نیلے سے دور پھینک دیا۔

کھیل ختم ہو چکا تھا۔ پانچ میں سے اب صرف دو افراد مزاحمت کے قابل تھے اور وہ دونوں میرے نشانے پر تھے۔ ان میں سے ایک کا کندھا خون اگل رہا تھا اور دوسرے کے چرے پر نیلے کے تیز ناخنوں کی آن گیت خراشیں تھیں۔ جو افراد مزاحمت کے قابل نہیں تھے ان میں سرغز جبار کی حالت سب سے بری تھی۔ وہ ہوش میں تھا اور مضروب ہڈیوں کو دونوں ہاتھوں سے تھامے بری طرح تڑپ رہا تھا۔ تڑپنے کے ساتھ ساتھ وہ پشتوں میں ہانے والے بھی کمر جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کرب کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا خیمہ بھی تھا۔ شاید اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک عمارت شخص یہ سب کچھ کر چکا ہے۔ اگر چار برس پہلے کے ”جہانی استاد“ سے اس کا تعارف ہوا تو وہ اسے کراچی کے قمار خانوں اور شر پر ہنگامہ بینی کے بدنام آڈوں میں مار پیٹ کرتے دیکھ چکا ہوتا تو یوں پریشان نہ ہوتا۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں اور اب بھی مجھے یہ کہنے میں ہاک نہیں کہ میں جرائم پیشہ حلقوں کا ایک ماہا ہوا اسٹریٹ فائٹر تھا۔ اور اسٹریٹ فائٹر کیا ہوتا ہے؟ یہ شاید بہت سے لوگوں کو علم نہیں۔ پہلوانی، کراٹے، کنگ فو، تاجا جودو اور دیگر عسکری علوم کی اہمیت انہی جگہ لیکن اسٹریٹ فائٹر ان سب سے جدا چیز ہے۔ ہر عسکری فن کچھ اصولوں کے تابع ہوتا ہے مثلاً جودو میں آپ ضرب نہیں لگاسکتے، پہلوان کراٹے استعمال نہیں کر سکتا۔ ایک ماہر لٹھ باز چاقو چمچری کے استعمال سے تاملد ہوتا ہے لیکن جب اسٹریٹ فائٹنگ کی بات ہوتی ہے تو ہر ایک ہی اصول سامنے رکھا جاتا ہے ”قاتل اینڈ فائٹ“ اسٹریٹ فائٹر دشمن کو زیر کرنے کے لیے لڑتا ہے اور

قاتل اسٹریٹ فائٹر دشمن کو زیر کرنے کے لیے لڑتا ہے اور

لیکن اتنا ہوا ضرور چل گیا کہ مجھ سے اسے جتنی بھی شکایتیں تھیں وہ دور ہو چکی تھیں اور وہ میرے ”چمپے رستم“ ہونے پر خوش تھی۔

جس دوران لال بی بی مجھ سے باتیں کر رہی تھی، گلشن دوبارہ نیسے میں گئی اور وہاں سے میری سب مشینیں من نکال لائی۔ میں نے سب مشینیں من کو لوڈ کر کے اسے لینے کی مدد سے گلے میں لٹکالیا۔ میرے گلے میں جموتی ”موت“ کی دینے میرے حلقوں کو کچھ اور ہراساں کر دیا، میں نے کچھ پوچھ گچھ کے لیے ان میں سے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا جو اردو بول اور سمجھ لیتا تھا۔ اس کا نام جودہ خاں تھا اور یہ وہی شخص تھا جس نے نیلہ پر چڑھائی کی تھی اور نتیجے میں لولہاں ہو کر رہا ہوا تھا۔ میں نے اسے سب مشینیں من کے نشانے پر رکھا اور دیگر افراد سے کچھ فاصلے پر لے گیا۔ وہ جھٹا ہوا بد معاش تھا۔ اس شخص کی صورت حال میں بھی اس کے چہرے پر کوئی خاص پریشانی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ابھی میں اس سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک بار پھر قرب و جوار گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج اٹھی۔

اس دفعہ آنے والے زیادہ تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ تعداد پندرہ بیس کے قریب ہے۔ وہ بے حد تیزی سے نمودار ہوئے اور اس سے پہلے کے میں کوئی احتیاطی تدبیر اختیار کرتا۔ وہ ہمارے سروں پر پہنچ گئے، ہم کُل جکڑ رہے اور خدشہ میں تھے۔ وہ ہلندی رہتے اور انہیں درختوں کی آڑ میں میسر تھی۔ اگر میں سب مشینیں من کے زعم میں ان سے الجھنے کی کوشش کرتا تو سرسرا گھٹاں کا سودا تھا۔ نوادہ افراد کے لباس اور ٹھیلوں سے عیاں تھا کہ وہ انہی پانچ افراد کے ساتھی ہیں جو ابھی میرے ہاتھوں پٹ پٹ کر بیٹھے ہیں۔ نوادہ افراد کو دیکھتے ہی جبار خاں اور جودہ خاں وغیرہ کے چہرے کُل اٹھ گئے۔ وہ ایک دم ہی خود کو بے حد محفوظ خیال کرنے لگے تھے۔ دوسری طرف نیلہ اور گلشن کے چہرے دھواں دھواں نظر آنے لگے۔ نیلہ نے بچے کو اپنے ساتھ بھیج لیا اور لال بی بی نے جلدی سے راتقل اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

آنے والوں میں چوڑے شانوں اور فراخ پیشانی والا ایک شخص سب سے نمایاں تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی ٹوٹ پھوٹ کے علاوہ میرے ہاتھ میں چمکتی ہوئی سب مشینیں من بھی دیکھ چکا تھا۔ تاہم ان دونوں عوامل کو خاطر میں لائے بغیر وہ بڑے اعتماد کے ساتھ گھوڑے سے اتار اور سنبھل سنبھل کر چلتا میرے سامنے پہنچ گیا۔ وہ افراد ذرا مڑباناہ انداز میں اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ آنے والے نے از خود اپنا تعارف

اس کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرتا ہے اس کا سب سے بڑا اختیار اس کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ ہوتی ہے اور اکثر اوقات اس آگ میں بڑے بڑے فائر اور مارشل آرٹس کے پیراشارا موم کی طرح پھٹتے دیکھے گئے ہیں۔ میری ایماندارانہ رائے ہے کہ جیسے شاعر، معمر اور ادیب تربیت سے نیسے بنے ایسے ہی لڑنے مرنے کا فن بھی سیکھنے سے نیسے آتے۔ یہ فن ہوتا ہی نہیں یہ تو ایک نیلی آگ ہوتی ہے جو سراج کے ظالم ہاتھ کسی شخص کے اندر روشن کرتے ہیں اور نا انصافیوں کی ہوا اسے بھڑکا کر شعلہ بنادیتی ہے۔

جو نیلی لڑائی تھی پھر بھاگ کر نیسے سے نکلا اور نیلہ سے لپٹ گیا۔ نیلہ اسے لے کر میرے پاس آن کھڑی ہوئی۔ نیلہ کا چوہا لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور رخساروں پر وہی نشان تھے جو کسی نئے لٹی کے کانٹے سے جلد پر نمودار ہوتے ہیں۔ اس کا لباس کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کا ایک دم بھڑکا جانا اور گھماں شیرینی کی طرح حملہ آور پر جا بڑا سمجھ میں آتا تھا۔ اسے جب تک مارا چٹا گیا تھا وہ سستی رہی تھی لیکن جب اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا گیا تھا وہ سب کچھ فراموش کر کے سراپا مزاحمت بن گئی تھی۔ گلشن بھی اپنا تار تار گریبان سنبھالتی میرے قریب آئی۔ حملہ آوروں کے پاس کل تین راتقلیں اور ایک ماؤزر تھا۔ ان میں سے ایک دو بلی راتقل خالی ہو چکی تھی۔ ایک راتقل میرے قبضے میں تھی۔ ماؤزر میں نے ناکارہ کر کے جھاریوں میں پھینک دیا تھا۔ اب صرف ایک راتقل باقی تھی۔ یہ اس شخص کے کندھے پر تھی جس نے خالی ہاتھ نیسے میں جھکنے کی دھڑکی کی تھی اور منہ کی کھار اٹھا پھیل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک راتقل لال بی بی والی بھی تھی اور وہ نیسے کے اندر پڑی تھی۔

میں نے گلشن سے کہا کہ وہ یہ دونوں راتقلیں اٹھا کر میرے پاس لے آئے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ نیلہ کی طرح گلشن بھی سستی سستی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میرا یہ روپ ان دونوں کے لئے قطعی غیر متوقع اور بے حد متاثر کن تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہاں کی صورت حال مکمل طور پر ہمارے قابو میں آچکی تھی۔ میری ہدایت پر نیلہ اور گلشن نیسے میں گھسے اور لال بی بی کی بندشیں مکمل کر اسے باہر لے آئیں۔ وہ جھڑا کرنے والے انداز میں مسلسل بول رہی تھی اور جبار خاں کو خاص طور پر قہقہے طعن کا نشانہ بناتی تھی۔ قریب آکر اس نے میرا شانہ تھاوا اور شکایت کرنے والے انداز میں کچھ کہنے لگی۔ اس کی باتیں میرے لیے نہیں پڑیں

دیکھتے ہی دیکھتے موقع پر صورت حال عجیب رنگ اختیار کر گئی۔ آتش مزاج لشکر خاں کے ساتھ آنے والے کچھ سوادوں نے جبار خاں، جودہ خاں اور ان کے دیگر ساتھیوں کو مختلف پٹروں سے اس طرح پانڈھ دیا کہ وہ پٹروں سے منہ کیر نظر آنے لگے۔ صرف ایک شخص کو اس سلوک سے معاف کر دیا گیا اور یہ وہ جودہ خاں کے چہرے کا بھڑکا ہوا تھوڑا سا ہوش رہا۔ جبار خاں اور جودہ خاں کے درمیان کڑی دوری پر بے ہوش رہا تھا۔ چاروں افراد کو رستیوں کے ذریعے بانڈھا جا چکا تو لشکر خاں کے ایک ساتھی نے اپنے گھوڑے کی خرچین سے ایک چوڑی کوڑا برآمد کیا۔ یہ کوڑا دیکھنے میں ہی خوف ناک نظر آتا تھا۔ اسے مزید اذیت ناک بنانے کے لیے اس کے گرد لوہے کا باریک تار لپیٹا گیا تھا۔ یہ کوڑا ایک بٹے کے گھستائی نے ہاتھ میں لیا اور کسی ماہر کوڑا زن کے انداز میں پھینکیں نکالتا اور بانڈھ لیا ہوا جودہ خاں کے سر پر پہنچ گیا۔

جودہ خاں قرقر قرقر رہا تھا۔ تمام نشہ ہرن ہو چکا تھا اور اب وہ سر پٹا پٹا فریاد تھا۔ تاہم یہ فریاد اس کے ہونٹوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ غالباً ان لوگوں کے نزدیک سزا سے بچنے کے لیے معافی کی درخواست ”مرا آگ کی شان کے خلاف تھی۔“ بہر طور ان سب کے چہروں سے یہ بات عیاں تھی کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے اور وہ اپنے سردار سے بے حد شرمندہ ہیں۔ ان چاروں کو درختوں کے ساتھ بندھے دیکھنے کا منظر بڑا تشنگی خیز تھا۔ گو ان کی بندشیں بہت مضبوط نہیں تھیں لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان کو بانڈھنے والی اصل شے رسی نہیں لشکر خاں کی دہشت اور بڑی تھی۔

میں نے دے نظروں میں لشکر خاں نے کہا ”سردار لشکر خاں! میرا خیال ہے ان لوہے کی کائی سڑا لیں چکی ہے۔ ویسے بھی یہ اپنی حرکت پر بادم نظر آ رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ انہیں معاف کر دیا جائے۔“

لشکر خاں آنکھیں نکال کر بولا ”تمہارا اب اس معاملے سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جس طرح تمہارے علاقوں میں کچھ پولیس کیس ناقابل ضمانت اور ناقابل راضی نامہ ہوتا ہے اسی باقی یہاں بھی کچھ جرم ناقابل معافی ہے۔“

لشکر خاں کے بارے میں میرا قیادہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ وہ مصلحت کو شش گمانہ کی گئی رکھنے والا۔ اس کا ہر انداز پر جوش اور ایک قطعیٹ لیے ہوئے تھا۔ بے شک جنہیں وہ سزا دے رہا تھا وہ اس کے ساتھی تھے اور اس نازک وقت میں اسے ایک ایک ساتھی کی ضرورت تھی مگر وہ انصاف کو نظر پر ضرورت کی حیثیت نہیں چڑھا رہا تھا۔ اس نے کوئی

کراتے ہوئے اپنا نام لشکر خاں بتایا اور پٹو آہستہ آہستہ بولا ”میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم ایس بی برکت اور صوبیدار مرجان کا ساتھی ہے۔ شاہ شہنشاہ۔ تم نے بڑا دلیری کا بات کیا ہے۔“

لشکر خاں کا نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ میں عیسیٰ جان کے ذریعے اس کے متعلق سن چکا تھا۔ اس شخص نے عیسیٰ جان اور لشکر جیسے دو مغربیوں سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس کے دلیرانہ عزائم نے اسے میری نظروں میں اہم بنا دیا تھا۔ میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ آہستہ آہستہ عصاب کا مالک ایک بے خوف شخص نظر آتا تھا۔ جس بات کو صحیح سمجھنے والا اس پر اڑ جانے والا دل میں کچھ نہ رکھنے والا ہے ”را“ بے کھوت اور دو ٹوک۔ ایسے لوگ جس شے میں بھی ہوں، اپنی صاف کوئی کی وجہ سے بہت سے دشمن بنالیتے ہیں لیکن جو ان کے دوست ہوں وہ واقعی دوست ہوتے ہیں۔ بے حد وقار اور مشکل وقت میں سیسا پلائی ہوئی دیوار بن جانے والے۔

لشکر خاں نے تیزی سے اپنے ساتھیوں کی اجازت کا جائزہ لیا اور کوئی سوال پوچھے بغیر ہی ”تک پہنچ گیا۔“ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا ”کیا جبار خاں وغیرہ نے کوئی بہ تیزی کیا تھا؟“

”بہ تیزی بہت چھوٹا لفظ ہے خان“ میں نے جواب دیا ”تمہارے ساتھی بدکار اور زانی لوگ ہیں۔ مجبور عورت کو دیکھ کر ان کے اندر چھپا ہوا زہریلا ناگ چھن پھلا کر جھومنے لگا ہے۔ میرے بس میں ہو تو ابھی ان کے سر پٹھوں سے کچل کر لائے دیر میں بھا دوں۔“

لشکر خاں نے کہا ”متم بہادر آدمی ہے۔ جو شخص دشمن پر قابو پا کر بھی اسے سخت سزا نہیں دیتا وہ بہادر ہوتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان لوگوں کو معاف کر دے گا۔ ان کو کیے کا سزا ضرور ملے گا اور ابھی ملے گا۔“

لشکر خاں کی آنکھوں میں قہقہہ آگ دکھ رہی تھی۔ اس نے ایک غصہ ناک نگاہ جبار خاں پر ڈالی اور اپنے ساتھ آنے والے گھڑ سواروں سے پشتوں میں گفتگو کرنے لگا۔ پھر اس گفتگو میں گلشن۔۔۔ نیلہ اور لال بی بی بھی شریک ہو گئیں۔ لال بی بی ڈبائی دینے والے انداز میں پیچھے جکر لشکر خاں سے کچھ کہنے لگی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جبار خاں، جودہ خاں وغیرہ کے رنگ قہقہے تھے۔ لشکر خاں کا سودھ لےنے ہی ان کی ساری تن فنی ختم ہو گئی تھی اور وہ انسانوں کے بجائے منی کے ڈیمر نظر آنے لگے تھے۔

سوچ بچار نہیں کی تھی کوئی لمبی دوڑی پلاننگ نہیں تھی۔ جو کسی سے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے سامنے جرم وار ہیں وہ وہیں مومٹے پر انہیں سزا دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ انصاف کی ایک خوبی یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ تاخیر سے نہ ہو اور لشکر خاں کے ”انصاف“ میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔

ہمارے لیے لشکر خاں کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس وقت وہ ہماری خاطر اپنے آدمیوں کی کھال اوجھڑ رہا ہے ہماری خاطر بھی یہی تمہاری خاطر اگر تم خود اپنے مجرموں کو معاف کر دو گی تو وہ اپنا ہاتھ روک لے گا۔ یہ خیر سگالی کا جذبہ ہم سب کے لیے سودمند ہوگا۔ چلو شاہاش انھیں اس سے بات کر۔“

لشکر خاں نے اشارہ کیا اور نجم عظیم کو مستانی نے پہلا کوڑا پوری قوت سے جمعہ خاں کی پیٹھ پر مارا ”خراپ“ کی تیز آواز کھائی میں دور تک گونجی۔ نیبلہ کے ساتھ آئے ہوئے بچے نے رونا شروع کر دیا۔ اٹھ دس سینکڑ کے وقت سے دوسرا کوڑا مجرم کی پیٹھ پر پڑا۔ پھر تیسرا اور پھر چوتھا۔ چار کوڑے تو اس نے ضبط سے برداشت کیے، پھر اس کی چیخیں نکل گئیں۔ کوڑا پڑنے ہی اس کا جسم اچھلتا تھا اور وہ تنے سے سر اٹھانے لگتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شلوار کے چوتھے اڑکنے اور دو عجیوں کے نیچے سے خون اکود گوشت جھانکنے لگا۔ گلشن اور نیبلہ سہم کر رہے سمیت نیچے کے اندر جا چکی تھیں۔ لال بی بی بھی منہ موڑے کھڑی تھی۔ تیس ہینٹیں کوڑے رسید کرنے کے بعد جمعہ خاں کو چھوڑا کیا تو وہ نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔ اب جبار خاں کی باری آئی۔ اس کی حالت بہت بگڑ چکی تھی۔ ٹوٹی ہوئی پنڈلی نے اسے درد سے بے حال کر رکھا تھا۔ یہ وقت اسے کوڑے رسید کرنے کا نہیں اسپتال پہنچانے کا تھا۔ مجھے اس پر واقعی ترس آیا۔

میں نے نیچے کا رخ کیا۔ نیبلہ بچے کو گود میں سینے کاٹوں میں اٹھایا دیے اور آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ میں نے اسے شانے سے ہلاتا تو وہ میری آمد سے آگاہ ہوئی۔ میں نے کہا ”نیبلہ! تم لشکر خاں سے بات کرو۔ میرا خیال ہے وہ تمہاری بات مان جائے گا۔“

وہ خوف زدہ انداز میں نفی میں سرھلانے لگی۔ اس کے اندر کی بھری ہوئی غر عورت اب پھر چھوٹی موٹی سی ہو کر سوچتی تھی۔ اپنی آہ کو جارحیت کے جزیروں میں دیکھ کر اس نے جو جدوجہد کی تھی وہ بالکل غیر ارادی تھی۔ جوئی وہ دشمن ترین گولیوں گزر گئی تھیں وہ اپنے آپ میں آگئی تھی۔ دندان ہوس کے لیے لوہے کا چٹان بن جانے والی اب پھر گوشت و پوست کی عورت تھی۔ وہ انکار میں سرھلانے لگی ”نہیں۔ نہیں میں نہیں جاؤں گی۔“

میں نے کہا ”دیکھو نیبلہ! ہمیں دو برائیوں میں سے چھوٹی برائی کو چننا ہے۔ اگر ہم یہاں سے بھاگ کر نکلتا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے لشکر خاں کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس وقت وہ ہماری خاطر اپنے آدمیوں کی کھال اوجھڑ رہا ہے ہماری خاطر بھی یہی تمہاری خاطر اگر تم خود اپنے مجرموں کو معاف کر دو گی تو وہ اپنا ہاتھ روک لے گا۔ یہ خیر سگالی کا جذبہ ہم سب کے لیے سودمند ہوگا۔ چلو شاہاش انھیں اس سے بات کر۔“

میں نے بازو سے تمام کر نیلہ کو اٹھایا۔ وہ ہراساں نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ جبار خاں کو پہلا کوڑا مارا جا چکا تھا اور ایک کوڑا کھاکری اس نے پانی طلب کر لیا تھا۔ مٹھی منجھوں والا ایک شخص اسے پیانے سے پانی پلا رہا تھا۔ جبار خاں کا باجوت چروہیوں کے مانند زرد تھا اور زخمی ہانگ مسلسل کانپتی چلی جا رہی تھی۔

خاں نے ایک بار پھر میری ہمت کی داد دی کہ میں بیٹھی جان کو بل دے کر اس کی حراست سے نکل بھاگا تھا۔ وہ نہ صرف خود نکلا تھا بلکہ ایک مجبور عورت اور بچے کی مشکل بھی میرے جب آسان ہو گئی تھی۔ لشکر خاں کو یہ جان کر دکھ ہوا کہ میرا ساتھی راستے میں بلندی سے گر کر لاپتا ہو گیا ہے۔ اس موقع پر لشکر خاں نے انکشاف کیا کہ جیوں تک پہنچنے سے پشیمیں نے بھاگتے ہوئے جو فائر کیے تھے ان میں سے ایک فائر نے بیٹھی جان کے ایک قریبی ساتھی حشمت کی کھوپڑی اڑا دی تھی۔

لشکر خاں کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ رات بھر بیٹھی جان اور لشکر خاں کے ساتھیوں میں آنکھ پھولی ہوئی رہی ہے اور اس خونی آنکھ پھولی میں دونوں طرف کے کئی افراد ہلاک زخمی ہو چکے ہیں۔ وقتی طور پر لشکر خاں کو پہلانی اختیار کرنی پڑی تھی۔ تاہم اس کے عزائم بلند تھے اور وہ بیٹھی جان کے جیتنے شکر شرا کے خلاف آتش فشاں کے مانند کھول رہا تھا۔ لشکر خاں کا خیال تھا کہ گردہ میں بیٹھتے کی وجہ صرف اور صرف لشکر نے بیٹھی جان کی غیر موجودگی میں قائم مقام سردار لشکر خاں تھا لیکن جب سے شکر آیا تھا اکثر حالات اسی کے ہاتھ میں رہتے تھے۔ بیٹھی جان کی موجودگی اور غیر موجودگی میں وہ بڑے دھڑلے سے حکم چلاتا اور من مانی کرتا تھا۔ اب کچھ عرصے سے اس نے گردہ میں اپنے مخالفین کو بے جا تشدد کا نشانہ بنانا بھی شروع کر دیا تھا۔

لشکر خاں نے کہا ”چار انسانوں کے زندہ جلنے کا منظر اماری آنکھوں میں نقش ہو چکا ہے اور امی نہیں جس نے مجھے دیکھا دیکھا ہے کبھی بھول نہیں سکتا۔ خوام نے قسم کھایا ہے کہ اس کا فکرو اس کی کوتاہی سزا ضرور دے گا۔ اگر سزا نہ دے گا تو رات نکل پھینک دے گا اور مونچھ کٹوا کر گھر میں بیٹھ جائے گا۔“

لشکر خاں کے سارے ساتھی شکر کے خلاف بھرے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شکر نے ان کے خلاف انتقامی کارروائی کو ان کے لیے ڈراما کھیلایا ہے۔ اپنے دو ساتھیوں کو خودی کھل کر دیا ہے اور الزام ان پر لگا دیا ہے۔

جن ”دو ساتھیوں“ کا ذکر ہو رہا تھا ان کے بارے میں مجھ سے بہتر کون جانتا تھا۔ وہ میرے ہی ہاتھوں عدم آباد رخصت ہوئے تھے۔ ان کی رخصتی غیر متوقع طور پر ایک زبردست نکٹش کا باعث بن گئی تھی اور بیٹھی جان کے گردہ میں پہلے سے موجود بے چینی سیدھی سادی بغاوت میں بدل گئی تھی۔ باقی لشکر خاں تھا اور اس کے ساتھی تھے۔ انہوں نے شکر

اور بیٹھی جان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا اور آئندہ بھی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود میں محسوس کر رہا تھا کہ اب بھی اپنے سردار اعلیٰ بیٹھی جان کے بارے میں ان کا رویہ زیادہ سخت نہیں۔ ان کی نفرت کا اصل نشانہ شکر تھا جو بقول ان کے اپنی حرکتوں سے سردار کو بانی گردہ سے الگ تھک کر رہا تھا۔ لشکر خاں میرے بارے میں اب بھی کچھ جان چکا تھا۔ سوائے اس بات کے کہ میں ہینڈ کا نشیمل احسان الہی نہیں شاہچہاں ہوں۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میں ایس جلی برکت اور دیگر دو افراد کے ساتھ پنجاب سے بیٹھی جان کی گرفتاری کے لیے روانہ ہوا تھا۔ یہاں کرم انجمنی سے صوبیدار مرہان اور شکاری کبیر علی شاہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔ ہم شکاریوں کے ہمیں میں ڈھکی تالاب پہنچے تھے اور پچھلے کی روز سے گردو نواح میں محکم رہے تھے۔ لشکر خاں نے پوچھا ”اب تمہارا کیا ارادہ ہے کا نشیمل صاحب؟“

میں نے کہا ”اگر وہ تو یہی ہے کہ کسی طرح اس جنگل سے نکل کر اپنے افسروں تک پہنچوں اور انہیں رپورٹ پیش کروں۔“

”شٹل اٹھا رپورٹ پیش کرے گا تم؟“

”یہی کہ گردہ کا سراغ مل گیا ہے اور چھاپا مار پائی کے ارکان کو ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا ہے۔“

”خواس کے بعد کیا ہوگا۔ کیا تم یہ سوچتا ہے کہ کرم لیوی کیل کانٹے سے لیس ہو کر بیٹھی جان کے ڈیرے پر دھاوا بول دے گا۔“

میں نے کہا ”کرم لیوی دھاوا نہ بولے گی تو اپنے آدمیوں کو بچانے کی کوشش تو کرے گی۔ وہ سب انجمنی کے ملازم ہیں اور ان کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔“

لشکر خاں نے کہا ”لیکن امارا خیال ہے کہ اب بیٹھی جان تم کو نہیں لے گا۔ جس ڈیرے پر تم نے اسے دیکھا تھا وہاں اب تمہیں کتنے ہی کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ وہ ڈیرا تبدیل کر چکا ہے؟“

”کچا کباب ہے“ لشکر خاں نے پورے یقین سے کہا ”لیکن اماری بات کا یہ مطلب نہیں کہ تم وہاں شہر نہ جاؤ اور اپنے بیٹوں کو اطلاع نہ کرو۔ ضرور کرو۔ بلکہ جتنا جلد ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہارے ساتھ دو جوان عورت ہے اور جس کے ساتھ جو ان عورت ہو اسے بیٹھی جان سے بہت بچ کر رہنا چاہیے۔ وہ بہت خراب کرنا ہے عورت کو لیکن ایک بات اہم تم سے ضرور کہے گا۔“

”وہ کیا؟“

”ابھی تم یہاں سے نکلے گا تو یہ تمہارے لیے خطرناک ہوگا۔ یحییٰ جان کا آدمی پاگل کتوں کے باغی چاروں طرف دوڑتا پھرنا ہے۔ یہ بڑا محفوظ جگہ ہے تم یہاں آسانی سے پانچ روز بچ سکتا ہے۔ امداد ڈرانڈا پڑ جائے تو تم پھر یہاں سے نکلو۔“

لشکر خاں نے ایک مفید رائے دی تھی۔ میں خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس کھائی سے باہر ہماری سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔ پناہ کے لیے بہترین جگہ یہی تھی۔ میں نے لشکر خاں سے پوچھا کہ وہ اب کہاں جا رہا ہے؟ وہ بولا ”زیادہ دور نہیں۔ ہو سکتا ہے شام تک ام بھی یہاں تمہارے پاس آجائے۔ اس کھائی کا پینٹ بہت بڑا ہے۔ لشکر خاں تو کیا پورا لشکر یہاں سلا سکا ہے۔“

لشکر خاں مبالغے سے کام لے رہا تھا۔ پورا لشکر تو نہیں مگر چند ہی افراد ایک دو عیموں میں یہاں یہ آسانی چھپ سکتے تھے۔ میں نے لشکر خاں سے کہا ”مردار تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم یہ جنگل چھوڑو گے نہیں۔ یحییٰ جان سے فکر لو گے۔“

وہ بولا ”ہمارا عمر یحییٰ جان سے نہیں۔ اس کافر کے بچے شکر سے ہے۔ ہم مجرم ہے لیکن وطن دشمن نہیں۔ وہ وطن دشمن ہے اور وطن دشمن اس کے پاس پناہ لیتے ہیں۔ راولپنڈی کے ایک جلسہ میں فائزنگ ہوا۔ کئی لوگ اپنی جان سے گیا۔ بیسیوں زخمی ہوا۔ اس فائزنگ کیس کا مجرم امارے پاس پناہ لیتا ہے اور یحییٰ جان لشکر کی خاطر ان ظالموں کو پناہ دیتا ہے۔ ام کو یہ منظور نہیں۔ ام کو لشکر بھی منظور نہیں۔ وہ مزدور مارا جائے گا تو یحییٰ جان پھر ہمارا اپنا ہو جائے گا۔ لاشیں مارنے سے پانی پھٹ نہیں جاتا۔ یحییٰ جان جیسا بھی ہے۔ امارا سردار ہے اور ام اسے سردار ہی سمجھے گا۔ وہ راستے سے بھٹک گیا ہے۔ ام اسے راستے پر لائے گا اور اگر وہ نہیں آئے گا تو پھر امارے درمیان ہندوئی فیصلہ کرے گا۔ اس نے جوش کے عالم میں اپنی ہندوئی ہوا میں لڑائی اور اس کا چہرہ الگ بگولا دکھائی دینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد لشکر خاں گھوڑے کی پشت پر سوار تھا اور اس کے تمام ساتھی عقب میں پایہ رکاب تھے۔ اس کے ساتھیوں میں سے دو نیم بے ہوش تھے۔ ایک جود خاں تھے تین درجن کے قریب کوڑے پڑے تھے اور دو سرا و حملہ آور جس کے چہرے پر میری رائے نقل گاہ تھا۔ ان دونوں کو احتیاط سے گھوڑوں پر اونڈھالنا دیا گیا تھا۔ جبار خاں کی ٹانگ

کے گرد تین سیدھی گولیاں رکھ کر میں نے ایک بگڑی مضبوط سے لپیٹ دی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے اسے کچھ اٹھایا بھی کھادی بھی اور اب وہ کون محسوس کر رہا تھا۔

لشکر خاں کے جانتے ہی لال بی بی، گلشن اور نیلہ وغیرہ نے مجھے گھیر لیا۔ رشید خاں بستر پر دراز تھا اور اس کی تھرا ٹکاپیں بھی مجھ پر ہی تھیں۔ لال بی بی نے بڑی محنت سے میرا منہ چوما اور ملاں لینے لگی۔ میرے اور لشکر خاں درمیان ہونے والی گفتگو سے یہ سارے لوگ مجھے بڑا کانشیل کی حیثیت سے جان بچے تھے۔ رشید خاں اپنی تحفہ آواز میں بولا ”ام کو پہلے ہی خبر تھا کہ آپ صرف لشکر خاں نہیں بلکہ آپ کے پولیس میں رہ کر خاص قسم کا زندگی ہوا ہے آپ نے۔ مگر حیرت کا بات ہے کہ آپ ابھی تک کانشیل ہی ہے۔ آپ کو تو کوئی بڑا افسر ہونا چاہیے تھا۔“

رشید خاں اپنی معصومیت کے سبب میرے لیے ”کشنز“ کا عہدہ تجویز کر رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ایسے عہدوں پر ہاتھ پاؤں کی طاقت سے نہیں کر سکی طاقت۔ لڑا جاتا ہے۔ اثر و رسوخ کے اثر سے بڑے بڑے سوراخوں کو جیت لیا جاتا ہے اور اختیار کی تلوار سے دشمنوں کے گلے کاٹے جاتے ہیں۔ ایک ناکاؤں شخص بھی ایسے عہدوں پر فائز ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کے اندر ایک حلیہ اور بے قرار روح موجود ہو۔ میں نے کہا ”رشید خاں! اتنی بڑی بددعا نہ دو۔ ہیز کانشیل ہو کر ایسی مصیبتوں واسطہ پڑ رہا ہے تو بڑی کشتی ہو کر کیا نہیں بیت جائے گی۔ با میں کوئی ایسا ٹنگ کاٹا ہو بھی نہیں ہوں۔ بس غورتوں کی۔ عربی دیکھ کر چاک چاک دماغ محسوس کیا تھا۔ اب یہ سوچ کر ہول ہوں کہ اگر جبار خاں کی طرح لشکر خاں کا میز بھی محسوس جانا بڑا اڑا انجام ہوتا ہے۔“

لال بی بی بدستور میرے لیے دوامیہ کلمات کہہ رہی تھیں۔ رشید خاں نے کہا ”آپ اپنے بارے میں کچھ بھی کہہ مگر یہ سچ ہے کہ آپ امارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا ہے۔“

میں نے کہا ”مجھے انسان ہی رہنے دو بھائی۔ فرشتوں پولیس میں بھرتی نہیں کیا جاتا۔ میرے اس لیے کو پتا چل گیا میں فرشتوں میں پاؤں دھرنے لگا ہوں تو کھڑے کھڑے یہ چھٹی کراویں گے۔ بال بچے دار آدمی ہوں۔ روزگار۔ محروم ہو گیا تو فرشتے کی جگہ انسان بھی نہیں رہ جاؤں گا۔“

گلشن نے اس گفتگو میں پہلی بار حصہ لیتے ہوئے

واپس نہیں آتا تھا اور ایک طرح سے یہ اچھائی ہوا تھا۔ لشکر خاں کی نوجوئی سے فائدے کے بجائے انا ہمارا نقصان ہو سکتا تھا۔ یہ ایک خیر اس کھائی کے مجاز جھکاؤ میں یوں کم تھا کہ بے نشان ہو کر رہ گیا تھا۔ اگر میں تیس افراد مزید آجاتے اور چھ سات خیمے اور لگ جاتے تو یہ پناہ گاہ پناہ گاہ نہ رہتی۔

رات کے تقریباً گیارہ بجے تھے جب میں خیمے سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ”کہاں جا رہے ہیں؟“ نیلہ اور رشید خاں نے تقریباً ایک ساتھ پوچھا۔

”جہاں مجھے جانا چاہیے۔“ میں نے جواب دیا۔

”مطلب؟“ نیلہ نے پوچھا۔

میں نے کہا ”ہو سکتا ہے عباس خاں زخمی حالت میں وہیں پڑا ہو جاں گرا تھا۔ موت و حیات کی کشمکش میں جلا شخص کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے اور ہم کل سے اب تک بہت سا وقت ضائع کر چکے ہیں۔ اب اور وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے آدھ پون گھنٹے میں میں وہاں تک پہنچ سکتا ہوں۔ بہت ہوا تو ایک گھنٹہ لگ جائے گا۔ اس وقت گیارہ بجے ہیں۔ دو بجے تک میری واپس چھٹی ہے۔“

رشید خاں کی آنکھوں میں بے چینی نظر آنے لگی۔ بولا ”بھائی جان نے بھی بالکل ایسی بات کہا تھا۔ وہ وہ گھنٹے کا کہہ کر گیا تھا اور اب تک نہیں آیا۔ اب آپ جا رہے ہیں۔ یہ نہ ہو ام آپ کا بھی راہ دیکھتا رہ جائے مت جاؤ بھائی صاحب۔ خواہ خواہ خود کو خطرے میں مت ڈالو۔“

میں نے کہا ”ایک طرف آپ لوگ کہتے ہیں کہ میں مرزا محمد کو غلط کړوں، دوسری طرف مجھے خیمے سے قدم باہر نہیں نکالتے دیتے۔ ایسا یہی چلے گا۔ کچھ حاصل کرنے کے لیے خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔ آپ لوگ اب نئے نہیں ہیں، اسلحہ ہے آپ کے پاس۔ حوصلے سے کام لیں۔ کچھ نہیں ہو گا یہاں۔“

اہل خیمہ کو قسلی تشفی نہ کر میں جانے کے لیے تار ہو گیا۔ سردی عروج پر تھی میں نے جیکٹ کے نیچے مرزا محمد کی ایک پرانی صدری پہن لی۔ چہرے کو ہوا کے ٹھنڈوں سے بچانے کے لیے گلشن کی ایک ادنیٰ شال سے کام لیا۔ میں نے یہ شال ڈھالنے کی طرح چہرے پر لپیٹ لی۔ لال بی بی کی رائے میرے ہاتھ میں تھی۔ گولیوں والا ٹیک کرے ہاتھ کر اور ایک ٹھنڈی ٹائیچ لے کر میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ چھان زادی ہونے کے ناطے گلشن بھی اپنی ساس کی

بھوتی اردو میں کہا ”آپ کے یہاں ہونے سے ام کو بہت ڈھارس ملا ہے۔ اب ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں آپ واپس نہ چلا جائے۔“

میں نے کہا ”بی بی گلشن! غالب خستہ کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔ تم میری موجودگی کو رحمت سمجھ رہی ہو جبکہ اس ساری زحمت کا اصل سبب میں ہی ہوں۔ نہ میں یہاں ہوتا۔ نہ تمہاری ساس خیمہ صبح سویرے میرا منہ ڈھلانے باہر لے جاتیں۔ نہ وہاں پانی گرتا اور نہ کسی کو ہمارا کھوج ملتا۔ میری تو غلغلہ نہ رہتا ہے کہ ہمیں اجازت دو اور اگر ہم اپنی کسی مجبوری کے تحت اجازت نہ ملائیں تو زبردستی ہمیں اجازت عنایت کر کے اس خیمے سے چلا کر۔ خاص طور پر میری موجودگی کا رعب تو بالکل مت لو۔“

میں اپنی ہلکی پھلکی باتوں سے ماحول کی بنیادی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نتیجہ برعکس برآمد ہو رہا تھا۔ رشید خاں کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور وہ اپنا کانٹا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر بولا ”ام آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہے بھائی صاحب! جہاں آپ نے امارا اتنا مدد کیا ہے وہاں کچھ مدد اور کریں“ اور آپ کبھی سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو عقل اور حوصلہ دیا ہے۔ آپ۔“

”کیسی مدد؟“ میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

وہ بولا ”آپ دیکھتا ہے ام پیار ہے۔ خیمے سے نہیں نکل سکتا۔ نہ امارا ماں اور بیوی باہر جا سکتا ہے۔ آپ امارے بھائی کا پتا کریں۔ ام آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولے گا۔“

آخری الفاظ کہتے کہ رشید خاں باقاعدہ رونے لگا۔ گلشن اور لال بی بی کی آنکھیں بھی ڈبڈبائیں تھیں۔ کم ہونے والا گھر کا سربراہ تھا۔ وہ اس کے بغیر دو قدم بھی نہیں چل سکتے تھے۔ ان کے لیے راندہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ خود کہیں گھو گیا تھا۔ میں نے رشید خاں سے قسلی تشفی کی باتیں کیں اور وعدہ کیا کہ مجھ سے اس سلسلے میں جو کچھ ہو سکا کروں گا۔



ہم رات گئے گئے خیمے میں جا گئے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ آگ بجھنے رہے اور توبہ پیتے رہے۔ جلوت اور خلوت میں یہی فرق ہوتا ہے کہ خلوت میں چھوٹا سا غم بھی براڑ محسوس ہوتا ہے اور جلوت کی گہما گہما میں جتنے چھٹکاڑے غم بھی گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ چھپلے اڑنا پس گھنٹوں میں ہم بہت کچھ بیت چکا تھا مگر خیمے میں ہلکی پھلکی باتوں کا جو سلسلہ شروع تھا اس نے ہمیں بہت کچھ بھلا رکھا تھا۔ لشکر خاں

طرح اسلحہ شناس تھی۔ میں نے سانس ہو کر سب مشین گن کا استعمال سمجھا دیا۔ وہ بہت کچھ پہلے سے جانتی تھیں صرف نیگنیں ایچ منت کے بارے میں بتانے کی ضرورت پڑی۔

نیچے سے باہر ہوا برف پوش تھی۔ سانس ہونوں سے نکلنے ہی جتنا شروع ہو جاتی تھی۔ میں نے تاج روشن کر لی اور احتیاط سے کھائی کے کنارے کی طرف ہونے لگا۔ کنارے کی پُر خیز دھوان تاج کے بغیر طے کرنا قریباً ناممکن تھا۔ جو گھوڑا میں نے سواری کے لیے منتخب کیا تھا وہ توانا ضرور تھا مگر سردی سے نڈھال ہو رہا تھا۔ دھوان عبور کرتے کرتے وہ تین چار دفعہ پھسلا اور ایک دفعہ توڑ پھوٹنے لگتا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ سردی مارے جانور کو دھوان پر لانے سے پہلے ڈرا وارم اپ کر لیتا چاہیے تھا۔ جو نمی ہم، نیچے میں اور غازی مرمو کھائی سے برآمد ہونے پڑیوں میں اترتی ہوئی تھو تیز ہوائے ہمارا استقبال کیا۔ لگا جیسے اب تک ہم ایک کمرے میں تھے اور اب کھلی جگہ پر آ گئے ہیں۔ میں گھوڑے پر سوار ہوا۔ میرے سامنے تیزی تھی اور اس تیزی میں جو ہوتا ہوا جنگل تھا۔ زوئے مشت کا یہ جنگل اپنے اندر ان گنت بھید چھپائے ہوئے تھا۔ گھنے چھتار و درختوں کے نیچے اور دران کھپاؤں میں ان گنت کمائیاں سنساری تھیں اور اسی جنگل میں یقیناً ایسی جگہیں بھی ہوں گی جہاں ابھی تک کسی انسان کا قدم نہیں پڑا ہوگا۔ چاند ستاروں کی غمر میں دھلا ہونے والا ابن آدم ابھی اپنی زمین ہی کو پوری طرح نہیں دیکھ پایا۔ وہ چاند پر پاؤں رکھ کر خوش ہوتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ ایسی جگہ پاؤں رکھ رہا ہے جہاں ابھی تک کسی انسان کا پاؤں نہیں پڑا۔ مجھے یقین تھا کہ اس جنگل میں بھی کئی ایسے مقامات ہوں گے جو روزِ آخر خیش سے انسانی آنکھ سے اوچل ہوں گے ایسی جگہوں پر جا کر کیا ہم یہ خوشی حاصل نہیں کر سکتے کہ ہم وہاں قدم رکھ رہے ہیں جہاں کوڑوں سال سے کسی کا قدم نہیں پڑا۔

میں نے اپنی یادداشت کے خاتمے کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا اور ذہن میں سستوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جس وقت عباس خاں پھل کر تارک خیب میں گرا ہم مشرق کی طرف جارہے تھے اسی سمت میں توڑا آگے جا کر ہمیں پیچھے لی تھیں اور جھپوں میں سے سب مشین گن ملی تھی جس کی مدد سے ہم موت کا گھبراؤ ڈونے میں کا سیاب ہوئے تھے۔ یہاں سے ہم نے جنوب کی طرف رخ کیا تھا اور بغیر کسی جانب مڑے کھائی تک پہنچے تھے ان سستوں کو ذہن میں رکھنا جانا تو عباس خاں تک پہنچنے کے لیے مجھے جنوب

اجنبی تھے۔ کوئی شناسا ٹیلا، رست یا جھنڈ نظر نہیں آتا تھا۔ ہاں ایک مقدم پر چند سایوں سے مدھ بھجڑ ہوئی۔ یقیناً وہ خطرناک لوگ ہوں گے۔ میری خوش قسمتی کے میں نے بروقت خود کو ایک آڑ میں چھپا لیا اور بیچ گیا۔ میں نے پندرہ بیس منٹ مزید گھوڑا بٹکایا اور پھر اس نیچے پر پہنچا کہ میں راستہ گھوڑکا ہوں۔۔۔ انسوس ضرور ہوا لیکن یہ کوئی ایسی غیر متوقع بات نہیں تھی۔ میں جانتا تھا اس کوشش میں کامیابی یا ناکامی کے امکانات مساوی ہیں۔ تیرہ و تارک جنگل، افزا غری کا عالم اور بے نشان راستے۔ ایسے میں کسی گم کردہ مقام کو ڈھونڈ لینا جوئے خیر لانے سے کم نہیں ہوتا اور میں یہ جوئے شیر نہیں لاسا تھا۔ تاہم واپس جانے سے پہلے میں نے ضروری سمجھا کہ توڑی سی کوشش اور کی جائے۔ نئے سرے سے ایک بار پھر ذہن میں نقشہ کھینچ کر سستوں کا تعین کیا اور سفر کا رخ جنوب مشرق سے مشرق کی طرف پھیر لیا۔

آدھ پون گھنٹے کی جنگل زور دے کے بعد اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میں ایک جانی بچائی جگہ کے نزدیک پہنچ چکا ہوں۔ برا غیر متوقع انکشاف تھا۔۔۔ میں اپنے نہیں جہاں سمجھ رہا تھا وہاں سے قریب چار میل کے فاصلے تھا اور بالکل مختلف سمت میں۔ بے آباد علاقوں اور دشتاں گزرا۔ راستوں پر سفر کرنے والے جانتے ہیں کہ وہاں مسافر کیسے بھٹکتا ہے اور سستوں کا قریب کیا کیوں کھلتا ہے۔ ایسے علاقوں میں سفر کرتے ہوئے یہ یقین ممکن ہوتا ہے کہ آپ دو روز کے جاں مسل سفر کے بعد خود کو اسی مقام پر پائیں جہاں سے روانہ ہوئے تھے یا پھر اندھیری رات میں کئی گھنٹے سفر کرنے کے بعد آپ کو معلوم ہو کہ یہ سفر واپس کے کا سفر تھا۔ میں نے دائرے کا سفر تو نہیں کیا تھا لیکن اپنی مطلوبہ جگہ سے کئی دور نکل گیا تھا۔ یہ جانوروں اور انسانوں کو ایک گھاٹ پانی پلانے والا جھونسا آلی ذخیرہ تھا۔ میں اپنے "تھیں کیمپ" یعنی ڈھکی تالاب سے پانچ بیس کی طرف جاتے ہوئے درجہ ریمیاں سے گزر چکا تھا۔ پہلی مرتبہ میں پراوان شیار کا غائب کر رہا تھا اور اس نے ریمیاں رک کر اپنے لنگڑے گھوڑے کو پانی پلایا تھا۔ دوسری مرتبہ غلام خاں کی آواز سن کر مجھے براں رکنا پڑا تھا۔ بعد ازاں جب عباس خاں اور میں نے ایک کھوہ میں جھانک کر دیکھا تھا تو غلام خاں ایک تم سن گدے کو پھینک پلایا تھا۔

وہ قزم مناظر میری ٹٹا ہوں میں تازہ ہوئے اور اس کے ساتھ ہی مجھ کا خیال برق کی طرح ذہن میں کوئٹہ کیاد یہ نہیں کہ میں اب تک تجھ اور اس کے حالات کو بھولا ہوا تھا۔ سب کے میں نے جان بوجھ کر دشتاں گزرا رستے اختیار کیے تاکہ جانور نما انسانوں سے مدھ بھجڑ کے امکانات کم سے کم رہیں۔ بڑے محتاط انداز میں سفر کرتا ہوا میں تقریباً ایک گھنٹے میں پانچ بیس پہنچ گیا۔ بادل اب اڑن چھو رہے تھے۔ ہوا بھی تھم تھم کر چل رہی تھی۔ آسمان پر اب آدموں کی روشنی تھی لہذا اور کرو کے ناظر قدرے واضح نظر آتے تھے۔ میری بائیں جانب درختوں کا وہ جھنڈ تھا جہاں ایک چھند بے میا میرا تختہ چنسا تھا اور لنگر خاں نامی شخص کا اس تختہ میں میرے ہاتھوں ہلاک ہو تھا۔ دائیں طرف خیب میں دور تک خانہ بدوشوں کے چھوٹے اور اونٹنی خیمے تھے۔ ان

جھونپڑوں اور چیموں میں رات کے اس آخری پھر بھی کہیں کہیں روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے سوچا شاید ان روشن جھونپڑوں میں ایک جھونپڑا نچو کا بھی ہو۔ وہ آس کا دپ جلائے پھلوان کا اور میرا انتظار کر رہی ہو۔ یہ خیال آتے ہی بیٹے میں بے چینی کی لہری دوڑ گئی۔

میں چھ روز پہلے اس بستی سے روانہ ہوا تھا تو میں نے تجو سے ایک وعدہ کیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ آرام سے لیٹے پر سر رکھ کر لیٹے۔ پھلوان شہزاد کو ڈھونڈ کر لانا میرا کام ہے اور میں اسے لے کر آؤں گا۔ آج اتنی تاخیر کے ساتھ میں آیا بھی تھا تو خالی ہاتھ تھا۔ تجو کے لیے میرے پاس کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ دل میں آئی کہ اتنا اچھا ہو کہ پھلوان شہزاد خود ہی واپس آچکا ہو۔ وہ درود کر تجو سے اپنی غلطی کی معافی مانگ چکا ہو اور دونوں میں زندگی بھر ساتھ بھانے کے عہد و پیمان ہو چکے ہوں۔ وہ چاندی کے زیور وہ سپیوں جڑے لباس اور وہ سارے خواب جو شہزاد نے تجو کو دکھائے تھے اور جن پر وہ اپنا حق سمجھتی تھی اسے واپس لی چکے ہوں۔ پیسے کے زور پر خریدی ہوئی یا سہین ان دونوں کے درمیان سے یوں نکل چکی ہو جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ لیکن یہ سب خواب و خیال کی باتیں تھیں۔ شہزاد لوٹنے کے لیے نہیں گیا تھا اور وہ لوٹا بھی کیوں۔ اس پر خطر ویرانے سے دوڑنا یا چنار کی کسی پر سکون چادر پوری میں وہ ایک نوخیز دُشمن کے پنج حسن سے خوش چینی کر رہا تھا۔ نہ اتنی جلدی وہ باغ بے غم ہوئے والا تھا اور نہ شہزاد کا پانی پیٹ اتنی جلدی بھرنے والا تھا۔ شاید چند ہفتوں یا مہینوں بعد اسے احساس ہو گا کہ اس نے تجو کے ساتھ ظلم کیا ہے لیکن فی الحال تو وہ اونچی ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

میں نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور دو مہی رفتار سے ڈھلوان طے کرنے لگا۔ ہوا کے دوش پر اپنی جسم کی بو موٹھکتے ہی بستی کے کتوں نے زور و شور سے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ رات نقل میرے ہاتھ میں تھی اور میں کسی بھی متوقع خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ جلد ہی بستی کے دو گھڑ سوار پہرے دار میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ سروی کی وجہ سے انہوں نے منہ سر لیٹ رکھے تھے۔ ایک پہرے دار کے ہاتھ میں تاج تھی۔ اس نے کبل کی بٹل میں سے ہاتھ باہر نکال کر تاج کی روشنی میرے چہرے پر پڑ گئی۔ مجھے یاد آیا کہ پہرے داروں کی طرح میں نے بھی اپنا چہرہ چھپا رکھا ہے۔ جوئی اولی شال میں نے چہرے سے ہٹائی ان دونوں نے مجھے پہچان لیا۔ تاج والے گھڑ سوار نے اپنی

رات نقل دوبارہ کندھے سے آویزاں کر لی۔ دوسری رات نقل کی تال بھی جو خطرناک انداز میں بڑی جانب اٹھی ہوئی تھی، مجھ تک پہنچے پہرے دار جانتے تھے کہ میں ان کی زبان سے نا آشنا ہوں پھر بھی رمی انداز میں انہوں نے چند کلمات ادا کیے جن کا لب لباب یقیناً علیک سلیم تھا۔ میں صرف مسکرانے اور سر ہلانے پر اکتفا کر رہا۔ وہ مجھے لے کر بستی کی طرف چل دیے۔ مجھے پہرے داروں کے ساتھ دیکھ کر کتوں کی بھونکا بھاگی ماند پڑ گئی تھی۔ تھوڑی سی دیر بعد ہم سردار بشر گل کے جنازی ساز جھونپڑے کے سامنے پہنچ گئے۔

پہرے دار چند لمحے آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے شاید سوچ رہے تھے کہ اتنی رات گئے سردار کو بگاڑیں یا نہیں۔ پھر ایک پہرے دار غالباً سردار کو بگانے کے لیے ہی آگے بڑھا تھا مگر ایک دم اسے روکنا پڑا۔ جھونپڑے کا چوٹی دروازہ کھلا اور سردار بشر گل رات نقل مانے باہر نکل آیا۔ پہرے دار نے جلدی سے تاج کی روشنی میرے چہرے پر ڈالی اور بشر گل سے میرا تعارف کرایا۔ مجھے پہچان کر بشر گل کے چہرے پر ناگوار کی خٹکین اُٹھیں۔ میں اڑتالیس گھنٹے کی صلت لے کر گیا تھا اور اب پورے چھ روز بعد شکل دکھا رہا تھا۔ پہرے داروں نے میرا گھوڑا ایک طرف باندھ دیا اور میں سردار بشر گل کے ساتھ اس کے جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔

اندر قدم رکھتے ہی خوشگوار حرارت کا احساس ہوا۔ وسط میں اٹیکٹھی دیک رہی تھی اور نیلگوں قاتلین پر گاڑے گئے تھکے ہوئے تھے۔ کہنے کو یہ جھونپڑا تھا لیکن ”رہنے“ کو کسی جگہ سے کم نہیں تھا۔ سردار نے اپنی رات نقل ایک طرف رکھ کر لائین کی ٹو اونچی کی اور مجھے پیٹنے کا اشارہ کیا۔ کھنی بھونک کے نیچے اس کی آنکھیں برہم نظر آتی تھیں اور دبیز مونچھوں تلے ہونٹ جیسے مجھ پر برس پڑنے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ خود گھائی کے انداز میں بڑبڑانے لگا۔ اس بڑبڑاہٹ کے دوران وہ گاہے گاہے مجھ سے کوئی سوال بھی پوچھ رہا تھا۔ ظاہر ہے کسی پوچھ رہا تھا، جن کتھان گھڑاڑی الٹی رات سے میرے لیے سترجم کے فرائض انجام دیتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ میں گونگے کی ماں کی طرح بشر گل کی ساری رمزیں سمجھ رہا تھا مگر صرف رمزیں سمجھنے سے گزارا مشکل تھا۔ میں نے اپنی پتلون کی جیب تھپتھپائی اور اشاروں کی زبان میں بشر گل کو سمجھایا کہ میں رات لے آیا ہوں لڑکی کہاں ہے؟ جواب میں کسی درجہ اطمینان کا اظہار کرنے کے بجائے بشر گل بدستور بڑے

بڑے منہ بنا رہا۔ اچانک مجھے فکر لاحق ہو گئی کہ تجو کے ساتھ کچھ ہونہ میا ہو۔ وہ بدترین حالات میں گھری ہوئی تھی۔ یہاں کسی وقت کوئی بھی آفت اس پر ٹوٹ سکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی ہی غلطی سے کسی مصیبت کا شکار ہو جائی۔ آخری ملاقات میں میں نے اس کی آنکھوں میں وہی بے قراری دیکھی تھی جو یاں میں پھنسی ہوئی کوئی کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ وہ جال توڑ کر اڑنا چاہتی ہے، اس کشیدہ رفاقت کی تلاش میں جس کے بغیر وہ ناممکن ہے۔ کہیں تجو نے بھی تو یہ جال توڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کئی طرح کے اندیشے میرے ذہن میں سر اٹھانے لگے۔ میں نے ایک بار پھر شادت کی انگلی سے ناک کو چھوا اور بشر گل سے اشاراتی زبان میں پوچھا کہ تجو کہاں ہے۔ اس نے ٹھیک پولیس کے قصبے سپاہی کی طرح بازو پھیلا کر ایس جانب اشارہ کیا اور بڑبڑانے لگا۔ بائیں جانب جھونپڑے کا زبان خانہ تھا۔ میری رگوں میں خون اچھل کر رز رہا گیا۔ ایک لمحے کے لیے میں یہ سمجھا کہ تجو بشر گل کے زبان خانے میں ہے، یعنی قصبہ کا ہر چاکہ اس کا لیکن پھر فوراً ذہن نے دلیل دی کہ بشر گل یوں مجھے اپنے حرم میں گھسنے کی ہدایت جاری نہیں کر سکتا، بائیں جانب سے اس کی مراد جھونپڑے کا باہر بائیں جانب ہے۔ بروقت بات ذہن میں آگئی تھی ورنہ زبردست دنگا فساد ہو رہا تھا۔ زنانہ حصے میں یقیناً بشر گل کی سب سے چھوٹی اور سب سے چینی بیوی تھی۔ رات کے اس پہر وہ فطری لباس سیت کسی بچہ، لباس میں ہو سکتی تھی۔ میں اندر قدم رکھا تو یقیناً بشر گل میرا قتل اسنے اور قرض کر لیتا۔

بشر گل کا مطلع نظر جانے کے بعد میں جھونپڑے سے باہر نکلا اور درمیانی رفتار سے تجو کے جھونپڑے کی طرف چل دیا۔ بندہ جس قدم چلنے کے بعد جب مجھے روکا نہیں گیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے ”گھونگے کی رمز“ سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے۔ بشر گل نے مجھے تجو کے جھونپڑے کی طرف ہی روانہ کیا تھا۔ پہرے داروں میں سے تاج بردار پہرے دار سامنے کی طرح میرے پیچھے آ رہا تھا اور پوری طرح چوکس تھا۔ تجو کے جھونپڑے سے میرا فاصلہ جوں جوں کم ہو رہا تھا۔

دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ کس حال میں تھی؟ اپنی کھنی یا کسی کے ساتھ تھی اور کھنی بھی یا نہیں۔ جوئی میں جھونپڑے کے سامنے پہنچا، ایک لمبا ترنگا قلعہ قریبی ساتیان سے نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ یوں لگا جیسے وہ خاص طور پر تجو کی حفاظت کے لیے ہی یہاں بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے منہ سر ایک دبیز کمل میں لیٹ رکھا تھا پھر بھی میں اسے پہچان گیا۔ یہ لنگر خاں تھا۔ اس نے مجھ پر کتا چھوڑا تھا۔ میں اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ غالباً وہ بھی مجھے نہیں بھول سکتا تھا کیونکہ میں نے اس کا کتا مار دیا تھا۔ مجھے پہچانے ہی لنگر خاں کی آنکھوں میں جرت آمیز غصے کی جھلک نظر آئی۔ اس نے بازو پھیلا کر بڑی درشتی سے میرا راست روک لیا۔ میرے پیچھے تاج بردار پہرے دار آ رہا تھا۔ اس نے دوری سے پکار کر لنگر خاں کو تنبیہ کی کہ مجھ سے الجھنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ جھونپڑے میں جانے کی اجازت مجھے سردار نے دی ہے۔ لنگر خاں مجھے گھورتا ہوا ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کا پس نہیں چل رہا تھا ورنہ شاید وہ مجھے توپ کے منہ پر رکھ کر اڑا دیتا۔ اس کا یہ غیر معمولی پیش اور معاندانہ رویہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کتے والے معاملے پر تو راضی نامہ ہو چکا تھا اور لنگر خاں ہرجانے کے طور پر ابھی سو رہا ہے بھی وصول کر چکا تھا پھر یہ نگاہوں کی شط فٹائی کیا تھی؟

”تجو!“ میں نے جھونپڑے کے در پر کھڑے ہو کر آواز دی۔ فوراً اندر کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی اور دروازوں سے جماعتی ہوئی روشنی نمایاں ہوئی۔ وہ جاگ رہی تھی۔ میری آواز سے یقیناً اچھل کر کھڑی ہوئی تھی۔ جھونپڑے کا دروازہ کھلا اور میں نے ”ساتواں حینہ“ کو اپنے سامنے پایا۔ اس کے لیے بال ہمارا شانوں پر بے ترتیب تھے۔ دروازہ کھولتے ہوئے گرم چادر اس کے سر سے پھسل گئی تھی اور اب جسم سے بھی پھسلتی جاری تھی۔ جسم کو تصویر تھا، جسم جو شاہکار تھا۔ اس کی آنکھوں کے پونے بھاری تھے اور شفاف پتلیاں کہہ رہی تھیں کہ وہ دیر تک اور مولادھار روتی رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک دم پھر رو پڑی۔ ایک ہی لمحے میں آنکھوں کے پانے بھرے، چھلکے اور برہنہ نگ میں اس سرعت پر حیران رہ گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ کا پ گئے۔ چادر کا پلو منہ میں محسوس کر وہ جلدی سے پلٹ گئی۔ میں نے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور اس کے قریب آن کھڑا ہوا۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

”تم ٹھیک تو ہو تجو!“ میں نے پوچھا۔ ”جی“ اس نے اقرار میں سر ہلایا اور تیزی سے جھونپڑے کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے ہٹائے بغیر جان گئی ہے کہ شہزاد پھلوان میرے ساتھ نہیں آیا اور یہ بھی جان گئی ہے کہ میرے پاس اس کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں۔ چند ہی لمحے بعد وہ واپس میرے

سائے آن کھڑی ہوئی۔ اب وہ آنسوؤں کے دھاروں پر قابو پا چکی تھی۔ ”آپ نے بہت دیر لگادی۔“ اس نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

وہ اصل سوال نظر انداز کر رہی تھی اور اصل سوال شہباز کے بارے میں تھا۔ اس کے ملنے یا نہ ملنے کے متعلق تھا اور جیسے وہ سوال کو نظر انداز کر رہی تھی ویسے ہی میں جواب سے پہلے چارہا تھا۔ یہ چارہا تھا کہ باتوں ہی باتوں میں اسے پتا چل جائے کہ شہباز کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ میں جیسے خالی ہاتھ گیا تھا ویسے ہی لوٹ آیا ہوں۔ خود کو مشکل میں دیکھ کر میں نے زبان والی کا سارا لیا اور نرم دلائل لفظوں میں پیٹ کر بے سخت نوکیلی خبر اس کے دائرہ سماعت میں دھکیل دی کہ میں فی الحال شہباز کو اپنے ساتھ نہیں لاسکا ہوں۔ تاہم اس کے ساتھ اسے یہ تسلی دی کہ شہباز کا پتا ٹھکانا معلوم ہو گیا ہے اور بہت جلد میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔ میری یہ بات کوئی ایسی غلطی نہیں تھی۔ شہباز کے سر مرحوم غلام خاں کی زبان تھی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ شہباز نے اپنا چنار کا ٹکڑا کیا ہے اور وہاں بس اُسے کے قریب رحمان زلی نامی ایک ٹکا فروش سے اس کے ٹھکانے کا پتا چل سکتا ہے۔ بخیر اس سے وفا کی طرف سے ہے جو فکر مند تھی اس کی خیریت معلوم کرنا چاہتی تھی اور جاننا چاہتی تھی کہ وہ کس حال میں ہے۔ میں نے ان تمام سوالوں کا منہ ایک ہی جواب سے بند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”بخیر! اگر مجھ پر بھروسہ کر رہی ہو تو پھر پورا بھروسہ کر دو۔ فی الحال میں تمہیں تفصیل نہیں جاسکتا۔ ہاں یہ یقین دلا ہوں کہ وہ خیریت سے ہے اور بہت جلد تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے گی۔“

بخیر جاتی لیجے میں بولی ”میب جی! میں تو زندگی بھر اس کا انتظار کر سکتی ہوں پر یہ دنیا والے انتظار کرنے دیں تو پھر بے تاب۔“ ایک دم پھر اس کی آنکھوں سے ساون بہا دوں کی ہڑی لگ گئی۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ میں نے قدرے چونک کر پوچھا ”سروا بشر گل نے کوئی بات کی ہے؟“

وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی ”میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ لوگ اتنی جلدی آنکھیں پھیر لیں گے کل تک سروا بشر گل ہمارا گھر آباد کرنے کی باتیں کرتا تھا اور کتنا تھا اس کے مہمان ہیں۔ اس کے گھر کے بی بی مگر شہباز کے لئے ہی وہ فریب ہو گیا ہے۔ جمہرات کے روز اس نے اپنی سب سے چھوٹی بیوی کو میرے جمہوزیہ میں بھیجا تھا۔ وہ بہت عرصہ پہلے میری بیوی اور باہنیں کرتی رہی۔ اس کی باتوں کا کوئی

کوئی لفظ ہی میری سمجھ میں آتا تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھے کسی غلط کام کے لیے تیار کر رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ مجھے حوصلہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ کام مجھ کو کرنا ہی پڑے گا۔ فیرجی اس صحنہ جوگی نے ایک بندے کو جمہوزیہ میں بلا لیا۔ وہ آنکھیں چاڑھا کر مجھ کے کتے لگا اور بشر گل کی بیوی سے باتیں کرنے لگا۔ اس بندے کا نام لنگر خاں ہے اور وہ اب بھی جمہوزیہ کے باہر بیٹھا میری چونکیز اڑی کر رہا ہے۔ یہ بات جمہرات کو ہی میری سمجھ میں آئی تھی کہ بشر گل اور اس کی بیوی مجھے لنگر خاں کے ہاتھ بچ رہا ہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میرے کتے مجھے موت بجائے یا زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سا جاؤں۔ میں بغیر کچھ کھائے بیٹھے جمہوزیہ میں پڑی رہی اور روٹی رہی۔ کل سروا بشر گل خود میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریشمی جوڑا تھا۔ یہ جوڑا اس نے میری جمہوزیہ میں رکھ دیا۔ سروا کے ساتھ لنگر خاں بھی تھا۔ لنگر خاں کو دیکھ کر میرا خون کھول گیا۔ میں نے جوڑا اٹھا کر انگلیٹھی پر پھینک دیا۔ سروا بشر گل نے مجھے تھپہ مارا اور زور زور سے چیخنے لگا۔ میرے منہ میں بھی جو آیا میں نے کہا۔ نہ اس کی بات میری سمجھ میں آ رہی تھی نہ میرا کما ہوا وہ سمجھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سروا مجھے دھمکیاں دیتا ہوا واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی جمہوزیہ کے دروازے پر ایک رائفل والا آن کھڑا ہوا۔ میں سمجھ گئی کہ اب میں اپنی مرضی سے باہر پاؤں نہیں رکھ سکتی۔ توڑی در بعد ایک عورت آئی اور ایک نیا جوڑا میرے سامنے پھینک گئی۔ یہ دیکھیں۔ یہ ہیں وہ دونوں جوڑے۔ بخیر جمہوزیہ میں کچھ چٹائی ایک طرف سے اٹھائی اور پیچھے سے کپڑے کے دو گولے نکال کر میرے سامنے رکھ دیے۔ یہ سپینوں جڑے دو ریشمی جوڑے تھے اور ان میں سے ایک جگہ جگہ سے جلا ہوا تھا۔ مجھے یہ جاننے میں ذرا دشواری نہیں ہوئی کہ یہ عوی جوڑے ہیں۔ میں نے اس پاؤندہ بستی میں کی نو تیار ہوا عورتوں کو ایسے ہی گھائی لباس میں دیکھا تھا۔ خود شہباز پہلوان کے ٹرک میں بھی ایک ایسی ہی زرق برق جوڑا نظر آیا تھا۔

بخیر سلسلہ کام جاری رکھتے ہوئے کہا ”میں رو رو کر بلان ہوتی رہی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی اور نہ اب آ رہی ہے کہ سروا نے اتنی جلدی آنکھیں کیوں پھیریں ہیں۔ کسی عورت کا مرحوم ہو جائے تو بڑے بوڑھے کی سال اس کی واپسی کا انتظار کرتے ہیں۔ شہباز تو کم ہی نہیں ہوا۔ اپنے کام سے خود کیس گیا ہے اور اس کے جاتے ہی یہ لوگ مجھے دوپٹی بنانے لگ گئے ہیں۔“ بخیر

آنکھیں مسلسل بہہ رہی تھیں۔ وہ پاؤندوں کے روہنے پر حیران تھی کہ شہباز کے جاتے ہی وہ کیوں بدل گئے ہیں۔ اسے اصل حقیقت معلوم نہیں تھی۔ شہباز اسے آٹھ ہزار میں فروخت کر کے بیٹے کے لیے میاں سے جا چکا تھا۔ اب وہ اس جمہوزیہ کی کھڑکی سے لگ کر تمام عمر میری اس کی راہ دہیتی سے اسے نہیں آتا تھا اور جنہوں نے رقم خرچ کی تھی انہوں نے وصول بھی کرنا تھی۔ یقیناً سروا بشر گل نے اپنے تئیں یہ محسوس کیا تھا کہ میں ایک کالی کوٹنی حاملہ عورت کے لیے سات ہزار کی رقم لے کر نہیں آؤں گا لہذا اس نے میرا زیادہ انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور ملت ختم ہونے کے دو دن بعد ہی لنگر خاں سے سودا پایا تھا۔

میں نے بخیر سے پوچھا ”تم نے یہ جوڑا پہنا تو نہیں؟“ وہ نفی میں سر ملانے لگی ”بولی ”سروا کے جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ مجھے ”سروا کے سامنے اونچا نہیں بولنا چاہیے تھا۔ اسے ناراض کر کے میں اپنا ہی نقصان کر رہی تھی۔ اگر مجھے کوئی لنگر خاں سے بچا سکتا تھا تو وہ سروا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے اس سے ملنا چاہیے۔ یہ بات پھر ”بولی“ پر آجاتی تھی۔ نہ میں سروا کی بولی سمجھتی ہوں نہ وہ میری میں تو کسی کو یہ بھی نہیں سمجھ سکتی تھی کہ سروا سے ملنا چاہتی ہوں۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ شام ہوتے ہی جمہوزیہ کے باہر سے گائے گائے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ یہ لنگر خاں کے سامنے تھے اور کسی طرح کی خوشی منا رہے تھے۔ میں بیٹیں انگلیٹھی کے سامنے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی کہ سروا خود ہی جمہوزیہ میں آگیا۔ میں نے رو رو کر اس کی منت کی کہ وہ میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کرے۔ میرا حوالہ نہ کرے۔ مجھے چھوڑ نہیں گیا۔ وہ کسی کام سے گیا ہے اور جلد واپس آجائے گا۔ میرے رونے جلنے کا بشر گل پر کچھ اثر ہوا۔ وہ جمہوزیہ سے باہر گیا اور توڑی دیر بعد ایک بچے کو لے کر واپس آگیا۔ نو دس سال کا یہ بچہ اردو کا کوئی کوئی لفظ بول لیتا تھا۔ وہ لڑکا مجھے بہت دیر کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ بار بار اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مجھے دکھاتا تھا اور ”دن۔ دن۔“ کہہ کر ریشمی جوڑے کی طرف اشارہ کرتے لگتا تھا۔ بہت دیر کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ بشر گل مجھ پر ترس کھاتے ہوئے مجھے دس دن کی ملت دے رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ دس دن تک شہباز آگیا تو ٹھیک نہیں تو مجھے یہ جوڑا پہننا پڑے گا۔“ بات ختم کر کے بخیر نے سر جھکا لیا۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی اور یہ بھی پتا

چل رہا تھا کہ جمہوزیہ کے سامنے لنگر خاں نے سبز پھلا کر میرا راستہ کیوں روک لیا تھا۔ مجھے دیکھ کر کسی نہ سمجھتا اس جنگی جانور کی سی بولی تھی جس کے منہ سے کسی نے شکار چھین لیا ہو۔ سروا کا کاوندہ میرے عقب میں نہ ہوتا تو شاید وہ جنگی جانور ہی کی طرح مجھ پر بھٹ پڑتا۔

میری اور بخیر کی گفتگو کے دوران ہی پیدہ حرمودار ہو گیا اور بستی میں چل پل نظر آنے لگی۔ یقیناً یہ خبر بستی میں گرم ہو چکی تھی کہ بخیر کے دو والی وارثوں میں سے ایک آگیا ہے۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر مچھس نکابوں والی کئی عورتوں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ آخر میں اسے اٹھ کر دروازے کو اندر سے کھڑی لگادی۔ بخیر جلدی جلدی میرے لیے ناشتا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔ پچھلے ایک ہفتے کا تمام اندوہ اس کی آنکھوں کے راستے بہہ کر نکل چکا تھا اور اب وہ شاش بشتا نظر آ رہی تھی۔ اسے جمہوزیہ میں تیزی سے اوڑھا کر کھوٹے دیکھنا ایک دلچسپ تجربہ تھا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی یہ تجربہ کر رہا تھا۔ اکثر عورت کی ملوث اسے اور حسین بنا دیتی ہے یا شاید یہ مرکی نگاہ کا خٹ ہے جو عورت کو ملوث دیکھنا چاہتا ہے۔ میری چور نگاہیں اس کے سراپا سے ٹکرائیں اور دل میں کھد کھد ہوتی رہی۔ بڑا دلچسپ تھا یہ شہباز بھی۔ یا شاید اسے اس سراپا کی قدر ہی نہیں تھی۔ لہذا اسیا تھا تو پھر ”بندر کیا جانے اور ک کا سودا“ والا عمارہ اس پر صادق آتا تھا بلکہ میرے خیال میں بخیر کے ارد گرد رہنے والے بہت سے مردوں پر یہ عمارہ صادق آتا تھا۔ یہ بے مثال بدن کی قدر دان کی نگاہوں میں آتا تو وہ اس اش کر اشتہا ہے ایک ایسا دیکھ بوا ہیرا تھا جو کچھ میں پڑا تھا اور جس کے گرد بے ذوق کچھ سے رنگ رہے تھے۔

خوشبو تباری تھی کہ بخیر میرے لیے ٹھیک ٹھاک ناشتا تیار کر رہی ہے۔ اس میں بسکٹ بھی کا رہا تھا تھا۔ انڈے کا ٹلوہ تھا اور چائے باقر خانی وغیرہ بھی لیکن اس ناشتے کے ساتھ ”ٹوٹی کماں کمنڈ“ والا حساب ہوا۔ تھی چٹائی ٹرے میری ہو کتی ہوئی بھوک کے حوالے ہونے ہی والی تھی کہ جمہوزیہ کا دروازہ دھڑ دھڑھٹے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کسی کی ٹپس میں بھری غرائیں ابھریں۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے لنگر خاں کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ سروا بشر گل کا چھوٹا بھائی ”رستم“ تھا۔ وہ دونوں مجھے لینے آئے تھے۔ رستم نے سروا کے جمہوزیہ کی طرف اشارہ کر کے دو تین بار کچھ کہا۔ ان الفاظ میں ”معنی“ کا لفظ نمایاں تھا۔ میں جانتا تھا معنی کرنے والا حرم کو کہتے ہیں یعنی رستم تبار تھا کہ جمہوزیہ میں حرم

محی الدین لوات کے شہ قلم سے ایک ناول

- جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی معاشرتی اور رومانی داستان۔
- محبت کیا ہے؟ اس ناول میں آپ کو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا۔

دل پارہ پارہ

قیمت: ۱۲۵ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ !

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: ۲۴۲۴۱۲

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال

نسبت روڈ، چوک میوہیتال، لاہور۔ فون: ۲۲۲۳۸۵۳

پتہ: لاہور، چوک میوہیتال، لاہور۔ فون: ۲۲۲۳۸۵۳

موجود ہے اور سردار اس کے ذریعے مجھ سے بات چیت کرنا چاہتا ہے۔ ایک ہفتے پہلے اس ہفتی میں کسی مترجم کا نام نشان نہیں تھا۔ اب اردو بولنے والا نہ جانے کہاں سے مل گیا تھا۔

میں نے اپنی راقل سنبھالی اور ناشتے کے لیے ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہوا لنگر خاں اور رستم کے ساتھ بھولیا۔ راستے میں ہستی کے لوگ مجھے رک رک کر دیکھتے اور چہ بیگیاں کرتے رہے میرے ہاتھوں لنگر خاں اور اس کے ساتھیوں کی درگت سب کو یاد تھی اور جنبہ بھولی ہوئی تھی مجھے دیکھ کر انہیں بھی یاد آتی تھی۔ میرا گھوڑا سردار کے گھوڑوں کے ساتھ بندھا ہوا چارے پر منہ مار رہا تھا۔ اس کی پیٹھ تھپکتا ہوا سردار کے جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ یہاں سردار مترجم کے ساتھ بیٹھا گڑگڑی بی رہا تھا۔ جھونپڑے میں دھومیں کے مرغولے تھے اور اگر بیوں کی مک ٹھی۔

مترجم کو دیکھ کر میں بڑی طرح چمک گیا۔ وہ جود خاں تھا۔ کل اسے لنگر خاں نے کوڑے لگوائے تھے اور وہ کوڑے کھاتے کھاتے بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک زردی کمند تھی اور وہ پیٹھ کے نیچے ایک گدا رکھے بڑی مشکل سے بیٹھا ہوا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر چوہکے۔ جود خاں کا اس جھونپڑے میں پایا جانا کبھی میں نہیں آیا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر حیران تھا۔ مجھے بچان کر پہلے تو اس کے چہرے پر خجالت نمودار ہوئی پھر جلد ہی اس خجالت کو سنجیدگی نے ڈھانپ لیا۔ سردار بشر گل نے جود خاں سے چند باتیں کیں۔ غالباً یہ پوچھا کہ کیا ہم دونوں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ جود خاں نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا تھا۔ میں نے جود خاں سے پوچھا ”تم کیسے یہاں ہو؟“

وہ قدرے مذہب انداز میں بولا ”میں سردار بھی ہے۔“

”در بانی لوگ؟“

”وہ بھی میں ہے۔“

”کہاں میں سارے؟“

”ہستی سے باہر گیا ہوا ہے۔ خواہی کچھ نام میں واپس آئے گا۔“

میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی۔ جود خاں اس وقت پاؤں دلوں کے مخصوص لباس میں تھا۔ اگر وہ جھونپڑے سے باہر ہوتا اور اس نے سب رواج منہ سرگرمی میں لیٹ رکھا ہوتا تو میرے لیے اسے پہچانا خاصا دشوار ہوتا۔

”کیا تم لوگ اب یہیں رہو گے؟“ میں نے جود خاں سے پوچھا۔

”اس سوال کا جواب تو آپ کو امارا سرداری دے سکتا ہے۔ ویسے ایک بات ام بھی بالوم کرنا چاہتا ہے۔ آپ میرا امارا مطلب ہے۔۔۔ آپ کیسے آیا یہاں؟“

”میں پہلے بھی یہاں کئی دفعہ آچکا ہوں۔ یہاں میرا ایک واقف کار رہتا ہے۔ کچھ دنوں سے وہ لاپتا ہے۔ اس کے لیے ہم سب پریشان ہیں۔“

سردار بشر گل نے جب دیکھا کہ ”مترجم“ نے اپنی ہی کانفرنس شروع کر دی ہے تو مداخلت کی اور ہم دونوں کو اصل موضوع پر لے آیا۔ مترجم کی وساطت سے میرے اور سردار کے درمیان گفتگو کچھ اس طرح ہوئی۔

”تم اب تک کہاں تھے؟“ سردار نے پوچھا۔

”میں ایک چکر میں پھنس گیا تھا سردار۔ میں نے جواب دیا ”ہمت کو قشش کی کہ وقت پر پہنچ سکوں لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔ مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ آپ لوگوں نے چند دن بھی میرا انتظار گوارا نہ کیا۔ لڑکی کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ آپ اسے کسی لنگر خاں کے حوالے کر رہے تھے۔“

”یہ بالکل غلط بات ہے“ سردار بھڑک کر بولا۔

”لیکن لڑکی نے مجھے خود بتایا ہے“ میں نے کہا۔

”اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارا بالکل ایسا ارادہ نہیں تھا کہ اسے کسی کے حوالے کر دیں۔“

”تو پھر۔۔۔ شادی کا جوڑا۔ وہ ناچ بگانا اور لڑکی کو ڈانٹ ڈپٹ۔۔۔؟“

سردار نے گڑگڑی کے چند کمرے کش لے لیے اور اسے ایک طرف رکھ کر بولا ”ہمارے مقامی رسم و رواج کے مطابق شہاز کے چلے جانے سے لڑکی خود بخود اس کی زوجیت سے آزاد ہو جاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسی عورت سے فوراً کسی دوسرے مرد کا نکاح بڑھا دیا جاتا ہے۔ ایسی عورت کو برت پوری کرنا ہوتا ہے اور اگر اس مدت میں پتا چل جائے کہ وہ امید سے ہے تو پھر بچہ کی پیدائش تک وہ کسی دوسرے کے نکاح میں نہیں آسکتی۔ ہاں ہمارے قبائل میں یہ رعایت ضرور ہے کہ عدت پوری ہونے سے پہلے عورت کسی دوسرے مرد سے منسوب ہو سکتی ہے۔ ہم جو کو لنگر خاں کے حوالے نہیں کر رہے تھے صرف اس سے منسوب کر رہے تھے کیونکہ لنگر خاں اس کی قیمت ادا کر چکا تھا لیکن جب وہ روئے دھونے لگی تو ہم نے یہ رسم بھی ملتوی کر دی۔“

میں نے کہا ”کچھ بھی ہے“ آپ کے لیے ضروری تھا کہ

کم از کم دو تین بننے تو میرا انتظار کر لے۔ آپ نے تو پہلی پر
سرسوں بٹائی ہے۔ اور مہلت پوری ہوئی، آؤھر آپ نے
اسے منسوب کرنا شروع کر دیا۔“

سرور کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ کڑخت آواز میں بولا
”تم یہ سب اس لیے کہہ رہے ہو کہ مقامی رسم و رواج سے
آگاہ نہیں ہو۔ یہاں ہر قبیلے کے کچھ اپنے قانون قاعدے
ہوتے ہیں۔ ہمارے رواج کے مطابق یہ وہ یا مطلقہ کوئی الغور
کسی مرد سے منسوب ہونا پڑتا ہے۔ دوسری صورت میں یہ
سمجھا جاتا ہے کہ وہ دوبارہ رشتہ ازدواج میں بندھنے کو تیار
نہیں۔ ایسی عورتیں جبراً فیملے سے باہر فروخت کر دی جاتی
ہیں۔“

میں رسم و رواج کی اس طویل بحث میں پڑنا نہیں چاہتا
تھا۔ یہی ساری معاملت یہ تھی کہ میں بخوبی باقی قیبت یعنی
سات ہزار روپیہ اور اسے ہر بندش سے آزاد
کرالوں۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ ایک بار پھر میرے پاس مطلوبہ
رقم موجود نہیں تھی۔ جس وقت عیسیٰ جان مجھے اپنے ڈیرے
پر لایا، میرے شکاری بوٹوں میں کل گیارہ ہزار روپے تھے۔
ان میں سے دس ہزار روپیہ میں نے غلام خاں مرحوم کی رقم
میں سے نکالا تھا اور ایک ہزار پہلے سے میرے پاس موجود
تھا۔ یہ ساری رقم میری جامہ تلاخی کے دوران عیسیٰ جان کے
ہاتھ لگ گئی تھی۔ بہر حال میں بالکل تھی دست بھی
نہیں تھا۔ میری جیکٹ کی جیب میں وہ طلائی زیور موجود تھے جو
کل روانہ ہوتے وقت فیملے نے مجھے چھیننے کے لیے دیے
تھے۔ ایک بار تو میرے جی میں بھی آئی تھی کہ انہیں پھینک
دی دوں لیکن پھر نہ جانے کیوں میں نے انہیں جیب میں بڑا
رہنے دیا تھا۔ بعض اوقات آدمی کی جیب میں لٹوانے کے لیے
کچھ ہو تو جان لٹنے سے بچ جاتی ہے۔ شاید میں نے بھی
لا شعوری طور پر یہ سوچا ہو کہ راستے میں کسی براجم پیش گروہ
سے ملاقات ہوئی تو انہیں یہ زیور دے کر گھوڑا اور را نقل
وغیرہ بچاؤں گا۔ راستے میں تو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا
لیکن یہ حادثہ ضرور ہوا تھا کہ میں راستہ بھول گیا تھا۔ اور پھر
عباس خاں کو بھول کر بخوبی طرف آنا پڑا تھا۔ اب میری
جیب میں بڑے ہوئے یہ زیور بخوبی کا ناؤں ادا کر سکتے تھے۔ یہ
عیسیٰ جان کے زیور تھے لیکن حقیقت میں اس کے بھی نہیں
تھے۔ یہ کسی گھر میں نقب لگا کر کسی نامعلوم عورت سے چھینے
گئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ عورت کے زیور تھے اور
اب عورت کے کام ہی آ رہے تھے۔

میں نے سرور بشر گل سے کہا ”ایک ہزار روپیہ میں نے

آپ کو دے دیا تھا۔ اب سات ہزار باقی ہے۔ زیور نکالنے
کے لیے میں نے جب۔ میں ہاتھ والا تو بشر گل نے انکار میں سر
ہلا کر میرے خدشات درست ثابت کر دیے۔
وہ بولا ”نہیں میاں! وہ سودا ختم ہو چکا ہے۔ اب نیا سودا
ہوگا۔“

ایک لمحے کے لیے میرا دماغ گھوم گیا۔ جی چاہا کہ اس
نیک صورت بد خصال بڈھے پر چار ہزار اور مار مار کر بھر کر
نکال دوں لیکن پھر مجھے خود پر قابو پانا پڑا۔ یہ حالت جوش کا
نہیں ہوش کا تقاضا کر رہے تھے۔ میں نے مہر کا ایک بڑا سا
آئینہ ٹھونٹ بھرا اور ٹھہرے ہوئے لیے میں کہا ”کیا کتنا
چاہتے ہیں آپ؟“

وہ بولا ”میں کوئی ایسی بات نہیں کر رہا جو تمہاری سمجھ
میں نہ آ سکے۔ آٹائیس گھنٹے کی مہلت ختم ہونے کے بعد
ہمارا سودا ختم ہو چکا ہے۔“

میں نے پوچھا ”اب کیا مطالبہ ہے آپ کا؟“
وہ بولا ”مصلیٰ طور پر تو اب تمہیں اس سلسلے میں لنگر
خاں سے بات کرنی چاہیے تھی۔ بہر حال میں تمہیں کسی
دوسرے کے پاس بھیج کر خراب کرنا نہیں چاہتا۔ لنگر خاں
سے سودا ختم کرنے کے لیے ہمیں اسے کچھ نہ کچھ ہرجانہ ادا
کرنا ہوگا۔ ہمارے درمیان آٹھ ہزار ملے ہوا تھا۔ اس میں
تین ہزار ہرجانے کا شامل کرلو۔ کل گیارہ ہزار روپیہ بنتا ہے
میں اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ جو ایک ہزار تم نے پیشگی دیا
وہ اس میں سے کاٹ لوں۔ اب دس ہزار کے عوض تم لوگو
لے جا سکتے ہو مہر مہلت اب بھی آٹائیس گھنٹے کی ہوگی۔ اس
کے بعد میں یا جہاں کسی طرح ذمے دار نہیں ہوں گے۔“

بخوبی کے بجائے ناؤ کی بات سرور یوں کر رہا تھا جیسے وہ
را نقل ہو یا زمین کا کوئی غلا ہو۔ اس کے خیال میں میرے
پاس سات ہزار روپیہ تھا اور تین ہزار روپیہ مزید لانے کے
لیے وہ مجھے پھر آٹائیس گھنٹے کی مہلت دے رہا تھا۔ مجھے
اس مہلت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اب یہ سودے باز
مزید ہواشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے جیکٹ کی جیب سے
طلائی چوڑیاں نکالیں اور سرور کے سامنے رکھ دیں۔
چوڑیاں کم و بیش چار تو لے کی تھیں اور ان کی قیمت ہرگز بڑا
ہزار سے کم نہیں تھی۔ خالص سودا دیکھتے ہی سرور کی آنکھیں
چمک اٹھیں۔ اب یہ کوئی دھکی دھکی بات نہیں رہی تھی۔
سرور ایک حریف آدمی ہے اور دوسروں کی مجبوزی۔
فاکھ اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا۔ لنگر خاں
کو ہرجانہ دینے کی بات وہ صرف سودا چانے کے لیے کر

تھا۔ تین ہزار روپے ہرجانہ کس نے دینا تھا۔ یہ فرض محال
اس میں کچھ دھم دی بھی جاتی تو وہ تین چار سو سے زائد نہ
ہوتی۔

چوڑیوں کو تھوڑی دیر ہاتھوں میں گھمانے کے بعد
سرور نے ایک کارندے کو جھوپڑے میں بلایا اور کوئی
بدایت دے کر کہا ہر بیچ دیا۔ چار پانچ منٹ بعد ہی ایک بہت
بڑے مجڑ والا شخص جھوپڑے میں داخل ہوا اور
سرور کو تعظیم پیش کر کے دو زانو بیٹھ گیا۔ یہ بہت سی کا زمر تھا۔
اس نے زخمی کی طرف منہ پھیر کر چوڑیوں کو بغور دیکھا، پھر
لباس سے کسوتی برآمد کی اور سونے کی پرکھ کرنے لگا۔ دیر تک
سرور بشر گل اور زرگر لنگتوں میں مصروف رہے پھر حرم کی
زبانی مجھے بتایا گیا کہ چوڑیوں کی قیمت آٹھ ہزار سے زائد
نہیں ہے۔ بہر حال مجھ سے خاص رعایت کرتے ہوئے سرور
انہیں نو ہزار میں رکھنے پر آمادہ ہے۔ یعنی ایک ہزار روپیہ
اب بھی میرے ذمے واجب الادا ہے۔ میں اس موقع پر
کوئی تاخیر نہ کرنا نہیں چاہتا تھا لہذا اپنا سارا غصہ میں نے
تصوراتی حوالے سے نکالا۔ یعنی خیالی ہی خیال میں شخصی
زرگر کی بہت بڑی گہڑی کو چھانچا مار کر گرایا۔ اسے دو تین
بار اٹھا کر زمین پر پٹخا، پھر ناغوں سے پکڑ کر کچر اور جھوپڑے
سے باہر پھینک دیا۔ یہ سارا عمل میرے ذہن میں مکمل ہوا تھا
لہذا زرگر کی محنت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ بدستور سرور
بشر گل کے ساتھ عافیت میں بیٹھا رہا اور اپنی باریک باریک
بدذات آنکھوں سے مجھے گھورا رہا۔ میں نے خاموشی سے
جیب میں ہاتھ ڈال کر آٹھ تو لے کی ایک انگوٹھی نکالی اور
زرگر کے سامنے قالین پر پھینک دی۔ اس نے اس انگوٹھی
کو بھی پرکھا۔ زرگر اور سرور میں چالو خیال ہوا اور پھر
سرور نے یہ زیور قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

میں سرور کے جھوپڑے سے اٹھنے ہی والا تھا کہ
دروازے سے باہر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ آٹھ
دس افراد تیز قدموں سے جھوپڑے کی طرف آ رہے تھے پھر
دروازہ کھلا اور میں نے لنگر خاں کو اپنے سامنے پایا۔ وہ بھی
جمعہ خاں کی طرح پاؤندوں کے لباس میں تھا۔ اس کے عقب
میں تین چار شناسا افراد اور تھے انہوں نے بھی پاؤندوں کا
روپ دھار رکھا تھا۔ باقی چہرے میرے لیے انہیں تھے۔ انہیں
چہرے والوں کی تعداد بائیس تھی۔ وہ قدرے گھبرائے ہوئے
دکھائی دیتے تھے۔ ان کے لباس دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ
وہ عیسیٰ جان کے ڈیرے سے آئے ہیں۔

لنگر خاں کے تین ساتھیوں نے اپنے ہاتھوں میں ایک

انسانی جسم اٹھا رکھا تھا۔ یہ کوئی مرد تھا۔ وہ سر ہا کسٹل میں لپٹا
ہوا تھا۔ کسٹل پر خون کے دھبے بھی صاف نظر آ رہے تھے۔
لنگر خاں کے ساتھیوں نے اس خنجر کا جسم کو جھوپڑے کے
ایک گوشے میں لٹکائی کے چوکور تختے پر ڈال دیا۔ جسم کو تختے پر
رکھا گیا تو مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے یہ جسم
زندگی سے خالی ہو چکا ہے اور اگر نہیں ہوا تو بس ہونے ہی
والا ہے۔ ایک دم ہی سب لوگ زخمی کے گرد جمع ہو گئے تھے
اور تیز خیز لہجے میں بول رہے تھے۔ مجھے کچھ دکھائی دے رہا تھا
کہ یہ بات کی سمجھ آ رہی تھی۔ اچانک جمعہ خاں نے محوم کر
میری طرف اشارہ کیا اور سب میری طرف دیکھنے لگے۔ میرا
دل ایک دم اچھل کر قحط میں آ گیا۔ کسٹل کے ہزاروں حصے
میں مجھے اندازہ ہوا کہ اس زخمی شخص کا قتل مجھ سے ہے۔

جمعہ خاں کے توجہ دلائے پر لنگر خاں نے پہلی بار میری
طرف دیکھا تھا۔ میری یہاں موجودگی پر اس کی آنکھوں میں
واضح جرت نظر آ رہی تھی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ تیزی
سے زخمی کے قریب پہنچا۔ اس کے خنجر کا چہرے سے کسٹل
ہٹایا جا چکا تھا۔ مجھے پچانے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی۔
میرے سامنے دنیا و انبیاء سے بے خبر ہوا شخص انسپکٹر باجوہ
تھا۔ را نقل کی گولی اس کی بائیں آنکھ سے ذرا نیچے لگی تھی
اور سر میں گھس گئی تھی۔ اس کا سانس چو آنکھوں سے
ٹھوڑی کے نیچے تک خون میں لٹھڑا ہوا تھا۔ میں سکتے میں رہ
گیا۔ صرف دو روز پہلے میں نے انسپکٹر باجوہ کو عیسیٰ جان کے
ڈیرے پر زندہ سلامت دیکھا تھا۔ اس کے گرد موت کے
سائے ضرور تھے لیکن وہ زندہ تھا۔ اور زندہ ہی نہیں تھا اس
کے اندر زندگی کی خواہش بھی زندہ تھی۔ ڈیرے سے فرار
ہوتے وقت جب میں نے اپنے ساتھیوں کو دیاں سے نکالنا چاہا
تھا تو نٹے کے باعث کوئی اتنی جگہ سے ملا نہیں تھا۔ صرف
انسپکٹر باجوہ تھا جس نے بھرپور کوشش کی تھی اور لڑکھڑاتا ہوا
میرے ساتھ دروازے تک آ گیا تھا۔

”انسپکٹر“ انسپکٹر“ میں نے اضطرابی کیفیت میں اسے
پکارا۔ وہ کچھ کھٹے کھٹے کی منزل سے بہت دور جا چکا تھا۔
میں نے اس کی ٹھوڑی کو ہلانے کی پوری انگلیوں کی پوری خون
سے لٹھڑا کھینچا۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولنے کی کوشش کی۔
سننے سے کان لگا کر دھڑکنوں کا گونج لگا۔ کچھ بھی واضح نہیں
ہو سکا۔ وہ اگر مرا نہیں تھا تو نہ ہونے کے برابر زندہ تھا۔ اس
دوران لنگر خاں میرے پاس آ کر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا
”یہ سب کیسے ہوا خان! اس نے مارا ہے اسے؟“

وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”مکون مار سکتا ہے۔“

خود سوچو کن مار سکتا ہے اسے؟
"شکر! میرے بیٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔"

"بالکل۔ یہ اسی کا کارنامہ ہے۔ وہ خنزیر کا بچہ ام لوگوں پر اپنا نشانہ پختہ کرتا ہے۔ بندے کو دیوار کے ساتھ کھڑا کرتا ہے اس کے سر پر پتھر رکھتا ہے اور گولی سے اڑاتا ہے۔"

نبیل نے جو کچھ بتایا تھا وہ درست نکلا تھا۔ بندہ کانشیل نذر کے بعد اب باجوہ کو بھی دردناک طریقے سے گولی مار دی گئی تھی۔ نبیل کے جملے میری سماعت میں گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا "مسلم شخص مر گیا تو ایک سانولے سے آدمی کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ کل وہ پورا ایک گھنٹا موت کے منہ میں رہا ہے۔ معلوم نہیں اب بھی اس کی جان بخشی ہوتی ہے یا نہیں۔"

اور وہی بات ہوئی تھی۔ اس دن تو باجوہ بچ گیا تھا لیکن آج اس کی صرف چند سانسیں بچ سکی تھیں۔ میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب باجوہ گھنٹوں میں سربے زار و خنجر رو رہا تھا۔ اسے نشہ کھلایا گیا تھا لیکن موت کا خوف نشے کی وجہ سے چیر کر اس کے ذہن تک پہنچ رہا تھا۔ وہ آنے والے کل سے خوف زدہ تھا۔ جب چاند ماری کے احاطے میں اسے دیوار کے ساتھ کھڑا کیا جاتا تھا اور گولیاں اس پر مینہ کی طرح برسی تھیں۔ اور آج وہ سب کچھ ہو گیا تھا۔ وہ سارے عذاب باجوہ پر گزر گئے تھے جس کا اس نے اندیشہ کیا تھا۔ کاش وہ اس دن ہمت کر کے میرے ساتھ ہی ڈیرے سے نکل آتا۔ اگر وہ نہیں نکل سکا تھا تو میں اسے لے آتا لیکن یہ دونوں کام نہیں ہو سکے تھے۔ میں باجوہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر نبیل اور عباس وغیرہ کی طرف گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری واپسی تک باجوہ سنبھل جائے گا اور میں اسے سارا دن کرواہوں سے نکال لوں گا مگر پھر چند قدم کے فاصلے پر شیطان ملعون شکر سے ملاقات ہو گئی تھی اور میں اس میں الجھ کر ڈیرے سے باہر نکل گیا تھا۔

قصبے کے بوڑھے معالج کو دیکھ کر میں اپنے خیالوں سے چونکا۔ وہ اپنے اول جاول معاون کے ساتھ پانچواں اندر داخل ہوا اور مگر ہاتھ رکھ کر جال سے باہر باجوہ پر جھمک گیا۔ اس نے بغور زخم کا معائنہ کیا اور پھر باپوسی سے سہرا کر پیچھے ہٹ گیا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو۔ "اب علاج معالجے کا فائدہ تو نہیں لیکن چونکہ ہم قصبے کے واحد معالج ہیں اور تیارے ہاتھوں میں "شفاف" بھی ہمت ہے لہذا کوئی شش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ شاید کوئی کرشمہ ہو جائے" اس نے اپنی

عکسری ایک چارپائی پر رکھی اور رنگ برنگی مریضوں، مجوز اور سنوٹوں کا پنڈورا باکس کھول کر بیٹھ گیا۔ اس کی سوزی خزان رسیدہ ہائیں بڑی بے موقع سستی کے ساتھ حرکت کر رہی تھیں جیسے اس نے قسم کھا رکھی ہو کہ مریض حالت چاہے کچھ بھی ہو۔ اپنی رفتار میں ردوبدل نہیں کر گا۔

میری نگاہوں میں غلام خاں کی بیوی سلیمہ کا چہرہ مگیا۔ زخمی ہو کر وہ بھی اسی "مسحاج" کے دست شفا کی زد آئی تھی۔ اسی طرح وہ جت لپٹی تھی اور یہ بوڑھا معالج اس مختلف کارروائیاں ڈالتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ رات ہی ہو گئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا انجام اس وفد بھی مختلف ہو گا لیکن اس انجام سے باجوہ کو جانے کے لیے میں کیا کر تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس کی زندگی کا ٹھکانا چراغ سنوٹوں نہیں لٹھوں میں بجھا چاہتا تھا۔ اگر مجھے ذرا بھی امید ہو تو باجوہ کو بچایا جاسکتا ہے تو میں فرشتہ اجل کے اس مقرر ہر کارے کو دھکیل کر باجوہ سے دور ہٹا دیتا اور ہر وہ کوئی کرنا جو کی جاسکتی تھی لیکن ایسا نہیں تھا اس لیے ہر کارے ہٹانے کے بجائے میں خود پیچھے ہٹ گیا۔

بوڑھے معالج نے حسب سابق باجوہ کے زخم پر مٹی سی پی رکھی اور پیٹی کے اوپر سے ایک تیل نما مائع دھونے سے اندھ لٹنا شروع کیا۔ اس کے نشی اسٹنٹ بھی حسب دستور مختلف کارستانیاں جاری رکھیں جو پیرے میں گریہ خاموشی تھی اچانک باجوہ کا سر غیر محسوس طور پر بائیں طرف ڈھلک گیا۔ وہ مر چکا تھا۔ اس معمولی نہایت اہم جہش کو تقریباً سبھی حاضرین نے محسوس کیا۔ بوڑھے معالج نے تیل اندھیلنے والا جج ایک طرف رکھا۔ باجوہ کی سانولی کٹائی اٹھا کر نہایت غور و خوض سے کامعائنہ کرنے لگا۔ بعد ازاں اس نے سینے پر کان رکھ دھڑکن سنی۔ آنکھوں کے پونے کھل کر پتلیاں دیکھیں باپوسی سے سہرا کر کھڑا ہو گیا۔ باجوہ کا گرد آلود خونچکان کنبل سے ڈھانپ دیا گیا۔

لشکر خاں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے جو پیرے سے باہر لے آیا۔ قریباً دو بج چکے تھے سہرا کی نرم دم ہزبے سے ختم ہونے کی اپنی سی خوش کر رہی تھی۔ مگر جو پیرے سے باہر گئی افراد و فیولیں کی صورت میں کھڑے تھے لشکر خاں مجھے ان کے درمیان سے گزار کر کھلی دم میں لے آیا اور ہم دونوں ایک پتھر بیٹھ گئے۔

لشکر خاں بولا "ام تمہارا چہرہ دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ تم

ہے بھرا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے تم یہ سوچ رہا ہو کہ کسی طرح اس جنگل سے نکلے اور "بیوی" کا مدد لے کر آئے۔ لیکن۔۔۔ ہمارے سے امارا ایک برادرانہ مشورہ ہے۔ ایسا کوئی بھی کوشش نہ صرف تمہارے لیے خطرناک ہو گا بلکہ اس سے اس بدکار شکر کا انجام بھی کچھ اور دور چلا جائے گا۔"

انجام کیسے دور ہو جائے گا؟
وہ بولا "بیوی یہاں کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک ہزار آدمی بھی آجائے گا تو یہ جنگل ان سب کو چاٹ جائے گا۔ کچھ کا زندگی ختم ہو گا، کچھ کا حوصلہ اور پھر وہ سب نامراد واپس چلا جائے گا۔ بیوی آنے کا فائدہ صرف شکر اور بیٹی جان کو ہو گا۔ اب تم پوچھو کہ وہ کیسے؟ برادر! وہ ایسے کہ بیوی شکر اور بیٹی جان کو ہی نہیں مارے گا، ام کو بھی مارے گا۔ ام بھی تو ڈاکو ہے اور جب وہ ام کو مارے گا تو ام بیٹی جان اور شکر کے لیے لڑے گا۔ ام بھی روپوش ہو جائے گا پھر ام میں سے کچھ سا تھکی دل چھوٹا کر کے بیٹی کے ساتھ جالے گا اور بتایا تھیل بریاد ہو جائے گا۔"

میں نے پوچھا "تمہارا خیال ہے کہ تم بیٹی جان سے کمر لے سکتے ہو؟"
"بالکل۔ بالکل لے سکتا ہے تم جانتے ہو باپا! لوہے لوکانا ہے امارا الو! فلاڈ کا باقی ہے اور بیٹی کے لوہے میں نگر کا مٹی مل گیا ہے تم دیکھنا ام اس پیچھے لوہے کا کیسے ڈرا بنانا ہے۔ بہت سانولہ شکر سے ٹال ہے وہ بیٹی بان کو چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ بس موقع کا انتظار میں ہے۔ آج بھی دیکھو ہمارے ساتھ باج آدمی آیا ہے۔ یہ سب لغت جج کر آیا ہے بیٹی پر اور شکر پر۔"

میں نے پوچھا "باجوہ کی لاش وہی لائے ہیں؟"
"ہاں وہی لایا ہے۔ بلکہ امارا خیال ہے وہ آیا ہی اس لیے ہے کہ اس نے انپکڑ ہوئے والا کلمہ دیکھا ہے۔ وہ بتا ہے کہ جب انپکڑ کو گولی لگا تو شکر نے اسے ٹھوکر مارا اور ماں بن کا گالیاں دیا پھر شکر کے ساتھیوں نے اسے ٹانگوں سے پکڑا اور جانور کے ماق حسیٹ کر ڈیرے سے باہر پھینک دیا۔ یہ باج آدمی جب بستی سے نکل رہا تھا انہوں نے انپکڑ کو جھانپوں میں پڑے دیکھا اس وقت انپکڑ کا سانس چل رہا تھا۔ انہوں نے اسے کھوڑے پر ڈالا اور اوپر لے آیا۔"

"انپکڑ کے بعد اب کس کی باری آئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہالوم نہیں" لشکر خاں نے جواب دیا "لیکن امارا خیال

ہے کہ اب وہ خنزیر کا بچہ اپنا ہاتھ روک لے گا۔ وہ جانتا ہے سب کو مار دیا تو یہ غل غل کسے بنائے گا۔ وہ بانی لوگوں کو یہ غل بنا کر رکھے گا اور فائدہ اٹھائے گا۔"

"یہ صرف تمہارا خیال ہے۔ لیکن ہے حقیقت میں ایسا نہ ہو۔ وہ بالکل سنا ہے اس کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ اگر اس نے سب کو ایک ایک کر کے مار ڈالا تو بہت بڑا کلمہ ہو گا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ میں آزاد ہونے کے باوجود کچھ نہ کر سکوں۔"

لشکر خاں بولا "وہ بالکل سنا ہو گا لیکن اس کے ساتھ بیٹی جان بھی ہے۔ وہ ابھی پوری طرح جاگل نہیں ہوا۔ ام کو یقین ہے کہ وہ سارا قیدی مار کر اپنا نقصان نہیں کرے گا اور تم یہ بھی مت سمجھو کہ تم آزاد ہو۔ یہ سارا جنگل اب۔۔۔ جنگ کا میدان ہے۔ اپنی جان پر کھلے بغیر نہ کوئی یہاں سے جاسکتا ہے نہ آسکتا ہے۔ ہمارے چالیس آدمی کے مقابلے میں بیٹی جان کے پاس ڈیڑھ سو سے کم آدمی ہیں۔ سب وہ سب کا سب ہتھیار بند ہے اور شکاری کتوں کی طرح ہمارا بو سونگھتا پھر آئے۔ بہت جلد وہ اس پاؤندہ بستی میں آئے گا اور سردار سے پوچھ گچھ کرے گا۔ تمہارے لیے بہتر ہے کہ کسی جھوٹے میں اپنے لیے جگہ بنا لو اور یہ لباس بھی بدلنا ہو گا تم کو۔"

اب مجھے صورت حال کی عینی کا احساس ہو رہا تھا۔ ڈاکوؤں کے ان دو گروہوں میں شروع ہونے والی لڑائی کی آگ پورے جنگل میں پھیل گئی تھی۔ یہ آگ یوں تو پہلے سے بھڑک رہی تھی لیکن اسے الاؤ پانے میں کچھ ہاتھ میرا بھی تھا۔ میرے ہاتھوں دو افراد کے قتل ہونے کے بعد یہ تازمہ ایک دم سنگین مٹخ اختیار کر گیا تھا اور اب اونچے نیچے نیلیوں میں اور۔۔۔ سینے جگہ میں دور تک موت کے سائے رقصاں تھے۔ میں نے لشکر خاں سے پوچھا "اگر لڑائی ہوئی تو سردار بشرگل بھی ہمارا ساتھ دے گا؟"

وہ بولا "خنزیر بہت مشکلی ہے اور ام خود بھی نہیں چاہتا کہ نئے لوگوں کو لڑائی میں کھینچے۔ پوری پاؤندہ بستی میں صرف چندہ ہیں راقط ہے۔ ان چندہ میں راقط کے لیے سب عورتوں بچوں کو توپ کے منہ پر باندھنا کوئی اچھا بات نہیں۔ بستی میں کسی کو ہالوم نہیں کہ ام نے یہاں کیسے پناہ لیا ہے۔ صرف سردار بشرگل کو ہالوم ہے کہ اس نے ام کو پناہ دیا ہے۔ امارے درمیان ملے ہے کہ اگر بیٹی جان کے سامنے امارا راز کھل گیا تو بشرگل اس ماٹے سے بالکل الگ ہو جائے گا۔ وہ یہ کہہ کر اپنا جان چھڑا لے گا کہ ام زبردستی

اس ہستی میں محسوس ہوتا ہے۔

گاہ جاؤ شاہاباش، تم آرام کرو۔ شام تک وہ بی بی اور پھر لوگ
ریاں بیچ جائے گا۔

میں نے کہا "ہو سکتا ہے ان دونوں کے علاوہ رشید خا
اور اس کے گھروالے بھی ساتھ آتا ہوں۔"

"خواہ مخواہ اپنا داغ مت تھکوا براور۔" لشکر خاں! "لشکر خاں!
"ام سب انتظام کر کے بھیجے گا۔ جو بھی آتا چاہے گا۔ آجائے۔
گا جو نہیں آتا چاہے گا ام کو مجبور نہیں کرے گا۔"

میں نے کہا "یہی تو مسئلہ ہے جو سکتا ہے تمہارے یہ
ہوئے آدمیوں کے ساتھ وہ لوگ آنے سے انکار کریں
اگر میں ساتھ ہوں گا تو زیادہ پریشانی نہیں ہوگی۔"

لشکر خاں بولا "تم نے بات بالکل ٹھیک کی ہے لیکن ام
مسئلے کا حل بھی امارے پاس ہے۔ وہ وہ لی۔ کیا نام ہے ام
کا۔ نیلہ۔ وہ پڑھا لکھا ہے ناں اور تم بھی پڑھا لکھا ہے۔

انگریزی جانتا ہے اور ابارا خیال ہے تم بھی جانتا ہوگا۔
اس کو انگریزی میں چھٹی لکھو اپنے دستخط کے ساتھ او
ساری بات بتا دو۔ اسے سمجھا دو کہ تمہارا آتا کیوں مشکل
ہے۔ وہ انگریزی کی چٹھی پر پورا اعتبار کرے گا۔ ام کو یقین

ہے وہ اتارے تو وقف نہیں کہ محبت بیچ میں فرق نہ کر سکے۔
لشکر خاں کو قائل کرنا خاصا مشکل نظر آ رہا تھا۔ میں کہتا
کہ مجھے انگریزی نہیں آتی تو وہ اردو میں ہی چٹھی لکھو لیتا۔

میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ لشکر خاں بولا "مارے درمیان
بہت سابات ہوا لیکن اصل بات نہ ام نے پوچھا اور نہ تم نے
بتایا۔ ام تو تمہیں بی بی اور بیچے کے پاس خیمے میں چھوڑ کر آیا
قائم اور ہر شکل کے پاس کچھ بیچے کیا؟"

جواب میں میں نے لشکر خاں کو بتایا کہ کس طرح میں
ٹائیک عباس خاں کو تلاش کرنے کھائی سے نکلا اور کیسے
راستہ ہلک کر پانچویں ہستی کی طرف نکل آیا۔ میں نے اس
ضمین میں بخوار پھولوں شہزاد کا ذکر بھی کر دیا اور بتایا کہ اس

سے پہلے بھی میں دو تین دفعہ ہستی میں آچکا ہوں۔ لشکر خاں
نے یہ ساری روداد دھیمان سے سنی اور بیچ میں مجھ سے
سوالات بھی پوچھتا رہا۔ اسے یہ جان کر افسوس ہوا کہ فوجی

واپسی کے سلسلے میں سردار بٹر گل نے مجھ سے کوئی رعایت
نہیں کی اور اصل رقم مع سود حاصل کی ہے تاہم اس کے
نزدیک یہ سب کچھ حسب معمول تھا کیونکہ خانہ بدوش ایسے

معاہلوں میں بہت سخت واقع ہوئے تھے عباس خاں کا ذکر
کرتے ہوئے لشکر خاں نے کہا "ہندو کی اور موت خدا تعالیٰ
کے ہاتھ میں ہے۔ تم اپنے جس ساتھی کو زندہ سمجھ رہا تھا وہ
ابھی تمہارے سامنے دم توڑ گیا اور جس کو تم موت کے

لشکر خاں مجھ سے کافی دیر تک چیت کرتا رہا۔ اس
کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مخالفین کو نچا دکھانے کے
سلسلے میں کافی پُر امید ہے۔ اس کا خیال تھا کہ آئندہ تین چار

روز میں ہمیں جان کے کئی ساتھی اپنا کیمپ چھوڑ کر اس کے
پاس آجائیں گے۔ اس کے بعد ہمیں جان سے مقابلہ کرنا یا
محاملات طے کرنا زیادہ مشکل نہیں رہے گا۔ ہمیں جان

گروپ سے لشکر خاں گروپ کو جو شکایات تھیں ان میں
سب سے اہم شکایت گروہ میں شکر کی موجودگی اور اس کا
پڑھتا ہوا عمل دخل تھا۔ لشکر خاں اور اس کے ساتھی اب

ایک دن کے لیے بھی شکر کو گروہ میں برداشت نہیں کر سکتے
تھے۔ دوسرا بڑا مسئلہ ان دو افراد کا تھا جن کا تعلق ایک
اجمعی ہوتی سیاسی پارٹی سے تھا اور جنہوں نے ایک جملے عام

میں فائزنگ کے بعد ہمیں جان کے پاس پناہ لی تھی۔ ایک طرح
سے یہ معاملہ بھی شکر کے معاملے سے جتنی تھا۔ پناہ لینے
والے افراد کو ہر طرح شکر کی حمایت حاصل تھی۔ لشکر خاں

اور اس کے ہم توا چاہتے تھے کہ ان دونوں افراد کو فی الفور
ڈیرے سے نکال باہر کیا جائے۔ اس کے بعد چار افراد کو زندہ
جلادینے کا معاملہ تھا۔ جرموں کو اس سہیانہ واردات کی قرار

واقعی سزا دینا ہمیں جان کا فرض تھا جو اس نے پورا نہیں کیا
تھا۔ اس طرح اور بھی کئی چھوٹے موٹے محاملات تھے جو ان
دونوں گروہوں میں روز افزوں کشیدگی کا سبب بن رہے تھے۔

میں نے لشکر خاں سے کہا "خان! مجھے اس وقت سب
سے زیادہ فکر اس عورت اور بیچے کی ہے جنہیں میں ڈیرے
سے نکال کر لایا تھا۔ وہ ابھی کھائی میں ہی خیمہ لگائے ہوئے

ہیں۔ اگر دوبارہ ہمیں جان کے ہتھے چڑھ گئے تو بہت بُرا
سلوک ہو گا ان سے۔ اس کے علاوہ اس خیمے میں سب مشین
مکین بھی ہے۔ وہ غلط ہاتھوں میں چلی گئی تو جتنی مصیبت کھڑی

ہو جائے گی۔"

لشکر خاں نے کہا "متم کسی بات کا فکر نہ کرو براور، بی بی
اور بیچے کو حفاظت سے یہاں لانا اب امارا ذمہ داری ہے۔
ام ابھی اپنے بندوں کو ادھر بھیجتا ہے۔ تم بس یہ دعا کرو کہ وہ

امارے لوگوں کے ہتھکنڈے تک محفوظ رہے۔"

میں نے کہا "اگر ایسا ہے تو میں بھی ساتھ جانا چاہوں
گا۔"

وہ بولا "یہ خطرناک کام ہے براور۔ ایسے کام کا نام کو
موت بولوں۔ امارا آوی پانڈوں کے ہمیں میں جانے گا۔ تم
جائے گا تو فوراً پھانسیا جائے گا۔ خواہ مخواہ کا مشکل کھڑا ہو جائے

والے سمجھ رہا تھا وہ زندہ ہے۔ ابھی جو لوگ ہمیں جان کو
بھڑو کر ہمارے پاس آیا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ عباس
ماں کے سر اور ایک ٹانگ پر چوٹ آیا ہے۔ ویسے اس کا

مالت خطرے سے باہر ہے۔ ڈیرے پر اس کا سر ہمیں ہی کر کے
سے اسی بی برکت وغیرہ کے ساتھ بند کر دیا گیا ہے۔"

یہ ایک اچھی خبر تھی۔ پچھلے چھپش خیموں میں میں
عباس خاں کے لیے بہت فکر مند رہا تھا۔ اس کی مصیبت مجھے
روہ کر کر کر محمد کی یاد دلاتی تھی۔ ایک جیل میں خرپ خرپ

کر جان دینے والا تو محمد بھی تو عباس خاں کی طرح ایک خوش
آواز شخص تھا۔ اس آواز کی موت کا صدمہ ابھی تک میرے
ذہن میں بازہ تھا کہ یہ دوسری آواز بھی میری آنکھوں کے

سامنے خاموشیوں کے گھرے کنوئیں میں ابتر تھی۔ مجھے
خوشہ تھا کہ یہ آواز بھی دم توڑ گئی ہے لیکن اب لشکر خاں کی
زبانی یہ چل رہا تھا کہ میں "ابھی" "نہ" "زندہ ہے۔"

لشکر خاں اور میں پھرے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لشکر خاں
واپس سردار بٹر گل کے چھوڑے میں جانا چاہتا تھا جبکہ میں
نچوڑے دو تیس کرنا چاہتا تھا۔ میں نے لشکر خاں سے کہا "تم

چلو۔ میں ابھی اس لڑکی سے مل کر آتا ہوں" لشکر خاں اپنی
بھاری بھر کمزور اناقل کندھے پر ڈال کر سردار کے چھوڑے کی
طرف چل دیا۔

انسپکٹر باجوہ کی لاش ابھی تک اسی چھوڑے میں رکھی
تھی۔ آثار سے نظر آتا تھا کہ ابھی ہستی میں کسی کو اس کی
موت کی خبر نہیں دی گئی تھی۔ چھوڑے کا دروازہ بند تھا اور

سردار بٹر گل کے دو خاص آدمی پرہ دینے والے انداز میں
وہاں موجود تھے۔ چھوڑے میں رکھی ہوئی باجوہ کی لاش کا
تصور کر کے ایس بی برکت کا چہرہ میری آنکھوں میں محوم گیا۔

وہ ہر ماتحت کو "بھوتی را" کہتے تھے لیکن انسپکٹر باجوہ کے لیے
یہ لقب استعمال نہیں کرتے تھے۔ صوبیدار مرزا نے ایک
روز پوچھا تھا کہ وہ انسپکٹر کے لیے یہ لقب استعمال کیوں نہیں

کرتے؟ ایس بی برکت نے کہا تھا "میں اسے اس لیے بھوتی
را نہیں کہتا کہ یہ بیچ بھوتی کا ہے" کیا مطلب؟ صوبیدار
نے وضاحت چاہی تھی "یہ میری ساس کا بیٹا ہے" ایس بی

برکت کا جواب تھا۔ آج ایس بی کا وہ خوش باش براور ہستی
انسانوں سے اور دنیا سے ہر نسبت توڑ کر رانی عدم ہو گیا تھا۔
میں دس دس قدموں سے بخوبی طرف روانہ ہو گیا۔

چھوڑے میں بخوبی کڑے چال پکار کے تھے چالوں کی
خوشبو چھوڑے میں اور چھوڑے سے باہر پھیلی ہوئی تھی۔
یوں لگتا تھا کسی بوڑھے دیکھے میں یہ دُش تیار گئی ہے۔ میں

سے چھوڑے کا درمیانی پردہ اٹھا کر دیکھا تو یہ اندازہ درست
نکلا۔ بخوبی دیکھے کے قریب بیٹھی تھی۔ آج اس نے نیا
لباس پہنا تھا اور بال بھی سلپے سے پانڈہ رکھے تھے۔ رات

والی سوگوار اب اس کے چہرے پر نہ ہونے کے برابر رہ گئی
تھی۔ بخوبی سنور کر معقول شکل و صورت کی دکھائی دینے لگی
تھی۔ اس "معقول صورت" میں اس کی جسمانی دلکشی جمع
کر دی جاتی تو وہ سیکڑوں ہزاروں عورتوں میں ایک تھی۔ میں

نے پوچھا "یہ اتنے ڈیرے سارے چالوں کیوں پکائے ہیں؟"
وہ ڈر ڈر کر بولی "میب بی! میں نے مت لائی تھی۔"
"کیسی مت؟"

"میبی کہ آپ یا شہزاد میں سے کوئی دو روز میں واپس
آگیا تو خیمے چالوں پانڈوں کی۔ اللہ نے میری سن لی ہے۔ اب
مجھے بھی مت پوری کرنی چاہیے۔"

میں نے کہا "شہزاد والی بات تو میری سمجھ میں آتی ہے
لیکن میرے آنے سے اتنی خوشی کیوں۔ میں تو تمہارے لیے
کوئی اچھی خبر بھی نہیں لایا؟"

"آپ آگئے ہیں۔ یہی بڑی بات ہے۔ اب اللہ سوچنا
کرم کرے گا تو اچھی خبر بھی آجائے گی۔"

اس کی آنکھوں میں ایک دم اس کے دیرے جل اٹھے۔
وہی دیرے جو وہ پچھلے ایک ہفتے سے شب و روز جلائے ہوئے
تھی۔ ان دیروں کی روشنی میں وہ ایک تاریک راستے پر اپنے
گھروالے کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس شخص کی راہ جو اس کے
ہونے والے بیچے کا باپ تھا جو اس کی زندگی میں شوہر بن کر
آیا تھا اور لیرا بن کر دینے ہو گیا تھا۔ بخوبی اس کی دعا بازی کا
کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ اسے سر کا تاج سمجھ رہی تھی اور رات
دن اس کے لیے دعاگو تھی۔

گرا گرم چالوں کی ایک قطاری بھر کر اس نے میرے
سامنے رکھ دی۔ چالوں کو دیکھی میں پکایا گیا تھا۔ ان میں
کیش "بادام اور سونف وغیرہ ڈالی گئی تھی۔ شکل و صورت
گواہ تھی کہ بڑے مزے دار چال ہیں مگر مجھے بخیر یہ وہ مجھے
کڑوے لگے۔ ان میں ایک سیدھی سادی عورت کی ناکام
تنہاؤں کا لو شامل تھا۔ اس کے علاوہ ابھی تھوڑی دیر پہلے
میں انسپکٹر باجوہ کی لاش دیکھ کر آیا تھا۔ اس کی موت کا غم
ایک سیاہ مٹھنڈ کی طرح میرے سینے میں پھیلا ہوا تھا۔ ایسے
میں کچھ کھانے کے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے
پلٹ ایک طرف ہٹا دی۔

وہ گھبرا کر بولی "میب بی! کیا بات ہے؟"
"کوئی بات نہیں۔ بس دل نہیں چاہا رہا۔"

”آپ نے ہشتا بھی نہیں کیا۔ اب دو بڑی چاولی کھا لیتے۔“

”نہیں۔ ابھی رکھو۔ میں ٹھہر کر کھالوں گا۔ دل کچھ پریشان ہے۔“

”کیوں کیا بات ہے صیبت جی؟“

”دراصل۔ میرا ایک ساتھی مار گیا ہے۔“

”ہائے ربا“ نوجو نے سینے پر ہاتھ رکھا ”تک کی بات ہے یہ؟“

”ابھی جب میں سردار کے جھونپڑے میں گیا ہوں تو پتا چلا ہے۔ کسی نے گولی مار دی ہے اسے۔“

”نوجو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اندوہ میں ڈوب گئیں ”کون تھا وہ۔ کس نے ماری گولی؟“

”میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ڈاکوؤں کے ہاتھوں مقتول کے اغوا کا ذکر کیا اور دیگر تفصیل بتائی تو نوجو کا دھیان خود بخود شبہ بازی طرف چلا جائے گا اور وہ جو پہلے ہی پریشان ہے مزید پریشان ہو جائے گی۔ میں نے گول مول بات کی اور اسے بتایا کہ مقتول شکار پارٹی میں ہمارے ساتھ آیا تھا۔ بعد میں کہیں کھو گیا۔ شاید بارور کی طرف نکل گیا تھا۔ وہاں اسے کسی نے گولی مار دی۔“

”نوجو آنکھوں میں آنسو چپکنے لگے۔ وہ چاولوں کی تھالی اٹھا کر خاموشی سے اندر لے گئی۔ میں نے اولی پردے کے اوپر سے اسے آواز دی ”نوجو! بات سنو۔“

”جی صیبت جی۔“ وہ دم گم سی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”دیکھو“ اگر چاول پکالے ہیں تو بچوں وغیرہ کو کھلا دو۔

”انہیں ضائع مت کرنا۔“

وہ بولی ”یہ کیسے ہو سکتا ہے صیبت جی۔ سردار کے جھونپڑے میں آپ کے دوست کی میت پڑی ہے اور میں یہاں چاول بانٹتی چھوڑ۔“

”تو پھر کیا کرو گی؟“

”پھینک دوں گی وہ گھونڈ کی کھلی میں۔“

”دیکھو تم نے یہ کام ثواب کے لیے کیا تھا اور ثواب چیز کو ضائع کرنے میں نہیں اسے ضرورت مند تک پہنچانے میں ہے۔ اگر ہاشا نہیں چاہتی ہو تو خاموشی سے بچوں کو میاں جھونپڑے میں ہلا کر کھلا دو۔ میں سردار کے جھونپڑے میں جا رہا ہوں۔ وہاں کفن دفن کا انتظام کرنا ہے۔ شام کو واپس آؤں گا۔“ نوجو سر ہانک سے ”میں سوں“ کی آواز نکالتی ہوئی واپس چلی گئی۔ میں اٹھ کر سردار کے جھونپڑے کی

طرف روانہ ہو گیا۔

اس دور دراز مقام سے انیسٹر کی لاش واپس شریک اور اس کے گھر تک پہنچنا بہت مشکل کام تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ بستی سے باہر نکلنے ہی عیسیٰ جان کے ساتھیوں سے ملے بغیر ناممکن تھا۔ فائدہ امانت کے طور پر اسے وہیں بستی کے قریب سیانی کے پیڑوں تلے دفن کیا گیا۔ اپنے عزیز واقارب سے بہت دور اس انجان علاقے میں انجینی لوگوں کے کندھوں پر انیسٹر باجوہ کا سفر آخرت رقت آمیز تھا۔

سہ پہر کو اسے شہر خاک کر کے ہم واپس آگئے شام کے بعد تک میں سردار بشر گل کے جھونپڑے میں موجود رہا۔

لشکر خاں اور ذخی جبار بھی وہاں تھے۔ مختلف موضوعات پر بات ہوتی رہی لیکن اہم موضوع ایک ہی تھا اور وہ یہ تھا کہ عیسیٰ جان اور اس کے گروہ کا مقابلہ کیسے کرنا ہے۔ شام کے فوراً بعد لشکر خاں کو ایک اور خوشخبری ملی۔ عیسیٰ کے ساتھیوں میں سے دس افراد پر مشتمل ایک اور گولی پانڈہ بستی پہنچ گئی تھی۔ ان افراد کو عیسیٰ جان سے ”تود“ کر پانڈہ بستی لائے والا لشکر خاں کا ہوشیار ساتھی جود خاں تھا۔ اس کی وفاداری غیر متزلزل تھی۔ صرف ایک دن پہلے اسے لشکر خاں کے حکم پر کوڑوں سے اڑھا دیا گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ دل میں کوڑے ریش رکھتا یا ویسے ہی لشکر خاں کو چھوڑ جاتا وہ پوری سرگردی سے اس کا ساتھ دے رہا تھا اور تکلیف کے باوجود بڑھ چڑھ کر اس ”سرو جنگ“ میں اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔

لشکر خاں کے اصرار پر مجھے بھی اپنا لباس تبدیل کرنا پڑا۔ ایک لمبے چوڑے پانڈے کی کھیر دار شلوار، فراک نما ٹکڑا اور صندری پہن کر میں خود کو بہت بدلا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ سردار کے آرام و جھونپڑے میں رات گئے تک گڑگڑایاں سٹکتی رہیں اور فوے کی پیالیاں پکارتی رہیں۔

آخر یہ محفل برخاست ہوئی اور میں لینے کے لیے اپنے ٹھکانے پر گیا۔ یہ خیمہ نوجو کے جھونپڑے سے قریب ہی تھا۔ میرے علاوہ لشکر خاں کے دو ساتھی بھی اس خیمے میں مقیم تھے۔ لشکر خاں کے ساتھیوں کی تعداد اب پچاس سے اوپر ہو چکی تھی۔ ان پچاس افراد کے لیے ایک بھی نیا خیمہ یا جھونپڑا کھڑا نہیں کیا گیا تھا۔ بس وہ اسی طرح ایک ایک دو دو کر کے بستی میں پھیل گئے تھے۔ ان کے گھوڑوں کو بھی بستی کے گھوڑوں میں غلط فط کر دیا گیا تھا اور اب ان کی الگ سے پہچان بہت مشکل تھی۔

حسب رواج اس اولی خیمے میں ایک چٹائی موجود تھی۔ خیمے کے درمیان ایک انٹیمٹھی ٹمک رہی تھی اور انٹیمٹھی کے

ارد گرد بھڑکی کھال کے تین بستر بچے تھے۔ میرے خیمے کے ساتھی میرے آنے سے پہلے ہی نیند کے آغوش میں جا چکے تھے۔ میں نے ان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور اپنے فرش بستر پر دراز ہو گیا۔ بعض اوقات ایک بالکل معمولی سی بات انسان کے ذہن میں ایک ایسی گھڑکی واکرتی ہے جس کی دوسری طرف یادوں کا ایک جہان آباد ہوتا ہے۔ گھڑکی کھلتے ہی ایک عمدہ ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے اور یکے بعد دیگرے بیت جانے والے شب و روز گھڑیاں چل اٹھتی ہیں اور لمحے قطار اندر قطار ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگتے ہیں۔ بالکل جیسے وہ اب بھی زندہ ہوں اپنی تمام جزئیات اور اپنے مکمل رنگ و روپ کے ساتھ۔ نہ جانے ذہن کا وہ کون سا نماں خاص ہے جہاں وقت محفوظ ہوتا ہے اور مختلف یادوں کی گھڑکیوں میں بڑی ترتیب سے آراستہ ہو جاتا ہے۔ ایسی ترتیب کے ساتھ کہ زمانے گزرنے کے بعد بھی ہزاروں لاکھوں یادوں میں سے اکثر یادیں و موعظے پر فوراً مل جاتی ہیں۔

بستر پر دراز ہوتے ہی میرے ذہن میں جو گھڑکی کھلی تھی اس میں میری زندگی کی اہم ترین یادیں محفوظ تھیں۔ اس گھڑکی کے کھلنے کی وجہ کوئی بہت اہم واقعہ یا منظر نہیں تھا، ایک معمولی سی بات تھی۔ نوجو نے آج شیشے چاول پکا کر بچوں کو کھلائے تھے۔ اس نے منت مان رکھی تھی۔ ایک ایسی ہی منت برسوں پہلے بھی ایک عورت نے مانی تھی۔ اس منت کی نسبت سے مجھے بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ کئی خیال وہ رہ کر ذہن پر بلیغ کر رہے تھے۔ سارا دن تو مصروف رہا تھا لیکن اب بستر پر لیٹنے ہی ایک دستان نگاہوں کے سامنے کھل گیا تھا۔ لگا جیسے کسی طوفانی جھگڑنے مجھے اپنی لپٹ میں لے کر زمین سے اٹھایا ہے اور وقت کی شرنگ سے گزار کر کئی برس پیچھے ایک مکان کی چھت پر پھینک دیا ہے۔ میں اس چھت پر کھڑا مندر کے زرخون میں سے ایک کمرے میں جھانک رہا ہوں۔ اس کمرے میں ایک لڑکی آئینے کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی ہے۔ میں اسے دیکھ رہا ہوں اور دیکھتا چلا جا رہا ہوں۔ میری آنکھ جھپک رہی ہے نہ میری سانس چل رہی ہے۔ بس دل دھڑک رہا ہے اور اس کی ہر دھڑکن سے کسی کی صدا آ رہی ہے۔ یہ کس مکان کی چھت ہے؟ یہ کون لڑکی ہے؟ میں اس چھت کو اور اس لڑکی کو کیسے بھول سکتا ہوں؟ بھول ہی نہیں سکتا۔ کوئی پروا اپنی زمین کو کوئی شیلہ اپنی شمع کو اور کوئی بزرگ اپنی شاخ کو بھول سکتا ہے؟ اور بھول کے زندہ رہ سکتا ہے؟ یہ میرے گھر کی چھت ہے جہاں میں اپنے والدین

اور اپنی بہن کے ساتھ رہتا ہوں۔ دور ایک دوسرے مکان کے کمرے میں آئینے کے سامنے بال سنوارنے والی لڑکی میری زندگی ہے، میری پہلی اور آخری خواہش۔ غزالہ!

ایک دم یس ہی سب کچھ بھول گیا۔ ذمے شت کا یہ دوران ہے۔ پانڈہ بستی، سروی کی لہروں پر ڈھونڈا بھرتا خیمہ۔ نوجو، فریال، عیسیٰ جان، شکر، لشکر خاں، کچھ بھی مجھے یاد نہ رہا۔ میرا ذہن برسوں کے فاصلے لمحوں میں پھٹ گیا جہاں میں نے آنکھ کھلی تھی اور اس مضافاتی قصبے میں پہنچ گیا جہاں میں نے آنکھ کھلی تھی اور پروان چڑھا تھا۔ جہاں میری زبان سے پہلا لفظ ادا ہوا تھا، میرے پاؤں نے پہلا قدم اٹھایا تھا، میرے قلم نے پہلا لفظ لکھا تھا اور پھر میرے دل نے پہلی محبت کی تھی۔ پہلی محبت جس میں کوئی ندیں کی شوریہ سری، مسند روں کی گہرائی اور اکھاڑ دینے والے طوفانوں کی شدت تھی۔ ایسے طوفان جس میں جنم لیا کرتے ہیں اور ہمارا قصبہ جس اور ٹھکان میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس قصبے پر اور ارد گرد کے چند دیہات پر ایک خدائی فوجداری طرف سے ایک ایسا قانون نافذ کر دیا گیا تھا جس کا مصروف اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ جی دار متوالے اسے توڑ دیں۔ ہر سزا کے خوف سے بے نیاز ہو کر اس کی دھجیاں بکھیریں اور بھیرتے رہیں۔ ”جل کوٹ“ نام تھا ہمارے قصبے کا۔ قصبے کے چوہدری بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ ارد گرد کے سات آنڈہ دیہات ان کی ملکیت تھے۔ بڑے چوہدری کا نام نادر علی تھا لیکن خاص مقام اسے ڈٹا میاں کہتے تھے۔ میں نے بچپن میں وڈے میاں کو دیکھا تھا تو وہ کھین شیعہ تھا لیکن پھر اس نے چھوٹی سی داڑھی رکھ لی تھی۔ اس داڑھی میں سیاسی اور سفیدی ایسے ملی ہوئی تھی جیسے وڈے میاں کے کردار میں۔ وہ نمازی تھا، خیر خیرات کرتا تھا۔ گیارہویں شریف کی دیکھیں پکا تھا اور علاقے میں اصلاحی کیشیاں قائم کرتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ذریعہ اندوز تھا۔ دھوکے باز تھا، سخت مزاج تھا اور اکثر لوگ کہتے تھے کہ قاتل بھی ہے۔ وڈے میاں نے اپنی زمینوں کو ایک چھوٹی سی جاگیر کی شکل دے رکھی تھی اور اس جاگیر میں وہ مطلق العنان حکمران تھا۔ اس کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات حتمی اور ہر فیصلہ قانون ہوتا تھا۔ یہ بات مشہور تھی کہ وڈے میاں کے باب چوہدری سراب نے اپنی بیٹی کو ایک کورجہ زمیندار سے پیار کرنے کی سزا دی تھی کہ بیٹی کو اس کے محبوب اور محبوب کے اہل خانہ سمیت گولیوں سے چھتی کر دیا تھا۔ بعد میں ان چند رہلاشوہر مہنی کا تیل چھڑک کر آگ لگائی گئی تھی اور راکھ دیا بڑکھوئی گئی تھی۔ اس عظیم سانحے کی دہشت

علاقے پر یہاں فوجانہ لڑکیاں غیر لڑکوں سے جیساں نہیں ڈالتیں اور کہتیں ہیں رنگ راپاں نہیں منائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ ان ذہنات میں بھی وہ سب کچھ ہوتا تھا جو ازل سے زندگی کا حصہ رہا ہے اور کبھی سمجھاؤ دے کر یہاں کو اس کا ثبوت بھی مل جاتا تھا۔ ایسے میں دُور سے یہاں کا قہر پوری ہو جاتا ہے اپنے معتوب پر فوجا اور دیکھنے والوں کو دہلا جاتا۔ چند ماہ خاوشی سے گزرتے، ”اہل دل“ سے سے رہتے۔ بڑے بڑے قوتار سے اپنے بچوں کو سمجھاتے رہتے۔ لیکن پھر غیر محسوس طور پر سابقہ معمولات لوٹ آتے اور فطرت خاوشی سے اپنے راستے بنانے لگتی۔

میں بھی اسی جس زندہ نفساں پل کر لاپن کی حد و حد
پہنچا تھا۔ پندرہ سولہ سال کی عمر ہی ہوئی میری، مُل کا ستھان
میں نے امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا اور اب میٹرک کی
تائریاں کر رہا تھا۔ میرے والد کا نام وقار احمد تھا۔ وہ محکمہ
انماز میں ایس ڈی او تھے۔ صرف تنخواہ ہر مہینہ گزارا کرتے تھے
اور شب و روز سفید پوشی پر قرار رکھنے کی فکر میں رہتے تھے۔
سفید پوشی پر قرار رکھنے کی فکر کو معمولی فکر نہیں ہوتی۔ اس
فکر نے انہیں چالیس سال کی عمر میں دل کا مریض بنادیا تھا۔
ایک دفعہ وہ شدید بیمار ہوئے تو ڈاکٹری رپورٹوں سے پتا چلا کہ
ان کے دل میں ایک خطرناک سوراخ ہے۔ ان دنوں ایسے
مرض سے شفا پانے کی توقع نہ ہونے کے برابر تھی۔
اگر ہوتی بھی تو ہمارے پاس اتنا سرمایہ کہاں تھا کہ مسیحا کی
نذر کیا جاتا۔ بیرون ملک تو دور کی بات ہے، اندرون ملک بھی
مہنگا علاج کرا تا ہمارے بس میں نہیں تھا۔ والد صاحب کے
دوستوں نے کوشش کی کہ سرکاری ملازم کی حیثیت سے
انہیں باہر بھیجا جائے اور اس سلسلے میں ارباب اختیار کو
درخواستیں بھی گزاریں۔ ممکن ہے کچھ درخواستوں پر تجویزی
بست کارروائی ہوئی ہو لیکن والد صاحب کی وفات تک یہ
درخواستیں صرف درخواستیں ہی رہیں۔ میری جنت نشیں
والدہ ایک بے حد سادہ اور شوہر پرست عورت تھیں۔ میں
نے پندرہ سولہ سال کی عمر تک انہیں کبھی والد صاحب سے
اونچی آواز میں بولتے نہیں سنا۔ بڑی ملائم آوازیں وہ انہیں
”آپ“ کہہ کر مخاطب کرتی تھیں، جواب میں والد صاحب
بھی انہیں ”آپ“ جناب“ حضور مجھے التفات سے نوازتے
تھے۔ اب اسے امی کی محبت پہلے بھی کچھ کم نہیں تھی لیکن جب
بے وہ بیمار ہوئے تھے، وہ ان پر بچاؤ ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ
چاہتی تھیں کہ گھر سے باہر اور گھر کے اندر اپنے مجازی خدا
کے لیے ایک ایسی جنت تعمیر کروں کہ جس میں کسی پریشانی

پلے ایک نسل ہی کو متاثر نہیں کیا تھا، اس کے بعد آنے والی نسل میں بھی یہ وحشت سراپت کرمی تھی اور مگر رہنے والے بدرون کے ساتھ اس کی شدت بڑھتی اور پھیلی جلی تھی۔ دوا میاں نہ صرف اپنے باپ کے نقش قدم پر چلا تھا بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ اگے نکلتا تھا۔ اس نے چودہ راہٹ سنبھالنے ہی اپنے رسالت میں ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرایا تھا کہ ان رسالت میں ہر شخص کو اور خاص طور پر نوجوانوں کو باند زندگی گزارانی ہوگی۔ یہاں کا کوئی نوجوان سنبھال دیکھے شہر نہیں جائے گا ورنہ شہر کے کسی کھیل قمار میں حصہ لے گا کوئی لڑکا بال نہیں بڑھائے گا، لڑکھائی دار کرتا نہیں پئے گا۔ سر عام گانا نہیں گائے گا اور کوئی ساز بجاتا نہیں سکھے گا۔ رسالت کی حدود میں ریڈیو اخبار وغیرہ "حرام" ہوں گے اس حرام کو علان کرنے والے ہر شخص کو سزا دی جائے گی۔ اگر کسی لڑکی لڑکے میں میل ثابت ہو گیا تو دونوں سخت ترین سزا کے مستحق ہوں گے اور اگر ان کے والدین ذمے دار پائے گئے تو وہ بھی محبوس جائیں گے۔

جن دنوں یہ ”مکرم نامہ“ جاری ہوا، اس سال کا تھا۔ معاملات کی کچھ زیادہ خبر نہیں تھی لیکن ایک طرح کی دہشت میں نے اس وقت بھی اپنے قصبے میں سستانی محسوس کی تھی۔ اس دہشت کی اصل وجہ میری سمجھ میں اس وقت آئی تھی جب ہمارے قصبے میں یکے بعد دیگرے دو فوجوؤں کو ”جرمِ محبت“ یا ”شُبہ محبت“ میں ذلت آمیز سزا دی گئی۔ وہ مناظر میرے پر دہ ذہن پر کسی دھندلی زو فہم کی طرح متحرک ہیں۔ ان لوگوں کے سر، مونچھیں، بھروسے سب کچھ مونڈ دیا گیا تھا پھر ان کے چرے کا لے کر کے، انیس گدھے پر اٹا بیٹھا گیا تھا اور مکھی میں جوتیوں کے ہار ڈال کر پیچھے لڑکے لگا دیے گئے تھے یہ عبرت ناک جلوس پورے قصبے سے گزرا تھا اور ہر آنکھ نے محبت کو تماشائے دیکھا تھا۔

یہ دو واقعات آخری نہیں تھے اس کے بعد بھی اکثر نئے
پروٹ بپتی رہی تھی اور بد نصیب نوجوانوں پر فزجرم عائد
کرتے کہ ان سے انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہوا تھا۔ یہ بات
مسئلہ ہے کہ "حالات" کسی مسئلے کا حل نہیں اور محبت میں تو
یہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ اسے جتنا دباؤ اتنی ایجبرتی ہے۔
وڈے میاں کے علاقے میں بھی یہی کچھ ہوا۔ تمام تر خوف
اور دہشت کے باوجود محبت کرنے والے محبت کرتے رہے،
آنکھیں پٹی رہیں اور دل دھڑکتے رہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ
سب کچھ نہایت احتیاط اور راز داری سے ہونے لگا۔ وڈا
میاں بڑے فخر سے اعلان کیا کرتا تھا کہ یہ غیرت مندوں کا

اور بے آرامی کا سایہ تک نہ ہو۔

اور بے ادبی کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے چچا طلیس ڈار احمد بھی جل کوٹ میں ہی رہے تھے۔ ان کا گھر ہماری ہی گلی میں دو تین مکان چھوڑ رکھا تھا۔ چچا طلیس کا میلان شروع سے زمینیں خریدنے اور بیچنے کی طرف تھا۔ انہوں نے اس کاروبار میں کافی پیسہ کمایا تھا۔ اچھا کھاتے بیٹے تھے اور جل کوٹ میں ان کا ٹیکس ہاؤس مکان دوڑے میاں کی حویلی کے بعد بے سے شاندار سمجھا جاتا تھا۔ غزالہ چچا طلیس کی اگلی بیٹی تھی اور بے حد لادلی تھی۔ بچپن سے ہم ایک دوسرے کو دیکھتے آئے تھے۔ کبھی کبھی چھوٹا وقت ساتھ گزارنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ سیاہ آنکھوں والی وہ گریباں لڑکی نگاہ کے راستے نہ جانے کب میرے دل میں اتر گئی تھی اور اس کی محبت گزرنے والے ہر دن کے ساتھ میرے لبوں میں رچی بسٹی چلی گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے واقعات سے اکثر مجھے اس محبت کا احساس ہونا رہتا تھا لیکن شدید ترین احساس اس دن ہوا تھا جب غزالہ جل کوٹ کے گھیاں کوچے پر ان چھوڑ کر ڈھنکے لے لیے ساہواں اپنی خال کے پاس چلی گئی تھی۔ یوں لگا تھا جیسے وہ قہقہے کی ساری خوبصورتی اور رونق اپنے چھوٹے سے اپنی میں بھر کے لے گئی ہو۔ وہ اپنی کیس تھا یا مومو عیار کی زنبیل ! جل کوٹ کے سارے قہقہے، ساری مسکراہٹیں، چٹکھٹکھٹوں کی گھما گھماہٹیں، میلوں کی رونق، موسموں کی ترنگ، میلوں کی چٹک میلوں کی جھکا ہٹ سب کچھ اس اپنی کیس میں بند ہو کر رہ گیا تھا اور وہ اپنی ساہواں کی کسی چادر دیوار میں کسی گھماہٹ کی اندر جا چٹا تھا۔

غزالہ کے جانے کے بعد میں ہنسل سوچتا رہا کہ میں کیوں اُداس ہوں اس کے لیے؟ اس نے تو مجھی مجھ سے زیادہ مہذب بات نہیں کی تھی، ہمیشہ ہوا کے ٹھوڑے پر سوار رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی نخوت آمیز جھجکی کی ایک = اس کے من موہنے غور کوڑھاب لیا کرتی تھی۔ اس نے مجھے شاہ جہاں کے بجائے ہمیشہ "اے جہاں" کہہ کر لایا تھا۔ بالکل اسی انداز میں جیسے چچا جلس ملاتے تھے اور چچی فخرہ بلانی تھیں لیکن کچھ بھی ہے "میری اُداسی ایک حقیقت اور محبت بھی ایک حقیقت تھی۔ غزالہ سے مجدا ہو کر میں دن رات روتی رہا۔ اس کا تصور شب و روز میری نگاہ میں رہتا تھا۔ وہ دس تیارہ سال کی تھی لیکن اپنی عمر سے بڑی نظر آتی تھی۔ لکھا ہوا قد، مکمل ہاتھ پیر، صراحی کی گردن اور آنکھیں جن میں سچ موتی کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ سریوں کی دھڑکن وہ قصبے کے اسکول سے پڑھ کر واپس آتی تو اس کے

شبابی رخسار انگڑوں کی طرح دیکھ دکھائی دیتے۔ اس
رخساروں کو دیکھ کر میرے دل میں امنک جاتی کہ اپنے
ہاتھوں کو برف کی سل پر رکھ دو اور جب تجلیاں نہ بن
ہو جائیں تو ان سے دھیرے دھیرے ان رخساروں کو سمٹا لے
لگوں۔ سلانا چلا جاؤں میاں تک کہ ایک عورت جائے۔
لیکن اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی نوبت کبھی نہ آئی۔ ان
دیکھے رخساروں والی غزال بڑی شان سے قدم اٹھاتی ہمارے
بوسیدہ دروازے کے سامنے سے گزرتی اور اپنی شاندار حوصلی
کے تحریک میں او جھل ہو جاتی۔ میں بھاگ کر چھت پر آجاتا۔
وہ اپنے گھر کے نیم روشن کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑی
ہو جاتی۔ اپنے شبابی رخساروں کا نظارہ کرتی اور لمبے بال
کھول کر کتھے سے سنوارنے لگتی۔ چھوٹی سی عمر میں ہی اس
کے بال پشت کے خم تک پہنچتے تھے۔ شاید یہی بال تھے جن کے
سبب وہ عمر سے بڑی نظر آتی تھی۔ سر کو بڑے انداز سے ایک
طرف جھکا کر وہ اپنے بالوں میں گھسکا کرتی اور میں اپنی
دھڑکنوں سے بے سر ہیکار ہو جاتا۔ جب وہ شہر چلی گئی تو مجھے
چچا خلیس کی شاندار حوصلی بھی اپنے مکان کی ہی طرح بوسیدہ
نظر آنے لگی۔ نیم روشن کمرے میں رکھا ہوا آئینہ ویران
ہو گیا اور کھڑکیوں میں بادوں کے جالے لٹک گئے۔

لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ عارضی فاصلے محبت میں شریعت پیدا کر دیتے ہیں۔ میرے اندر بھڑکنے والی آگ بھی فروغ میں ہو چکی تھی۔ جب دو تین ہفتے بعد غزالہ شریعت قصبے میں آتی تو میں دیوانہ وار اس کے گرد بیکرا کر، ہمارے ہمارے سے بھاگی حولی میں جا بنا اور غزالہ کے قرب سے اپنے سینے کی چٹائی کشم کرنے کی کوشش کرتا۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔ یقیناً ارضی ہوتی ہے۔ میں بھی جانتے بوجھتے ایک جنم زار میں تھا۔ رکھ رہا تھا۔ محبت کرنا اور بھی دؤر ہے میاں کی راجدھانی میں، اندھا پن ہی تو تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں ایک ایسی راہ پر چل رہا ہوں جو عقرب مجھے بال بال میں گرا دے گی۔ مجھ سے چھوٹے دو بھائی بچپن میں ہی فوت ہو چکے تھے۔ شہناج مجھ سے دس گیارہ برس چھوٹی تھی۔ جب میں سولہ سال کا تھا، اس کی عمر پانچ سال کے لگ بھگ تھی۔ ہم دونوں ہمیں بھائی والدین کی آنکھ کا تارا تھے۔ اپنی بیماری کی نوعیت ہمارے کے بعد والد صاحب ہم دونوں کو کچھ زیادہ ہی وقت دے گئے تھے۔ خاص طور پر ہمیں میری تربیت کی بہت فکر تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ آئینے بیٹھے مجھے ویتسین کر رہے ہوں۔ انہماک پر حرف میرے لیے مشعل راہ تھا۔ وہ مجھے سراغدار کر کے کافی سکھارہے تھے۔ خود داری اور محنت کی وہ راہ دکھا رہے تھے

جس پر چلنے والے کے سر پر عزت نفس کا تاج ڈالنا نہیں اور اسے اپنے ضمیر کے سامنے کبھی شرمندہ نہیں ہونا پڑتا۔ اباجان ابھی کتابیں پڑھنے کے شوقین تھے اور موسیقی سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ گو ہمارے قبے میں کئی دوسری چیزوں کی طرح موسیقی بھی شجر مومند تھی۔ تاہم والد صاحب کے پاس ایک پرانا پیپ ریکارڈ موجود تھا۔ کبھی کبھی وہ بند کر کے میں موسیقی سے دل بہلاتے۔ میں نے اکثر انہیں یہ گیت سنتے پایا۔ یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے۔ افسوس ہم نہ ہوں گے۔ اس وقت مجھے ایسا تھا کہ ان کی بیماری کا کچھ پتا نہیں تھا لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں جب بھی اباجان یہ گیت سنتے، میرا سینہ یاس کی دھند سے بھر جاتا۔ ایک عجیب سی بے کلی ساعت کے راستے لوہیں سرایت کرتی اور دل کو تیر کی طرح پھوپھڑانے لگتا۔ ایک دفعہ میں نے دردناک کی بھری سے اباجان کو یہ گیت سنتے دیکھا۔ چٹ بوٹھ پڑے وہ آرام کر رہے تھے۔ پھر وہاں سے بھرے ہوئے دونوں بازو بٹنے پر پابند رہ گئے تھے۔ گو دیش فیض احمد فیض کی ایک کتاب دھری تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ دور خلا میں کسی ناویدہ نفلے کو دیکھ رہے تھے۔ فضا میں یوں ابھر رہے تھے۔ کوئی نہ ساتھ دے گا۔ تب کچھ عیسے رہے گا جائیں گے ہم اکیلے۔ یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے۔ وہ منظر آج تک میری نگاہوں میں نقش ہے۔ اس کے بعد مجھے کبھی ایک کے کمرے میں جھانکنے کی جرات نہیں ہوئی۔

ایک موقع پر کچھ دنوں کے لیے اباجان علیل ہو گئے۔ یہ سخت سردیوں کے دن تھے۔ اباجان نے میں دردناک اور گاہے گاہے ٹیبلٹ بھی کھانے پڑے۔ پورے ہفتے امی، اباجان کی پٹی سے لٹی رہیں۔ پتا نہیں کس مٹی کی بنی ہوئی تھیں وہ نہ رات کو سو سکتی تھیں نہ دن کو آرام کرتی تھیں اور یہ بھی نہیں کہ نہ رے سے ٹھن یا حرکات و سکنات سے سستی ظاہر ہو۔ پورے گھر میں چکراتی پھرتی تھیں۔ ادھر اباجان نے آواز دی "سرت نیگم" اور وہ پکاریں "بئی آئی" اور آواز کے ساتھ ان کے سرانے پہنچ گئیں۔ وہ بٹنے بعد اباجان ٹھیک دئے اور اپنے پاؤں پر چل کر کنبے کی نماز پڑھنے گئے تو امی جی جیسے انہیں۔ اس روز انہوں نے مجھے چاول پکائے تھے اور بچوں میں تقسیم کیے تھے۔ یوں تو کڑے چاول تھے مگر بے اہتمام سے پکائے گئے تھے۔ بادام، مری اور شمش ڈالی تھی۔ ہمارے گھر میں امی کے جیز کے ساتھ آنے والا بیل کا ایک ست بڑا۔ مجھ تھا۔ اس میں یہ چاول پکے تھے۔

امی دیکھ کر محبت کر معن میں لے آئی تھیں۔ اس روز انہوں نے رنگ دار لباس پہن رکھا تھا۔ سپید رخساروں پر چاندی کے خوب صورت ہنڈے ہلکے لے رہے تھے۔ اپنے شوہر کی محبت پائی پر تھا لیکن بھر بھر کر چاول پانچنی ہوئی وہ ماں، ایک بیٹے کی آنکھ کو بڑی پیاری لگی تھی۔ کچھ چاول قریبی گھروں میں دینے کے لیے ماں نے علیحدہ رکھے ہوئے تھے۔ ان چاولوں میں سے دو قالیان چچا علی کے گھر دینی تھیں۔ یہ کام میرے ذمے لگا۔ ماں نے ایک ٹرے میں قالیان رکھ کر خان پوش سے ڈھکیں اور پولیس "جاؤ پڑاؤ" چچی کو دے آؤ۔

میرے جسم میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا۔ آج تو میں سر کے بل بھی چچی کے گھر جا سکتا تھا۔ کل سے غزالہ آئی ہوئی تھی اور اسے دیکھنے اور چھونے کی حسرت میرے سینے میں چھلے تھیں۔ بہتوں سے لاد کی طرح بھڑک رہی تھی۔ میں ایسا جلد باز تو نہیں تھا اور نہ ہی ایسا بے وقوف، لیکن نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ غزالہ کو چھونے کی طلب میرے اندر بڑھتی سی چل جاری تھی۔ اس طلب کو بڑھانے میں کچھ ہاتھ میرے شری کزن فاروق کا بھی تھا۔ وہ میزک کا استحقاق دے کر چھٹیاں گزرانے جل کوٹ آیا ہوا تھا۔ اس کی بالغانہ صحبت اور سنسناتی سرگوشیوں نے میرے سینے میں ہلچل سی چار کھی تھی۔ غزالہ کی خاموشی "اس کی بے ٹرٹی اور بے پروائی کی فاروق نے ایسی ایسی توہینات کی تھیں کہ میں بزم خود راجھا بن کر غزالہ کو ہیر سمجھنے لگا تھا۔ ایسی ہیرو میرا بڑا پیش پس چند گھنوں میں بالکل کر سکتا تھا اور جو میری بارسری کی دھن پر بے تاب ہو کر چل سکتی تھی۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میں اپنے انجام سے اتنا ہی بے خبر تھا جتنا ایک اندھا پہاڑ کے سامنے پہنچ کر پہاڑ کی موجودگی سے ہوتا ہے۔

میں چاول دینے چچی کے گھر پہنچا تو حالات بڑے ہی سازگار نظر آئے۔ چچی اور دو نوکرانیاں حویلی کی چھت پر دھوپ سینک رہی تھیں۔ چچا گھر میں نہیں تھے اور غزالہ کا چھوٹا بھائی نیو کمرے میں بے خبر سو رہا تھا۔ غزالہ نے نیو کے قریب ہی کرسی پر بیٹھی ایک انکش کتاب پڑھ رہی تھی۔ شر جاکوہ انکش میڈیم اسکول میں داخل ہوئی تھی اور مجھ سے کئی جانتیں پیچھے ہونے کے باوجود اس کی انکش مجھ سے اچھی تھی۔ بڑھائی سے ہٹ کر بھی وہ بے حد ذہین تھی اور نوعمری میں ہی بیوی جیسی باتیں کرتی تھی۔ میں بڑے بڑے میں کھڑا اسے بنور دیکھتا رہا۔ وہ میری آمد سے بے خبر تھی۔ میں نے جی بھر کے اسے نگاہوں میں اتارا اور پھر اندر چلا گیا

اسلاماں لیکم "میں نے کہا۔
"وعلیک السلام۔ تم کب آئے جانی؟" اس نے جلدی سے دوپٹا سر رکھ لیا۔ سر کے سوا اسے دھانچا بھی کیا تھا۔
"میں لڑپن اور بلوغت کے درمیان کھڑی تھی وہ۔
"تو رات ایک منٹ ہو گیا ہے" میں نے کہا۔
"تو کیا کر رہے تھے؟" اتنی دیر سے؟" اس نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں دیکھ رہا تھا" میں نے بے ساختہ جواب دیا۔
"چھا، خواہ خواہ باتیں نہ بنایا کرو" وہ ناگوار سے بولی "اسی اور پھٹت پر ہیں۔"
"لیکن میں تو تم سے ملنے آیا ہوں" میں نے لڑکپن کی شرفی سے کہا۔

"کیا کہتا ہے مجھ سے؟"
"تاؤس؟" میرے ذہن میں دھند سی پھیل رہی تھی۔
"ہناؤ؟" وہ جہیز ہو کر بولی۔

میں نے ٹرے میرے رکھ کر دردناک سے کوا ندر سے گنڈی لگادی۔ میرا خیال تھا کہ اس واضح "انکار" کے بعد غزالہ کی کاپلٹ ہو جائے گی۔ اسے ایک دم چپ لگ جائے گی اور وہ شرابا مل کھانا شروع کر دے گی لیکن میری اس حرکت نے اسے بالکل سچ پکڑا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اندازہ ہوا کہ تعمیری اور پرنیکیل میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میرے شری کزن کا پڑھایا ہوا پہلا سبق ہی غلط ثابت ہو گیا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ پیچھے ہٹنے کے بجائے مجھے ہمت نظر آیا کہ آگے بڑھوں اور سینے میں مینوں سے جاری کشش کو کسی نتیجے پر پہنچا دوں۔

میں نے آگے بڑھ کر غزالہ کو بانوں میں لے لیا۔ مجھے اس کے جسم سے کچے آموں کی خوشبو آئی۔ مجھے لگا جیسے میں ابھی بالے حریت کے باغ میں چڑے آڑا نہیں ہوں۔ عجب دوا کی سی مجھ پر کاری ہو گئی۔ اس کا نوخیز شاخ سا جسم میرے جذبات کے تند جھوٹوں میں لگ کر ڈوبا ہو گیا پھر یہ شاخ زیادہ لچکی تو پلٹ کر شاخیں سے میرے رخسار پر آ پڑی۔ اس نے مجھے چھڑا رہا تھا۔ وہ مجھے دھکیل رہی تھی۔ مار رہی تھی۔ مجھ پر چلا رہی تھی۔ میں نے گھر اس کا منہ بند کر دیا۔ مجھے خچر کھار ایک دم ہی جیسے میں ہوش میں آ گیا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ گنڈی لگانے کی عین غلطی کے بعد میں غزالہ کو روک رہے کی عین ترین غلطی بھی کر چکا ہوں۔ ایک دم ہی میرے جذبات کا چڑھا ہوا دریا ایک خشک آب جڑ بن گیا۔

میں نے دیکھا، غزالہ کی قمیص دو جگہ سے پھٹ چکی ہے اور اس کا چہرہ لال بھوکا ہو رہا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر میری ہتھیلی کی ٹھنڈی ورنہ وہ چلا چلا کر پوری حویلی میں جگ مچا کر گئی۔ میں سر تاپا کر اپنے لگا "مجھے معاف کر دو غزالہ۔ مجھے غلطی ہو گئی۔ شمس خدا کا واسطہ کسی کو کچھ نہ پتا تھا۔"

میں نے اسے چھوڑا تو وہ ایک جھٹکے سے دور جا کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں نیلی آگ روشن تھی۔ میں نے ایک ڈری سہمی نگاہ بند دروازے پر ڈالی اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "میں شرمندہ ہوں غزالہ، مجھے غلطی لگ گئی تھی۔ مجھے معاف کر دو۔ تم جو قسم چاہو مجھ سے لے لو۔ آئندہ میں تمہیں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا۔"

وہ بالکل خاموش کھڑی رہی۔ ساکت و جامد۔ میں جانتا تھا کہ اس کی خاموشی گفتگو سے زیادہ ملک ہے۔ اپنی بات پر اڑ جانے کا اس کا یہ مخصوص انداز تھا۔ میں نے چچا چچی تک کو اس انداز کے سامنے بے بس دیکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے معاف نہیں کرے گی اور میری اس حرکت کا دھندورا ابھی پوری حویلی میں پھٹ دے گی۔ نفلوں سے پابند یوں میں بکڑاؤ ذہن خوف سے سچ لگیا۔ ایک لمحے کے لیے دڑے میاں کا چہرہ میری نگاہ میں گھوما اور میرے دل میں آئی کہ اپنے راز کو راز رکھنے کے لیے اس لڑکی کو قتل کر دوں مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ہاتھوں پر ابھی قتل کی گھیریں بیٹا شروع نہیں ہوئی تھیں۔ ابھی ان ہتھیاریوں پر ایک نیک ماں کے پوسے چمکتے تھے اور مجھ پر لڑکی جو زہر اکو کو لاری کی طرح میری آنکھوں کے سامنے تھی "میری محبت بھی تو تھی۔ میں اسے کیسے مار سکتا تھا۔ میں اس کے سامنے بس منگوا سکتا تھا اور اپنے گناہ کی معافی طلب کر سکتا تھا اور میں نے یہ سب کچھ کیا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی جی ہوئی قمیص کے ساتھ باہر جانے لگی اور مجھے اپنا انجام نظر آیا تو میں رو دیا لیکن وہ کسی رو بوٹ کی طرح سیدھی چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

آنکھوں سے جذبات کی پٹی بہنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ایک خوفناک چکر میں پھنس گیا ہوں۔ دڑے میاں نے معاف کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ دوسری طرف چچی سے بھی کسی خرقہ کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو ہمیں ذلیل و خوار کرنے کے لیے کسی موقع کی ناک میں رہتی تھی۔ میں نے گھر واپس پہنچ کر اپنے کزن فاروق کو اس سانحے کے بارے میں بتایا۔ وہ ہنس دیا اور بتے بتے لوت پوٹ ہو گیا "بولا "تم نے چند ہوشا جہاں۔ اس گاؤں میں وہ کر شاہ دولے کے چوپے بن گئے ہو۔ چھوٹا سا تھمارا داغ ہے اور اس سے بھی

جھوٹا دل۔ یہ لڑکیاں ایسے ہی غرے دکھایا کرتی ہیں۔ تم دیکھنا کسی کو ہنک تک نہیں پڑے گی۔ اگر پڑے گی بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ اور تم نے کیا بھی کیا ہے؟“

”لیکن وہ تو بچی تھیں قیس کے ساتھ باہر نکل گئی تھی؟“

”اے گھماکار! صرف تجھے دکھانے کے لیے باہر جاتے ہی اس نے قیس چادر سے ڈھاپ لی ہوگی۔ آج رات میں وہ قیس کہیں ٹھکانے لگ جائے گی اور پھر روزِ شریک اس کا پتا نہیں چلے گا۔“

فاہر دوق نے جو کچھ کہا تھا حقیقت اس کے برعکس نکلی۔ شام کی آذان سے پہلے پہلے ہی خبر چچا کی حویلی سے نکل کر پورے جل کوٹ میں پھیل گئی کہ وقار احمد کے بیٹے نے چچا کی بیٹی سے زیادتی کی ہے۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل چکی تھی۔ میرے ذہن میں فوری بات یہی آئی کہ جل کوٹ سے بھاگ جاؤں۔ میری ماں بیرونی دروازے کے پاس کھڑے میں بیٹھی چاولوں والا۔ گچھو دھوری تھی۔ اچھی وہ اس دانے سے بے خبر تھی لیکن کسی بھی لمحے یہ خبر اس کے کانوں تک بھی پہنچنے والی تھی۔

میں نے مکان کی عین دیوار چھلا گئی اور ایک ایسی گلی میں آگیا جو کچھ آگے جا کر کھیتوں سے جا ملتی تھی۔ نیم تاریک گلی میں دوڑتا ہوا میں چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ کچھ آوازیں آئیں اور میرے دائیں بائیں سے دوڑے میاں کے کارندے نمودار ہو گئے۔

اُن کی تعداد دس بارہ سے کم نہیں تھی۔ دو تین کے ہاتھ میں بندوقیں تھیں اور اتنے ہی لٹامیوں سے مسلح تھے۔ غالباً انہوں نے مجھے گھر کی دیوار پھلانگ دیکھ لیا تھا اور ساتھ والی گلی میں دوڑتے ہوئے میرے سر پر پہنچ گئے تھے۔ وہ دو اطراف سے نمودار ہوئے تھے۔ میرے عقب میں سیاٹ دیوار تھی اور سامنے ایک جوہر۔ شوق کی سیاہی مائل شرفی جوہر کے پانی میں منکس ہو رہی تھی۔ ایک بچہ دو بھینسوں کو دھکیل دھکیل کر جوہر سے باہر نکال رہا تھا۔ جوہر کے کنارے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر چند بلیوں بڑی متانت سے ایک ہتھار میں چلی جا رہی تھیں۔ سب کچھ ویسے ہی تھا جیسے میں روز دیکھتا تھا۔ صرف میں جانتا تھا کہ میرے سینے میں کیا پھل چکی ہوئی ہے اور میرے سر پر کیا قامت ٹوٹنے والی ہے۔ میں بھاگ کر بھٹوں کے درمیان سے گزرا۔ وہ کانیں کانیں کرتی رانیں بائیں لپکیں۔ میں نے جوہر میں چھلانگ لگائی اور اندھا وند ہاتھ پاؤں چلاتا دو سرے کنارے کی

طرف بڑھنے لگا۔ مجھے اپنے عقب میں دوڑے میاں کے کارندوں کی غلط گالیاں سنائی دیں۔ ان میں سے چند نے میرے پیچھے ہی چھلانگیں لگا دیں اور کچھ کھلاوا کاٹ کر دوسرے کنارے کی طرف بڑھے تاکہ اگر میں جوہر پار کر لوں تو مجھے روکا جاسکے۔ میرے جوہر پار کرنے کی فوج ہی نہیں آئی۔ میرے پیچھے پانی میں کودنے والوں نے جوہر کے عین وسط میں مجھے دبوچ لیا۔ یوں لگا جیسے میں ایک دم فولادی ہتھمڑوں کی زد میں آگیا ہوں۔ وہ مجھے مار رہے تھے۔ اٹھا اٹھا کر پانی میں پھینک رہے تھے اور ماں بس کی بدترین گالیاں دے رہے تھے۔ میرے منہ میں خون کا ٹھنکن ڈال دیا تھا۔ لگا۔ میری قیاس پیمانی اور غوطے کھا کھا کر دم آنکھوں میں آگیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جوہر کے کناروں پر مت سے لوگ اکٹھے ہو چکے ہیں اور میری درگت دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت ذہن کو ”تکلف“ کا اتنا احساس نہیں تھا جتنا ”بے عزتی“ کا تھا۔ یہ سوچ سوچاں روح ہو رہی تھی کہ ابھی چند لمحوں میں میری نیک نام ماں کو اور میرے پیارے باپ کو میری حالت کا پتا چلے والا ہے۔

وڑے میاں کے کارندے مجھے کھینچے ہوئے پانی سے باہر لائے اور بے دریغ پینے لگے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں احتجاج کر رہا تھا۔ اپنی صفائی پیش کر رہا تھا یا انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ میں مزاحمت کر رہا تھا اور ابھی تک اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح ان کے زرخے سے نکل کر بھاگ جاؤں۔ ایک سخت ہاتھ نے میرے سینے ہونے کر بیان کو روکا رکھا تھا۔ ایک ہاتھ کی نمائندگی ظالمانہ گرفت میرے پیچھے ہاتھوں پر تھی۔ ایک ہاتھ شلوار کے سینے میں تھا۔ یہ ہاتھ اور ایسے ہی کسی ہاتھ مجھے وڑے میاں کی حویلی کی طرف بھیج اور دھکیل رہے تھے۔ ارد گرد لوگوں کا جھوم تھا۔ کچھ ڈری ہوئی نگاہیں تھیں اور کچھ متاثر دیکھتی آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں اور نگاہوں میں ہر گزری اضافہ ہو رہا تھا۔ قیس کی فضا میں جیسے کھلی گئی تھی۔ دروازے و دروازہ کھل رہے تھے اور لوگ لپ لپ کر باہر آ رہے تھے۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا ”اشا جانا! آہو جو سب کچھ تو ان گلی کوچوں میں ہونے دیکھ رہا ہے آج تجھ پر پینے والا ہے۔ تیرے گلے میں جوتوں کے ہار ڈالے جائے والے ہیں اور تجھ پر ملامت کے ڈوگرے برسٹے والے ہیں۔ کیا تو نے بھی تصور بھی کیا تھا کہ تیرے ساتھ ایہ ہوگا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سب ایک ڈراؤنا خواب ہو اور ابھی ایک جگہ کے ساتھ تیری آنکھ کھلنے والی ہو۔“ کاش

خواب ہو کاش۔ ”میرے دل کی گمراہوں سے دعا نکلی۔ پھر میں نے خود کو وڑے میاں کی حویلی کے دروازے کے عین سامنے پایا۔ میاں ایک طرف حویلی کا اصلیل تھا اور دوسری طرف نوکوں کی گھڑیاں دور تک چلی گئی تھیں۔ سامنے ایک چوک سا تھا جس میں لوہے کا ایک طویل پائپ گڑھا ہوا تھا۔ ایک رسی کے ذریعے پائپ پر روش لائین آویزاں کی جاسکتی تھی۔ رمضان شریف کے مہینے میں سحری اور افطار کے وقت اس پائپ پر مختلف رنگوں کی لائینیں آویزاں کر کے لوگوں کی سہانی پیدا کی جاتی تھی۔ اس پائپ کے نیچے ٹین کی چھت والا ایک بوسیدہ کرا تھا۔ اس کمرے میں ایک بہت بڑا ڈھول بڑا ریتا تھا جسے فوت کما جاتا تھا۔ یہ فوت صرف خاص خاص مواقع پر بجائی جاتی تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ جل کوٹ کی یہ مشہور فوت جس کی آواز دو کوس تک جاتی ہے آج میرے لئے بجنے والی ہے۔

فوتی دیر بعد میں سے وڑے میاں کو اپنے سامنے دیکھا۔ وہ حویلی کے بجائے اس گلی سے برآمد ہوا جو ہمارے محلے میں جاتی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ اس وقت میری بچی سے مل کر آ رہا تھا۔ بچا اس وقت کمر میں نہیں تھا۔ وہ قیس سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ ہوتا تو شاید میں اپنے محبت باک انجام سے بچ جاتا۔ بچتا تو میری سختی ہی کچھ کم ہو جاتی لیکن وہ وڑے میاں سے نہیں ملا۔ وڑے میاں کی ملاقات صرف بچی سے ہوئی اور بچی میرے کيس کو جتنا ٹھنکن بنا سکتی تھی اس نے بنا دیا۔ نہ مجھے اس سے رعایت کی توقع تھی اور نہ اس نے کی۔ وڑے میاں کے اختیار میں پھانسی دینا نہیں تھا۔ وہ وہ یقیناً میرے لئے موت کا پروانہ بھی جاری کر رہی تھی۔ اس کی زبان سے میرے لئے لفظ نہیں زہر میں نیچے ہوئے تھے۔ نکلا کر تھے اور یہ پہلے وقتوں کی بات تھی۔ آج تو میں اس کی بیٹی کی قیاس پیمانی کر رہا تھا۔ آج وہ برق بن کر مجھے خاکستر بھی کر دیتی تو کم تھا۔ وڑے میاں نے خون بار نظروں سے مجھے گھورا۔ میں نے کچھ کتا چاہا لیکن خون آلود ہونٹ کپکپا کر رہ گئے نسل در نسل خون میں سرائت کرنے والا خوف ذہن کو جکڑ چکا تھا۔ میں بے گناہ ہوتے ہوئے بھی خود کو گناہ گار سمجھنے پر مجبور تھا۔ تاہم دل میں ایک آس بھی تھی۔ شاید۔ شاید وڑے میاں مجھ پر رحم کرے۔ میرے سفید پوش باپ کی کوئی نیکی کام آجائے۔ میری تھوڑی کڑا رماں کی کوئی دعا لگ جائے یا میری خاندانی شرافت کے کچھ رعایتی نبرہل جائیں لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ اپنے خاندان کی بیٹی کے خون سے ہاتھ رنجنے کے بعد چہرہ رویوں نے کسی کو معاف نہ کرنے کی قسم کھا رکھی

تھی۔ وڑے میاں کے ایک اشارے پر اس کے ڈھکوں نے مجھے اٹھا کر اوندھے منہ پختہ فرش پر پٹیاں اور تیل میں بھیکے ہوئے چری کوڑے سے بے دریغ میری کھال اوڑھ کر جانے لگی۔ یہ بڑی ظالم مار تھی۔ مجھے یاد ہے میں گلا بچا پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ بے عزتی کے احساس پر جسامتی آفت کا احساس غالب آچکا تھا۔ اس دن مجھے پتا چلا تھا کہ اچھے محلے جاندار لوگ کوڑے کھا کر وڑے میاں کے پاؤں میں کیوں لوٹنے لگتے ہیں اور کیوں رحم کی بجائے مانتے لگتے ہیں۔ میں انہیں بددل سمجھتا تھا لیکن آج پتا چلا تھا کہ وہ بددل نہیں بد نصیب تھے۔ کوڑے کی وہ مار مجھے آج تک یاد ہے اور اس مار کی چند ایک نشانی ابھی میری پیٹ پر موجود ہیں۔ اس کے بعد بھی کئی دفعہ لڑائی بھڑائی میں میرا کوڑے سے سامنا ہوا ہے لیکن جو آفت وڑے میاں کے خاندانی کوڑے میں رچی بسی تھی، کسی اور کوڑے میں نہیں پائی۔ اس بے پناہ آفت کی ایک وجہ اور بھی میری سمجھ میں آتی ہے۔ میں اس وقت ایک نوخیز لڑکا تھا۔ جلد ریشم کی طرح ملائم تھی۔ ماں باپ نے سبھی کا پیچھے کی تکلف بھی نہیں ہونے دی تھی۔ ایسے میں وڑے میاں کا کوڑا جھیلنے کے لئے قوت برداشت آتی تو کمال سے آتی۔ پھر بھی میں نے وڑے میاں کے آگے ہاتھ جوڑے نہ فریاد کی۔ بس اپنے ہی کرب کی دھندل و منہ پر رقص بکھل کر رہا۔

”بھٹاؤ اس کوڑے کے پتر کو کھوٹے پر“ وڑے میاں کی جھانک نے آواز بھیلے پیسے کی طرح میرے کانوں میں اتری۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وڑے میاں کا لازم کمر میں جن اور اس کا بیٹا اصلیل کی طرف سے ایک گدھے کو کھینچے ہوئے میری طرف لا رہے تھے۔ ٹین کی چھت تلے رکھی ہوئی فوت دھڑ دھڑ سے بجنے لگی تھی۔ قماشانی چاروں طرف سے اٹھ آ رہے تھے۔ ایک کرخت ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے میرے چہرے پر کچھ لٹنے کی کوشش کی۔ یہ کالک تھی۔ یہ کالک میرے چہرے پر نہیں محبت کے چہرے پر ملی جا رہی تھی۔ فطرت کے چہرے پر ملی جا رہی تھی۔ میں نے شدید مزاحمت کی۔ اور مجھے یاد ہے اس موقع پر میں نے وڑے میاں سے کوئی بات بھی کی تھی۔ شاید کوئی احتجاجی تھی۔ کوئی صفائی پیش کی تھی۔ کوئی دلیل پیش کی تھی۔ جو اب وڑے میاں نے بڑی فطرت سے مجھے ٹھوکر رسید کی تھی۔ اس کے گامٹے مجھے ٹھنکنے ہوئے زلت کے محبت ترین کوڑے کی طرف لے چلے تھے۔ اور اس وقت میں نے فیصلہ کر لیا

تھا کہ اس کڑے میں نہیں گروں گا۔ نہ گلے میں جوتوں کے بار پھنوں گا، نہ منہ کالا کراؤں گا اور نہ کڑے پر بنیوں گا۔ میں نے کیا کیا ہے؟ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اگر یہ سب کچھ ہوگا تو میری لاش کے ساتھ ہوگا، میرے ساتھ نہیں۔ دو قار احمد کے بیٹے کے ساتھ نہیں۔ اور پھر میں نے بھرپور مزاحمت کی تھی۔ مجھے یاد ہے میں دیوانوں کی طرح ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ دانتوں سے کاٹ رہا تھا، پھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ درجنوں ہاتھ مجھے گرفت میں لے رہے تھے اور میں ان کی گرفت سے پھسل رہا تھا۔

کسی شخص کو زندہ سی گدھے پر بٹھا کر اس کا جلوس نہیں نکالا جاسکتا، ایسے جلوس اس وقت نکلتے ہیں جب سزا دینے والا پوری طرح غالب اور سزا پانے والا پوری طرح مغلوب ہو جائے۔ جل کوٹ کے باسیوں نے پہلی مرتبہ انصوفی ہوتے دیکھی کہ دوڑے میاں کے ستاک کارندے ایک "عجم" کو "محبت" کی حوڑ سزا دینے میں ناکام رہے تاہم اس جان لیوا انگشت میں میرے جسم پر کپڑے کا ایک تار بانی نہ بچا تھا۔ میں سر تپا رہتا تھا۔ دوڑے میاں کے جھجھلائے ہوئے کارندوں نے میرے بہت جسم پر گھونٹوں کی بارش کر دی۔ پھر جب میں نیم لے بے ہوش ہو گیا تو میرے گلے میں پکڑی کا ایک پھندا ڈال کر مجھے گلی میں گھسیٹا جانے لگا۔ یہی وقت تھا جب اباجان پانے کا پینے ہوئے سوخ پر پہنچے وہ جس بیٹے کو اپنی طرح باوقار اور سر بلند دیکھنا چاہتے تھے وہ کسی جانور کی طرح گلی میں گھسیٹا جا رہا تھا اور اس کا بچا جسم غوکوں کی زد میں تھا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ مرنا جاتے تو کیا ہوتا۔

اور وہ مجھے اسی جگہ وہیں کڑے کڑے "انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھا اور تکلف سے گہرے ہو گئے لوگوں نے انہیں سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ سنبھلنے کے لیے نہیں گئے تھے۔ بے حد شدید ہارٹ انگیک ہوا تھا۔ بے چارے منٹ کے اندر اندر ان کی مدد قفس مضری سے پرواز کر گئی۔ کسی نے میرے گلے سے پکڑی نکالی، کسی نے قہقہہ پاندھا اور کسی نے سارا روئے کراٹھا۔ فوت خاموش ہو چکی تھی اور میں بیسوت کھڑا تھا۔ نہ میری آنکھ میں آنسو تھا اور نہ ہی دل میں کوئی شدید قسم کا اضطراب۔ یوں لگتا تھا کوئی معمولی واقعہ رونما ہوا ہے۔ والد صاحب فوت ہو چکے تھے مگر کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ابھی وہ زندہ ہیں۔ انہیں اسپتال لے جانا چاہیے۔ میں نے دیکھا لوگ میرے والد صاحب کی لاش چاہانی پر رکھ کر ایک طرف بھاگے جا رہے تھے پھر

ہمارے محلے کی طرف سے روٹی جیتی عورتیں برآمد ہوئیں۔ ان میں میری والدہ سب سے نمایاں تھیں۔ وہ عورت جو بلوٹ سے لے کر اب تک سات برسوں میں رہی تھی، کچھ سر اور کچھ پاؤں بھانکتی آ رہی تھی۔ کاش اس وقت زمین پھٹ جاتی یا آسمان میرے سر ٹوٹ پڑتا۔ میں نے اپنی والدہ کی دلہزدہ نظریں نہیں۔ وہ لوگوں کے ازدحام میں مجھے اور والد صاحب کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ عورتیں انہیں سنبھال رہی تھیں، مودلا سا دے رہے تھے۔ وہ صدمے سے بے ہوش ہو کر پھٹ گئی میں کرکٹس، قماشانی ایک دم ان کے گرد جمع ہو گئے جیسے وہ چھوٹے پلے والد صاحب کے گرد جمع تھے۔ میں جیسے خواب میں چلا ہوا اپنی ماں کے پاس پہنچا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں، کچھ نے کوسو رہا تھا اور دانت

مضبوطی سے ایک دوسرے رہتے ہوئے تھے۔ کانپنے ہاتھوں والی عورتیں انہیں پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھیں اور پانی ان کی ہاتھوں سے باہر چلا جا رہا تھا۔ کلائیوں میں موٹے کے گہرے ٹوٹ چکے تھے اور زور زور سے چاندی کا بندا "مرودہ" بڑا تھا۔ کسی جذباتی عورت نے میرے سر پر دو ہتھ مارا اور مجھے گونے لگی۔ "ہٹا کر مارا تو کرکوں نہ کیا پیدا ہوتے ہی۔ لغت ہے تیری زندگی پر۔ لغت ہے"۔

"لغت ہے تیری زندگی پر۔ لغت ہے"۔ یہ آواز جیسے پورے محل کوٹ میں گونج رہی تھی۔ میرے والد صاحب کی موت کی تصدیق راستے ہی میں ہو گئی۔ لوگوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اسپتال لے جا کر ان کی جیجی یا ڈکرائی جائے۔ انہیں واپس جل کوٹ لے آئے وہ سارے مناظر میری آنکھوں میں ایک دھندلے خواب کی طرح متحرک ہیں۔

ہمارے گھر کے صحن میں نیم کے پودے تھے عورتوں کا چھوٹا ایک چاہانی پر والد کا بے حس و حرکت جسم۔ ان کی چھانی سے لپٹی ہوئی میری مٹی بن۔ نوے "چھین" آدھونکا۔ بھرا والا صاب کا فٹن میں لپٹا ہوا چوہا میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ وہ سفر آخرت پر جانے کے لئے تیار تھے۔ سر کے خوبصورت بالوں میں گلاب کی پتیوں اٹکی ہوئی تھیں۔ نیکیوں ہونٹ ذرا سے دھاتے۔ وہ تیار ہوا آنکھوں نے اپنے فٹن کے دودھ دیوار پر آخری نگاہ ڈال رہے تھے۔

والد کی وفات کے بعد ایسی جان چھ روز مسلسل بے ہوش رہیں۔ ان کے ایک ہتھ سے کبھی کبھی خون رسنے لگتا تھا۔ انہیں سائبرال "مشن اسپتال" لے جایا گیا۔ معلوم ہوا کہ ان کے دماغ کی کس پٹ جگہ ہے۔ ساتویں روز وہ ہستی بھی مجھ سے جدا ہو گئی جس کے ہاتھ ہر وقت میرے لئے دعا کے

لئے اٹھے رہتے تھے اور جس کا آنچل وقت کی چلچلاتی دھوپ میں میرے سر کا سایہ تھا۔ میری ماں سرگئی میں اور شتاس اس دنیا میں تھا وہ گئے۔ چینی کا سورج سوا نیزے پر اٹھا اور ہمارے کوئل جسموں کو بھلسانے لگا۔ ہم چند روز قہیے کے امام صاحب کے گھر میں رہے پھر چھاپٹیں اپنے گھر لے گیا۔ معلوم نہیں ایسا لوگوں کے فطرت کی وجہ سے ہوا، ضمیر کی ملامت کے سبب یا پھر بچ بچ وقتی طور پر چچا کے دل میں رحم پیدا ہو گیا تھا۔ شیتا کو تو گھر میں رکھا گیا تاہم مجھے فارم پر بھیج دیا گیا۔ یہ فٹن فارم تھا اور یہاں بچانے بنیئیں وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں فارم پر ہی سوتا، وہیں کھانا کھاتا اور میری کتابیں بھی وہیں تھیں۔ وہ میری زندگی کے بہت کچھ شہ و روز تھے۔ بپ کی مہمان صورت، ماں کی نرم گود اور صحن میں نیم کی ٹھنڈی چھاؤں ہر گھڑی یاد آتی تھی۔ میں پھوں کتابوں پر سر جھکا کر دو آ رہتا۔ کوئی آواز نہ تو بدک اٹھتا۔ کوشش ہوتی کہ آنا سامنا نہ ہو۔ سامنا ہو جاتا تو آنکھیں پڑنے لگتے۔ یوں لگتا میں ابھی تک چوراہے کے بیچ ٹنگا ہوا ہوں اور پورا قصبہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

ایک دو ماہ تو خیریت سے گزرے پھر چچا نے فارم پر مجھ سے ہلکا چھکا کام لیتا شروع کر دیا۔ "جھانی" آج باغیچے میں کوڑی کر دیتا۔ آج بھینسوں کے لئے چار بانڈا دیتا۔ آج ملاب کی باڑھ ٹھیک کر دیتا۔ "پوٹھالی" سے میرا دل تو پیلے ہی اچاٹ ہو چکا تھا اب میں نے کتابیں بند کر کے ایک طرف رکھ دیں۔ مجموعی طور پر چچا کا سلوک مجھ سے زیادہ برا نہیں تھا۔ مجھے کھانا وقت پر مل جاتا تھا۔ کپڑے گھر سے دھل کر آتے تھے۔ کام بھی زیادہ نہیں کرنا پڑا تھا۔ ہاں قہیے میں جانے پر پابندی تھی۔ جیسے جیسے کوئی جھوٹ کا مرض ہے اور میں قرنطینہ میں رکھا گیا ہوں۔

شیتا کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی رہتی تھیں۔ چار پانچ مہینے میں وہ صرف تین بار مجھ سے مل سکی۔ میری بارشیں نے اسے دیکھا تو وہ بڑی مرضانی ہوئی تھی۔ اس کا لباس بھی میلا چھپا تھا۔ اس روز پہلی بار میرے سینے میں شیتا کے لئے ایک طرح کی محبت جاگی تھی۔ میرا دل چاہا کہ اس گڑبادیسی بن کو اس طرح آغوش میں چھپاؤں کہ وہ دنیا کی ہر بلا سے محفوظ ہو جائے۔ میں ہی اس کی ماں بن جاؤں "اس کا بپا بن جاؤں" اس کا آشیانہ بن جاؤں اور وہ ہر شے بن جاؤں جو اس سے جھین لگتی ہے۔ اس روز میرے مہوہ تن میں زندہ رہنے کی آگ پیدا ہوئی تھی۔ میں اپنی مٹی بن کے لئے زندہ رہتا چاہتا تھا۔ یہ زندہ رہنے کی یہ خواہش اس وقت عروج پر پہنچ

گئی تھی جب مجھے ایک دیرینہ دوست کی زبانی پتا چلا تھا کہ چچا کے گھر میں میری بہن سے اچھا سلوک نہیں ہو رہا۔ چچی اس سے نوکریوں کی طرح کام لیتی ہے اور چچا کی غیر موجودگی میں مارنے سے بھی نہیں بچتی۔ میری بہن پانچ ساڑھے پانچ برس کی نازک لڑکی تھی۔ یہ عمر تئیس کے پیچھے بھاگنے کی تھی۔ یہ باپ کے سینے پر پھیل کر سونے کا زمانہ تھا۔ اور وہ وقت کی چچی میں بچی جاری تھی۔ اس کا کیا تصور تھا سوائے اس کے کہ وہ میری بہن تھی اور میرا تصور کیا تھا سوائے اس کے کہ میں نے محبت کی تھی اور اس محبت سے ہارا ہوا ایک کنور لکھ مجھے چچا زاد کے قریب لے گیا تھا۔

وہ ساڈن کی ایک خوبصورت شام تھی۔ بادل برس برس برس کر اچھی نکلتا تھا۔ دور مشقی افق پر قوس قزح چمک رہی تھی۔ ایسی ہی گھمری گھمری سانی شاموں میں اباجان بہن اپنی انگلی سے لگا کر کھینچنے لگتے تھے۔ آسمان اس وقت کتنا وسیع اور خوبصورت ہو جاتا تھا۔ لگتا تھا توڑ کی روشنائی سے فضا میں کوہ قاف کی کمانیاں نکلی ہوئی ہیں۔ اس روز اپنی گم شدہ خست دیکھنے کے لئے میرا دل بے قرار ہو گیا تھا۔ میں اپنا گھر دیکھنا چاہتا تھا اور میرے قہیے میں داخلے پر چچی کی طرف سے پابندی تھی۔ میں بہت دیر سوچتا رہا اور پھر "جوتی" کے اونچے کھیتوں میں چلا قہیے کی طرف بڑھنے لگا۔ قہیے کے دامن میں ایک تھے "ٹپلا" تھا۔ میں اس پر چڑھ گیا۔ مجھے گھر کی محبت اور صحن میں خاموش کھڑی نیم نظر آنے لگی۔ میں اپنی نگاہوں سے نیم کے چیلے پتوں کو چومنے لگا۔ مجھے لگا جیسے میرے ساتھ وہ بھی دو رہے ہیں۔ میں نے تصور کی نگاہوں

علیہم الحق حقہ کے دونوں

پر باتما ببول

۱۵%

۱۵%

علی مہل پہلی کھنڈر عزیز ناریٹ اردو بازار لاہور

سے دیکھا۔ اس نیم تلے ایک ویران صحرا ہے جس میں خشک چٹے کھمبے ہیں اور دیواروں پر دیرانی پر پھیلے سورہی خالی کمروں کا سطر آکھوں کے سامنے آیا اور کانوں میں وہ ملم گیت گیت گونجنے لگا جس میں زندگی کے میلوں اور زندگی کی یوقانی کا ذکر تھا۔ درختوں میں چنک گیا۔ میری نگاہ چند بچوں پر پڑی۔ وہ آبادی اور کھیتوں کے سطر پر ایک گلی میں کھیل رہے تھے۔ مجھے لگا ان میں شفتا بھی ہے۔ میں اسے دیکھنے کے لئے بے قرار ہوا تھا۔ مٹی تو یہ چٹاکی حکم عدولی لیکن میں اس حکم عدولی سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔ میں کھیتوں کے اندر ہی اندر چلا گلی تک پہنچ گیا۔ وہ شفتا ہی تھی۔ اس کے بال گرد میں اُٹے ہوئے تھے۔ چہرے پر میل پھیل اور بال پر مٹی کی چھاپ تھی۔ چلی نظر میں وہ مجھ سے بچا ہی ہی نہیں گئی۔ "شفتا" میں نے اسے آواز دی۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے اپنیت کے ساتھ ساتھ اجنبیت بھی تھی جیسے وہ کسی دورا ہے پر کھڑی ہو۔ میں نے لپک کر اسے اپنی ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ کس کسسا کر رہ گئی۔ میں نے دیکھا اس کی نازک ہتھیلی پر جلنے کا داغ تھا۔ زخم پر نیل دا لگی ہوئی تھی اور کھڑے کے نیچے سے سرخ گوشت نظر آ رہا تھا۔

"کیا ہوا شفتا؟ کیسے جل گیا؟" میں نے تڑپ کر پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔ عجیب سی سی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ وہ جو ہر وقت چلتی تھی اب باتیں کرنا بھی بھول گئی تھی۔ ایک لڑکی نے کہا "یہ شرارتیں کرتی تھی۔ اس کی چاہنی نے اسے گرم چٹا لگایا ہے۔" میں سر ہار کر گیا۔

"کیا شرارت کی تھی تم نے شفتا؟ کیا کیا تھا۔ بتا دیکھا کیا تھا؟"

وہ خاموش رہی اور اپنے فزاک کا کوا موڑتی رہی۔ اس کی مٹھی کی گول مٹلی ناک پر بیسنے کی چمک تھی۔ وہ کرب ناک انداز میں شراباری تھی۔ میرا فکرم وہ نقشہ کھینچنے سے قاصر ہے جو اس وقت میں نے اپنی معصوم بہن کے چہرے پر دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو اُٹے آئے "کیا شرارت کی تھی تم نے؟" میں نے اسے دونوں شانوں سے جھنجھوڑ کر بلند آواز پوچھا۔

ایک لڑکا بولا "اس نے شرارت نہیں کی تھی چوری کی تھی۔ دودھ پر سے ملائی اتار کر کھائی تھی۔ اس کی چاہنی نے پکڑ لیا اور جس ہاتھ پر ملائی لگی ہوئی تھی اس پر گرم چٹا لگاوا۔"

میں نے بے اختیار اپنے ہونٹ شفتا کی زخمی ہتھیلی پر رکھ دیے اور اسے ہاتھوں میں سمجھ لیا۔ "میری بہن۔ میں تھک رہا ہوں۔ تجھے لیے میں اپنی زندگی لٹا دوں گا۔" میں نے اسی جگہ بیٹھے بیٹھے میں نے تیرہ کر لیا کہ اب اپنی بہن کو یہاں رہنے دوں گا نہ خود رہوں گا۔ دور۔ کیسے بہت دور نکل جاؤں گا۔ بھی واپس نہ آنے کے لئے۔

بعض فیصلے ایسے ہی طوفانی ہوتے ہیں۔ لمحوں کی جنبش سے زندگیوں کا رخ بدلتا ہے۔ میں نے اپنے میں اٹھنے والی ایک ہی بلند دیوار لہر سینوں کو منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ میں نے بغیر کچھ سوچے کچھ شفتا کو بازوؤں میں اٹھایا اور لیے لیے ڈگ بھرتا ہوا کھیتوں میں اُٹھا۔ اس وقت قوس قزح میرے سامنے تھی۔ اور در افق کے اس پار کہیں کوئی مہراں نہیں مجھے پکار رہی تھی۔

میں نے کئی میل پیدل سفر کیا۔ پھر ایک تانگے میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ وہاں سے بغیر ٹکٹ گاڑی میں سوار ہوا اور بمادیو کے نزدیک ایک ویران اسٹیشن پر اتر گیا۔ یہاں ٹکٹ چیکر کے ہاتھوں پکڑا گیا جیسا کہ بعد میں بتا چلا کہ یہ کمزور کا تھا۔ میرے پاس ادا کرنے کو ایک پھولی کوڑی نہیں تھی۔ ٹکٹ چیکر عبد اللہ شاہ ایک مہراں شخص ثابت ہوا نہ صرف یہ کہ ہمیں اپنے گھر لے گیا بلکہ چند روز بعد اس نے ریلوے اسٹیشن پر ہی ایک چھوٹا سا خانچہ بھی گوارا دیا۔ عبد اللہ ایک دھمکی باب تھا۔ بیٹے لڑکھو کر اس سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ سب سے چھوٹا بیٹا کھو گیا۔ داخل سے دل برداشتہ ہو کر نجانے کدھر کا رخ کر گیا تھا۔ عبد اللہ چھوٹے سے سرکاری کوارٹر میں اپنی پیاروی کے ساتھ تھا رہتا تھا۔ چند ہی روز میں ہم وہاں ایک گھر کے افراد کی طرح مل جل کر رہنے لگے۔ عبد اللہ کی بیوی ایک خاموش طبع سیدی سادی عورت تھی۔ اولاد کے دکھ نے اسے تپ دق کا مریض بنا دیا تھا۔ کوارٹر کے ایک علیحدہ کمرے میں وہ سارا دن لیٹی کھاتی رہتی۔ ہم دونوں میں سے کوئی اس کی کوغری میں گھسنے لگتا تو وہ زور زور سے نفی میں سر ہلاتی لگتی اور ہاتھ کے اشارے سے منع کرتی کہ ہم اندر نہ آئیں۔ مجھے اس قریب المرگ عورت میں اپنی چھڑی ہوئی ماں کی جھلک نظر آتی تھی۔ میں اسے "ماں جی" کہنے لگا۔ ان دونوں میں جو کما آقا تھا اس جی کے دوا دار پر خرچ کر دیتا۔ ان کے منع کرنے کے باوجود ان کے کمرے میں چلا جاتا۔ ان کے پاؤں دبا تا اور پکھا جھلتا رہتا۔ کوئی تین ماہ بعد ماں جی اللہ کو ہادی ہو گئیں۔ اس چار دیواری میں چلا عبد اللہ بکسر تھا رہ گیا۔ وہ ہم بہن بہن بھائی سے بہت مانوس ہو گیا

تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ہم اس کے ساتھ ہی رہیں۔ میرے لئے وہ فیصلہ کا دور تھا۔ میرے سینے میں ہمدردی انتقام کی آگ بھڑکی رہتی تھی۔ یہ آگ بچا جلیں اور بچی ناخن کے لئے تھی اور ان سفاک چوہہ دیوں کے لئے تھی جو دے میان چھوٹے میاں، ننگے میاں اور پتا نہیں کیا کیا کھاتے تھے۔ اپنے والدین کے مڑھ چہ میری نگاہوں میں گھومتے تھے تو دل چاہتا تھا پورے جل کوٹ کو جلا کر رکھ کر دوں۔ اور پھر خود بھی آگ اڑھ کر ابدی نیند سو جاؤں۔ کبھی کبھی یہ احساس آتھیں نیند کی طرح میرے دماغ میں ٹھس جاتا کہ اپنے والدین کو قتل کرنے والا میں خود ہوں۔ میں نے کیوں ایسا کام کیا جس کا نتیجہ میرے پیادوں کی ابدی مددائی کی صورت میں نکلا۔ کیوں میری ہتھیلی پر پتھر کے گئے تھے کیا میں جانتا نہیں تھا کہ بچی کا دل ہمارے گھرانے کے خلاف نفرت اور کدورت سے بھرا ہوا ہے اور غزالہ اسی بچی کی بیٹی ہے۔ کیوں میں نے اسے اپنے خیالوں کا محور بنایا اور اس سے آرزوئیں وابستہ کیں۔ کبھی یوں ہوتا کہ فکروں میں دیکھتے ہوئے اور کائناتوں میں بڑھے ہوئے ماسٹر میری آنکھوں میں گھومتے لگتے اور میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ سوچتا کہ میں ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو کر اپنے دشمنوں کے لئے موت کا یا مہربانی جاؤں لیکن ایسے لمحوں میں شفتا کی سن موہنی صورت آنکھوں کے سامنے آتی اور میرے جسم اور ذہن کے تنے ہوئے تار ڈھیلے پڑنے لگتے۔ میں سارے طوقانی خیالات ذہن سے جھٹک کر صرف اور صرف شفتا کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگتا۔

پہلے رنگ کے کوارٹروں کی طویل قطاریں ہمارا کوارٹر آخری تھا۔ دو کمرے، ایک کوغری، ایک رسولی اور ایک چھوٹا سا صحن۔ چار دیواری سے باہر ہر طرف رست کی مٹی تھی اور صحرائی بھانڈیاں۔ ہم نے اپنے آگن میں پھولدار پورے لگائے، دیواروں پر پتیلیں چڑھائیں اور منڈیروں پر پرندوں کے لئے پانی اور دانے کے کپالے رکھ چاہا۔ عبد اللہ کی ڈیوٹی اکثر رات کی ہوتی تھی، صبح دودھ واپس آ جاتا اور میری خانچہ لگانے کے لئے اسٹیشن چلا جاتا۔ اگر کبھی اس کی ڈیوٹی دن کی ہوتی تو میں رات کو خانچہ لگاتا۔ اسٹیشن کے رات دن تو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ میرا خانچہ بڑھتے بڑھتے اب ایک چھوٹی سی دکان کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ چائے، بکٹ، پسنی مٹائی کباب مسکرت کولڈ ڈرینک بھی کچھ دہل رہا تھا۔ معمولی کوشش سے متعلق آمدنی ہو جاتی تھی۔ میں نے شفتا کو ایک مقامی اسکول میں داخل کرادیا اور

خود بھی دوبارہ کتابوں سے ناواقف ہوا۔ اسٹیشن سے قاصر ہونے ہی میں یوں گھر کو لپکتا جیسے لپکتا طیس کی طرف کھینچا ہے۔ شفتا میرے لئے مٹا نہیں ہی تو تھی۔ وہ میری زندگی کا محور تھی اور میرے زندہ رہنے کا جواز بھی۔ اس کے لئے بھی میں سب کچھ تھا۔ وہ سات سال کی ہو چکی تھی لیکن مجھ سے لٹ کر سوتی تھی۔ میرے ہاتھ سے کھانا کھاتی تھی اور میری گود میں بیٹھ کر کائناتیں سنتی تھی۔ میں ایک ماں کی طرح اسے سلاتا، کپڑے پہنا تا اور اس کے بالوں میں کھنکھن کرنا تھا۔ ایک باپ کی طرح اس کی انگلی پکڑ کر اسے اسکول چھوڑنے جاتا تھا۔ اس کی ہر فرمائش پوری کرتا تھا۔ اپنے سینے کو اس کے لئے چھوٹا بناتا تھا اور پھر ایک بھائی کی طرح اس سے کھلتا تھا۔ اس سے روکتا اور اسے مٹاتا تھا۔

اسی طرح آٹھ برس گزر گئے۔ میں نے اہل اہل یں کر لیا اور نوکری کی تلاش میں بھٹ گیا۔ شفتا مٹی کی پکلی سے ایک توخیر پودا بن گئی۔ سندھ آب و ہوا میں جماعت میں مٹی اور جب سفید پیغام اور سفید دھونے میں اسکول جانے کے لئے گھر سے نکلتی تو یوں لگتا جیسے کوئی خوبصورت فرشتہ رات بھر خیمہ میں نما کر اور سپید و سحر سے سنور کر زمین پر اتر آیا ہو۔ دیکھنے والی نگاہ اس پر پڑتی تھی تو جگر کر رہ جاتی تھی۔ نوکری کی تلاش میں مجھے آٹے دن بمادیو جاننا پڑا تھا لیکن میری کوشش رہتی تھی کہ شفتا کو خود اسکول چھوڑ کر آؤں اور وہاں سے لادوں۔ میں جب تک اس سے دور رہتا ایک عجیب بے گلی دل کو گھیرے رہتی۔ شاید یہ بے گلی اس دود پر آشوب کا پیش خیمہ تھی جو مجھ پر اور شفتا پر آنے والا تھا۔

اور پھر ایک روز وہ واقعہ رونما ہو گیا تھا۔ ایک معصوف وکیل صاحب کو اپنے مشاورتی ادارے کے لئے اسٹینٹ کی ضرورت تھی۔ یہ اسالی میری ضرورت کے عین مطابق تھی اور مجھے بچھڑے فیصد امید تھی کہ میں یہ ملازمت حاصل کر لوں گا۔ رات بمادیو میں مزارا کر میں اگلے روز دوسرے کے وقت گھر واپس پہنچا۔ میری فیر موجودگی میں شفتا کو اسکول سے لانے اور لے جانے کا کام اکثر چاہا چھوڑا کرتے تھے اتفاقاً ایک دو روز سے وہ بھی بتا رہے تھے۔ دوسرا ایک بچے کے قریب شفتا اسکول سے واپس آتی تو اس کا چہرہ کھ کر میں دہل گیا۔ شفتا کے رخساروں پر سرخی اور زردی کی آمیزش ہوئی عجیب لگ رہی تھی۔ وہ ہاتھیں ہوئی اور سینے میں نہالی ہوئی تھی۔ اندر گھسنے ہی اس نے دروازے کو گونڈی لگائی مٹا میں چار دیواری پر بیٹھیں اور بھاگ کر میری گود میں گر گئی۔ وہ بچپن سے صوبی تھی۔ ایک پل میں مجھے لگا پوری کائنات سک اٹھی ہے۔ وہ

میری کائنات ہی تو تھی۔ کیا ہوا شتا؟ میں نے کانپتے ہاتھوں میں اس کا گلابی چرویا اور لرزان لبے میں اس سے روٹنے کو بچ پڑی۔
 ”وہ میرا چچا کر رہے تھے“
 ”کیوں؟“

”وہ چیموں والے شکاری۔ ان کے ساتھ ہر متحال شاہ کا بیٹا بھی تھا“

میرے سینے میں آتش فشاں پھٹا اور رگوں میں آتشیں لادابہ نکلا ”کیوں چچا کر رہے تھے تمہارا؟“

”مجھے کچھ معلوم نہیں۔ بیٹا۔ میں قاتل کے ساتھ کمری طرف آ رہی تھی۔ باہو کی باغیچی کے پاس ان کی چیمیں ہمارے پاس ٹرک کھینچیں۔“

اس سے پہلے کہ شتا کچھ اور کہتی، کچھ قاتل پر ایک جیب کا شور مٹا دیا۔ میں لپک کر کمرے میں گیا۔ دیوار سے لٹکے ہوئے لوہرے لائنس یافتہ روبرو اور نکال کر بیٹھنے میں اڑسا اور ہانکا ہوا دوازے پر پہنچ گیا۔ دواخانہ کھل کر دیکھا۔ ایک جیب ہمارے گھر کے مین سامنے سے گزر کر ساتھ والی گلی میں مڑی۔

اسی شب مجھے متحال شاہ کی حویلی میں حاضر ہونے کا حکم ملا تھا۔ ہر متحال شاہ ملائے کا سب سے معتبر شخص تھا۔ شکار کی غرض سے آنے والے عرب امیر زادے اور شیخ اکثر متحال شاہ کی رہائش گاہ کو رست ہاؤس کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس ”رست ہاؤس“ کے حوالے سے بہت سی گفتگوں و گفتگوئی کمانیاں مشہور تھیں۔ متحال شاہ کا پیغام ملنے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ پولستان کے اس دور افتادہ مقام پر ایک سرخ جھنڈ پتلے والا ہے۔ یہ جھنڈ جہاں کئی لوگوں کی جان لے گا وہاں بہت سی چیزوں کو بھی ہالٹ کر رکھ دے گا۔

متحال شاہ کی حویلی میں مجھ پر وہی بجلی گری تھی جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ امارات سے آئے ہوئے ایک فنزادے راشد بن راشد نے مجھے شرف ملاقات بخشا ہے اور وہ ایک نئی محالے میں مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ملنے سے صاف انکار کر دیا اور پیش میں اہلنا ہوا اپنے گھر واپس آ گیا۔

”دو روز بعد پولیس انسپکٹر عالم کھوڑو اور متحال شاہ خود میرے گھر پہنچ گئے۔ وہ بڑے اہل سیٹ طریقے سے مجھے اپنے ساتھ حویلی لے گئے۔ بڑے پار و بہت سے انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں ایک بہت خوش قسمت شخص واقع ہوا ہوں۔ میری بہن پر ایک ایسے شخص کی نگاہ انتخاب

پڑی ہے جو اپنے مال و دولت اور رُتبے کے اعتبار سے بادشاہ سے کم نہیں۔ وہ میری بہن کو عقد میں لیتا چاہتا ہے۔ میری بہن شزاری کھلائی۔ کہ کوڑوں میں کھیلے گی اور اپنا مرتبہ بھی ایک دم زمین سے آسمان پر پہنچ جائے گا۔ نے ہنکار کر متحال شاہ سے کہا تھا ”سائیں! تیری دو بیٹیاں بھی تو جہاں ہیں۔ وہ کچھ کم خوبصورت نہیں۔ انہیں امیر زادے کے حرم میں داخل کیوں نہیں کر دیتا؟“ میرے جواب پر متحال شاہ کا پاراساتویں آسمان کو کیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ مجھ پر بموں کے کچے چھوڑ دیتا۔ لیکن اس وقت اسے حکمت سے کام لینا تھا۔ اس کا سیاہ چہرہ بڑی طرح تنہا لیکن پھر اپنی اصل حالت میں آ کچھ بھی کیفیت انسپکٹر عالم کھوڑو کی تھی۔ انہوں نے مجھے ڈھکے چھپے لفظوں میں سمجھایا کہ میری شاد رگہ حیات کے قدموں تلے ہے۔ وہ ذرا سادہ ڈھانسیں گے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ چاہے عبداللہ کی نوکری ”میری دکان“ گھر سے رشتے نہ بنے کچھ باقی نہیں رہے گا۔

میں نے سینہ تان کر کہا ”کچھ باقی نہ رہے۔ میری فخر تو باقی رہے گی۔ میری معصوم بہن تو ہوس کی سولی پر پڑے گی“

ہر متحال شاہ نے مصنوعی افسردگی سے کہا تھا ”وہ نہ ہو سکے جو تم چاہ رہے ہو۔ بڑے لوگوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہوتے ہیں۔ وہاں تک پہنچ جاتے ہیں جہاں تبسور بھی نہیں پہنچ سکتا“

میں نے کہا تھا ”سائیں! مجھے سمجھانے کی کوشش کرو۔ تمہارے منہ میں ایک ہوس پرست کی زبان بول رہی ہے۔ جاو جا کر اپنے منہ کو تپاؤ۔ یہاں ہر جاندار نہیں ہے جسے اس کا عقاب نہ پہنچ ڈالے گا۔ یہاں ظالموں جزا جرنے والے سر بھرے لوگ بھی ملتے ہیں اور ایسا ایک سر بھرادہ ہے جس کی بہن پر اس نے اپنی ناپاک نظر ہے“

میں غصے سے کانپ رہا تھا۔ کچھ بھی کیفیت حوالہ کی تھی۔ اپنے آقا کے ولی نعمت کی طرف سے اسے یقیناً عمل بددلی کی ہدایات ملی ہوئی تھیں اور وہ اب تک ان ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم میرے چٹائی لیے اس کی منافقت کا خغل چکنا چور کر دیا۔ سانپ اپنی اصل میں آکر بھڑا اٹھا۔ میرا مزاج ”تو اپنی اوقات سے آگے نہ بڑھے گا۔ تو بہن بھی عیا ہے گا اور ذلت کا بار بھی میں پہنے گا“

میں ایک جھگڑے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ”سائیں! مجھے کالی ریس بہت بچتا ہے گا اگر اب گالی دے گا تو“

قرب تھا کہ میں اور متحال شاہ دست و گریباں ہو جائے۔ انسپکٹر عالم کھوڑو چھ میں آیا۔ اس نے مجھے بڑی سردی سے گھورا اور بولا ”کیک ہے تم جاؤ۔ اب تم سے زمین ملاقات ہوگی۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر تم وہاں بھی مل کر ایسی ہی آکڑوں دیکھا سکو“

میں کوئی اُن بڑھ و صفا نہیں تھا۔ بی اے، ایل ایل بی، تھانہ، پکری میرے لئے جانی پہچانی جہیں تھیں۔ میں تھا انسپکٹر عالم مجھ پر بڑی ہوشی تھا نہیں ڈالے گا۔ وہ مجھے نے کے لئے کوئی جھوٹا کیس تیار کرے گا۔ اپنے ایک اور ماہر قانون دان ایڈووکیٹ ظفر احسن صاحب کی مدد میں نے اپنی ضمانت عمل از گرفتاری کرائی اور دیگر قانونی بنویاں بھی کر لیں۔ میری تیاریاں دیکھ کر انسپکٹر عالم شاہ اور ان کے آقا کے ولی نعمت شیخ راشد بن راشد ایک دم چپ سا رہ گئے۔ چند ہفتوں کے لئے معاملہ بالکل اڑ گیا بلکہ میں نے یہ بھی سنا کہ شیخ راشد سیر و سیاحت قاتل ہو کر واپس چلا گیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ ن سے پہلے کی خاموشی تھی۔ شیخ راشد شکاری باز کے بہت اور بلندی پر تھا اور پر سمیٹ کر بہت رفتاری سے شکار پر گرنے والا تھا۔

دوسری طرف میں بھی قاتل نہیں تھا۔ اپنی شتائی لٹ کرتے ہوئے جان دے دیا میرے لئے اتنی سیل تھا آٹھیس کھل کر بند کر لیا۔ آٹھ برس پہلے میں نے اپنے جس جھگڑے کو بیدار ہونے سے روک لیا تھا وہ اب پوری طرح بیدار تھا۔ یہ میں ہی تو تھی جس کی خاطر میں ساری ذہنیں بننے سے لگا کر زندگی کا زہریلا تھا ”اب ملے اس بہن کو نشانے پر رکھ لیا تھا“ میں اپنے حواس کھوٹا تو اور کیا ہوتا۔ نئے زخموں کے ساتھ ساتھ پرانے بھی ہرے ہو گئے تھے۔ پوری دنیا کے لئے میرے دل میں ت کا ایک طوفان اٹھ آیا تھا۔ مجھے اپنے اندر موجود ہر ن کے کندھوں پر چٹا ٹیکس یاد ہے مایاں کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔ قرب و جوار کی ہر آواز پر متحال شاہ اور انسپکٹر عالم کھوڑو آواز کا لگان ہوتا تھا۔ یہ دنیا ظالموں اور جاہلوں سے بھر گئی اور میرا دل ان کے خلاف غرت سے لبریز ہو گیا تھا۔ باغی اٹھ حالات کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ میرے اس میں ہر وقت روبرو رہتا تھا اور پھنسی سے بھر پور تھا ہوا

طاہر جاوید نعل کے دل گداز
 قلم سے ایک خوبصورت ناول

سٹیشن
 پکڑ س

قیمت: ۱۵۰ روپے
 محبت کے موضوع پر لکھی جانے
 والی ایک پُر اثر کہانی
 بہترین گرو و پیش اور
 عمدہ طباعت کے ساتھ
 براہ راست
 منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
 ۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
 فون: ۲۲۳۸۵۳

اسٹاکٹ: علی بک سٹال
 نسبت روڈ چوک میوہسپتال لاہور
 فون: ۲۲۳۸۵۳

پتہ: علی بک سٹال، طلحہ خانیہ

ی میں سے اپنی بہن کو محفوظ ہاتھوں میں پھنچا۔ پکوال کے قریب رکھ کر پوری ٹھہری جس میں پھول شریف سے ہمارے گھرانے کے تعلقات بڑے پرانے تھے والد صاحب کی طرح پھول شریف بھی عہدہ انار میں تھا۔ والد صاحب کو بچے بیٹوں کی طرح چاہتا تھا۔ اس نے شتا کو اپنے پاس رکھنے اور اس کی نگہداشت کرنے کی پوری ذمہ داری اٹھائی۔

کھوڑکا سے میرے اور شتا کے فرار کے بعد جس بہن پر سب سے زیادہ ستم ڈاؤں چاچا عبداللہ تھا۔ شتا شاہ کے اہلکار پولیس والے اسے کوارٹر سے پکڑ کر لے گئے اور سات روزہ رہائش کے دوران اسے سخت تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس کی جسمانی حالت اور عمر کے پیش نظر عدالت نے اس کا مزید رہائش نہیں دیا اور وہ جوڈیشل رہائش پر جیل بھیج دیا گیا لیکن شتا شاہ اسے اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اپنے کارندوں کے قتل کے لیے اسے دیوانہ کر دیا تھا اور وہ حساب بے باقی کرنے کے لیے جلد از جلد مجھ تک اور شتا تک پہنچنا چاہتا تھا۔ جو واحد ”کلید“ اس کے ہاتھ میں تھا وہ چاچا عبداللہ تھا۔ انسپکٹر عالم کھوڑو نے بھاگ دوڑ کر کے ایک بار پھر چاچا عبداللہ کا رہائش لے لیا اور اس حریفہ تھانے میں اس پر اپنا تشدد کیا گیا کہ بعد ازاں اسپتال میں چل بسا۔ سوکاری کاغذوں میں اس کی موت کی وجہ ہارٹ اینک تھی مگر سب جانتے تھے کہ وہ کیسے مرا ہے اور یہ فرض حال اس پر ہارٹ اینک ہی ہوا ہے تو یوں ہوا ہے۔

کھوڑکا میں ہی ایک نوجوان وکیل اسمد غوری نامی بھی رہتا تھا۔ میرا اور اس کا صرف اتنا تعلق تھا کہ کبھی راہ چلتے ہوئے ملے ہو جاتی تھی۔ ممکن ہے وہ میرے پورے نام سے بھی واقف نہ ہو۔ چاچے عبداللہ سے بھی اس کا تعلق صرف محلے داری کا تھا۔ غوری نے اس واقعے کا بے حد اثر لیا۔ اس نے اپنے طور پر انسپکٹر عالم اور شتا شاہ وغیرہ پر کیس کر دیا۔ اس نے مؤقف اختیار کیا کہ انسپکٹر عالم نے ذاتی دشمنی چکانے کی خاطر سپاہانہ تشدد کے ذریعے حوالہ کی موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ انسانی اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے اس نوجوان وکیل نے شتا شاہ اور انسپکٹر عالم کے خلاف جو آواز اٹھائی اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلا۔ آٹھ دس روز بعد ہی اسمد غوری کی نو بیاتیا پوری عتاب ہو گئی۔ وہ اپنے چودہ سالہ دیور کے ساتھ یکے سے سسرال آ رہی تھی کہ دونوں کہیں راستے ہی میں رہ گئے۔

اس واقعے کے ایک ہفتے بعد اسمد غوری نے اپنا کیس واپس لے لیا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ اس کی بیوی واپس

جاتی تھی اور میں اس متاعِ بازوؤں میں سینے اندر صادقانہ بھاگ رہا تھا۔ وہ طوفانی رات زندگی بھر کے لیے میرے حافظے پر نقش ہو چکی ہے۔ بجلی کے کندے ”بادلوں کی گرج“ اٹھا اٹھا کر بجتی ہوئی ہوا اور وہ بے سست ستر۔ شتا شاہ کے کارندے شکاری کتوں کی طرح میرے تعاقب میں تھے اور میری نگاہیں کتوں کی پناہ گاہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ آخر کار یہ پناہ گاہ مجھے میسر آئی۔ قہقہے سے قریب پانچ میل آگے سرکاری رکھ کے قریب یہ ایک ویران اور بے چراغ کھنڈ تھی۔ طوفان نے اسے منہدم کر دیا تھا لیکن لمبا اس طور گرا تھا کہ جمونڈی کی صورت برقرار رہی تھی اور اس کے اندر پناہ لی جا سکتی تھی۔ درختوں میں گھری ہوئی اس جاہ حال جمونڈی کے اندر میں نے مسلسل دو راتیں گزاریں۔ تیسری رات جمونڈی کے کھنڈ وہاں پہنچ گئے۔ ایک عمر رسیدہ جوڑا تھا۔ کوئی انہیں دیکھتا تو بھکاری سمجھتا لیکن بظاہر بھکاری نظر آنے والے ان میاں بیوی نے ہمارے ساتھ جو تعاون کیا وہ شاید کوئی شہنشاہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہمیں شتا شاہ کی زد سے نکلنے کے لیے ان دونوں نے نہ صرف اپنی جان خطرے میں ڈالی بلکہ ہمارے لیے لباس سواری اور رقم کا انتظام بھی کیا۔ زندگی میں بڑی موٹی موٹی رقمیں دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا ہے لیکن ایک لڑکا ہاتھوں والے بوڑھے نے زور و راہ کے طور پر چند بوسیدہ نوٹ مجھے تھمائے تھے وہ آج تک میرے محافظ میں ایک خزانے کی طرح محفوظ ہیں اور دمک رہے ہیں۔

میں اپنی بہن کو لے کر پہلے لاہور اور پھر پکوال آیا۔ پولیس ہر جگہ میرے پیچھے تھی اور شتا شاہ کے کارندے بھی ہاتھوں کی طرح مجھے ڈھونڈتے پھرتے تھے میں جان چکا تھا کہ حالات کی بے رحم کھوت نے مجھے ایک ایسے راستے پر لے دیا ہے جس پر مجھے مسلسل بھاگنا ہوگا۔ جہاں بھی رکوں گا میں مارا جاؤں گا۔ دوسرے نظروں میں شاہ جہاں بی اسے لے لیا لیکن اب ایک سرٹ بھاگتے ہوئے شخص کا نام تھا۔ اس نے سوچا ”شاہ جہاں جب بھاگتا ہی مقدر ہے تو پھر میں کو کو موت تمہارے پیچھے نہیں آگے ہو“ اور پھر میں نے بسا کر کھایا۔ وقت گواہ ہے کہ میں موت کے آگے نہیں بچے بھاگا ہوں۔ میں نے دشمنوں کی خندیں حرام کی ہیں اور سب کے جبر اپنی دہشت کے پیرے بھائے ہیں۔ وہ اثر و سمجھ کے گھوڑوں پر سوار تھے اور مجھے ایک بندگی میں بھاگتے تھے بے موت مرنے کے بجائے میں پلٹا اور پوری نشت سے ان پر جھیت ڈرا۔ تاہم اس خونی جھپٹ سے پہلے

باہر طوفانی باد باران کا قہقہہ مت خیز شور تھا اور اندر غیظ و غضب کے دیو جھگڑ رہے تھے۔ وہ اپنے طور پر مجھے بے دست دبا کر بچے تھے اس سنگین حقیقت کا انہیں علم نہیں تھا کہ میری پڈلی سے ابھی تک ایک خنجر بندھا ہوا ہے۔ میں حملہ آوروں کی گرفت میں پھنس رہا تھا اور میرا ایک ہاتھ مسلسل پڈلی تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر جو کئی خنجر میرے ہاتھ میں آیا میں سر ہٹا ہوا ہوں۔ اس وقت مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ صرف کانوں میں شتا کی دہلی دہلی جھین گون رہی تھیں اور نگاہوں میں حملہ آوروں کے کرخت چہرے تھے جیسے ہاتھوں میں برق لہراتی ہے میرا خنجر حملہ آوروں کے درمیان چکا اور انہیں زخم زخم کر گیا۔ دس سیکنڈ کے مختصر وقفے میں وہاں تین لاشیں ترپ رہی تھیں اور ایک شخص زخمی ہو کر اور فرار اختیار کر رہا تھا۔

میں حملہ آوروں کو پہچان چکا تھا۔ ان میں سے دو شتا کے آدمی تھے۔ میں نے انہیں قتل کر دیا تھا اور یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں تھی۔ میں نے ان سرکاری سائڈوں کے خون سے ہاتھ رنگے تھے جنہیں کوئی انگلی تک لگانے کا جواز نہیں تھا۔ اب میرا اور شتا کا میاں رہتا ہجرت ناک موت کو دعوت دیتا تھا۔ گزرنے والا ہر سیکنڈ ہماری زندگیوں کو موت کے قریب کر رہا تھا۔ میں نے تڑپتی پڑتی لاشوں کے قریب سے ایک شاٹ گن اٹھائی اور گولیوں والا بیٹل کندھے پر ڈال کر شتا کی طرف بڑھا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں کہ ہاتھ رکھے جانے سے اس کا دم گھٹ گیا تھا یا اپنے بازوؤں میں گھومتے کو ٹھہرے دیکھ کر اس کا ذہن کام کرنا چھوڑ گیا تھا۔

”شتا! ہوش کرو۔ شتا ہوش کرو میری بہن“ میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر جمونڈی پر پھرایا اور اسے کندھے پر ڈال لیا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور زمین پر گری ہوئی لاشیں بھاگ گئیں۔ کمرے میں گھری تاریکی چھا گئی۔ میں نے ہاتھوں سے ٹھٹھل ٹھٹھل کر شتا کا دھنڈا اور پاؤں سے ٹھٹھل کر اپنی جوتی تلاش کی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

طوفانی جھڑپوں سے کلائی کے درو دیوار ہل رہے تھے اور ہاتھوں کی گھن گرج کر نہ ختم ہونے لگی تھی۔ امارات کے امیر زادے اور شتا شاہ کو اس واقعے کی اطلاع ہونے سے پہلے میں جتنی دور چلا جاتا تھا ہی میرے لیے ہوتا تھا۔ یہ زندگی اور موت کی دوڑ تھی اور اس میں میرا سب کچھ ڈاکڑ پر لگا ہوا تھا۔ میرے پاس ایک بہن کے سوا اور کچھ نہیں تھا وہ میری ستیا

اور چرہ طوفانی رات مجھ پر دوڑ ہوئی جب ڈاکوؤں کے ہمیں میں شتا شاہ کے کارندے اور پولیس کے ساتھ ہوش میری بہن کو اٹھانے کے لیے میری چار دیواری میں داخل ہوئے۔ چاچا عبداللہ اس دن شکر گیا ہوا تھا۔ شاید کرائے کا کوئی مکان دیکھنے۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم یہ کوارٹر چھوڑ دیں۔ میری بہن میری چار دیواری کے ساتھ چار دیواری جوڑے اس طرح سوئی ہوئی تھی کہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ اپنا ہاتھ میرے سر کے دھیرے دھیرے سے آزاد ہو کر خنجر کی وادی میں جا چکی تھی۔ مجھے جگانا تھا کیونکہ وہ سوری تھی۔ اور میں کوئی تھانہ نہیں جاگ رہا تھا۔ میرے ساتھ شتا کی ”ماں“ جاگ رہی تھی اس کے ”اپا جان“ جاگ رہے تھے وہ نیم شب کی دھماکی جاگ رہی تھیں جو کبھی ہم دونوں کے لیے ناگہانی تھیں اور وہ عمدہ جاگ رہا تھا جو میں نے یہ زبان خاموشی اپنی ماں کی قبر سے کیا تھا۔ ”ماں! تیرا بیٹا جہیم ہوا ہے“ تیری بیٹی جہیم نہیں ہوئی میں تیری گڑیا کی حفاظت کروں گا۔ اپنی ہر سانس اس کے لیے وقف کروں گا۔ اور یہ عمدہ بھانے اور سانس لانے کی گھڑی تھی۔ صحن میں کسی کے کوندے کی آواز آئی تو میں بھاگ کر کھڑکی میں پہنچا تھا۔ آدھ کھلی کھڑکی سے میں نے دیکھا ایک سایہ بیرونی دروازے کے پاس جھمک رہا تھا۔ پھر دروازہ کھلا اور تین مزید افراد ہمارا مار مار کر اندر گھس آئے۔ وہ سب ڈھانچا ہوش تھے اور ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ میں نے لپک کر اپنا دیواری کھینچے کے نیچے سے نکالا اور کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ اس دوران وہ لوگ برآمدے میں پہنچ چکے تھے۔

”رک جاؤ“ میری آواز گھڑکی چار دیواری میں گونجی ”آگے بڑھے تو ڈھیر کروں گا“ ابھی میرے خنجر کے بازو گھٹ فضا میں تھی کہ دروازہ ایک دھماکے سے ٹوٹ گیا۔ میں نے گولی چلائی لیکن نشانہ خطا کیا اور ایک گراؤیل شخص بھاگتا ہوا مجھ پر آ پڑا۔ میں پشت کے بل چار دیواری پر گر گیا اور اسے توڑنا ہوا فرش بوس ہو گیا۔ دیوار اور میرے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ اسی وقت شتا کی پچ میرے کانوں میں گونجی۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔ میرے دماغ میں چنگاریاں بھڑکیں۔ میں دیوانہ وار حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑا۔ وہ چار تھے ان میں سے ایک نے شتا کو دیوچ رکھا تھا اور باقی تین مجھ سے برسرِ پیکار تھے اور وہ کوئی معمولی لوگ بھی نہیں تھے۔ پہلے ہونے جنسوں والے منتخب خنجرے تھے اس مختصر کمرے میں ایک یا دو منٹ ہمارے درمیان سخت جدوجہد ہوئی پھر انہوں نے مجھے گرا لیا اور مارنے لگے۔

آجی ہے تاہم وہ سخت بیمار ہے۔ قہر میں بہت عام مہی کہ غوری کی بیوی شریا اغوا ہونے کے بعد سے انکسٹر عالم اور اس کے محلے کے قبضے میں تھی اور وہ اسے بڑے سلوک کا نشانہ بناتے رہے تھے۔ شریا کی بیماری کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ اس کے پیٹ میں پچھرا جو ضائع ہو چکا ہے۔ دوسری طرف اسد غوری اور اس کے اہل خانہ کا گناہ تھا کہ دو پر بھائی غلط بس میں سوار ہو کر بیڑہ لہسا کی پہنچ گئے تھے۔ پھر سیلاب کی وجہ سے انھیں وہاں روکنا پڑا اور وہ کوئی اطلاع بھی نہ دے سکے۔ اس بیان کو چند ہی روز بعد شریا نے اپنے محل سے غلط ثابت کر دیا۔ اس نے ہماری مقدار میں خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔ بالکل اس کی جان بھائی جا سک۔ اس کی حالت سننے ہی اسد غوری اسے لے کر گھس چلا گیا۔ مہی کمزور پکا وہاں نہ آنے کے لیے۔ اسد غوری کے دیگر اہل خانہ بھی اس کے ساتھ ہی تھے۔

چاچا عبداللہ کی اذیت ناک موت ایک ایسا واقعہ تھا جسے میں بھلائے نہیں بھول سکتا تاہم میری یہ خواہش ہرگز نہیں تھی کہ میں اس قتل کے بدلے کسی اور کا قتل کروں۔ میں نے قانون کا امتحان قانون توڑنے کے لئے نہیں انصاف حاصل کرنے کے لئے پاس کیا تھا۔ میں تو ان تین افراد کا مقدمہ بھی قانون کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا جو اپنی ہمتا کی حفاظت کرتے ہوئے میرے ہاتھوں سے قتل ہوئے تھے۔ میں نے قانون ہاتھ میں لیتا ہوا تو والدین کی موت کے بعد آٹھ سال تک کتاؤں کا ساتھ نہ لینا، رات کی چھٹی ماہی گھڑیوں میں لالچین کے سامنے کمان ہو کر نصالی اور اراق برحق ریزی نہ کرتا۔ میرا لھکانا بازار ہوتے پھٹپھٹ کی ٹھیکس ہوتیں اور میری دلچسپی ان سرگوشیوں میں ہوتی جو گراہ تو جوانوں کے ہونٹوں سے نکلتی ہیں اور جرائم کی الف ب سکتا ہے۔ میں ہرگز جرم کی دنیا میں قدم رکھنا نہیں چاہتا تھا لیکن میرے لئے کوئی راستہ چھوڑا ہی نہیں گیا تھا۔

میرے اور عدالت کے درمیان ایک ٹنک بوس دیوار کھڑی کر دی گئی تھی اور اس دیوار کی دونوں جانب متحال شاہ کے ہرکارے اور انکسٹر عالم کے ساتھ پوش و زنا تے بھرتے تھے۔ میں بعد کوشش اپنے محترم استاد ایڈووکیٹ ظفر احسن کے پاس پہنچا تھا اور ان سے مدد کی درخواست کی تھی۔ انھوں نے مدد سے انکار نہیں کیا تھا لیکن اقرار کی دشوار گمانی سر کرتے ہوئے انھیں جو ذہنی اذیت اٹھانی پڑی تھی اسے صرف میں نے محسوس کیا تھا۔ اس کے بعد مجھے جو صلہ نہیں ہوا تھا کہ میں ایک مہمان سے اتنی بڑی قربانی طلب کروں۔ پھر ایک

روز میری بڑداشت کے بعد نوٹ گئے تھے میرے عرف کا پانی بر نکلا تھا۔ میں نے بے تحاشا شراب پی تھی اور جمعہ ہوا شام ہوا تا کہ انکسٹر کے مصروف ترین چوک میں پہنچ گیا تھا۔ یہاں سانسے ہی وہ بلند و بالا ہوٹل تھا جہاں متحال شاہ آکر ٹھہرا ہوا تھا۔ سڑک پر کھڑے ہو کر میں نے متحال شاہ کو پکارا تھا "باہر نکل کئے! آج پھر مجھ کو۔ آبا پرا کر مت ہے تو۔" بسیں تیرا مقبوضہ بنادوں تو شاہ جہاں نام نہیں میرا۔" میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جگہ خون بہہ رہا تھا۔ ٹرنک جام ہو گیا تھا۔ لوگ میرے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ چاروں طرف ٹرنک کا نشیلا کی بیٹیاں گونج رہی تھیں۔ پھر ہوٹل کے مین دروازے سے تین چار ڈشکے برآمد ہوئے تھے۔ ان میں متحال کا وفاقا درکار تھیں بھی شامل تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بھینکا تھا "رائی خاں کے سالے! ایوں بھونکنا ہے کئے کی طرح تیرے جیسے خارش زدہ جانوروں کے لئے پھر صاحب اپنی زبان نہیں بلایا کرتے، صرف اشارہ کیا کرتے ہیں مجھ جیسے فقیر خادموں کو۔" اس کے ساتھ ہی انھیں مجھ پر ٹوٹ پڑا تھا اس کے سامنے بھی ایک ساتھ حملہ آور ہوئے تھے۔ خراب تو انسان کو کمزور کر دیتی ہے، یہی تھا اس روز مجھے شراب کا نہیں سرکشی کا نشہ تھا۔ متحال شاہ کے آدمی جتنی شدت سے مجھ پر پہنچے تھے میں نے اتنی ہی شدت سے ان پر جوابی حملہ کیا۔

میرے ہاتھ میں وہی خنجر تھا جو اس سے پہلے متحال شاہ کے تین ڈشکوں کا لوبو لی چکا تھا۔ اس خنجر کی دہشت نے میرے حریفوں کو ڈرگذا سا دیا۔ ان میں سے ایک کی ران پر گہرا زخم آیا اور دو سراسر اپنے کندھا چڑکڑا کر رہ گیا۔ اس دوران مجھے کبھی ایک چاقو کا ٹکڑا لگا۔ آجاکا کچھ فاصلے سے پولیس جیب کا ساکن سنا دیا۔ میں گرفتار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت میرے جسم میں بجلیاں گونج رہی تھیں۔ شراب کی بوٹلی ابھی ٹنک میرے ہاتھ میں تھی۔ وہ میں نے پوری قوت سے انھیں کے منہ پر توڑ دی اور دیگ سنیما کی طرف بھاگ نکلا۔ پچاس ساتھ گز آگے فیل روڈ پر میں نے ایک شیورین کو زبردستی روکا اور اس میں بیٹھ کر گنگرام اسپتال کی طرف نکل گیا۔

اگلے ہی روز میں نے ایک خط لکھا تھا۔ یہ خط انکسٹر عالم یا متحال شاہ کے نام نہیں تھا۔ متحال شاہ کے "حقیر خادم" انھیں کے نام تھا۔ میں نے لکھا "میں جس شخص کے حقیر خادم ہوں وہ بے چارہ خود بھی انکا حقیر ہے کہ میرے ہاتھوں قتل ہوئے کی سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔ میں اس شخص کو قتل کروں

گاہ پر دے کے پیچھے بیٹھ کر تھمارے حقیر مالک کی ڈوریں ہلاتا ہے۔ میرا خیال ہے تم میری بات سمجھ گئے ہو اور وہ سب بھی جان جائیں گے جن کو تم نے خط سنا۔ گے یہ میرا وعدہ ہے تم سب سے۔ وہ شخص اب زندہ نہیں ہے گا۔"

شیخ راشد بن راشد کے بارے میں مجھے بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ وہ شخص جو یہاں شہزادہ باجیگرا تھا، اپنے وطن میں ایک مجرم تھا۔ لاکھوں ڈالر کے عین سمیت کئی الزامات تھے۔ اور ریاستی قانون کے مطابق اس پر مقدمے چل رہے تھے۔ اپنے محلے میں وہ بے حد عیاش اور خشن پرست مشہور تھا۔ عورت، شکار اور ہیرے یہ اس کی تین بڑی کمزوریاں سمجھی جاتی تھیں۔ ان کمزوریوں کے حوالے سے وہ کبھی کبھی انسانیت کی پست ترین سطح تک پہنچ جاتا تھا۔ میری بہن کی نسبت سے اس کے محفل دل میں جو بدبینی پیدا ہوئی تھی وہ اس کی ضد بن گئی۔ وہ خود کبھی منظر میں تھا اور بظاہر اس معاملے سے بالکل الگ تھلک نظر آتا تھا لیکن اس کے ہرکارے پوری شدت سے اپنے ہدف تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے اور میری بہن کے خلاف ہونے والی سازشوں کا مرکز شیخ دی تھا۔ میں کیوں کسی اور کو گناہ گار ٹھہراؤں اور اس سے الجھ کر اپنی توانائیاں ضائع کرنا۔ کیوں نہ میں اس سارے فساد کی جڑ تک پہنچاؤں اور اسے اکھاڑ بیٹھوں۔ شیخ راشد بن راشد تک پہنچانے تک دشوار تھا۔ وہ بیٹ بروف گاڑی میں گھومتا تھا اور مسکے گاڑ کے نرے میں رہتا تھا۔ ہر جن جگہوں پر اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا وہاں مجھ جیسے بے بضاعت شخص کا داخلہ اکثر ممنوع ہوتا تھا لیکن پانی کی طرح انعام بھی اپنے راستے تلاش کر لیتا ہے۔

میں بھی ایک روز اس شخص تک پہنچ گیا جس نے میری جی بھائی زندگی اکھاڑی تھی اور میرے محسن چاچے عبداللہ کے خون سے ہاتھ رنگے تھے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ شیخ راشد کہاں ہے تاہم اس بات کا یقین تھا کہ وہ پاکستان میں ہی ہے اور متحال شاہ و جمہور سے مسلسل رابطہ قائم رکھے ہوئے ہے۔ میں نے ایک چال کھلی۔ ایک روز میں نے اپنے ایک دوست عزیز احمد سے رابطہ کیا۔ عزیز بہادر پور کا رہائشی تھا اور میں ایک مقامی کالج میں ایم ایس سی کر رہا تھا۔ کالج یونیورسٹیاں ہنگاموں کی وجہ سے بند تھیں۔ عزیز کو ڈھونڈنے میں خاصی دشواری پیش آئی۔ بہر حال ایک بے پائے ٹھکانے سے وہ مجھے دستیاب ہو ہی گیا۔ ابھی میں نے انھیں بتایا ایک شخص کا ذکر کیا ہے جیسا کہ میں نے بتایا ہے۔ انھیں "حقیر متحال شاہ کا خاص کارندہ تھا۔ وہ کرائی تھا اور ذرا بیٹھی ہوئی

آواز کے ساتھ بڑے خاص لب و لہجے میں بولتا تھا۔ میں جانتا تھا عزیز معمولی کوشش سے انھیں کے لب و لہجے کی نقل کر لے گا۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ عزیز آوازوں کی نقل میں بڑا ماہر تھا۔ اس نے میری توقع سے بڑھ کر انھیں کے لب و لہجے کی کاپی کی۔

میں نے عزیز احمد کے ذریعے پولیس انکسٹر عالم کو ڈرگذا کر دیا۔ وہ شخص صاحب شدید زخمی ہو گئے ہیں۔ وہ چند سیاتیوں کو لے کر فوراً اس وقت پر پہنچے۔ اس سے پہلے کہ انکسٹر عالم تفصیلات پر جیتا لائن کٹ جانے کے تاثر کے ساتھ فون بند کر دیا گیا۔ انھیں اس وقت متحال شاہ کے ساتھ کمزور پکا سے کبیں باہر گیا ہوا تھا۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ایٹرائی مرٹے میں یہ کال "فراڈ" ثابت ہو سکے گی۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ شیخ راشد کے ٹھکانے پر بھی فون ہوتا اور انکسٹر وہاں رابطہ قائم کر کے صورت حال سے آگاہ ہو جاتا۔ (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا) فون موجود تھا لیکن انکسٹر عالم نے یہ غلط فہمی نہیں کی، جس وقت عزیز احمد نے بہادر پور سے انکسٹر عالم کو کال کی، میں تانیک شیشوں والی ایک کرد گاڑی میں تھانے سے صرف تین سو گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ لباس، ٹوٹی اور ٹیک کی مدد سے میں نے اپنا ٹیکل کانی حد تک بدل رکھا تھا اور امید نہیں تھی کہ غور سے دیکھے بغیر کوئی مجھے پہچان سکے گا۔

بھائی کال کے ذریعے جو تھرم نے اند میرے میں چلایا تھا وہ عین شانے پر لگا۔ کال موصول ہونے کے صرف پانچ منٹ بعد انکسٹر عالم کی ٹیلی جیب طوفانی رفتار سے بڑی سڑک کی طرف جاتی نظر آئی۔ میں اسی گز کی کے انتظار میں تھا۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر میں انکسٹر عالم کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ بڑی سڑک تک قریبا پانچ میل کا فاصلہ خطرناک تھا کیونکہ ٹرنک کم تھا اور مسلسل پیچھے رہنے والی گاڑی نظریں آسکتی تھی لیکن بڑی سڑک پر اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ دیے بھی انکسٹر بڑی بدحواسی کے عالم میں روانہ ہوا تھا۔ امید نہیں تھی کہ وہ یا اس کے سامنے اپنے عقب پر خصوصی نگاہ رکھ سکیں گے۔

مجھے سو فیصد یقین تھا کہ انکسٹر عالم بہادر پور شہر کا رخ کرے گا لیکن یہ یقین اس وقت ٹنک میں بدل گیا جب انکسٹر عالم نے جی ٹی روڈ پر سڑکاری رکھا اور بہادر پور سے آٹھ دس میل آگے نکل کر جام پور دہائی قہر کی طرف مڑ گیا۔ یہ قہر

ایک معروف اداکار کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس فلمی اداکار کا تعلق اس قصبے سے تھا اور یہ تعلق برقرار رکھنے کے لئے اس نے یہاں ایک بڑی کوٹھی بنوا رکھی تھی۔ بعد میں اس کی کوششوں سے نہ صرف جام پورہ میں بجلی کی بجٹی تھی بلکہ گزائرے لائق سڑک بھی بنی تھی۔ پاکستان فلم اسکرین کا یہ ہرودھنزا اداکار اکثر ہر سیاحت اور شکار کے لئے یہاں آتا رہتا تھا۔ اب انسپکٹر عالم کوڑی کی جب جام پورہ کی طرف مڑتے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ شیخ راشد جام پورہ میں ہے اور اگر وہ جام پورہ میں ہے تو یہی بات ہے کہ فلمی اداکار کا سہماں ہے۔

اگلے آدھ گھنٹے کے اندر اندر میرا یہ قیاد بالکل درست نکلا۔ انسپکٹر عالم کی دھول اڑاتی جب جام پورہ کی آبادی میں کم ہو گئی۔ میں نے اپنی کوٹھا میں جوڑے کے کنارے اونچے نیچے سرکنڈوں میں چھادی اور پھیل گئے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں مقامی لباس شوار قمیص میں تھا۔ کندھے پر ایک بڑا دھمال، آنکھوں پر دھوپ کی عینک اور سر سرخندی ٹوپی تھی۔ داڑھی بڑھی ہوئی اور چہرے پر میل چکیل کی خمیں تھیں۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ کموڑی کا وہی بابو شاہ جہاں ہے جس نے پانچ چھ اہلہ وکالت کا امتحان پاس کیا ہے اور جسے سفید پتلون اور کالے کوٹ میں دیکھ کر جنونی کموڑی کا کئی بڑی بوڑھیوں نے اپنی بیٹیوں کے لئے رشتے ڈھونڈنے چھوڑ دیے تھے۔

میں جام پورہ میں ایک جامی کی دکان پر پہنچا اور وہیں سے مجھے تمام مطلوبہ معلومات مہیا ہو گئیں۔ شیخ راشد بن ارشد بچپن سے یہیں فلمی اداکار کی رہائش گاہ پر قیام پزیر تھا۔ یہاں قریبی سائین پر وہ چھلی کا شکار کھیل رہے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آج کسی وقت بچپن پر شہزاد واپس چلا جائے گا۔ میرے پاس ایک تیز دھار خنجر کے علاوہ اڑتیں پور کا ریلو اور قریباً تیس راؤنڈ تھے۔ یہ سارا اسلحہ میں نے محفوظ طریقے سے لباس میں چھپا رکھا تھا۔ نجانے کیوں اس قصبے میں پہنچے ہی مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں شیخ کو اس قصبے سے زندہ سلامت واپس نہیں لوٹنے دوں گا۔ یہ میرے دل کی گواہی تھی کہ امارت کے امیر زادے کا وراثہ پانی آج پورا ہو گیا ہے۔ وہ خدا کی زمین کو اپنے قدموں سے جتنا روند سکا تھا روند چکا ہے۔ اپنے جیسے کا نظم بھی کر چکا ہے اور اپنے مقدر کی بددعا میں بھی سمیٹ چکا ہے۔ شتا جیسی جتنی لڑکیاں اس کی میلی نظر کا شکار ہو رہی ہیں اور شیا جیسی جتنی ساتھیوں اس کے بہتر پامال ہونا چاہتے ہیں۔ اب

اس کے گناہ و ثواب کا کھانا بند ہونے والا ہے۔ شکر کی اذان کے تموز ہی میں میرے دل میں ملتا ہوا جام کے شاندار حادثہ ہاؤس کی طرف نکل گیا۔ فلمی اداکار رہائش گاہ و حادثہ ہاؤس ہی تھی۔ وہ پوری کی پوری سفید سی بنی ہوئی تھی۔ جام پورہ میں اس عمارت کو دیکھ کر پورہ تھا کہ کوڑے کے ڈھیر میں ایک موتی پڑا ہوا ہے۔ امارت کے سامنے ایک وسیع احاطہ تھا۔ اس احاطے کی دیواری زیادہ بلند نہیں تھی۔ پورچ کے قریب تموزی سی جگہ چھوڑ کر باقی تمام احاطے میں گھاس کا فرش تھا اور اقسام کے درخت لگے ہوئے تھے۔ چھب کر بیٹھ رہنے لے یہ جگہ بہت مناسب تھی۔ میں نے ایک محفوظ مقام چار دیواری چھلا گئی اور گھنے درختوں کے اندر ہی اندر پورچ کے قریب پہنچ گیا۔ میری خواہش تھی کہ میرے دھار شیخ راشد کے خون کا زائچہ دیکھ سکے لیکن یہ خواہش پوری نہیں آئی تھی۔ موقع محل کے مطابق مجھے ریلوور سے کام لینا تھا۔

میں کیلے کے کوٹہ قد پودوں میں قریباً ڈھائی گھنٹے بیٹھا رہا۔ ریلوور میرے ہاتھ میں تھا اور نگاہیں پورچ پر رہ گئی تھیں۔ پورچ میں موجود گاڑیوں سے پتا چلتا تھا میریان اور سہماں دونوں میں ہیں۔ ہاں انسپکٹر عالم تیزی سے آیا تھا اس تیزی سے واپس لوٹ گیا تھا اور اس کی نشانی کے طور پر صرف ایک سطح را نقل میں : گیسٹر حمل رہا تھا۔ شیخ کے ذاتی گاڑی بھی عمارت ہی تھی اور بھی بھاران میں سے کوئی باہر نکل کر سرگرمی پر لگتا تھا۔ شام چھ بجے کے قریب پورچ میں پہل نظر آ گئی۔ شیخ کی وسیع و عریض سرسبز زانہ روئی دروازے کے سامنے لائی گئی۔ اس کے آگے ایک سرخ گاڑی تھی جس پر دو ریلوور بدوار افراد سوار تھے۔ سرسبز کے عقب گاڑی کی جب تھی۔ چار گاڑیوں میں تھے جبکہ دواٹر پر چوکس کھڑے تھے۔

خوش پوش اور دراز قد تھا۔ مردوزن کے جھرمٹ میں سب سے نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے کرخت چہرے پر خود بندی اور نخوت کی چھاپ دور ہی سے نظر آ رہی تھی۔ اس کے سپید ہاتھوں میں نہایت قیمتی انگوٹھیاں بندھ رہی تھیں۔ اور یہ دیکھتا تھا تھے جو میری بہن کی طرف بڑھتا جا رہے تھے۔ میں آج ان ہاتھوں کو بے جان کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ قدم قدم پر جیسے مسکرائیں اور تعصبات سینے ہوئے شیخ راشد بن ارشد جو کسی اپنی گاڑی کے قریب پہنچا، میں درختوں کی اوٹ سے برآمد ہوا۔ اپنا ریلوور والا ہاتھ سیدھا کیا اور قریب اس فٹ کے فاصلے سے پانچ ٹوکیاں شیخ کے جسم میں انا دیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے تین گولیاں اس کے سینے پر لگی تھیں، ایک گردن میں اور ایک چہرے کے کسی حصے پر۔ دھاگوں سے پورچ کو آٹھ ایک ساتھ درختوں جتنیں بلند ہوئیں۔ میں نے شیخ کو لہرا کر ایک باڑی کا رڈ کے بازوؤں میں جھونکے دیکھا۔ تین گاڑیوں کے ہاتھ بیک وقت اپنے انگوٹھوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بیرونی چار دیواری مجھ سے تقریباً تیس فٹ کے فاصلے پر تھی۔ میں کتنی بھی تیزی سے بھاگا، گاڑیوں سے پہلے چار دیواری بھانڈ نہیں سکتا تھا۔ میں صرف اتنا کر سکتا تھا کہ ایک مشکل اٹھنے سے بھاگوں۔ یہ

کوشش کروں کہ میرے اور گاڑیوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ رکاوٹیں آئیں تاکہ گولی گھٹنے کا امکان کم سے کم ہو۔ یہ سب کچھ میں پہلے سے سوچ چکا تھا لہذا دوبارہ سوچنے میں میں نے ایک بل بھی ضائع نہیں کیا اور پوری رفتار سے چار دیواری کی طرف بھاگا۔ میرے عقب میں گولیاں چلیں لیکن قسمت نے ساتھ دیا۔ میرے عقب میں آنے والی موت پورچ کے گول ستونوں اور درختوں سے ٹکرا کر رہ گئی۔ میں نے بجا فضا چار دیواری چھلا گئی اور گلی میں آ گیا۔

اب کمری تاریکی چیل چکی تھی۔ اس سے پیشتر کہ شیخ راشد کے گاڑیوں اور دیگر افراد میرے پیچھے گلی میں پہنچے اور مجھے مختلف اطراف سے گھیر لیا جاتا تھا۔ ایک مکان میں گھس گیا۔ اہل خانہ مجھے دیکھ کر گھبرائے لیکن میں نے ریلوور دکھا کر انہیں خاموش کر دیا۔ یہ ایک اسکول ماسٹر ماجد علی کا گھر تھا۔ یہاں وہ اپنی بیوی، دو جوان بہنوں اور اندھے بہرے باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ ماسٹر ماجد علی ایک مسجد دار فاضل تھا۔ وہ میرے ہاتھوں میں ریلوور کے علاوہ آنکھوں میں خون کی سرخی بھی دیکھ چکا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ چند منٹ پہلے میں ایک شخص کو گولیوں سے چھلکی کر چکا ہوں۔ میرے سر پر

خون سوار ہے لہذا وہ اپنی اور اہل خانہ کی تحیث چاہتا ہے تو خاموشی سے میری ہدایت پر عمل کرے۔ ماجد علی میری بات سمجھ گیا۔ اس نے مجھے ایک محفوظ پناہ گاہ مہیا کر دی اور اہل خانہ کو میرے ساتھ تعاون کرنے کی ہدایت کر کے باہر نکل گیا۔ چودہ دیر بعد وہ واپس آیا اور اس کی زبان مجھے معلوم ہوا کہ شیخ راشد موت پختے پر دم توڑ گیا تھا۔ اب پورے جام پورہ میں پولیس دندنا رہی ہے اور قصبے کے ارد گرد بھی میری تلاش جاری ہے۔

میں پورے اڑتالیس گھنٹے ماسٹر ماجد علی کے گھر میں پناہ گزین رہا۔ میرے اور اہل خانہ کے درمیان صرف خوف کا رشتہ تھا اور میرے ہاتھ میں بھرا ہوا ریلوور اس رشتے کو مستحکم رکھے ہوئے تھا۔ میری تلاش کی سرگرمی ماند پڑی تو تیسری شب میں نے خاموشی سے جام پورہ چھوڑا اور اپنا پیادہ ایک طرف روانہ ہو گیا۔ کار کی طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ یقینی طور پر پولیس کی نظریں لپکتی تھی۔ یہ کار اس واردات سے پہلے میں نے ایک مقامی مین کے ذریعہ سے چھپی تھی۔ کافی قیسی کار تھی۔ اس قیسی کار میں جو سب سے قیمتی چیز تھی وہ ایک شاٹ گن تھی۔ یہ وہی گن تھی جو تین ہفتے پہلے میں نے اپنے گھر میں متحال شاہ کے آدمیوں سے چھپی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آنے والے دنوں میں یہ شاٹ گن میرے لئے بہت مددگار ثابت ہوگی۔

جام پورہ سے راولپنڈی اختیار کر کے میں ایک بار پھر لاہور آ گیا۔ اپنا حلیہ میں نے راستے ہی میں تبدیل کر لیا تھا۔ داڑھی مونچھیں منڈوا دی تھیں اور سر کے بال بھی کافی چھوٹے کرادیے تھے۔ لاہور میں لہذا بازار سے میں نے دو تین پتلونیں بیعین خرید لیں۔ سارا دن کی لائبریری میں گوشہ نشین ہو کر بیٹھا رہتا، رات کو "دفن ہاتھوں" میں گھس جاتا اور منہ سرپٹ کر سو رہتا۔ اخباروں میں میرے کارنامے کا ذکر شہر سڑیوں میں آ رہا تھا۔ متحال شاہ کے تین آدمیوں کا قتل پھر ایک ریلوے ملازم کی پولیس تشدد سے موت اور پھر شیخ راشد بن ارشد کا دھڑن تختہ درختوں افراد کی موجودگی میں یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں لہذا لوگ اس معاملے میں خاطر خواہ دلچسپی لے رہے تھے۔ جام پورہ کے حادثہ ہاؤس میں شیخ کے قتل کے درختوں جسم دیدہ گواہ موجود تھے اور میں جانتا تھا جس گھڑی میں گرفتار ہوا ہیک وارنٹ میرے ہاتھ میں آجائے گا۔

میں لاہور میں زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکا۔ جلدی میرے اوڑ میرے حریفوں کے درمیان وہ آنکھ چوٹی پھر شروع ہو گئی جو

خون سوار ہے لہذا وہ اپنی اور اہل خانہ کی تحیث چاہتا ہے تو خاموشی سے میری ہدایت پر عمل کرے۔ ماجد علی میری بات سمجھ گیا۔ اس نے مجھے ایک محفوظ پناہ گاہ مہیا کر دی اور اہل خانہ کو میرے ساتھ تعاون کرنے کی ہدایت کر کے باہر نکل گیا۔ چودہ دیر بعد وہ واپس آیا اور اس کی زبان مجھے معلوم ہوا کہ شیخ راشد موت پختے پر دم توڑ گیا تھا۔ اب پورے جام پورہ میں پولیس دندنا رہی ہے اور قصبے کے ارد گرد بھی میری تلاش جاری ہے۔

میں پورے اڑتالیس گھنٹے ماسٹر ماجد علی کے گھر میں پناہ گزین رہا۔ میرے اور اہل خانہ کے درمیان صرف خوف کا رشتہ تھا اور میرے ہاتھ میں بھرا ہوا ریلوور اس رشتے کو مستحکم رکھے ہوئے تھا۔ میری تلاش کی سرگرمی ماند پڑی تو تیسری شب میں نے خاموشی سے جام پورہ چھوڑا اور اپنا پیادہ ایک طرف روانہ ہو گیا۔ کار کی طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ یقینی طور پر پولیس کی نظریں لپکتی تھی۔ یہ کار اس واردات سے پہلے میں نے ایک مقامی مین کے ذریعہ سے چھپی تھی۔ کافی قیسی کار تھی۔ اس قیسی کار میں جو سب سے قیمتی چیز تھی وہ ایک شاٹ گن تھی۔ یہ وہی گن تھی جو تین ہفتے پہلے میں نے اپنے گھر میں متحال شاہ کے آدمیوں سے چھپی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آنے والے دنوں میں یہ شاٹ گن میرے لئے بہت مددگار ثابت ہوگی۔

جام پورہ سے راولپنڈی اختیار کر کے میں ایک بار پھر لاہور آ گیا۔ اپنا حلیہ میں نے راستے ہی میں تبدیل کر لیا تھا۔ داڑھی مونچھیں منڈوا دی تھیں اور سر کے بال بھی کافی چھوٹے کرادیے تھے۔ لاہور میں لہذا بازار سے میں نے دو تین پتلونیں بیعین خرید لیں۔ سارا دن کی لائبریری میں گوشہ نشین ہو کر بیٹھا رہتا، رات کو "دفن ہاتھوں" میں گھس جاتا اور منہ سرپٹ کر سو رہتا۔ اخباروں میں میرے کارنامے کا ذکر شہر سڑیوں میں آ رہا تھا۔ متحال شاہ کے تین آدمیوں کا قتل پھر ایک ریلوے ملازم کی پولیس تشدد سے موت اور پھر شیخ راشد بن ارشد کا دھڑن تختہ درختوں افراد کی موجودگی میں یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں لہذا لوگ اس معاملے میں خاطر خواہ دلچسپی لے رہے تھے۔ جام پورہ کے حادثہ ہاؤس میں شیخ کے قتل کے درختوں جسم دیدہ گواہ موجود تھے اور میں جانتا تھا جس گھڑی میں گرفتار ہوا ہیک وارنٹ میرے ہاتھ میں آجائے گا۔

میں لاہور میں زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکا۔ جلدی میرے اوڑ میرے حریفوں کے درمیان وہ آنکھ چوٹی پھر شروع ہو گئی جو

خون سوار ہے لہذا وہ اپنی اور اہل خانہ کی تحیث چاہتا ہے تو خاموشی سے میری ہدایت پر عمل کرے۔ ماجد علی میری بات سمجھ گیا۔ اس نے مجھے ایک محفوظ پناہ گاہ مہیا کر دی اور اہل خانہ کو میرے ساتھ تعاون کرنے کی ہدایت کر کے باہر نکل گیا۔ چودہ دیر بعد وہ واپس آیا اور اس کی زبان مجھے معلوم ہوا کہ شیخ راشد موت پختے پر دم توڑ گیا تھا۔ اب پورے جام پورہ میں پولیس دندنا رہی ہے اور قصبے کے ارد گرد بھی میری تلاش جاری ہے۔

میں پورے اڑتالیس گھنٹے ماسٹر ماجد علی کے گھر میں پناہ گزین رہا۔ میرے اور اہل خانہ کے درمیان صرف خوف کا رشتہ تھا اور میرے ہاتھ میں بھرا ہوا ریلوور اس رشتے کو مستحکم رکھے ہوئے تھا۔ میری تلاش کی سرگرمی ماند پڑی تو تیسری شب میں نے خاموشی سے جام پورہ چھوڑا اور اپنا پیادہ ایک طرف روانہ ہو گیا۔ کار کی طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ یقینی طور پر پولیس کی نظریں لپکتی تھی۔ یہ کار اس واردات سے پہلے میں نے ایک مقامی مین کے ذریعہ سے چھپی تھی۔ کافی قیسی کار تھی۔ اس قیسی کار میں جو سب سے قیمتی چیز تھی وہ ایک شاٹ گن تھی۔ یہ وہی گن تھی جو تین ہفتے پہلے میں نے اپنے گھر میں متحال شاہ کے آدمیوں سے چھپی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آنے والے دنوں میں یہ شاٹ گن میرے لئے بہت مددگار ثابت ہوگی۔

جام پورہ سے راولپنڈی اختیار کر کے میں ایک بار پھر لاہور آ گیا۔ اپنا حلیہ میں نے راستے ہی میں تبدیل کر لیا تھا۔ داڑھی مونچھیں منڈوا دی تھیں اور سر کے بال بھی کافی چھوٹے کرادیے تھے۔ لاہور میں لہذا بازار سے میں نے دو تین پتلونیں بیعین خرید لیں۔ سارا دن کی لائبریری میں گوشہ نشین ہو کر بیٹھا رہتا، رات کو "دفن ہاتھوں" میں گھس جاتا اور منہ سرپٹ کر سو رہتا۔ اخباروں میں میرے کارنامے کا ذکر شہر سڑیوں میں آ رہا تھا۔ متحال شاہ کے تین آدمیوں کا قتل پھر ایک ریلوے ملازم کی پولیس تشدد سے موت اور پھر شیخ راشد بن ارشد کا دھڑن تختہ درختوں افراد کی موجودگی میں یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں لہذا لوگ اس معاملے میں خاطر خواہ دلچسپی لے رہے تھے۔ جام پورہ کے حادثہ ہاؤس میں شیخ کے قتل کے درختوں جسم دیدہ گواہ موجود تھے اور میں جانتا تھا جس گھڑی میں گرفتار ہوا ہیک وارنٹ میرے ہاتھ میں آجائے گا۔

میں لاہور میں زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکا۔ جلدی میرے اوڑ میرے حریفوں کے درمیان وہ آنکھ چوٹی پھر شروع ہو گئی جو

تین ماہ پہلے ایک طوفانی رات کو ریلوے کالونی کے کوارٹر نمبر 18 بی سے شروع ہوئی تھی اور شیخ راشد کے قتل کے بعد جس کی نوعیت سنگین تر ہو گئی تھی۔ ایک روز جب میں پنجاب پبلک لائبریری سے جی بی بی او کی طرف جا رہا تھا تو اتار گلی والے چوراہے میں متحال شاہ کے آدمیوں نے مجھے دیکھ لیا۔ ان میں خوشنوار مہمن بھی شامل تھا۔ وہ ایک سفید نیوٹا کار میں سوار تھے مجھے دیکھتے ہی انہوں نے بریک لگا کر میں نے گاڑی کے چاروں دروازے ایک ساتھ کھلتے دیکھے۔ میں اس وقت ڈیڑا کر اسٹک پر تھا۔ میری دائیں جانب ایک فوجوان ڈبل سائیکس سرخ بھنڈا 175 پر بیٹھا تھا۔ ان دونوں یہ موٹر سائیکل طلبہ میں بہت مقبول تھی۔ فوجوان دیگر گاڑیوں کے ہمراہ سرخ کٹنل پر کھڑا تھا۔ اس کے سامنے دو گمان میں بھی نہ تھا کہ اچانک اس پر کیا افتاد پڑنے والی ہے۔ میں نے خود کو ”اپنے قاتلوں“ کے دروہو پاکر موٹر سائیکل پر چھٹا مارا۔ میری ٹانگ کی زوردار ضرب فوجوان کی چھاتی پر پڑی۔ وہ دھماکا بان سالو کا تھا۔ پینڈل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور الٹ کر موٹر پر گرا۔ موٹر سائیکل گرنے سے جھنجھکیا کیونکہ اس پر میری گرفت مضبوط تھی۔ میں موٹر سائیکل پر ہنوار ہوا۔ انجن پہلے سے اشارت تھا۔ مجھے گھسٹ لگنے اور کچھ چھوڑنے میں ایک سینکڑہ بھی نہیں لگا۔ بھنڈا 175 گرتی اور مکان سے نکلے تھری طرح چوراہے کی طرف بڑھی۔ دو ٹریفک کانسٹیبل سارا منظر آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ میری طرف لپکے لیکن ان کی لپک میں وہی سستی تھی جو ایک نہایت تیز رفتار گیند کی طرف لپکنے والے فیلڈر میں ہوتی ہے۔ جو ہاتھ زخمی کرانے سے بہتر سمجھتا ہے کہ جو کابو جائے۔

موت میرے تعاقب میں تھی۔ میں نے موٹر سائیکل کو لاہور کی سڑکوں پر ہوائی جہاز بنایا۔ میں تنگ گلیاں استعمال کر کے سفید نیوٹا سے پیچھا چھڑا سکتا تھا لیکن جوئی میں اسمبلی ہال سے شارع فاطمہ کی طرف مڑا، دو موٹر سائیکل سوار ساراجنٹ میرے پیچھے لگ گئے۔ اور پھر اسی برس نہیں ہوئی، مگر رام اپتال کے عین سامنے کھڑی ایک پولیس جپ نے مجھے دیکھ کر سائزن بجایا اور میرا تعاقب شروع کر دیا۔ پولیس کے آگے لگ کر کھانا ایک سستی خیر تجربہ تھا، پر گھڑی یہ احساس تھا کہ اچھی دھماکا ہو گا اور ایک انگلی کی گولی پشت میں گھس جائے گی۔ مزنگ جو جگہ تک پہنچتے پہنچتے میں نے تین چار بار مڑ کر دیکھا۔ پولیس جپ سب سے آگے تھی۔ اس کے پیچھے ٹریفک پولیس کے ساراجنٹ تھے اور آخر میں سفید نیوٹا بڑی شان سے لڑائی چلی آ رہی تھی۔

فیروز پور روڈ پر اچھرو موٹر تک تو خیرت گزری لی۔ جوئی سرکے کنارے کھلی سڑک پر پہنچا عقب سے اوپر۔ تین گاڑیوں ہوئے۔ یہ سیون ایم ایم تھی۔ ایک گولی سنسنی ہوئی میرے پهلوسے گزری۔ دوسری موٹر سائیکل کی بازو میں گھس گئی اور تیسری نے میرا بازو چھید دیا۔ دروہی ایک شدید لہر پر جس میں دوڑ گئی۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا۔ لگا۔ پولیس کی جپ اب تیزی سے میرے قریب پہنچ رہی تھی۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ موٹر سائیکل سمیت سر میں آ جاؤں اور تیر کر دوسری طرف پہنچ جاؤں لیکن پھر میں نے موٹر سائیکل کو بائیں طرف ایک ذیلی سڑک پر موڑ دیا۔ دائیں طرف ایک گھٹ نظر آیا۔ یہ نیوٹو سٹی ٹیمپس ہی کی کوڑا عمارت تھی۔ شام کے جھنڈے میں گیت پر ایک فری انڈیا اوپنر عمر چوکیدار کھڑا تھا اور اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے تاریکی کا ہی حصہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل کو تیزی سے اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو حیرت انگیز پھرتی سے اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ گیت اُدھ کھلا تھا۔ میں نے ٹانگ کی ضرب سے اسے مزید کھول دیا اور موٹر سائیکل اندر لپٹا چلا گیا۔ میرے عقب میں گاڑیوں کے پچھے چرچائے اور وہ بھی گیت میں داخل ہو گئیں۔ میں نے موٹر سائیکل ایک نیم روشن برآمدے میں پہنچی، قیص کے اندر ہاتھ ڈال کر ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور کشادہ بیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر آیا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں ایک گرو ہاٹل میں گھس آیا ہوں۔ جوئی میں نے بیڑھوں کے اختتام پر ایک طویل برآمدے میں قدم رکھا، دوڑ بالکونی میں کھڑی ایک لڑکی چہنچہنے والے انداز میں پکاری۔ اس کے ساتھ ہی دائیں جانب ایک دروازہ کھلا اور درختوں لڑکیاں حیران پریشان چہرے بنائے باہر نکل آئیں۔ میں نے ریوالور دوبارہ لباس میں چھپا لیا۔ لڑکیوں میں سے کئی ایک کے ہاتھ میں کھانے کے پیچھے اور پلیٹیں وغیرہ نظر آ رہی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میس میں سے برآمد ہوئی ہیں۔

”کون ہو تم؟“ ایک ساتھ کئی سُر ملی آوازیں اُبھریں۔ میں نے ایک ہاتھ سے زخمی بازو دیا اور اکتانچہ لیے میں کہا ”کچھ غنڈے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ پلیز میری مدد کیجئے۔“

لڑکیاں ہراساں نظر آنے لگیں۔ نیچے پولیس جپ کا سائزن گونج رہا تھا اور میں کہہ رہا تھا کہ غنڈے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اتنے میں ایک خوبصورت لڑکی بیڑھوں سے بھاگتی ہوئی اوپر آئی۔ ”وہ برآمدے تمہاری موٹر

سائیکل بڑی ہے؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”ہاں۔ ہاں۔“ میں نے ہلکا کر جواب دیا۔

”خیر پہلی کالج میں پڑتے ہو؟“

”جی۔ ہاں۔“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اقرار میں سر ہلاتا مناسب سمجھا تھا۔ لڑکیوں نے مجھے یوں بھانپا جیسے مرغیوں کے نرم و نازک پر چوڑوں کو ڈھانچتے ہیں۔ وہ تیزی سے مجھے طعام گاہ میں لائیں اور ایک لٹلی دوواڑے سے گزار کر اور ایک تنگ زینہ چڑھا کر اسٹور نما تاریک کمرے میں لے آئیں۔ مجھے سے موٹر سائیکل کے بارے میں پوچھنے والی لیڈر نما لڑکی نے مجھے اسٹور روم میں دھکیلا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

ان دنوں کالونی اور نیوٹو سٹیوں میں ہنگامے ہو رہے تھے اور طلبہ کی پولیس سے سختی ہوئی تھی۔ جس موٹر سائیکل پر میں سیان پہنچا تھا وہ دیکھنے میں ہی کسی اسٹوڈنٹ کی نظر آتی تھی۔ اس کے پینڈل میں فائل بھی اڑی ہوئی تھی، اس حوالے سے مجھے بھی کوئی سینئر اسٹوڈنٹ سمجھ لیا گیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ موٹر سائیکل کی ٹینگی پر ”سینئر“ کا بڑا سا اسٹیکر لگا ہوا تھا۔ اسی اسٹیکر کو دیکھ کر لیڈر نما لڑکی نے مجھ سے بیل کالج کے بارے میں سوال کیا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد مجھے اسٹور سے نکالا گیا تو مطلع صاف ہو چکا تھا۔ پولیس اور متحال شاہ کے ہر کارے میری تلاش میں ناکام ہو کر واپس جا چکے تھے۔ پولیس میری تلاش میں ہاسٹل کے اندر داخل نہیں ہوئی تھی۔ حالات ایسے تھے کہ وہ ایسا کری نہیں سکتی تھی۔ چند روز پہلے ایک مظاہرے کے دوران پولیس سے یہ غلطی سرزد ہوئی تھی اور اس وقت سے ہاسٹل کی طالبات سراپا احتجاج بنی ہوئی تھیں۔ گولی میرے بازو کے اندر ہی تھی۔ میں نے خود ہی خون روکنے کے لئے پٹی باندھ لی تھی۔ بازو سے گولی نکالنے کے لئے میڈیکل کی دو طالبات نے ذہن ایک کمرے میں میرا چھوٹا سا آپریشن کر ڈالا۔ اس ہاسٹل میں ان دونوں طالبات کی حیثیت مہمان کی تھی۔ نوبے سے پہلے انہیں واپس لیے جانا تھا لیکن میری دیکھ بھال کے لئے انہوں نے وہیں رُکنے کا فیصلہ کیا۔

میری خون آلود قیص انار دی گئی تھی۔ میں ایک نرم و نازک بیڑ پر کھٹکے سے ٹیک لگا کر نیم دراز تھا اور اس خوف میں ڈوبا ہوا تھا کہ معلوم نہیں کب میرا بھانڈا چھوٹ جائے جن دو طالبات نے میرے بازو کی چرچہ باز کی تھی ان میں سے ایک لڑکی کے چہرے پر بار بار میری نگاہ جم جاتی تھی۔ جوئی میں اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں دھماکا ایک

سختی سی میرے رگ دے میں جھینٹے لگتی۔ نو دس برس پہلے جل کوٹ میں غزالہ کو آخری بار دیکھا تھا۔ جل کوٹ سے نکلے ہی ماضی سے میرا ہر رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے چولستان کے اس دور دراز قصبے میں ایک نئی زندگی شروع کی تھی ”ایک بالکل مختلف شخص کے روپ میں۔ ماضی کی کوئی آواز میرے کانوں سے نکلتی تھی نہ کوئی چہرہ آنکھوں میں چکا تھا اور نہ کوئی راستہ میرے قدموں تلے آیا تھا۔ میں اپنی جہنم بھوی سے اور اس سے وابستہ تئلیوں سے بہت دور۔ بہت دور رہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ چچا پلیس، چچی فائبر، غزالہ اور نیوٹا کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ وڈے مہان زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ اس کی حویلی کے سامنے رکھی ہوئی فوت اب بھی بیٹی جاتی ہے یا کوئی سرکش ہاتھ اسے بھاڑ کر کھڑے کھڑے کر چکا ہے۔ برسوں بعد کی گرد سے جھانکنے والا ایک مانوس چہ میری آنکھوں کے سامنے آیا تھا اور دل کی زمین پر زلزلے برپا ہونے لگے تھے۔ یہ وہی چوہا تھا جو کبھی میرے دل کا داغ تھا اور پھر پھیل کر میری زندگی کا داغ بن گیا تھا۔

وہ بھی گاہے گاہے چوہک کر میری طرف دیکھنے لگتی تھی جیسے کچھ کہنا چاہی ہو اور کہہ نہ پا رہی ہو۔ جوئی اس کی ساتھی لڑکی کسی کام سے باہر گئی، میں نے اس کی طرف انگلی اٹھائی ”تم۔ تم۔ غزالہ ہو؟“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ اس کی آنکھوں میں شک کی موندلاہٹ، یقین کی چمک میں بدل گئی۔

”اوس۔ تم۔ تم شاہ جہاں ہو؟“ اس نے کہا۔

اس وقت اچانک دوسری لڑکی اندر آئی۔ ہمیں چپ ہونا پڑا۔ اس دوسری لڑکی کا نام طاہرہ تھا۔ وہ میڈیکل کالج میں تھوڑا نیکی کی طالبہ تھی۔ بڑے شوخ لمبے میں ہوتی تھی اور بہت زیادہ ہوتی تھی۔ بچھلے دھکے میں وہ پچیس چھپیں ہزار الفاظ تو ضرور استعمال کر چکی تھی۔ ان میں سے چار ہزار الفاظ اس نے صرف اتنی سی بات سمجھانے میں استعمال کئے تھے کہ میرے جسم پر بہت گھنے بال ہیں جو اسے بے حد اچھے لگتے ہیں کیونکہ اس کے معیتر کے جسم پر بھی ایسے ہی بال ہیں۔ اب اگر میں یہ پوچھ بیٹھتا کہ اپنے معیتر کے جسم کے بال اس نے کیسے دیکھ لئے تو یقیناً جواب میں صبح ہو جاتی۔ طاہرہ بول رہی تھی اور اس کی آواز کہیں بہت دور سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میرے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے غزالہ تھی اور اس کے سوا میں ہر شے بھول گیا تھا۔

غزالہ کلی سے نوکشت پول میں ڈھل چکی تھی۔ اس کے سراپا میں قیامتیں چھپی ہوئی تھیں۔ نگاہ اس کی طرف اٹھتی تو جھٹکا بھول جاتی تھی۔ جو قیامت اس نے دس برس پہلے مجھ پر توڑی تھی وہ اسے بھولی نہیں تھی۔ گزرتے ہوئے وقت نے اس کے اندر احساس ندامت بگایا تھا اور یہ احساس بڑھتے بڑھتے اب ضمیر کی غش بن چکا تھا۔ ایک کک بھی وہ وہ شب و روز اپنے سینے میں چھپاتے پھرتی تھی۔ وقت سب سے بڑا انقلابی ہے اور اس انقلابی وقت نے غزالہ کے تنگی بیکر میں جو تک لگا رکھی تھی۔ وہ مجھ سے ملی تو دس برس پہلے خاک اوڑھ کر سو جانے والا ماضی ایک اعترافی لے کر بیدار ہو گیا۔

پھر ایک روز نال روڈ کے ایک دستوران میں میں اور وہ نیم تاریک گوشے میں آئے سامنے بیٹھے تھے۔ غزالہ مجھے اسنے اور اسنے اہل خانہ کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے والد نے جل کوٹ میں اپنی زمینیں بیچ دی تھیں۔ پانچ پچھ برس پہلے انہوں نے جرمنی میں اپنا کام شروع کر لیا ہے اور وہیں رہتے ہیں۔ سال میں دو تین بار چکر لگاتے ہیں اور ملی کرواپس چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ گجرات میں رہتی ہے۔ بھائی کرینٹ مائل اسکول میں پڑھ رہا ہے اور وہ کنگ ایڈورڈ میں فورٹھ ایمر کی طالبہ ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کی سائیول والی خالہ بھی لاہور میں شیفٹ ہو چکی ہیں اور گجرات ہی میں رہتی ہیں۔ غزالہ نے کہا ”تمہارے جانے کے بعد ابو اور انی نے تمہیں بہت تلاش کروایا۔ ارد گرد کے رسات میں منادی کروائی۔ مسجدوں میں اعلان ہوا۔ پھر کئی روز اخباروں میں اشتہار بھی آتے رہے۔ آخر سب تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ ابو کو تمہارے گم ہونے کا اتنا دکھ تھا کہ وہ کئی بار پڑنے رہے۔ دراصل انہی دنوں ان کا دل جل کوٹ سے اچاٹ ہو گیا تھا اور وہ لاہور شفٹ ہونے کی باتیں کرنے لگے تھے۔ اور صرف اتنی نہیں ہم سب بھی ہمیں مہس کرتے تھے۔“ ایک لمحہ توقف کر کے غزالہ نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے چہرے پر عجب سارنگ تھا۔ اس رنگ میں سب سے نمایاں غصہ دیکھائی دیتا تھا۔ ایک خاموش نیت ہم دونوں کے درمیان گونج رہی تھی اور کسی کو برہنہ بدن گھوٹ میں ٹھہنے جانے کا منظر ہم دونوں کے تصور میں آتا تھا۔ اس منظر کے تصور میں اترتے ہی مجھے اپنی نگاہ جھٹکائی چاہیے تھی لیکن میں نے نگاہ نہیں جھٹکائی یہ کام غزالہ نے کیا۔ اس کی سرشار چٹکوں نے اس کی آنکھوں کو احاطہ لیا۔ وہ لرزاں آواز میں بولی ”شاہ جہاں اشرمتی کی

لفظ اس احساس کو بیان کرنے کے لئے بہت چھوٹا ہے جو تمہارے جانے کے بعد میرے دل میں گھر گئے ہوئے ہے۔ میں جانتی ہوں، تمہارے اور تمہارے گھرانے کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میری وجہ سے ہوا۔ کاش اس روز نہ۔“ ایک دم اس کی آواز بیٹھ گئی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن بہت جلدی چپ ہو گئی۔

خاموشی کی بھی ایک زبان ہوتی ہے۔ میں اس کے بغیر کے سب کچھ سمجھ رہا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ وہ اپنی زبان سے میرے کانوں میں اظہار ندامت کا رس گھولے۔ میں نے اسے فحاش سے بچانے کی کوشش نہیں کی۔ میرے دل میں اس کے لئے رحم کا شائبہ تک نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں اس کی طرح صاحب اختیار ہو جاؤں اور سارا دنیا میری نظر کرم کی طالب ہو جائے تو پچھتائیں گی کی لڑکی وہ آخری جیجی قاہرہ اور اس کی ہم صفت بنی کے لئے نفرت کا ایک سمندر بلکورے لیتا رہتا تھا اور یہ سمندر اس وقت بھی بلکورے لے رہا تھا۔ تاہم میں نے چہرے پر نرم خطوط ابھار رکھے اور دستوران کے اس پر سکون گوشے میں غزالہ سے ہم کلام رہا۔

اسے قریب سے دیکھ کر اور سن کر میرے اندر کا ختم شخص پوری طرح بیدار ہو گیا تھا۔ میرے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی تھی کہ جیجی قاہرہ کی بیٹی سے انتقام لوں۔ چہرے پر ایک نیا چہرہ سما کر اس سے یوں ہی ملتا رہوں اور اسے ایک ایسے راستے پر لانے کی کوشش کروں جہاں اس کا ہر قدم میری طرف اٹھے اور اس کی ہر سوچ کا مرکز و محور میری ذات ہو۔ غزالہ سے پہلی ملاقات میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اپنے مقاصد کے حصول میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوگی۔ آنے والے دنوں میں یہ اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری یلغار سے پہلے ہی میرا ہمزاد اس لڑکی کو جھجکا ہے۔ یہ ہزار کون تھا؟ شاید وہی احساس ندامت جو غزالہ کے ساتھ ہی ملی چل کر جوان ہوا تھا اور ہر گز اسے میری یاد دلانا نہ تھا۔ اب وہ ایک حسین دوشیزہ تھی۔ وہ بہ طور پر خود سے یہ توقع رکھ گئی تھی کہ اس کے حسن کے احترام میں اسے معاف کیا جاسکتا ہے اور اس کی عمو انگریز شخصیت کے صلے میں اس سے محبت کی جاسکتی ہے۔

میرا دھوکہ اسے یقین دلانے لگا کہ میں ماضی کی رنجشوں کو فراموش کر کے اس کی ذات میں گم ہوتا جا رہا

ہوں۔ اس احساس کے رد عمل میں وہ خود بھی میرے اندر گم ہونے لگی۔ اس کے گھروالوں کو میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا بلکہ وہ خود بھی میرے بارے میں کیا جانتی تھی۔ اس کی نظر میں ایک نوجوان ہونمارا وکیل تھا۔ میری بہن شفتا اسے نسیان میں تنظیم تھی اور میں غنڈہ لاہور میں کوئی اچھا روزگار حاصل کرنے والا تھا۔

وہ بے خبر تھی کہ میں چار افراد کا قاتل ہوں۔ دو صوبوں کی پولیس میرے پیچھے ہے اور چولستان کے خطرناک ترین غنڈے یاگل کتوں کی طرح مجھے کھونٹے پھرتے ہیں۔ میں نے یہ سب کچھ بڑی کامیابی کے ساتھ اس سے چھپا رکھا تھا۔ اس نے بی بی چاہا کہ والدین کو میرے بارے میں بتادے اور مجھے ان سے ملوانے لگیں میں نے ہیرا راس اس ارادے سے باز رکھا۔ کبھی کبھی وہ کہتی ”شاہ جہاں! آپ اپنے بڑا سرا رکھیں ہیں۔ کسی وقت مجھے لگتا ہے آپ کسی جاسوسی فلم کے کردار ہیں جو کسی لڑکی سے ملنے کے لئے اندھیرے سے نکلتا ہے اور اندھیرے ہی میں غائب ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس کے پیچھے لگے رہتے ہیں، کبھی وہ ان سے پچھا ہے، کبھی ان کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔“

آخر غزالہ کو مطمئن کرنے کے لئے میں نے ایک فرضی کہانی اسے سنا دی تھی۔ اس کہانی میں چولستان کے ایک وزیرے اور اس کے گماشتوں کا ذکر تھا جنہیں دلیلوں کے ایک پیتل نے کسی کیس میں سزا دلوائی تھی۔ اس پیتل میں میں بھی تھا۔ اب وہ لوگ ہمیں نقصان پہنچانے کے درپے تھے اور خواہ مخواہ اٹھتے رہتے تھے۔ میں نے غزالہ کو یقین دلایا کہ جلدی یہ یقین قائم ہو جائے گا۔ معلوم نہیں غزالہ میری توضیح سے مطمئن ہوئی یا نہیں۔ مجھے اس سے غرض بھی نہیں تھی۔ میرے لئے یہی کافی تھا کہ وہ دستور مجھ سے مل رہی تھی اور میرے لئے اس کی خود پسندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ آخر ایک ایسا ایجنٹ مل گیا جب وہ مکمل طور پر میرے رنگ میں رنگ گئی۔ اب وہ ایک بکا ہوا پھل تھی جو میری ضابطہ طبع کے لیے ہر وقت تیار تھا۔ میں جب چاہتا ہاتھ بڑھا کر اسے توڑ لیتا۔

ابھی کامیابی کے نشے نے مجھے سرشار کر دیا۔ میرے اندر کا ختم الزنج و خشی پوری طرح بیدار ہو گیا۔ میں جیجی قاہرہ کی بیٹی کو برباد کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے حسین سراپا کو کچھ کر عبرت نشان بنا دینا چاہتا تھا اور میرے خیال میں یہ سزا ان عورتوں کے ڈھانے ہوئے ستم کے مقابلے میں معمولی تھی۔ انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا میرے ساتھ۔ انہوں نے

میرے اور شفتا کے سر سے باپ کا سایہ چھینا۔ ماں کی گود چھینی، نیم کا پیر چھینا، پنوں والا آنگن چھینا اور آخر میں زندہ رہنے کا حق بھی چھین لیا۔ ان عورتوں کی بدولت مجھے بھرے بازار میں جانوروں کی طرح مارا گیا۔ گھوٹوں میں گھسایا گیا اور اس طرح باپ کے سامنے لایا گیا کہ میرے جسم پر گزرنے کا ایک آثار نہیں تھا۔ آہ۔ میں وہ گھوٹاں جیسے بھول سکتا تھا، نہیں بھیل سکتا تھا اور جب یاد کرنا تھا تو خون کے آنسو روتا تھا۔ وہی کرب میرے رگ دے کو چڑھتا تھا جو ڈسے میاں کے کوڑے سے لپک کر میری غلی پٹ میں سرایت کر گیا تھا اور جوش کے لئے وہاں ٹھہر گیا تھا۔

پھر ایک روز میں اور غزالہ بھول کے ایک کمرے میں تنہا تھے۔ یہاں سب کچھ میرے بس میں تھا۔ میں اسے قدم قدم چلاتا خود پسندی کی ایک ایسی منزل پر لے آیا جہاں اس کے سامنے صرف میں ہی میں تھا۔ وہ میری دسترس میں تھی۔ یہ ایک ایسا دور رہا تھا جہاں سے کسی بھی سمت سر کیا جاسکتا تھا۔ اور پھر ایک دم میرے قدم زمین میں بیوست ہو گئے تھے۔ مجھے روکنے والی کاشے تھیں؟ شاید مرحوم باپ کی دور افتادہ صدا، شاید ماں کی گھمبیاں آنکھیں، شاید خون میں تھرتے ہوئے وہ کردار ساز جڑبے جو مجھے وراثت میں ملے تھے۔ میرے ہاتھ لرز اٹھے تھے، آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے پھوٹ رہے تھے، میں نے غزالہ کو جھٹک کر دور پھینک دیا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھتی چلی گئی تھی۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے“ میں حلق کی پوری قوت سے دہرایا تھا ”دفع ہو جاؤ کیتا۔“ جاؤ۔ اپنی پیاری ماں کے صدمے میں نے ہمیں معاف کیا۔ جاؤ۔ چلی جاؤ۔“

وہ بے ہوش ہوتے ہوئے چلی گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تھا اور دندا تاہوا اس کی طرف بڑھا تھا۔ پھر اسے قریباً سمیٹ کر باہر نکال دیا تھا میں نے۔ میرا خیال تھا کہ غزالہ اب بھی مجھے اپنی صورت نہیں دکھائے گی۔ میں اسے آنکھوں سے ہی نہیں اپنے ذہن سے بھی دور کر چکا تھا۔ اور پھر ذہن میں اتنی جگہ ہی نکال چکی کہ کوئی غیر ضروری سوچ وہاں ٹھہر سکتی۔ ان دنوں بڑی ”معروف“ زندگی تھی میری۔ میں جرم کی دنیا میں پورے طعشق سے قدم رکھ چکا تھا۔ اس ضمن راستے پر آغاز ہی میں میرا سامنا شکر عزا جیسے بدنام زمانہ شخص سے ہو گیا تھا۔ وہ بڑی اونچے بوم میں اڑتا تھا اور یہ بلندی مجھے بھی بہت اوپر لے گئی تھی۔ وہ بنگالوں کے دن اور بنگالوں کی راتیں تھیں۔ شب و روز کے ہر پہل میں گولیوں سننا سننا، تجروں

کی چمک و چمکیوں کی گھن گرج اور رقص و سرور کی فتنہ خیزیاں تھیں۔ جل کوٹ کے وڈے میاں جیسے بدواغ چوہدریوں کا دھڑن تختہ کر دینا اب میرے لئے بائیں ہاتھ کا جیل تھا اور میں یہ مکمل ضرور کھلنا چاہتا تھا۔

ایک مرتبہ اپنی "مصدقیات" سے کچھ وقت نکال کر میں جلی کوٹ پہنچا تھا۔ میں ایک کار میں سوار تھا۔ اس کار میں میرے ساتھ چار افراد سوار تھے جنہیں ضلع لاہور میں چوٹی کا غارت کر سمجھا جاتا تھا۔ ان غارت گروں کے علاوہ میری کار میں اتنا اسلحہ موجود تھا جس سے پورے نہیں تو نصف جل کوٹ کو یہ آسانی موت کی نیند سلا یا جاسکتا تھا۔ قریب بارہ برس کے بعد میں نے وہ جگہ دیکھی تھی جہاں ایک نو عمر لڑکے کے سر پر آسمان توڑ کراس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچی گئی تھی۔

اب وہاں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ وہ زمین کا سا تباہان لگا رہا اور اس میں رکھی ہوئی گناہی ساز کی کثرت بھی موجود نہیں تھی لیکن وڈیوں کی حویلی نہیں بدلی تھی۔ اسی شان اور ودبے سے کھڑی تھی جیسے بارہ سال قبل میں نے دیکھی تھی۔ میں کسی سحرانی کولے کی طرح حویلی میں ٹھس گیا تھا۔ حویلی کے وسیع و عریض صحن میں دریاں بھی ہوئی تھیں اور ایک مقامی دینی مدرسے سے کوئی ڈیڑھ سو طلبہ قرآن خوانی میں مصروف تھے۔ پتا چلا کہ آج وڈے میاں، چھوٹے میاں اور ان کے ایک بچا زاد کی دوسری بری ہے۔ یہ تینوں افراد دو سال پہلے ایک جھڑے میں ہلاک ہو چکے تھے۔ خاندانی رقابت داروں نے انہیں گھات لگا کر مارا تھا اور لاشیں گھوٹوں تلے روند ڈالی تھیں۔

میرے اندر انتقام کے شعلے چھن پھلا کر سرخ کر رہے تھے۔ میں جانتا تھا میری جگہ وڈے میاں ہوتا اور میں وڈے میاں کی جگہ ہوتا تو اس روز حویلی میں شعلے ضرور بجھکتے ان شعلوں میں وڈا میاں نہ جلتا تو اس کے اہل خانہ ضرور جلتے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ضرور زندگی سے محروم ہوتے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے غضب کی آگ کو بیٹے کے آتش کدے میں سمیٹ کر اور اپنے آبائی گھر پر ایک نظر ڈال کر میں جل کوٹ سے واپس آیا تھا۔ اس عہد کے ساتھ کہ ایک نہ ایک دن مجھے پھر جل کوٹ آنا ہے۔

مجھے یاد ہے اپنے اندر کی نیلی آگ کو سڑ کرنے کے لئے اس رات میں نے بے تحاشا شراب پی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں بوتلیں لئے میں رات گئے تک لاہور کے بازار صحن میں گھومتا رہا تھا۔ میں نے ہوائی فائرنگ کر کے چوہدریوں کی رنگین کھڑکیاں توڑ دی تھیں، مگر تب سے بد معاشوں کو اٹھا اٹھا

کر چٹا تھا۔ راہ گیروں کو ٹھوکریں رسید کی تھیں۔ کون تھا؟ مجھے روکتا۔ کس میں ہمت تھی کہ جہانی استاد کی راہ میں مزاحمت کرتا؟ میری بادشاہی مسجد کی طرف نکل گیا۔ اس کا اونچی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتا منو پارک میں پہنچا تھا۔ یہاں میری شاندار گردن کھڑی تھی۔ میرا تجارتی کارڈ گنگو اس کے قریب جو کسی سے پرادے رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے سنبھال دیا تھا اور گاڑی کی طرف لے آیا تھا۔ ڈرائیو نے فوراً ہی اپنی نشست سنبھال لی تھی۔ میں نے گاڑی میں بیٹھنا چاہا تھا جب گنگو نے میری توجہ سامنے فٹ پاتھ کی طرف دلائی تھی۔ میں نے دھندلائی نظروں سے دیکھا، ایک سفید واکس وین کے قریب غزالہ کھڑی تھی۔ گنگو نے بتا: "بی بی ایک کھٹے سے آپ کا انتظار کر رہی تھی"

میں نے غور سے غزالہ کو دیکھا تھا، میری گاڑی یہاں کھڑی دیکھ کر وہ ٹوک مچی تھی۔ سفیدی مائل لباس میں وہ چاندنی میں نمایا ہوا تاج محل دکھائی دے رہی تھی۔ خوبصورت، روہان انگیز اور آواں۔ میں، میرا گارڈ اور دو دیگر نبیاً ڈرائیور گل باز اس کے ارد گرد کھڑے تھے۔ تاج محل اور ایسے گندے ماحول میں؟ یا شاید وہ بادشاہی مسجد بھی جو بازار صحن کی غلاط میں شمر سار کھڑی تھی۔

"کیوں کھڑی ہو یہاں۔ کیا لینے آئی ہو؟" میں پہنچا تھا۔ سڑک سے گزرتے ہوئے لاکڑا سا نیل سوار مڑ مڑ کر مجھے دیکھ رہے تھے۔

"شاہ جہاں! میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ پلیز میرے ساتھ چلو؟" وہ افریقی سے بولی تھی۔

"میں لعنت بھیجتا ہوں تجھ پر اور تیری "پلیز" پر۔ چلی جاؤ یہاں سے۔ گیٹ لاسٹ۔ آئی سے گیٹ لاسٹ" میں گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈھیر ہو گیا تھا اور میرے کارندے مجھے لے کر بڑی سڑک پر آگئے تھے۔

"عورت ایک معنی ہے مجھے کا نہ سمجھانے کا" اس منقہ! کی صداقت مجھ پر انہی آشوب و نون میں ظاہر ہوئی تھی۔ مستقبل کی ایک خوبصورت اور نہایت ذہین ڈاکٹر ایک بد معاش سے محبت کر رہی تھی۔ دھکارتے جانے کے باوجود اس شخص کا سایہ بنی ہوئی تھی جو قاتل، ڈیک، شرابی، عیاش اور جنونی سب کچھ تھا۔ وہ ایک نرم و نازک بزدل تھی اور اس بات پر تمسخر تھی کہ گوشت نوچ لینے والے اور خون پی جانے والے عقاب کے گھونٹے میں جانے گی۔ اس پر سب کچھ عیاں ہو چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں ناک جرم کی دلدل میں دھنس چکا ہوں۔ میری واپسی کی کوئی امید ہے اور نہ میں

واپس آنا چاہتا ہوں پھر بھی وہ میرا چچا کر رہی تھی۔ انہی راستوں پر چلتے چلتے آخر وہ شام آئی تھی جب ایک روز شفا مجھے ملی تھی اور اس کے لئے سے میری زندگی ایک ایسے انقلاب سے آشنا ہوئی جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اپنی داستان کے شروع میں میں اس واقعے کا ذکر کر چکا ہوں۔ شفا مجھے جرم کی دلدل سے نکالنے کے لئے آئی تھی۔ اور وہ یہ کام کر رہی تھی۔ کیوں کر گزری تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ یہ کام کر سکتی تھی۔ روئے زمین پر وہی تھی جو یہ کام کر سکتی تھی۔ میں اس کے آنسوؤں میں یوں بہ گیا تھا کہ سیدھا حد الت کے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔

وہ زمانہ ایک انسان کے اندر سے نئے انسان کی نمود کا زمانہ تھا۔ حالات، پھیلاؤ، وکیل، عدالتیں اور جج ہوئے برے منظر ایک بار پھر میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ عدالتوں کی کارروائی طویل اور گنگناہک تھی۔ میرے حق میں یہ بات جاری تھی کہ جو افراد میرے ہاتھوں قتل ہوئے ان میں اکثریت قانون کے مفروہوں کی تھی یا وہ ایسے لوگ تھے جو عدالت کے کمرے میں کھڑے ہوتے تو موت کا پروانہ ان کے ہاتھوں میں تھما دیا جاتا۔ میں نے پہلے چار قتل اپنی معصوم بہن کی جان اور آہو بچاتے ہوئے کئے تھے۔ یہ حقیقت بڑے جاندار طریقے سے عدالت کے سامنے پیش کرنے کا سرا میرے استاد حرم اور بلند پایہ قانون داں جناب ظفر احسن کے سر پر دراصل یہ ظفر احسن ہی تھے جن کے مسلسل اصرار پر شفا مجھ تک پہنچی تھی اور اس نے مجھے پیش ہونے پر آمادہ کیا تھا۔ میرے قاتل وکیل کی کوششوں سے جویری کے دل میں میرے لئے نرم گوشے پیدا ہوئے۔ آخر کار ہائی کورٹ میں میری اپیل منظور ہوئی اور میں جو سیشن کورٹ سے چھانسی کا سختی قرار پا چکا تھا زندگی کی طرف لوٹ آیا۔

مجھے مختلف مقدمات میں بارہ سال قید یا شقت کی سزا ہوئی۔ اس قید کا سلا سال میں نے لاہور جیل میں کاٹا۔ لاہور میں ہی میرے ہاتھوں ایک مقدمہ کے دانت ٹوٹنے کا واقعہ ہوا۔ نتیجے میں قید کا ایک سال کانٹے کے بعد بھی میری قید میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ شفا کی آہ و زاری نے میرے دل میں زلزلے برپا کر دیے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جس طرح جرم کی دنیا کو خیر باد کہہ کر جیل میں آیا ہوں اسی طرح اپنے اندر کے استاد جہاں کو بھی خیر باد کہہ کر جیل میں ایک سیدھا سا رہے ضرر قیدی بن جاؤں گا۔ میری زندگی کا اولین اور آخری مقصد صرف اور صرف سزا بھگت کر اس دنیا میں واپس جانا ہو گا جہاں میری بہن شفا میری راہ دیکھ رہی ہے۔

مقدمہ والے واقعے کے بعد مجھے ایک جیل میں قفل کر دیا گیا۔ ایک میں میں نے تین سال کاٹے تھے جب کچھ مڑا سرا لوگ میرے درے ہو گئے اور مجھے مارنے کی کوشش کرنے لگے پھر نور محمد کے قتل کا کوئی واقعہ رونما ہوا اور وہ حادثوں بھری رات مجھ پر وارد ہوئی جب میں ایک جیل سے انگو ابو کر آتا تھا تو دریاں کی حویلی میں پہنچ گیا تھا۔

گڑوالے چالوں کے حوالے سے سوچ کا جو طول سفر شروع ہوا تھا وہ پچیس پچیس برسوں کا فاصلہ طے کر کے پھر اپنے نقطہ آغاز پر پہنچ گیا۔ میں خیالوں کی دنیا سے واپس اسی خیمے میں گیا جو رات کے سمندر میں سرودی کی لمبوں پر ڈوب ابھر رہا تھا اور جس کی ظہیری ہوئی فضا میں انجمنی کی آگ بجھتے بجھتے اب راکھ بن چکی تھی۔ خیمے سے باہر ہاتھوں کے کتوں کا شور تھا اور خیمے کے اندر دو افراد کے خزانے گونج رہے تھے۔ اس کے علاوہ پوری بستی میں کوئی آہٹ، کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میری آنکھیں اب نیند سے بوجھل ہوتا شروع ہو گئی تھیں۔ سچ کہتے ہیں نیند ٹھوس پر بھی آجاتی ہے۔ مجھے بھی اس ٹھوسے ہوئے خیمے اور اس پر خطر اندھیرے کے حصار میں نیند ہونے لگی۔ میں نے مکمل ڈوب کر کے اپنے گرد اچھی طرح لپیٹا، رانا نقل یا نقل تار حالت میں بیٹے سے لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ شب کا باقی حصہ جیسے ہوا کے ایک جھوٹے کے مانند گزر گیا۔ کوئی گنجوڑ کر مجھے جگا رہا تھا۔ میں نے آنکھ کھلی۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ خیمے میں اجالا پھیلا ہوا تھا۔ مجھے جگانے والا خود لشکر خاں تھا۔

"اٹھو برادر! تمہارے لئے ایک اچھا خبر ہے" اس نے اپنے مخصوص لباس میں کہا۔

"کیسی خبر؟" میں مکمل کے حصار سے نکل کر بیٹھ گیا۔

"تمہارا بی بی اور بچہ لوگ یہاں پہنچ گیا ہے۔"

دیکھو۔ دروازے سے باہر میرے ساتیان کے بچے" میں نے دیکھا نیلے اور بچہ دونوں موجود تھے۔ وہ اسی لباس میں تھے جس میں میں انہیں لال بی بی اور رشید خاں کے پاس چھوڑ کر آیا تھا۔ نیلے کے زخمی پاؤں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور اس نے ایک بڑی سی مردانہ چٹیل پن رکھی تھی۔ لڑکا اب ہوش میں تھا اور ٹھیک ٹھاک نظر آ رہا تھا۔ نیلے کا بازو تھامے وہ یوں کھڑا تھا جیسے ایک بل کے لئے بھی اسے خود سے جڑا نہ کرنا چاہتا ہو۔ میں اٹھ کر جلدی سے ان دونوں کے پاس پہنچا۔ نیلے گل آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی "آپ تو ایک گھنے کا کہہ کر نکلے تھے؟" اس نے

اجتاج کیا۔

”بس حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ میں واپس نہ لوٹ سکا۔ اوسے دو دوسرے لوگ کدھر ہیں؟“ میں نے لال بی بی ... وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔

”انہوں نے آنے سے انکار کر دیا۔ وہ لال بی بی تو اچھل اچھل کر آئے سے باہر ہو رہی تھی۔ کتنی تھی؟ بیٹے کے بغیر تو میری لاش بھی یہاں سے نہیں جائے گی۔ ماں کی وجہ سے رشید خاں اور اس کی بیوی بھی وہاں رہنے پر مجبور ہو گئے۔“
”یہ ان لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ برا خطرناک کام کیا۔“
لشکر خاں نے کہا۔

میں نے نیلے سے پوچھا کہ ان دونوں کو راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ وہ بولی ”راستے میں تو نہیں ہوئی لیکن کل کلسارا دن سخت پریشانی میں گزرا۔ ہمیں آپ کی طرف سے بڑی فکر تھی۔“ وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”کیا دیکھ رہی ہو اس طرح؟“ میں نے پوچھا
وہ مسکرا کر بولی ”کیا آپ اتنی ہیڈ کاسٹیل ہیں؟“

”کس وجہ سے شک ہو رہا ہے تمہیں؟“ میں نے پوچھا
”اس خط کی وجہ سے“ اس نے وہ خط مجھے دکھایا جو کل لشکر خاں نے مجھ سے لکھوایا تھا۔ وہ بولی ”گر ہیڈ کاسٹیل اتنی اچھی انگریزی لکھتا ہو تو پھر انگریزوں کو انگریزی ادب کا کیزا ہونا چاہئے۔ حیرت ہے اتنی انگریزی پڑھ کر بھی آپ نے یہ نوکری کی ہے؟“

میں نے کہا ”انگریزی پڑھ کر نوکری کی ہے تو اچھا کیا ہے۔ کچھ لوگوں کو تو بے روزگاری کی وجہ سے ڈاکے بھی ڈالنے پڑتے ہیں۔ یہاں وہ گن کہاں ہے جو کل میں نے لال بی بی کو دی تھی؟“ میرا اشارہ سب مشین گن کی طرف تھا۔

لشکر خاں کا ایک ساتھی آگے بڑھا اور کپڑے میں لپی ہوئی گن میرے حوالے کر دی۔ نیچے کے ایک غلاف میں گن کے میگزین اور رائیڈ وغیرہ تھے۔ یہ اشیاء کافی بچت و سحار کے بعد لال بی بی سے حاصل کر گئے تھے۔ وہ اسلحہ شناس جماندہ بڑھیا اس گن کی قدر و قیمت سمجھتی تھی اور کسی صورت اسے خود سے چھوڑنے پر تیار نہیں تھی حالانکہ میں اس کی راتقل بھی خط کے ساتھ ہی ارسال کر چکا تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران ہی ایک گھڑسوار موٹے پر پہنچ گیا۔ وہ لشکر خاں کے ساتھیوں میں سے تھا۔ اس کا کھڑا پسینے سے شرابور تھا اور وہ خود بھی پانی پاتا ہوا کھائی دیتا تھا۔ لشکر خاں کے نزدیک

پہنچ کر وہ چلا گیا لگا کر گھوڑے سے اترا۔ لشکر خاں کے احترام میں جھکا اور اسے کوئی اطلاع دینے لگا۔ غلغلہ یقیناً سنسنی خیز تھی۔ موقع پر موجود لشکر خاں کے بھی ساتھی چوکس نظر آنے لگے۔ وہ لوگ کچھ دیر تک تیرے ہی میں آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پھر چند آدمی سردار بشر گل کے جھوپڑے کی جانب بھاگ گئے۔ لشکر خاں مجھ سے خطاب ہوا۔

”برادر! تم لوگ بھی اپنے خیمے میں جاؤ۔ اپنا ہتھیار متھار چوکس رکھو۔ لی بی سے کٹوہ دے میں رہے۔ سردار عیسیٰ اور شکر ادھر آ رہا ہے۔ امارا گوشہ ہوگا وہ امارے بارے میں جانے بغیر واپس چلا جائے تم امارا مطلب سمجھ رہا ہے نا؟“

”بالکل سمجھ رہا ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
لشکر خاں ہمیں کچھ مزید ہدایات دے کر آگے بڑھ گیا۔ میں نیلے اور نیچے کو لے کر جھوپڑے میں آ گیا۔ میرے ساتھ ایک انجینی عورت کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔ میں نے تجو کو سمجھایا کہ وہ ان دونوں کو جھوپڑے میں رکھے اور ہو سکے تو قبلہ کو کسی پائندہ عورت کا لباس مٹا کر دے۔

”خیر ہے میسجی؟ آپ۔ بڑے گھبرائے ہوئے لگتے ہیں۔“ تجو نے پوچھا۔

”بس کچھ ایسی ہی بات ہے۔ سمجھ لو کہ کچھ لوگ ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ رہے ہیں۔“ اس سے پہلے کہ تجو مزید سوال کرتی، میں اپنے خیمے کی طرف لوٹ آیا۔ خیمے میں میرے دونوں ساتھی بھی اب جاگ چکے تھے اور ہوشیار باش نظر آتے تھے۔ میری بھاری بھر کم سب مشین گن دیکھ کر وہ بہت ہوش ہوئے اور اس میں دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے سب مشین گن کا ایک میگزین لود کرنے کے بعد ایچ کر لیا اور دوسرا تیار حالت میں پاس رکھ لیا۔ ابھی ہمیں خیمے میں تھے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک کھنٹی کی صدا بستی میں گونجنے لگی۔ یہ صدا بستی کے پاس ہی ایک اونچے نیلے سے آ رہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر پہلے سے موجود اضطرابی کیفیت اب شدید ہو گئی تھی۔ ایک شخص نے اٹھ کر خیمے کے روزن سے باہر جھانکا۔ اس دوران لشکر خاں کا ترحی ساتھی جمعہ خاں آندھی اور طوفان کی طرح خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے ہم تینوں کو ساتھ لیا اور بستی کے مغربی کنارے پر پہنچا۔ یہاں اور بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں سے کچھ کے ہاتھوں میں راتقلیں تھیں اور کچھ کلایوں اور

لاٹھیوں سے مسلح تھے۔ یہ سب کے سب بستی کے لوگ تھے۔ سردار بشر گل تیر تیر لہجے میں انہیں کچھ سمجھا رہا تھا۔ ان سے کچھ فاصلے پر لشکر خاں اور اس کے ساتھی بھی صف بندی میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی قلعے میں محصور سپاہی دفاعی پوزیشن سنبھال رہے ہیں۔ جیسا کہ میں پتا چکا ہوں زوئے شت کی یہ پائندہ بستی خیب میں واقع تھی۔ یہ ایک راوی سی تھی جس کی تین اطراف میں بالکل عمودی دیواریں تھیں۔ ان اطراف سے کوئی بستی میں داخل ہونا چاہتا تو اسے بیشتر جھکوں پر باقاعدہ رستے یا طویل میزمری کی ضرورت پڑتی۔ ایسی کئی چھنی زمینیں اس علاقے میں عام ہیں۔ ہموار زمین پر چلنا ہوا مسافر ایک دم خود کو گمراہی کھائی کے کنارے پاتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ اندر میرے میں جا رہا ہوتا تو اپنا کیا شکر کرتا۔ اس بستی کی تین اطراف بھی ایسی ہی کئی چھنی بلند زمین سے محفوظ تھیں۔ چھنی سمت میں ڈھلوان تھی اور ہمیں سے بستی میں آمدورفت ہوتی تھی۔ اب اس سمت کو چور چاندی سے محفوظ کیا جا رہا تھا۔ حکمت عملی میں یہ اچانک تبدیلی معلوم نہیں کیوں کر رونما ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر لشکر خاں لگتا ہوا میری طرف آیا۔

”برادر! تم امارا ہمسایا ہے۔ ام نہیں چاہتا کہ تم لڑے۔ تم بیچے اپنی بی بی اور بچہ لوگ کے پاس جاؤ۔ لیکن تمہارا یہ گن امارا بہت مدد کر سکتا ہے۔“

میں نے کہا ”خان! پارسے! ہم بھی تمہاری مدد کر سکتا ہے لیکن کچھ پتا چھنی چلے کیا معاملہ ہے؟“
وہ تیزی سے بولا ”اچھی دو آدمی عیسیٰ جان کے پاس سے بھاگ کر امارے پاس آیا ہے۔ بالکل بھروسے کا آدمی ہے وہ لوگ۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اس بستی میں عیسیٰ جان کا ایک مخبر موجود تھا۔ اس کا فرے بچے نے سارا بھید کھول دیا ہے۔ آج صبح اس نے جا کر عیسیٰ جان کو بتایا ہے کہ سردار بشر گل امارے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اب عیسیٰ جان یہاں ام کو ڈھونڈنے نہیں آ رہا۔ ساری بستی کا فنی پلید کرنے آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ڈیڑھ سو سے کم آدمی ہیں۔ اب اس کے سب ہتھیار بند ہے۔ خوہ بہت کڑا ہوا ہے۔ پھر جو بھی ہوا ہے اس کا سامنا تو اب کرنا ہے۔ اور امارے خدا نے چاہا تو ام کرے گا۔“

میں نے کہا ”خان! تم مجھے برادر بھی کہتے ہو اور یہ بھی سمجھتے ہو کہ میں تمہیں یہاں چھوڑ کر بیچے عورتوں کے پاس جا بیٹھوں گا۔ ذرا سوچو ایسا ہو سکتا ہے؟“
”میں برادر! امارا یہ مطلب نہیں۔ ام تمہارا حوصلہ

جاتا ہے۔ جو شخص عیسیٰ کی قید سے نکل سکتا ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔“
”اگر کمر کچھ نہیں خان۔ ہم اسے لڑیں گے۔ اب جو بھی ہوتا ہے ہم سب کے ساتھ ہوگا۔“
تھوڑی سی بحث و سحار کے بعد لشکر خاں نے ہتھیار ڈال دیے۔ میں نے لشکر خاں اور اس کے ساتھیوں کی سرچا بندی کا جائزہ لیا۔ وہ ایسی لڑائیوں میں ماہر نظر آتے تھے۔ ہر شخص اپنی مناسب ترین پوزیشن پر موجود تھا۔ لشکر خاں کے ساتھیوں کے دائیں بائیں پاؤندوں کے مسلح آدمی تھے۔ ان سب کے چہرے ہمتا رہے تھے اور وہ مرے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ یہ سب لوگ قریباً دو سو کڑی طویل ”مجاز“ پر چلے آئے تھے اور یہی وہ ڈھلوان تھی جہاں سے بستی میں داخل ہوا جاسکتا تھا۔

میں نے لشکر خاں سے پوچھا ”اگر وہ لوگ چکر کاٹ کر دوسری طرف پہنچ گئے اور اوپر سے بستی پر فائر کر گئے تو؟“

”کچھ نہیں ہوگا۔“ لشکر خاں بولا ”ایک بھی دربار راتقل نہیں ہے۔ ان لوگوں کے پاس۔ ویسے بھی بستی کا لوگ خیمے چھوڑ کر جھوپڑوں میں چلا گیا ہے۔ اوپر سے گولہ چلا بھی تو جھوپڑے میں بیٹھا ہو لوگ خیریت سے رہے گا۔ بالکل کچے مکان کے مابق ہیں۔“

لشکر خاں کی بات ٹھیک تھی۔ جھوپڑوں کی دیواروں کو سرخ مٹی کا پل کر دیا گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے مٹی کی گولہ موجود تھے۔ ایسے میں ان پر فائرنگ کے اثر انداز ہونے کا امکان کم ہی تھا۔ لشکر خاں کے مشورے سے میں نے ایک صف میں شامل ہو گیا۔ ایک ہتھیار اوٹ میں آسن بنا کر میں نے سب مشین گن کو پوزیشن میں کیا اور آنے والے گولوں کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے جو سنسنی خیز تھی۔ جو مہماں ہو سکتے تھے اور نامہاں بھی۔ دھماکا خیز بھی اور پُر سکون بھی۔ ایسے بھی اور بڑے بھی۔

قریباً دس منٹ بعد میں نے پہلی مرتبہ حملہ آوروں کے گھوڑوں کی ٹانگیں سنیں اور پھر قریباً پندرہ منٹ بعد بستی کے فواح میں پہلی گولی چلی۔ یہ ایک پرجوش تجربہ تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی فکر مند بھی دل و دماغ کو کھیرے ہوئے تھی۔ اگر عیسیٰ اور شکر وغیرہ اس لڑائی میں کامیاب ہوتے تو بستی اور بستی کے کینوں پر قیامت گزرتا۔ عیسیٰ اور بستی کے کینوں میں اس وقت تجو، نیلے، نامعلوم، اور میں بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ چھاپا مار پانی کے بھینس

ساتھیوں کی قید یا رہائی کا واسطہ ابھی اس لڑائی کے نتیجے پر تھا۔ ایک طرح سے یہ لڑائی اب میری ذاتی لڑائی بھی تھی۔ عیسیٰ اور شکر نے ہستی کو تین اطراف سے گھیر لیا۔ وہ صبح سویرے کے قریب پہنچے تھے دوپہر بارہ بجے تک دھن دھن سے کئی بار گولیاں چلیں تاہم کوئی شخص ہلاک یا شدید زخمی نہیں ہوا۔ دوپہر تک حملہ آور اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ وہ صرف شامی مرغ سے ہی ہستی میں داخل ہو سکتے ہیں اور یہی وہ سمت ہے جہاں انہیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انہوں نے اپنی ساری توجہ اس سمت میں مرکوز کر دی۔ نسبتاً اونچی جگہوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ جہاں چھوٹی کدورتی آڑ موجود نہیں تھی وہاں آڑ کا انتظام کر لیا۔ اس مقصد کے لئے درختوں کے تنے اور چھوٹے درخت استعمال کئے گئے۔ اسی دوران عیسیٰ کے ساتھیوں نے ایک اہم پیش رفت بھی کر لی۔ وہ بڑی ہوشیاری سے اس جگہ پر قابض ہو گئے جس سے ہستی کو پانی فراہم ہوا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا عیسیٰ جان و خیر کو جتنے کی طرف متوجہ کرنے والا وہی خطرہ تھا جو اس سے پہلے اپنے سردار بشر گل کو اس معاملے میں لوٹ کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہستی کی ساری آبادی اس جگہ سے پانی حاصل کرتی ہے اور اگر انہیں پانی سے محروم کر دیا جائے تو وہ سخت مشکل میں پڑ جائیں گے اس کے مشورے پر شکر نے چندہ میں افراد کے ساتھ مل کر تیزی سے کارروائی کی اور دو افراد کو قتل کر کے جگہ پر قبضہ کر لیا۔

○☆☆○

ہستی کا محاصرہ ہوئے چار روز ہو چکے تھے۔ دھن دھن سے گولیاں بھی چل رہی تھیں۔ تیسرے روز رات کے وقت عیسیٰ جان کے کچھ چوبیس ساتھیوں نے اچانک ہلا بول کر ہستی میں گھسنے کی کوشش کی۔ لشکر خاں اور اس کے ساتھی غافل نہیں تھے۔ انہوں نے فی الفور جوانی کارروائی کی۔ اس جھڑپ میں 'میں' نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ اس لڑائی میں لشکر خاں کا ایک ساتھی شدید زخمی ہوا اور تھوڑی دیر میں چل بسا۔ حملہ آوروں کا نقصان چار گنا تھا۔ ان کے چار آدمی ہلاک ہوئے اور چاروں کی لاشیں ہماری پوزیشنوں سے دس چندہ گز کے فاصلے پر پڑی رہ گئیں۔ کوئی بھی ان لاشوں کو اٹھانے کا رعب نہیں لے رہا تھا۔ آخر ہستی کے آوارہ کتے ان پر منہ مارنے لگے تاہم اگلی شب عیسیٰ جان کے آدمی لاشیں اٹھا کر لے گئے۔

موسم ٹھنڈا تھا۔ شروع میں تو پانی کی وجہ سے دقت محسوس نہیں ہوئی لیکن پھر احساس ہونے لگا کہ روزمرہ کے

معمولات جاری رکھنے کے لیے پانی کتنا ضروری ہے۔ پوری ہستی میں اب ایک قطرہ پانی نہیں تھا۔ نمائے اور کپڑے دھوئے بغیر تو میمون گزارا ہو سکتا ہے لیکن روٹی بھی تو پانی ہی سے پکتی ہے اور ہڈیاں بھی پانی کے بغیر چولے نہیں چڑھتی۔ سردیوں میں ایک دو روز تو پانی برداشت کی جاسکتی ہے لیکن اس کے بعد نہیں۔ صورت حال روز بروز خدشہ ہو رہی تھی۔ یہ امید رکھنا عبث تھا کہ ہم حملہ آوروں کو مار بھاگیں گے ہاں یہ توقع رکھی جاسکتی تھی کہ وہ اتنا کر خودی محاصرہ اٹھالیں۔ تاہم ایسے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے پاس ایمویشن کی مقدار تسلی بخش ہے اور بوقت ضرورت انہیں مزید کمک مل سکتی ہے۔ وہ ہمیں اشتعال دلا کر بار بار فائرنگ کرتے تھے جیسے اسی کوشش میں ہوں کہ ہمارا الشاک ختم کیا جائے۔

پانچویں روز صورت حال مزید سنگین ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ باگز خیل کے لوگ بھی اس محاصرے میں عیسیٰ جان کے ساتھ شریک ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں یا ہندوں اور باگز خیل والوں میں پہلے سے چپقلش چلی آ رہی تھی۔ یہ کسی چراگاہ پر قبضہ جمانے کا معاملہ تھا۔ اس چپقلش کی سنگین نوعیت کا احساس مجھے اس وقت ہوا تھا جب معمولی سی بات پر 'مروخ' غلام خاں اور سردار بشر گل کا بھائی کرسم بھڑک اٹھے تھے اور گھانا بیاں سونت کر ایک دوسرے کے مقابل آگئے تھے۔ میں نے ان دونوں کو بھٹک ایک دوسرے سے علیحدہ کیا تھا اب یہی چپقلش ایک نئے رنگ میں سامنے آئی تھی۔ عیسیٰ جان اور اس کے ساتھیوں کا حصار پہلے ہی مدت مضبوط تھا۔ اب باگز خیل والوں کے شامل ہونے سے اس میں اور پیڑھوٹی آئی۔

دوسری طرف پانی نہ ملنے سے ہستی کے حالات ابتر ہو رہے تھے۔ پانی کے علاوہ ایک مسئلہ ایندھن کا بھی تھا۔ خشک ایندھن بالکل ختم ہو چکا تھا۔ دو روز تک لوگوں نے ککڑی کی کاکڑ اور نیم کار آبدار شاؤ توڑ کر آگ جلائی پھر کارآمد اشیا آگ میں جمع کی جانے لگیں۔ اب ایندھن قریباً نایاب تھا۔ اگر جگہ سے عیسیٰ جان کے آدمیوں کا قبضہ ختم کیا جاسکتا تو پانی کے علاوہ ایندھن کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا تھا۔ جگہ کے اوپر کئی تعداد میں خشک درخت موجود تھے اور ان میں سے کچھ کٹے ہوئے بھی تھے۔

لوہہ بھڑکتی ہوئی صورت حال سب کے لئے پریشان کن تھی۔ شام کو سردار بشر گل کے وسیع و عریض جھونپڑے میں دیر تک صلاح مشورہ ہوئے۔ موضوع بحث یہی تھا کہ

جتنے کا کنٹرول دوبارہ کیے حاصل کیا جائے۔ اس کے علاوہ باگز خیل والوں کا میدان میں اترنا بھی ہر ایک کے لئے باعث تشویش تھا۔ سردار بشر گل نے کہا کہ اگر کل تک ہستی کی کوئی صورت نہ نکلی تو جگہ پر ہلا ہونا ہوگا۔ اس نے بتایا کہ پانی اور ایندھن کے نہ ملنے کی وجہ سے لوگ کچا گوشت کھاتے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ واپس اپنے 'مورچے' میں جانے سے پہلے میں بخور اور نیلہ کو دیکھنے گیا۔ ہستی کے عام نمینوں کی طرح ان کے چہرے بھی اترے ہوئے تھے۔ موت کا خوف تو محاصرے کے پہلے روز سے ہر ایک کو دامن گیر تھا۔ اب اس خوف میں سردی اور بھوک کا خوف بھی شامل ہو گیا تھا۔ بخور نے بتایا کہ وہ پچھلے تین دن سے کچا گوشت کھا رہے ہیں۔ جھونپڑے ساری رات برقاب بنے رہے ہیں۔ نیلہ کے ساتھ آنے والے بچے کو کل سے شدید بخار تھا۔ اس کی طبیعت پہلے بھی خراب تھی۔ اب ناقص غذا کے سبب وہ زیادہ بیمار ہو گیا تھا۔

اس شب 'مورچے' میں بیٹھے بیٹھے مجھے ادھم اٹھنے لگی تو خود کو چوس کر رکھنے کے لیے میں نے قریب بیٹھے کو مستانی سے گپ شب شروع کر دی۔ اس کا نام گل شیر تھا۔ معلوم نہیں گل کے ساتھ شیر کیوں لگا دیا گیا تھا۔ گل کے ساتھ تو ہمیشہ بلیل کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ گل کے ساتھ شیر نہ لگایا گیا ہو بلکہ شیر کے ساتھ گل لگایا گیا ہو۔ اگر ایسی بات تھی تو پھر اعتراض کی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ شیر آخر شیر ہوتا ہے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ کچھ بھی لگا سکتا ہے بلکہ کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں، وہ اپنی پسند کے مطابق 'چر' اڑایا دونوں چیزیں ایک ساتھ دے سکتا ہے۔ گل شیر کو میرے ساتھ اس جگہ بستہ مورچے میں بیٹھے آج چوتھی شب تھی۔ ان چاروں راتوں میں میں نے ڈٹ کر خنیز پوری کی تھی بلکہ اکثر دن کے وقت بھی جھپکی چپکی کے لیے تھی۔ وجہ گل شیر ہی تھا۔ معلوم نہیں کس مٹی کا بنا ہوا تھا وہ اپنے حصے کی ذیوٹی میں تو جانتا ہی تھا، میرے حصے کی ذیوٹی میں بھی آگے نہیں جھپکتا تھا۔ آخر اسے مسلسل جاتے دیکھ کر میں نے مسلسل سونا شروع کر دیا تھا۔ خطرات تو ہم جیسوں کو دیے بھی لوری دیا کرتے ہیں اور جب سونے میں کوئی اندیشہ بھی نہ ہو تو لوری کا مجرم رکھنے میں کیا حرج رہ جاتا ہے۔

میں نے جب بھی کہا 'بھائی گل شیر! تھوڑی سی خنیز لے لو' تو اس نے لال لال آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ سوار کی دنیا سے ایک بڑا سا چٹکا لے کر نچلے ہوٹ میں رکھا اور دھمکا کر انکار میں سر ہلا دیا۔ اس نے بتایا تھا کہ ایسی بہت سی قبائلی

لڑائیوں میں حصہ لے چکا ہے۔ کئی مرتبہ اسے پورا پورا ہنست کچھ کھائے بچے بغیر مورچے میں چوس رہتا پڑا ہے۔ اب ایسی عادت بن چکی ہے کہ رات نکل باٹھ میں کھائے ہی اس کی خنیز اڑن چھو جاتی ہے۔ گل شیر کا تعلق لشکر خاں والے جتنے سے تھا تاہم وہ پاؤندہ ہستی اور اس کے گرد و فواح کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا 'بھائی گل شیر! تمہارے خیال میں چشمہ کتنے فاصلے پر ہے یہاں سے؟'

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا 'خوجہ اتنی دور نہیں ہے۔ بالکل پاس ہے۔ یہ سائے کا ٹیلا ہے۔ تاہم اس کی دوسری طرف ہے۔ بہت ہوا تو تین سو قدم کا فاصلہ ہوگا۔ وہ بعض حضرات کی طرح 'قف' کی بوڑی یا قاعدگی سے 'پ' میں بدل دیتا تھا۔ شادت کی انگلی سے اپنی دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا 'وہ اونچا پیڑ دیکھ رہا ہے نہ تم۔ اس پر چڑھے گا تو دوسری طرف چشمہ صاف صاف نظر آئے گا۔' شکیل کا یہ درخت کافی اونچا تھا۔ چالیس پچاس فٹ سے کم بلندی کیا رہی ہوگی اس کی۔ چاند تاروں کی مدد ہم روشنی میں وہ ساکت کھڑا دو پہلے حلق نظر آ رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس حلق کو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ پچھلے پانچ روز سے میں یہاں موجود تھا اور کئی بار اس درخت پر نگاہ پڑ چکی تھی لیکن نگاہ ڈالنے اور دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ واقعی بہت بڑا درخت تھا یہ اور بہت شاندار بھی۔ کھائے کیوں دل چاہا کہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر خاموشی سے اس درخت پر چڑھا جائے اور ڈرگرویش کا جائزہ لیا جائے کچھ نہ مکرے سے کچھ کرنا بہتر ہوتا ہے۔ یعنی بے کارو کچھ تو کیا کرو۔ پتائی پتائی کیسے لگے۔

میں نے اپنی سب مشین من گل شیر کو سونپی اور اس کی بارہ بورا رات نقل کندھے پر لٹا کر درخت چٹائی کے لئے تیار ہو گیا۔ گل شیر نے مجھے دیکھا چاہا مگر چونکہ اس 'جانب' کے پیچھے کوئی اٹھائی نہیں تھی 'میں' اسے 'مہار' کر کے درخت کی طرف رعب گیا۔ درمیان میں فاصلہ بمشکل ہیں پچیس فٹ تھا۔ تنے کی لیپٹ سات آٹھ فٹ سے کیا کم ہوئی۔ میں تنے کے پیچھے کھڑا ہوا تو سامنے سے آنے والی گولیوں سے بالکل محفوظ ہو گیا۔ تاکہ درخت اور اس پر نہ پڑے۔ شے کے شمار ابھار تھے۔ میں نے شاخوں کا جائزہ لیا پھر گھنٹوں کے بل جھک کر جست لگائی اور ایک دس فٹ اونچی شاخ سے جمبول کراہر پہنچ گیا۔ جل کوٹ میں سولہ برس کی عمر تک شب و روز میرا ایسے ہی درختوں سے واسطہ رہا تھا۔ بچپن کی یہ مہارت اب

کام آری تھی۔ میں شاخوں پر مضبوطی سے ہاتھ پاؤں جماتا اور جانے لگا۔ کوشش یہ تھی کہ میری نقل و حرکت حتی الامکان غیر محسوس ہو اور سائت ہوا میں برک و بارانی طرح جو خواب رہیں پیسے میرے چڑھنے سے پہلے تھے۔

اوپرے درختوں پر چڑھتے ہوئے جوں جوں بلندی کی طرف جائیں کام بھرا ہوتا جاتا ہے۔ تازک شاخوں پر ہاتھ پاؤں کا وزن بڑی سہارت سے تقسیم کرتا ہوتا ہے اور یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کون سی شاخ وزن سہارے گی اور کون سی تازک اندام "اولی اللہ" کہہ کر پاؤں کے نیچے سے نکل جائے گی۔

خاصی بلندی پر پہنچ کر میں نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ نیلے کی دوسری جانب چشمے کے خدو خال صاف نظر آ رہے تھے۔ یقیناً باپاں یاں وغیرہ کرنے کا انتظام بھی تھا۔ مجھے یہ جان کر خوشوار حیرت ہوئی کہ چشمہ نیلے کے بالکل ساتھ ہی واقع ہے۔ گل شیر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ فاصلہ دھاتی تین سو قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ یقیناً چشمے کے ارد گرد پھیلی جان کے سطح کارندے بھی ہوں گے مگر تاریکی میں ان کی پوزیشنیں نظر نہیں آری تھیں۔ یہ سوچ کر میرا دل دھڑک اٹھا کہ سب

مشتیں گمن کے ذریعے ان پوزیشنوں کو بے آسانی نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ کچھ دیر گزر کر وہ نواح کا جائزہ لینے کے بعد میں جس خاموشی سے درخت پر چڑھا تھا اسی خاموشی سے نیچے اتر آیا۔

تھوڑی دیر بعد وہیں ایک پتھر کی اوٹ میں میرے اور لشکر خاں کے درمیان اس بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ "میں براہ راست یہ بت خطرناک کام ہے" لشکر خاں نے کہا "جب تک آجلا نہ ہو جائے تم اوپر سے سردار پھیلی کے کسی لشکر کی نشانہ نہیں بنا سکتے۔ اور پیسے ہی آگاہ ہو گا تم اوپر درخت پر بالکل صاف نظر آجائے گا۔ پھیلی کا حرای بندوبستی تم کو فوراً سے پہلے مار گرائے گا۔"

"ایک طریقہ ہو سکتا ہے براہ راست" میں نے اس معاملے میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا "درخت کاٹی گھٹا ہے مجھے یقین ہے جب تک میں گولی نہ چلاؤں گا میری پوزیشن کا پتا نہیں چلے گا۔ کیوں نہ میں تین چار برسٹ ماروں اور نیچے چلائی لگا دوں۔"

"اور تمہارا ہڈی پھلی ایک ہو جائے" لشکر خاں نے میرا حقہ مکمل کیا۔

"خان! اس کا بھی حل سوچا جاسکتا ہے۔ چلائی لگانے کے لئے جال یا کوئی اور چیز نیچے رکھی جاسکتی ہے۔"

"تمہارا بات امدادی کچھ میں نہیں آتا براہ راست یہ برا

سے سنبل پر چڑھتا تھا اور سب مشتیں گمن کے ساتھ پوزیشن سنجال کر بیٹھ جاتا تھا۔ اس کا ردوائی کو آب چشمے پر "نصفائی مہلہ" کہہ سکتے ہیں۔ زمینی نیلے کی قیادت رسم نے کرنا تھی۔ اس کا کام یہ تھا کہ وہ دس پندرہ افراد کے ساتھ بالکل چوکس حالت میں رہے۔ جو کسی میں درخت سے چشمے کے خاندنوں کو نشانہ بنائوں وہ اپنی جگہ سے حرکت کر کے چشمے پر پہنچ جائے۔ درخت سے میرے کوونے کا مسئلہ کافی ٹیڑھا تھا۔ یقیناً سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ میں بروقت کوونے میں سکون پایا نہیں اور اگر کوونہ تو راستے میں انک جاؤں گایا نیچے پہنچوں گا۔ اور اس سے بھی اہم سوال یہ تھا کہ روشنی چھیلنے پر میں نیچے سے دیکھ تو نہیں لیا جاؤں گا۔ درحقیقت یہ ایک جال لیا اہم تھی۔ کوئی عام شخص ایسی پلاننگ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر میں ایسا سوچ رہا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایک عام شخص نہیں تھا۔

سات برس پشتر مجھ پر ٹوٹے والے مصائب کے پہاڑ نے مجھے عام شخص رہنے ہی نہیں دیا تھا۔ میں دنیا کو دھوکا دیتا تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ سجا کر اور لہجے میں منانیت سمیٹ کر خود کو ایک عام شخص ظاہر کرتا تھا لیکن میں نہیں تھا ایک عام شخص۔ میرے اندر ایک سفاک و درندہ چھپا ہوا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ جیل سے رہا ہو گیا تھا اور اب آزادی کی ہوا اس کی بے خوفی اور درد منگی کو جو بن پر لاری تھی۔

رات تاریک اور سرد تھی۔ درمیانی راتوں کا چاند منہنی افق پر موجود تھا لیکن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رات آخری پر فطعلہ ابراہیم ہوتا شروع ہوا تھا اور اب آسمان کا بیشتر حصہ بادلوں سے ڈھک چکا تھا۔ جو کسی میری کلائی کی گھڑی نے چار بجائے۔ میں نے اپنے قریب بیٹھے گل شیر کا کندھا تھپتھپایا اور دم آواز میں کہا "اچھا میں چلا ہوں۔"

"گلی شیر منہنیا! اپنا خیال رکھنا بھائی۔ گولی چلا کر "نورا" چلائی گئی مارنا "بھول" میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرتا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میری دائیں جانب قریب بیس فٹ آگے کی طرف رستم اپنے دھتے کے ساتھ بالکل تیار حالت میں موجود تھا۔ وہ کل میں افراد تھے ان میں مقامی صرف رستم ہی تھا۔ باقی سب لشکر خاں کے آدمی تھے۔ وہ خود کار را کھل اور شات ٹنوں سے مسلح تھے اس کے علاوہ ان کے پاس دو عدد دستی بم بھی تھے۔ میں نے رستم کی طرف دیکھ کر ہاتھ لیرایا۔ اس نے بھی ہاتھ لیرا کر جواب دیا۔ میں اونڈھا لیت گیا اور حسب سابق ریک کر چلا ہوا سنبل تک پہنچ گیا۔

تھے کی آؤ میں کھڑے ہو کر میں نے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر ایک دو شاخے سے جھول کر درخت پر اٹھیا۔ سب مشتیں گمن بھی ساتھ تھی لہذا اس دفعہ درخت پر چڑھنا نسبتاً دشوار ثابت ہوا۔ مورچا بنانے کے لئے ایک مضبوط دو شاخہ میں کل دن کے وقت ہی منتخب کر چکا تھا۔ سب مشتیں گمن کو مناسب جگہ بنانے کے بعد میں نے چند بالائی شاخوں کو نیچے جھکا کر زیریں شاخوں میں پھنسا دیا اور اس طرح میرا پالیاں پھلو زیادہ محفوظ ہو گیا۔ کالی جیکٹ میں نیچے ہی اتار آیا تھا۔ اب میرے جسم پر ایک خاکستری قمیض تھی اور شلوار بھی کچھ ایسے شوخ رنگ کی تھیں تھیں۔ اگر میں اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہتا تو اندھیرا پھٹنے پر بھی نیچے سے دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔

وقت کی رفتار کبھی نہیں بدلتی لیکن موقع محل کے لحاظ سے وقت گزرنے کا احساس بدلتا رہتا ہے۔ اس بلند و بالا درخت پر تنگ کر اٹھنے کا انتظار کرنا بہت ٹھنک تھا۔ لیکن کرنا تھا۔ میں بیٹھا رہا اور وقت ریتکتا رہا۔ آخر مشرق سے سپیدہ مخر نمودار ہوئے لگا۔ سیاہی میں سفیدی کی آمیزش ہونے لگی۔ شاخوں پر پرندے چہچہاتے اور میری نگاہوں کے سامنے خیب و فراز نمایاں ہوتے چلے گئے۔ میں بالکل بے حس و حرکت ہو گیا۔ ایک معمولی سی جنبش، ایک ذرا سی حرکت موت کا پیام بن سکتی تھی۔ موت جو چھلکا ہوا سیسا تھی اور جو مجھے ہر طرف سے نشانہ بنا سکتی تھی۔

تھپتھپاتے آجائے میں میں نے چشمے کا منظر دیکھا۔ پتھروں سے چھوٹا ہوا پانی ایک شفاف تالاب میں جمع ہو رہا تھا۔ تالاب کے کنارے چند برہنہ چٹانیں زمین میں بوست تھیں۔ ان چٹانوں کے عقب میں جیسی جان کے آدمیوں کی پوزیشنیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ کل چار آدمی تھے ان کے کندھوں پر بھاری کیبل تھے۔ رانٹلیں گود میں رکھے وہ پتھروں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے ان میں سے ایک اونگھ رہا تھا جبکہ باقی باتوں میں مصروف تھے۔ یہ تعداد میری توقع سے بہت کم تھی۔ میں نے دیگر محافظوں کی تلاش میں ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ چشمے کی دوسری جانب ایک جگہ راکھ اور کوئلوں کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہاں رات کو ٹنگ جلائی گئی ہے۔ ارد گرد کی زمین سیاہی بالکل ہو رہی تھی۔ اس سیاہی بالکل زمین کے ساتھ ایک چھوٹی سی کھوکھلا دار ڈاکو ہاتھ نظر آتا تھا۔ میرے دیکھنے ہی دیکھتے اس دہانے میں نقل و حرکت کے آثار نظر آئے۔ ایک شخص ہاتھ میں بڑی سی سیاہ رنگ کیتلی لئے پر آمد ہوا۔ رات نقل اس کے کندھے سے بھی

محترم شیم نوید کے فسون خیز قلم سے ناقابل فراموش ناول

دیب بان

بائیسویں کیم

خیر و شر کا ازی تصادم، قدم قدم پر بنی کر دیش،

ہنگامے جگاتی حیرت انگیز داستان،

ایک انوکھی کہانی، ایک مکمل تاریخ

● وہ دیوتاؤں کی چہیتی تھی۔

● پراسرار سرگوشیاں اس کی رہنما تھیں۔

● اس کے ہاتھ میں زندگی کی ریکھا تھی نہ موت کی۔

● وہ سانپوں سے بڑھ کر زہریلی تھی۔

● اس کی آنکھوں سے موت کی کڑکتی بجلیاں نکلتی تھیں۔

● وہ انتقام کی بھڑکتی آگ کو دشمن کے خون کے چھینٹوں سے سرد کرنا چاہتی تھی۔

● پراسرار اور شیطانی قوتیں اس کی راہ میں حائل تھیں

60

اسے پلانا اسے سہارے دینا اسے طلب فرمائیں

علی میاں پبلیکیشنز ۲۰ عزیز ناکسٹ، اردو بازار لاہور
07247414

علی بکسٹال نسبت روڈ، چوک میوہ پستال، لاہور



جھول رہی تھی۔ اس نے باہر نکل کر اطراف کا جائزہ لیا۔ ایک ساعت کے لئے مجھے غموں ہوا کہ وہ درخت کی طرف دیکھ رہا ہے۔ خون رگوں میں سنسنی اٹھا۔ سب نشیمن گن کی لہلی پر میری انگلی اور تن گئی۔

اطراف کا جائزہ لے کر کھینچنے والے نے اپنے سر پر ٹوپی درست کی اور کھوہ کی طرف رخ پھیر کر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں کا نتیجہ فوراً نکلا۔ کھوہ کے دہانے سے دو آدمی قہقہے لگاتے ہوئے آئے۔ وہ جھٹے پر جا کر منہ ہاتھ دھوئے میں مصروف ہو گئے۔ ان کے منہ ہاتھ دھوئے کے دوران چار افراد مزید کھوہ سے نکل آئے اور چند قدم چل کر جھٹے کی طرف آگئے۔ ایک مخصوص مقام پر جھٹے ہی وہ سب جھک جاتے تھے اور باقی کا فاصلہ دوڑ کر اور جھک کر طے کرتے تھے۔ یقیناً اس مقام سے گزرتے ہوئے وہ لشکر خاں اور اس کے ساتھیوں کے نشانے پر ہوتے تھے۔

میں نے تقریباً پانچ منٹ ان کی مصروفیات کا جائزہ لیا۔



اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔